خدا کی بستی

شوکت صدیقی

خُدا کی بستی

(ناول)

اچھی کتاب
کا
نکھار ہمیشہ
قائم
رہتا ہے!

خدا کی بستی

شوکت صدیقی

◎

ناشر

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں)

ایڈیشن ———— 2002
تعداد ———— ۵۰۰
قیمت ———— 120

ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

ظفر مسعود کے نام

وہ ”خدا کی بستی“ کا پہلی بار نوشا بنا۔ ٹیلیویژن
کے مقبول اداکار کی حیثیت سے اُبھر کر
سامنے آیا۔ نت نئے رُوپ میں جلوہ گر
ہوا۔ مشہور ہوا۔ خوش شکل اور خوش طبع
تھا۔ آشفتہ مزاج اور مہم جُو تھا۔ اداکاری سے
تائب ہوا۔ زندگی میں ایک کے بعد دوسرا تجربہ
کیا۔ قاہرہ پہنچا۔ ٹیکسی کے ایک حادثہ کا
شکار ہوا۔ بھری جوانی میں اللہ کو پیارا ہوا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

GHALIB INSTITUTE
RESEARCH LIBRARY

برسبیلِ تذکرہ

چوبیس سال، قبل کا ذکر ہے۔ دن اور تاریخ تو صحیح طور پر یاد نہیں — البتہ اتنا یاد ہے، جون ۱۹۵۷ء کی ایک گرم اور بوجھل سہ پہر تھی، جب میں نے اس ناول کا آغاز کیا تھا۔ اور پہلی ہی نشست میں پندرہ سے زائد صفحات لکھ کر اُٹھا تھا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے۔ بدن میں جان تھی۔ ذہن زرخیز تھا — خیالات لاوے کی مانند اُبلتے تھے۔ الفاظ کے پیکر میں ڈھلتے تھے۔ قلم گویا فراٹے بھرتا تھا۔ دن میں لکھتا تھا، اور رات میں بھی۔ ایک انگریزی اخبار میں کام بھی کرتا تھا۔ پابندی سے دفتر جاتا تھا۔ خوش اسلوبی سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

اکتوبر کا مہینہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ناول اختتام کو پہنچا۔ یہ لگ بھگ چار ماہ کی شب و روز محنت کا ثمر تھا۔ ناول مکمل ہوا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ مسوّدہ اُٹھا کر ایک طرف رکھا۔ سوچا، ذہن کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو یکسوئی سے مسوّدہ پر نظرِ ثانی کروں گا۔ پلاٹ مربوط کروں گا۔ واقعات میں ہم آہنگی پیدا کروں گا۔ حقائق کی چھان پھٹک کروں گا۔ الفاظ کی نشست و برخاست اور جملوں کی تراش خراش پر مزید توجہ صرف کروں گا۔ نوک پلک درست کروں گا۔

بقول شخصے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کروں گا۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ ناول مکمل ہوتے ہی ناشر کی تحویل میں چلا گیا۔ کتابت شدہ مسودے کی پروف ریڈنگ نہ خود کر سکا۔ اور نہ ہی اپنی نگرانی میں کرا سکا۔ ۱۹۵۸ء میں ناول چھپ کر آیا۔ دیکھا تو دھچکا لگا ذہن نے جگہ جگہ ٹھوکر کھائی۔ پروف ریڈنگ کی غلطیاں سب سے زیادہ شاق گزریں الفاظ کا کیا ذکر، جملے کے جملے غائب تھے۔ بہر حال یہی ایڈیشن چھپتا رہا۔ اور بار بار چھپتا رہا۔ پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ اردو کے اسی ایڈیشن کے ترجمے اب تک اٹھارہ غیر ملکی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

خدا خدا کر کے ایک طویل اور صبر آزما مقدمہ بازی کے بعد، ۱۹۷۰ء میں "خدا کی بستی" کے جملہ حقوق، کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت مجھے واپس ملے۔ ۱۹۷۱ء ختم بھی نہ ہوا تھا کہ آخری ایڈیشن ختم ہو گیا۔ بازار میں ناول ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا۔ ایسا عنقا ہوا کہ قارئین بے قرار ہو کر بار بار مجھ سے رجوع کرتے۔ میں کبھی معذرت کرتا۔ اور کبھی خاموشی اختیار کرنے میں عافیت سمجھتا۔ اس عرصے میں کئی ناشرین نے ناول کی اشاعت میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ مگر بات بن نہ سکی۔ کوتاہی مجھ سے ہی ہوئی۔ سوچتا تھا کہ "خدا کی بستی" کا نیا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد ہی چھپواؤں گا۔ لیکن اتنی یکسوئی نصیب نہ ہوئی کہ دل جمعی کے ساتھ نظر ثانی کر سکوں۔ گوناگوں صحافتی مصروفیات نے مہلت ہی نہ دی۔ اور جب کوچۂ صحافت سے نکل کر کوئے ادب میں واپس آیا تو ایک نئے ناول پر کام کرنا شروع کر دیا، جو ہنوز تکمیل کے مراحل میں ہے۔

بارے، کسی نہ کسی طور وقت نکالا۔ نظر ثانی کی۔ اغلاط کی حتی الوسع

اصلاح کی۔ زبان و بیان میں کہیں کہیں جھول تھا، ابہام تھا۔ اُسے درست کیا۔ بنایا، سنوارا اور اشاعت کے لئے دے دیا۔ دیکھا جائے، تو اس حیثیت سے "خدا کی بستی" کا موجودہ ایڈیشن، پچھلے ایڈیشنوں سے قدرے مختلف ہے۔

شوکت صدّیقی

۱۶؍ جون ۱۹۸۱ء

فصل اوّل

(۱)

گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین روشن تھی۔

لالٹین کی روشنی میں محلے کے کچھ لڑکے، بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ وضع قطع سے وہ آوارہ گرد اور لاابالی نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بال۔ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص۔ اور گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ ملی جُلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کر کہتا:

"کہو، اُستاد! کیسا بیمہ کیا۔"

"ابے! یہ رہی بگی، واہ میری جان، میں تیرے قربان۔"

"سالو! آج تم کو بدا ماروں گا۔"

وہ برابر جیت رہا تھا۔ اُس کے مقابلے میں شامی تھا۔ وہ دُبلا پتلا چھریرے جسم کا لڑکا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ مزاج کا بھی تیز تھا۔ ایک بار جب

راجہ نے سب کی نظریں بچاکر۔ پیر کے نیچے چھُپا ہُوا تاش کا پتّا نکالا تو شامی نے تاڑ لیا۔ فوراً چلّایا :

"دیکھ لیا، دیکھ لیا۔ سالے ! یہ بے ایمانیاں کرتے ہو۔"

راجہ اس کے احتجاج پر کھسیانہ سا ہو کر ہنسنے لگا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "ابے کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے ؟"

شامی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "تم نے ابھی پیر کے نیچے سے پتّا نکالا ہے۔"

راجہ نے دھاندلی کرنی چاہی۔ شامی نے جل کر ہاتھ میں دبے ہوئے تاش کے سارے پتّے پھینک دیئے۔ اور رُوٹھ کر بیٹھ گیا۔

راجہ اُسے چھیڑنے لگا۔ "سالا ہارنے لگا تو رونے بیٹھ گیا۔"

شامی بگڑ کر بولا۔ "تم ایک نمبر بے ایمان ہو۔ اب کبھی تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔"

راجہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "کھیلو گے کیوں نہیں۔ داؤ دے کر جانا پڑے گا۔"

شامی اکڑ کر بولا۔ "دیکھیں کون مائی کا لال داؤ لیتا ہے۔"

راجہ کو غصہ آ گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے گھور کر دُبلے پتلے شامی کو دیکھا۔ کڑک کر بولا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" اور جھپٹ کر شامی کا گریبان پکڑ لیا۔ شامی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑانا چاہا۔ گریبان چر سے پھٹ گیا شامی کو تاؤ آ گیا۔ اُس نے منہ بسُور کر راجہ کی جانب دیکھا۔ اور تڑ سے زناٹے کا ایک ہاتھ راجہ کے گال پر رسید کیا۔ راجہ کے کان جھنجھنا اُٹھے۔ وہ تلملا کر شامی پر جھپٹا۔ اور دونوں گتھّم گتھّا ہو گئے۔

لڑکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ اُنہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب وہ دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی۔ دوسری للکار للکار

لرشامی کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا، مگر اُس کے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ پہلے راجہ نے ٹنگڑی لگا کر پٹخنی دی۔ شامی کو گرایا اور اُوپر سے دبا کر بیٹھ گیا۔

لیکن ایک بار شامی نے نیچے سے کچکچا کر زور لگایا۔ راجہ سے سنبھالا نہ گیا۔ دھڑام سے نیچے آ گیا۔ شامی جھٹ اُس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ گردن پر گھٹنا رکھ کر دو تین گھسے جو دئے تو راجہ چیں بول گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔

اُسی وقت گلی میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو لڑکوں نے دیکھا کالے صاحب آ رہا تھا۔ اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ قدم بوجھل پڑ رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی لڑکوں نے نعرہ لگایا :

"کالے صاحب !"

اُس نے گھُور کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ راجہ اور شامی ابھی تک گتھم گتھا تھے۔ کالے صاحب کی نظر پڑی تو وہ اُنہیں ڈانٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُس نے علیحدہ کیا۔ اُن کی قمیصیں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ دُھندلی روشنی میں دونوں کا حُلیہ بھُوتوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ کالے صاحب نے تیکھی نظروں سے دیکھا اور آنکھیں نکال کر غصّہ سے اُن پر جھپٹا۔ اُنہوں نے کالے صاحب کو آگے بڑھتے دیکھا تو گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کالے صاحب کو ہنسی آ گئی۔ اُس نے بغل میں دبا ہوا اپنا چمڑے کا بیگ سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چیخنے لگے :

"کالے صاحب ! ٹوٹ گئی بوتل اُڑ گیا کاگ"

"کالے صاحب ......"

وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتا۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹتا۔ کبھی اُن کو دھمکانے کے لئے جھپٹتا۔ لڑکے اُس کو پلٹتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ پھر اکٹھا ہوتے اور تالیاں

بجا بجا کر چھیڑتے۔ وہ دُور تک اُس کے پیچھے شور مچاتے چلے گئے۔

لالٹین کے نیچے اب صرف راجہ، شامی اور نوشا رہ گئے تھے۔ راجہ کھسیانا کھسیانا دکھائی پڑ رہا تھا۔ وہ محلّے کے سارے لڑکوں کا سرغنہ تھا اور اُس وقت شامی کے ہاتھوں سب کے سامنے اُس کی بڑی کرکری ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کیے۔

جیب سے ایک مُڑی تڑی سگریٹ نکالی، سُلگائی۔ دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور ایک روپیہ نکال کر نوشا سے بولا:

"ابے سنیما چلتا ہے؟"

نوشا کی خوشی سے باچھیں کِھل گئیں۔ کہنے لگا "کونسی پکچر دیکھوگے؟"

راجہ نے شامی کی جانب دیکھ کر کہا "آج تو یار لوگ 'بغداد کا چور' دیکھیں گے۔ باپ قسم ایسی فسٹ کلاس پکچر ہے۔ لطف آجائے گا۔"

نوشا نے شامی کی سفارش کی "اور شامی کو نہیں لے چلوگے؟"

راجہ بگڑ کر بولا "دیکھ بے چلنا ہے تو ویسی بات کر، ورنہ جا اپنی ایسی کی تیسی میں۔"

شامی غرانے لگا "دیکھو جی! تم کو سنیما جانا ہو تو جاؤ۔ میرا نام مت لو۔ میں تو گھر جاؤں گا۔ تمہاری طرح میں رات رات بھر آوارہ گردی نہیں کرتا۔" اتنا کہہ کر وہ تو وہاں سے چل دیا۔

نوشا کہنے لگا "ابے سُن تو۔"

راجہ نے ڈانٹ کر کہا "جانے دے سالے کو۔ دیکھ لینا اب کبھی اس کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ایک نمبر حرامی ہے۔ سالے نے گردن چھیل ڈالی۔" وہ آہستہ آہستہ اپنی گردن سہلانے لگا۔ جس پہ خراش پڑ گئی تھی۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے سنیما ہاؤس کی طرف چل دئے۔

آدھی رات کے قریب جب وہ "بغداد کا چور" دیکھ کر لوٹے تو گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے ایک خارش زدہ کتا بیٹھا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ دونوں اس کے قریب سے گزرے تو راجہ نے ایسی زوردار لات ماری کہ وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا بھاگا۔ اُس کی چیخوں سے ساری گلی گونج اُٹھی۔ نوشا پہلے ہی سہما ہوا تھا، اس شور سے اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔ مگر راجہ بڑے کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ پکچر اُس کو پسند آئی تھی۔ بار بار کہتا تھا:

"یار! بڑی زوردار پکچر تھی۔ کیا سالا اشٹائل سے مکّہ مارتا تھا۔" راجہ نے مٹھی بھینچ کر اپنا ہاتھ بڑے پینترے کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور حلق سے آواز نکالی۔ "ڈھشم"۔ ساتھ ہی اُس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نوشا کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ "باپ قسم مجا آگیا آج۔"

نوشا جل کر بولا۔ "ابے تجھ کو مجا آ رہا ہے۔ کہیں اپنا سینما نہ ہو جائے۔"

راجہ اُسے چھیڑنے لگا۔ "جب اتنا ہی ڈر ہے تو سلے خاں پھر سینما کیوں جاتے ہو؟"

نوشا کہنے لگا۔ "یار اب نہیں جاؤں گا۔ بہت رات ہو جاتی ہے۔"

"ابے تُو روز یونہی کہتا ہے۔ کل پھر جائے گا۔ دیکھ لینا۔"

دونوں باتیں کرتے سُنسان گلی میں چلتے رہے۔ نوشا کا گھر قریب آگیا تو اُس نے راجہ کو ٹھہرا لیا۔ خود آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر گیا۔ کان لگا کر اندر کی آہٹ لی۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ اُس نے کواڑوں کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوشا اُلٹے قدموں راجہ کے پاس واپس پہنچا۔

راجہ نے پوچھا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "دروازہ تو بند ہے۔" اُس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

راجہ کہنے لگا۔ "ابے تو پھر انتظار کس بات کا ہے؟"

دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے گھر کی چار دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

نوشا کا گھر بھی محلّہ کے عام مکانوں کی طرح پرانی وضع کا تھا۔ کھپریل کی چھت تھی۔ دیواریں زیادہ اُونچی نہ تھیں۔ راجہ دیوار سے ٹیک لگا کر گھوڑا بن گیا۔ نوشا سے بولا: "آجا پیارے شیر!"

نوشا چپ چاپ اُس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اُس نے دیوار مضبوطی سے پکڑی اور بندر کی طرح اُچک کر اُوپر پہنچ گیا۔ نیچے سے راجہ نے سرگوشی سے کہا: "میں تو اب چلا۔"

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ "اچھا۔"

راجہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لیکن نوشا دیوار پر خاموش بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کوئی آواز نہ سُنائی نہ دی تو وہ دھم سے صحن میں کُود گیا۔ وہاں ٹین کا ایک ڈبّا پڑا تھا۔ ڈبّا اُس کے پیروں کے نیچے آکر زور سے بج اُٹھا۔ اُسی وقت کمرے کے اندر ماں کی آواز اُبھری۔ "کون؟"

نوشا دیوار سے چمٹ کر بیٹھ گیا۔ اور منہ سے بلّی کی طرح آوازیں نکالنے لگا، میاؤں میاؤں۔

ماں کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پھر اُبھری۔ "ہش، بِل بِل ہش!"

نوشا دیوار کے قریب سہما ہوا بیٹھا تھا۔ دھڑکتے دل سے سوچتا تھا، اگر ماں نے باہر آکر کہیں اُسے دیکھ لیا تو اچھی خاصی مرمّت ہو جائے گی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ سردی کے مارے نوشا کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ سارا بدن برف کی مانند سرد پڑ گیا تھا۔ مگر وہ دبکا ہوا جہاں تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کمرے کے اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اُس نے احتیاط کے طور پہ دو تین بار بلّی کی آواز نکالی۔ مگر کوئی نہ بولا۔

وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اُس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کونے میں لیمپ جل رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں سامنے فرش پر اُس کا چھوٹا بھائی انّو لیٹا تھا۔ ذرا فاصلے پر ماں لیٹی تھی۔ اور اُس کے قریب ہی سلطانہ لحاف میں دبکی پڑی تھی۔ وہ انّو اور نوشا سے بڑی تھی۔

نوشا چوروں کی طرح چپکے سے کمرے کے اندر گیا اور انّو کے برابر لیٹ گیا۔ اُسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ ڈر کے مارے اُس نے انّو کی رضائی کو ہاتھ بھی نہ لگایا، جیسے اوڑھ کر دونوں سویا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیند میں ذرا بھی انّو کے ہاتھ لگتا تو گھبرا کر اس طرح چیختا کہ سوتوں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سردی سے کانپتا سکڑا سمٹا لیٹا رہا۔

ذرا دیر بعد سلطانہ کے کھانسنے کی آواز کمرے کی خاموشی میں اُبھری۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے مُڑ کر نوشا کو دیکھا جو آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ وہ اُٹھ کر نوشا کے پاس گئی۔ رضائی اُس کے جسم پر ڈال کر سرگوشی میں آہستہ سے بولی:

"اُدمُوئے بلّے! رضائی تو اوڑھ لے۔ تجھے تو سردی بھی نہیں لگتی۔"

نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور گھور کر سلطانہ کو دیکھا۔ وہ اُسے چھیڑنے لگی۔ "آنکھیں نکالیں تو ابھی جگاتی ہوں اماں کو۔"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ اس کی ران میں زور سے چٹکی بھری۔ وہ بلبلا کر بولی۔ "ہائے اماں! ایک تو کمبخت کے ساتھ نیکی کرو۔ اوپر سے چٹکیاں بھر رہا ہے۔"

اس دفعہ سلطانہ کی آواز کسی قدر اونچی تھی۔ مگر ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اُس نے کروٹ بھی نہ لی۔ نوشا نے ڈر کے مارے چوں بھی نہ کی۔ آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑا رہا۔ جب سلطانہ اُٹھ کر جانے لگی تو وہ جل کر بڑبڑایا۔ "حرامزادی!"

سلطانہ نے اُس کی گالی سُن لی تھی۔ مگر اب وہ اُس سے اُلجھنا نہیں چاہتی

تھی۔ خاموشی سے جاکر اپنی جگہ لیٹ گئی۔ نوشا ذرا دیر تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا پھر گہری نیند سوگیا اور دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔

اُس روز جب وہ ورکشاپ پہنچا تو دیر ہو گئی تھی۔ پھاٹک پر چوکیدار گل خاں بیٹھا ناک میں نسوار چڑھا رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "خو تم اِتنی دیری سے آتا ہے۔ سیٹھ بوت گرم ہوتا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ نئیں تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔" فوراً ہی اُس کو چھینک آگئی۔ پھر کئی چھینکیں آئیں۔ اُس کی بقیہ بات چھینکوں کی نذر ہو گئی۔ نوشا چھپاک سے احاطہ میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچتے ہی اُس نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے عبداللہ مستری کو دیکھا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ موٹروں کی مرمت کرنے والے ورکشاپ کا مالک تھا ــــ کاریگروں کو سزا دینے کے معاملہ میں دُور دُور تک اُس کا شہرہ تھا۔ نوشا اِدھر اُدھر دیکھتا بھالتا شیڈ کے نیچے پہنچ گیا جہاں دوسرے کاریگر کام کر رہے تھے۔ اس کے پہنچتے ہی ایک کاریگر زور سے کھنکار کر بولا۔

"دیر سے آنا تھا تو سر سے تولا باندھ کر آتا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "ارے یار یہ تو بڑا پکا ہے۔ ابے رات کونسی فلم دیکھی تھی؟"

"سالا روز سینما جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی شوقین سے ٹکر گیا۔"

"ارے اس کی کیا پوچھتے ہو اس پر تو چاقو چلتے ہیں چاقو۔"

نوشا بگڑ کر بولا "دیکھو جی! مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

ابھی اس پر ایک آدھ فقرہ اور چُست ہوتا۔ اچانک عبداللہ مستری کی آواز سُنائی دی۔ وہ اسی طرف آرہا تھا۔ نوشا نے جلدی سے ایک پانا اُٹھایا اور قریب کھڑی ہوئی موٹر کے نیچے گھس گیا اور خواہ مخواہ کھٹر پٹر کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد عبداللہ مستری وہاں آگیا۔ کاریگروں کی روح فنا ہو گئی۔ سب کے ہاتھ جلدی

جلدی جلدی چلنے لگے۔ نوشا موڑے کے نیچے گھُسا ہوا کھڑ پڑ کئے جا رہا تھا۔ اس کا دھڑ باہر نکلا تھا اور برابر جنبش کر رہا تھا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ساری آئی گئی ایک اور کاریگر کے سر گئی، وہ بھی دیر سے پہنچا تھا۔ اُس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔

عبداللہ نے پہلی ہی نظر میں اُس کو بھانپ لیا۔ گردن ہلا کر بولا "کیوں بے دیر سے آیا تھا؟"

ڈر کے مارے لڑکے کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس دفعہ عبداللہ نے گرج کر پوچھا "ابے کیا منہ پھوٹ گیا۔ بولتا کیوں نہیں؟"

وہ گھبرا کر بولا "امّاں نے روک لیا تھا"

عبداللہ نے ایک ٹیڑھی سی گالی دے کر کہا "امّاں نے کیا اپنے کسی یار کے پاس بھیجا تھا؟"

اس بات کا وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ صرف عبداللہ کے مُنہ کو ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

عبداللہ غضب ناک ہو کر چلّایا "سالوں کو کام بھی سکھاؤ۔ اور اُوپر سے تنخواہ بھی دو۔ اور یہ حرام کے تخم اس کا صلہ یہ دیتے ہیں کہ گھر سے نواب بن کر نکلتے ہیں"

اُس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور لڑکے کی ناک اُس میں رکھ کر زور سے بھینچ دی۔ وہ بلبلا کر چیخا۔

"ہائے مرگیا مستری جی!"

"تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا"

وہ برابر چیختا رہا، گڑ گڑاتا رہا۔ مگر عبداللہ نے اُس کی ناک نہ چھوڑی جب وہ تکلیف سے بے تابو ہو کر فرش پر ہاتھ پاؤں پٹکنے لگا تو عبداللہ نے ڈانٹا۔

"سالے یہ ایکٹنگ ہو رہا ہے۔"

وہ تڑپ کر چیخا۔ "ارے مر گیا مستری جی۔ اب کبھی نہیں کروں گا۔"

مستری زور سے گرجا۔ "سیدھا بیٹھ۔" لڑکا ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ذرا دیر بعد عبداللہ نے پلاس کے شکنجہ سے اُس کی ناک آزاد کی۔ ناک اب ٹماٹر کی طرح سُرخ نظر آرہی تھی۔ لڑکا بار بار ناک چھُوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرتا۔

عبداللہ نے اُس کی تکلیف پر توجہ دئے بغیر اُونچی آواز سے پکارا۔ "منشی جی! اے منشی، ذرا یہاں تو آؤ۔"

فوراً ہی ایک سُوکھا پتلا، ادھیڑ آدمی۔ ناک کی پھُننگی پر عینک درست کرتا ہوا پہنچا۔

عبداللہ نے لڑکے کی جانب اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جی آج کی اس حرام کے جنے کی تنخواہ نہیں لگے گی۔ سمجھ گئے۔"

منشی جی فوراً سمجھ گئے۔ جھٹ جواب دیا۔ "بہت بہتر، بہت بہتر۔ میں ابھی جاکر رجسٹر میں اس کی غیر حاضری لگائے دیتا ہوں۔"

لڑکے نے اطمینان کی سانس لی۔ سوچا اب تو جان بچ گئی۔ لیکن عبداللہ مستری اتنی آسانی سے کاریگروں کی خطا معاف کر دیتا تو پھر اُس کی شہرت کیوں ہوتی۔ کہنے لگا:

"اچھا جی! اب تم سارے کپڑے اُتارو اور نلکے کے نیچے جاکر بیٹھ جاؤ۔ فی الحال تمہاری یہی سزا ہے۔"

کاریگر لڑکا گڑگڑانے لگا۔ مگر عبداللہ ایسی خوشامد سے کہاں پسیجنے والا تھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "ابے اُتارتا ہے کپڑے یا پھر دکھاؤں کال کوٹھڑی کا راستہ۔"

کال کوٹھڑی کا نام سُنتے ہی لڑکے کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے گھبرا کر جلدی جلدی سارے کپڑے اُتارے اور مادر زاد برہنہ ہو گیا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا بھی بپھری ہوئی تھی۔ مہاوٹوں کی سردی تھی۔ خود عبداللہ موٹے اُونی کپڑے کا اوورکوٹ پہنے تھا۔ سر اور کانوں کو مفلر سے ڈھکے ہوئے تھا۔ لڑکے کا برہنہ جسم سردی سے کپکپانے لگا۔

عبداللہ نے اُسے خاموش کھڑا دیکھ کر کہا "ابے اس طرح کب تک چوتڑ کھولے کھڑا رہے گا۔ نلکے تلے جاتا ہے کہ نہیں؟"

نوعمر کاریگر نے بے بسی سے عبداللہ کی جانب دیکھا اور نظریں شرم سے نیچی کئے پائپ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا جس کی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی موٹی دھار بن کر گر رہا تھا۔

عبداللہ چلا گیا تو نوشا نے چوہے کی طرح موٹر کے نیچے سے گردن نکالی۔ اور باہر آ گیا۔ اس کے کپڑے گرد سے اٹ گئے تھے۔ چہرے پر سیاہی کے جگہ جگہ دھبے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک کاریگر نے، جو عمر میں دو تین سال بڑا ہوگا، اُس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا:

"اُستاد اب رشوت میں ایک پپا دلواؤ۔ نہیں تو ابھی تم کو بھی نلکے کے نیچے بھجواتا ہوں۔"

نوشا اُس کے تصور ہی سے کانپ اُٹھا۔ اُس نے چپ چاپ چہرہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ کاریگر نے اُس کے گالوں کا ایک بوسہ لیا۔ پھر بُرا سا منہ بنا کر فرش پر تھوک دیا۔

"سالے نے منہ کڑوا کر دیا۔ ارے یہ موبل آئل کہاں سے چپڑ لیا؟"

سب کاریگر کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسنے لگے۔ نوشا کھسیانا ہو کر سر کے بال کریدنے لگا۔

(۲)

لیمپ کی دُھندلی روشنی میں سلطانہ گردن جھکائے قینچی سے بیڑی کے پتّے کاٹ رہی تھی۔ قریب ہی ماں بیٹھی تھی، جو کٹے ہوئے پتّوں میں تمباکو بھر بھر کر بیڑیاں بنا رہی تھی۔ دونوں سے ذرا ہٹ کر انّو کاپی پر جھکا ہوا لکھنے میں منہمک تھا۔ نوشا سب سے الگ تھلگ کونے میں پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔

کمرے میں دیر سے خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخر ماں نے سکوت توڑا۔ انّو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "دیکھ کل سویرے ہی سویرے اُٹھ کر کارخانے جانا۔ ملک جی سے کہنا، سارا پچھلا حساب صاف کر دو!"

انّو نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے جواب دیا "اچھا، اچھا۔"

ماں نے پھر کہا "دیکھ بھولنا مت۔ پورا حساب لے کر آنا۔ نہیں تو گھر میں فاقہ پڑ جائے گا۔ میرے پاس اب ایک پیسہ نہیں رہا۔ اور ہاں اُن سے یہ بھی کہہ دینا، شام تک ہزار بیڑیاں پہنچ جائیں گی۔ سمجھ گیا نا!"

اُس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ وہ رُک رُک کر اپنی بات کہتی رہی۔ ذرا دیر خاموش رہی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی "ذرا اِدھر تو آ۔ بیڑیوں کے بنڈل بنا بنا کر تاگا لپیٹتا جا۔"

انّو نے احتجاج کیا "میں اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ کام پورا نہیں ہوا تو کل ماسٹر صاحب بنچ پر کھڑا کر دیں گے۔"

مگر ماں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ ڈپٹ کر بولی "چل چل باتیں نہ بنا۔ بڑا آیا پڑھنے والا۔ بس ہو چکی پڑھائی۔ پہلے پیٹ کا دھندا کر۔ کھانے کو نہیں ہوگا تو سب سے زیادہ تو ہی غل مچائے گا۔"

انّو با دلِ ناخواستہ اُٹھا اور ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بیڑیوں کے

بنڈل تیار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد باہر گلی میں گیدڑ کے بولنے کی آواز اُبھری۔ نوشا جو ابھی تک تھکا ہُوا سا لیٹا تھا جھٹ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلطانہ نے اُس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ ماں سے کہنے لگی:

"اماں آج تو سرِ شام ہی گیدڑ بولنے لگے۔"

ماں لاپرواہی سے بولی۔ "توبہ کرو بیٹی! اس وقت کہاں سے گیدڑ آگئے؟"

نوشا فوراً بیچ میں بول اُٹھا۔ "نہیں اماں آواز تو گیدڑ کی معلوم پڑتی ہے۔ جاکر بھگا آؤں۔"

ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "چل بیٹھ۔ بڑا آیا گیدڑ بھگانے والا۔ یہ کیوں نہیں کہتا، وہ تیرا سگا باہر کھڑا بُلا رہا ہے۔ دیکھ میں تجھ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں اس حرامی راجہ کی صحبت چھوڑ دے۔ نہیں تو سر پر ہاتھ دھر کر روئے گا۔"

نوشا کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ دیر تک پڑا سلطانہ کو کوستا رہا، جو شوخی سے بار بار اُس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ نوشا کا بس چلتا تو اُس کے منہ پر ایسا زنّاٹے کا تھپّڑ رسید کرتا کہ ساری ہنسی نکل جاتی۔

نوشا جھنجلا جھنجلا کر سُلطانہ کو کوستا رہا۔

باہر گلی میں راجہ بار بار حلق سے گیدڑ کی آواز نکالتا رہا۔ ہر بار وہ دروازے کی جانب دیکھتا مگر اُس روز دروازہ نہ کُھلنا تھا نہ کُھلا۔ وہ دیر تک نوشا کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

راجہ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے پہنچا۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ محلّہ کے کسی لڑکے کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ دن بھر بادل گھرے رہے۔ شام کو بوندا باندی بھی ہوئی۔ اب ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ راجہ کے پاس اُس روز پیسے بھی زیادہ نہ تھے، ورنہ سنیما ہی چلا جاتا۔ سوچا تھا کہ نوشا مل جائے گا تو دونوں مسلم ہوٹل میں ایک ایک کڑک

چائے پئیں گے اور ریڈیو سے فلمی گانے سنیں گے۔

راجہ نے لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے گیدڑ کی آواز نکالی۔

ہکّا ہوا، ہکّا ہوا۔

دیر تک سنسان گلی میں اُس کی آواز گونجتی رہی مگر کوئی دروازہ نہ کھلا، کوئی باہر نہ نکلا۔ وہ چل کر بڑبڑانے لگا۔ "آج سب سالے مر گئے"۔ اسی جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ مسلم ہوٹل کی طرف چل دیا۔ مگر اس وقت ریڈیو پر خبریں سُنائی جا رہی تھیں۔ اُس نے سوچا جب تک خبریں چلیں، اتنی دیر کیوں نہ چمپی کرا لی جائے۔ سر میں کچھ درد بھی تھا۔ چمپی کرنے والا ایک نوجوان مالشیا ہوٹل کے باہر ہی بیٹھا تھا۔

راجہ نے اُس کے قریب جا کر کہا "ابے ہوتی ہے چمپی ومپی؟"

وہ جھٹ بولا "ابھی لو!" اور تیل کی شیشیاں سنبھال کر سامنے آ کھڑا ہوا۔

راجہ نے پوچھا "مگر یہ تو بتا، لے گا کیا؟"

وہ کہنے لگا "یار جو جی چاہے دے دینا"۔

راجہ بولا "میرے پاس تو ایک دونی ہے، بول کیا کہتا ہے؟"

اُس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا "چل یار تو بھی کیا یاد کرے گا؟"

راجہ وہیں ہوٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ مالشیے نے شیشی سے تیل نکالکر راجہ کے سر میں ڈالا اور مالش شروع کر دی۔ اُس کی انگلیاں نرم تھیں اور ہاتھ پھرتی سے چل رہے تھے۔ راجہ چمپی کراتے کراتے پوچھ بیٹھا "کیوں جی! روزانہ تم کو کیا مل جاتا ہوگا؟"

وہ بولا "بس یار! یہ نہ پوچھ کیا مل جاتا ہے"۔

راجہ اصرار کرنے لگا "پھر بھی؟"

"یہی روپیہ، ڈیڑھ روپیہ روز پیٹ لیتا ہوں"۔

راجہ نے حیرت سے کہا: "ابے تو یہ کچھ کم ہے۔ کیا کسی کا گھر لوٹنے کا ارادہ ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "کم تو نہیں، پر محنت بڑی ہے۔"

راجہ بولا: "ابے کیا محنت ہے۔ میں سیکھوں تو سکھا دے گا۔" واقعی وہ اس کے لئے آمادہ بھی تھا۔

چمپی کرنے والا کہنے لگا: "یار کیا کرے گا سیکھ کر، سالا بڑا واہیات دھندا ہے۔"

"واہیات کی اس میں کونسی بات ہے؟"

وہ کہنے لگا۔ "بس کہہ دیا کہ ہے۔"

راجہ نے ڈانٹ کر کہا: "ابے صاف صاف بتا۔ آخر بات کیا ہے؟"

وہ مسکرانے لگا۔ "تو پھر اس آدمی سے پوچھ لے۔"

راجہ نے اُس شخص کی جانب دیکھا جو برابر کی دکان کے تختے پر بیٹھا اپنی ران کھجا رہا تھا۔ راجہ نے اُس سے تو کوئی بات نہیں کی۔ البتہ چمپی والے سے بولا۔

"ابے اس سے کیوں پوچھوں تُو کیوں نہیں بتاتا؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "وہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے۔" اُس نے اُس شخص کو مخاطب کیا: "اماں خاں صاحب! یہ راجہ تم کو پوچھ رہا ہے۔"

خاں صاحب نے ران کھجاتے کھجاتے، راجہ کی طرف دیکھا۔ ہنس کر بولا۔

"روپیہ ایک عدد کلدار ملے گا۔ بول چلتا ہے؟"

راجہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: "کہاں؟"

اُس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر کہا: "واہ جانِ من! اب یہ بھی سمجھانا پڑیگا۔"

اور راجہ کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ اُس نے وہیں سے اس کو ایک موٹی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"سالے حرامی پن کرتا ہے۔ ابھی ساری بدمعاشی نکال کر رکھ دوں گا۔"

وہ گھبرا کر بولا "ابے میں نے تجھ سے کہا بھی کیا ہے۔"

راجہ نے اُسی طرح کڑک کر کہا "سالے یہاں بدمعاشی کرنے آتے ہو۔"

وہ بولا "ابے جائے گا یا پِھ لے گا۔ خاما خا سر ہوئے جا رہا ہے۔" اُس نے راجہ کو دھمکی دی۔ مگر راجہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا اور چیخ چیخ کر گالیاں دیتا رہا۔ شامتِ اعمال چمپی کرنے والا بھی خاں صاحب کی حمایت میں بول اُٹھا۔ راجہ اُس کے سر ہو گیا۔ غصّہ سے اُس کی تیل کی شیشیاں توڑ ڈالیں۔ اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ خاں صاحب بہت سٹ پٹائے۔ بڑی مشکل سے راجہ کو منایا۔ منت سماجت بھی کی اور گالیاں بھی کھائیں۔

راجہ نے جھنجھلاہٹ میں چائے بھی نہیں پی اور اپنی کھولی کی جانب چل دیا کھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر گھُپ اندھیرا تھا۔ یہ کھولی ایک شکستہ عمارت میں تھی، جو پچھلی برسات میں منہدم ہو گئی تھی۔ راجہ کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی بوڑھے گداگر نے کھانسنا شروع کر دیا۔

راجہ نے پوچھا "اماں اُستاد! تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

وہ کھانستے کھانستے بولا "باپ رے باپ آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ ذرا دروازہ تو بند کر دے اور دیکھ وہ کونے میں جو چدّر پڑی ہے، مجھے اُڑھا دے۔"

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ راجہ نے ماچس جلائی تو سامنے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بوڑھا، فرش پر گٹھڑی بنا ہوا دکھائی دیا۔ روشنی کے ساتھ ہی ایک چمگادڑ کھولی کے اندر تیزی کے ساتھ چکّر کاٹنے لگی۔ راجہ نے کونے میں پڑی ہوئی چادر اُٹھائی اور گداگر کے اُوپر ڈال دی۔ گداگر اپنے کوڑھ کے زخموں کو کھٹر کھٹر کھجاتے ہوئے بولا:

"آج تُو جلدی آگیا۔ سردی لگی ہوگی۔ باہر جھکڑ چل رہے ہیں۔"

راجہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کھولی کا دروازہ بند کیا اور اپنی گدڑی کے اندر گھس گیا۔ اُس وقت غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ راجہ کو ایسا محسوس ہوا گویا گدڑی پانی میں بھیگ گئی اور اس کا سارا بدن منجمد ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے کھلنڈرے پن سے ہُو ہُو کر کے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکالیں اور گھٹنوں کو سکیڑ کر سینے سے لگالیا۔ بڑی دیر بعد راجہ کو نیند آئی۔

سویرے ہی سویرے گداگر نے کمر پر لات مار کر راجہ کو جگا دیا۔ آنکھ تو کھل گئی مگر وہ دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ گداگر کی دوسری لات اُس کے کندھے پر لگی۔ اب ٹالنا مشکل تھا۔ بوڑھا بخشنے والا نہیں تھا۔ لاتیں مارنا اور شام کو اٹھنی دینے میں نخرے الگ کرتا۔ آخر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ بوڑھے گداگر نے کھولا تھا یا رات گئے تیز ہوا سے پھڑ پھڑا کر کھل گیا تھا۔ باہر ہر طرف کہر چھا گئی تھی۔ دُھندلی دُھندلی نیلگوں روشنی میں گداگر بھُوتوں کی طرح ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔ اُس کی گندی داڑھی بکھری ہوئی تھی اور سر کے بال اُلجھ کر آنکھوں پر آگئے تھے۔ وہ اپنے رستے ہوئے زخم کھجا رہا تھا۔

راجہ نے کھولی سے لکڑی کی چھوٹی سی گاڑی باہر نکالی۔ گداگر کو اس میں بٹھایا اور گاڑی کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔ بوڑھا تو اپنی چادر اوڑھ کر مزے سے گاڑی کے اندر بیٹھا رہا مگر راجہ صرف ایک پھٹی ہوئی قمیص پہنے تھا۔ اس کا جسم صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز رہا تھا۔ اُسے سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ کر گداگر کہنے لگا :

"ابے یہ روز روز جو تو سنیما جاتا ہے، کیوں بے فضول پیسہ برباد کرتا ہے۔ ایک پُرانا کوٹ کسی کباڑیے سے کیوں نہیں خرید لیتا۔ دیکھ تو کیسی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔"

راجہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ گاڑی کھینچتا رہا اور

سردی سے کپکپاتا رہا۔ سارا شہر نیلگوں کہر کے جال میں اُلجھا ہُوا ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دھند ہی دُھند تھی۔ سناٹا تھا۔ خاموشی تھی اور اس گہرے سکوت میں آہستہ آہستہ اُبھرتی ہوئی آمدِ صبح کی پہلی آوازیں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ گداگر نے اپنی مخصوص صدا لگائی۔

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

اُس کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔ صبح کی گہری خاموشی میں اُس کی صدا بڑی ہی دردناک معلوم ہو رہی تھی۔ مگر راجہ پر اس دردناک صدا کا ذرا بھی اثر نہ ہُوا۔ اگر کوئی احساس تھا تو صرف سردی کا۔ وہ گاڑی کو کھینچتا ہُوا اللہ دیا کے چائے خانے کے سامنے پہنچ گیا۔ اندر بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کوئلہ زور سے چٹختا تو سُرخ روشنی کی لکیر دُور تک لہرا جاتی۔ بھٹّی کے اُوپر سماوار رکھا تھا، سماوار کے اندر سے ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی۔

راجہ نے گاڑی کی رفتار سُست کر دی۔ گداگر گڑگڑا کر اللہ دیا کو دُعائیں دینے لگا۔ "اللہ کاروبار میں برکت دے۔" مگر اللہ دیا، جس کو اس وقت گاہکوں کی ضرورت تھی، بے رُخی سے بولا:

"بابا آگے جاؤ۔"

راجہ نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اندر چائے خانے میں اللہ دیا بڑبڑا رہا تھا: "سالے صبح ہی صبح نازل ہو گئے۔ نہ بوہنی نہ بٹّا، پہلے ان کو دے دو۔"

گداگر نے اُس کی بڑبڑاہٹ سُن کر راجہ سے کہا: "ابے تُو نے بھی کس سالے منحوس کے پاس گاڑی روکی۔"

راجہ نے بیزاری سے جواب دیا: "سوچا تھا، سالا ایک چائے تو پلا ہی

دے گا۔"

گداگر نے فوراً کہا "ابے تو نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ پیسے دیتے تو اُس کا باپ چائے پلاتا۔ چل تجھے ابھی چائے پلاتا ہوں۔ اوہو ہو! ابھی زبردست سردی ہے۔" اُس کے دانت سردی سے بج رہے تھے۔

آگے بڑھ کر وہ ایک اور چائے خانے کے قریب پہنچے۔ دونوں نے ایک ایک پیالی چائے کی چڑھائی اور تازہ دم ہو کر پھیری پر چل دئے۔ تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ ایک راہ گیر نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سکہ گداگر کے پیالے میں ڈالا۔ ٹن سے آواز اُبھری۔ بوڑھے نے ٹٹول کر اُسے اُٹھایا۔ خوش ہو کر بولا "اکنّی جان پڑتی ہے" اُس نے چپکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اکنّی اُٹھا کر دیکھی اور بڑبڑانے لگا۔

"مجھے تو کھوٹی لگے ہے۔ ذرا تو دیکھ راجہ۔"

راجہ نے اکنّی اُس کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھی اور واپس دے کر بولا۔

"ایک دم کندطعم ہے۔"

گداگر جل کر بولا "یارو کیا جمانہ آگیا ہے۔ اب تو پبلک اللہ میاں کو بھی دھوکا دینے لگی۔" وہ رُک رُک کر بڑبڑاتا رہا "آج کا دن تو بڑا منحوس لگے ہے۔ سالی سویرے سے نسیٹ پرنسیٹ پر ہو رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔"

مگر وہ دن دونوں کے لئے منحوس ثابت نہ ہوا۔ کچھ ایسے بھی اللہ کے بندے مل گئے، جن کے دل میں خوفِ خدا تھا اور جو اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ دوپہر تک، ڈیڑھ سوا روپے کی ریزگاری اکٹھی ہو گئی۔ ایک محلہ میں کسی مرنے والے کا چالیسواں تھا۔ دونوں نے ٹھاٹھ سے روٹیاں تنوری اور سالن کھایا۔ ذرا دھوپ میں بیٹھ کر آرام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں جب شہر کی ایک صاف ستھری سڑک سے گزر رہے تھے تو ایک شخص نے جو وضع قطع سے ڈاکٹر لگتا تھا، راجہ کے برابر لمحے بھر کے لئے رُک کر پوچھا۔

"اے بچے! تم اِس بوڑھے کے ساتھ کب سے ہو؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر بوڑھے کوڑھی کی جانب دیکھا جو آنکھیں بند کئے مُردوں کی طرح نڈھال پڑا تھا اور اپنے زخموں کو لنجی لنجی اُنگلیوں سے کھُجا رہا تھا۔

"تم اِس بوڑھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے نزدیک کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ اور کار اسٹارٹ کر دی۔

جب موٹر آگے بڑھ گئی تو گداگر نے گندی سی گالی دی۔ راجہ سے کہنے لگا۔ "سالے نے پیسہ ایک نہیں دیا نصیحت ڈھیر بھر کر دی۔ اب اِس مُرغی کے جنے سے پوچھو کہ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دھت تیرے کی" گداگر نے پھر گالی دی۔

راجہ نے سوچا بوڑھا ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ خالی نصیحت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ جب اُسے کوئی کام نہیں ملا، تب ہی اُس نے گداگر کی نوکری کی تھی۔ اب اُسے دونوں وقت پیٹ بھرنے کو کھانا ملتا تھا۔ روزانہ اٹھنی جیب خرچ۔ اس کے علاوہ گداگر کی نظر بچا کر جو پیسے بھیک سے اُڑا لیتا، وہ آمدنی الگ تھی۔

دن بھر راجہ، بوڑھے گداگر کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ بوڑھا اپنی دردناک صدا بلند کرتا رہا۔ گاڑی کے پہیئے اُونچے نیچے راستوں پر کھڑکھڑاتے رہے۔ گداگر جب ایک کروٹ پڑے پڑے تھک جاتا تو دوسرا پہلو بدلتا۔ کوئی سنسان جگہ آتی، راجہ دم لینے کو ٹھہر جاتا۔ سگریٹ سلگا کر دو چار کش لگاتا۔ تازہ دم ہوتا۔ صبح کے نکلے ہوئے دونوں تھکے ہارے کھولی میں واپس پہنچے۔ پہر رات گزر چلی تھی۔ بازاروں کی رونق اُجڑنے لگی تھی۔ گلی کوچوں میں سناٹا پڑ گیا تھا۔

کھولی میں پہنچتے ہی راجہ نے پیسے مانگے۔ بوڑھا حسب معمول ٹال مٹول کرنے لگا۔ "ابے تو اِن پیسوں کو برباد کر دے گا۔ میرے پاس پڑے رہنے دے۔

تیرے ہی بھلے کی کہتا ہوں۔"

راجہ ضد کرنے لگا۔" نہیں میں تو ابھی لوں گا۔"

گداگر جل کر کہنے لگا۔" سالے مرے گا تو کفن بھی بھیک ہی کا پڑے گا۔"

راجہ بولا۔" دیکھو استاد! اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ سیدھے ہاتھ سے اٹھنی نکال کر دو۔"

آخر گداگر نے ٹوڑل کے آٹھ آنے کی ریزگاری گنی اور راجہ کے ہاتھ میں رکھ کر ایک گالی بھی دی۔ پیسے ملتے ہی راجہ نے زقند بھری اور کھولی سے باہر چلا گیا۔

(۳)

میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے صرف شامی بیٹھا تھا۔ محلہ کے دوسرے لڑکے نہ جانے کہاں تھے۔ راجہ اُس کے قریب سے گزرا۔ مگر کوئی بھی نہ بولا۔ اس روز کے جھگڑے کے بعد دونوں میں اب تک بات چیت بند تھی۔ راجہ ٹہلتا ہوا گلی کے نکڑ تک چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے سوچا شامی سے اب صلح کر لینی چاہیئے۔ لہٰذا واپسی پر جب لالٹین کے پاس دوبارہ آیا تو اُس نے بڑی بے باکی سے پوچھا۔

" ابے شامی! یہ سالا نوشا آج کہاں مر گیا؟"

شامی بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ اُس نے جھٹ جواب دیا۔" اُس کی اماں نے پکڑ کر بٹھا لیا ہو گا۔"

راجہ اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بے تکلفی سے بولا۔" یار! نوشے کی ماں سالی ایک نمبر چنڈال ہے۔ باپ رے باپ، اس زور سے چلاتی ہے کہ اُس سے تو ڈر لگتا ہے۔"

شامی نے اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔" یار تاش ہو تو نکال، ذرا

دو چار ہاتھ ہو جائیں۔"

راجہ نے فوراً پتلون کی جیب سے تاش کی گڈی نکالی، اور تاشوں کو پھینٹنے لگا۔

شامی بولا "دیکھو اُستاد! ٹرک بازی نہیں چلے گی۔ ورنہ میں نہیں کھیلوں گا۔ بیکار میں جھگڑا ٹنٹا ہو جاتا ہے۔"

راجہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا "نہیں بے! اُس روز تو میں ذرا مجاخ کر رہا تھا۔ خاماخا کا پھڈّا ہو گیا۔"

دونوں اطمینان سے بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ ایک بار شامی نے چہک کر زور سے پتّا مارا اور جھوم کے بولا "کہو اُستاد کیسی رہی؟"

اُسی وقت اُس کے سر پر دھڑ سے جُوتا پڑا اور گرج دار بھاری آواز اُبھری۔ "اور یہ کیسی رہی؟"

شامی نے گھبرا کر دیکھا، اُس کا باپ پشت پر کھڑا خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں جُوتا تھا اور چہرہ غصّہ سے ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ شامی کی سِٹّی گم ہو گئی۔ باپ نے جُوتے کا دُوسرا ہاتھ گھمایا مگر شامی گردن جھکا کر سر کو صاف بچا گیا۔ تاش چھوڑ کر بگ ٹٹ بھاگا۔

باپ نے چیخ کر کہا "ٹھہر جا حرامی! نہیں تو کھال اُدھیڑ دوں گا۔"

مگر شامی اب کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اُس نے زقند بھری اور آنکھ جھپکتے ہی دُور جا پہنچا۔ گلی کا چکّر کاٹ کر وہ سیدھا گھر گیا۔ باپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں نے اُسے دیکھا تو سمجھ گئی کہ باپ سے مڈبھیڑ ہو گئی، جب ہی اتنا خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔ اُس نے شامی کو دو چار کوسنے دئے اور کوٹھڑی کی جانب دھکا دے کر بولی — "اب منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا جلدی سے چھُپ جا۔ ورنہ تیرا باوا آج ہڈی پسلی توڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

شامی جلدی سے کوٹھڑی کے اندر گھس گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد باپ گھر کے اندر آیا اور شامی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ اُس کی گالیوں کی آواز گھر کے سناٹے میں اُبھرتی رہی۔ شامی کا خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سہما ہوا کوٹھڑی کے اندر بیٹھا رہا۔ دروازے پر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اُس کا دل اُچھل پڑتا۔

بہت دیر بعد کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سرگوشی میں آہستہ آہستہ اُسے آواز دے رہی تھی۔ شامی نے دروازہ کھولا تو وہ اُسے باورچی خانے میں لے گئی۔ کمر میں زور کی چٹکی بھر کر بولی۔

"لے کچھ ٹھونس لے۔ صبح کا بھوکا پیاسا پھر رہا ہے۔ کمبختوں نے میری زندگی حرام کردی۔"

وہ بیٹھی اپنی قسمت کو کوستی رہی اور شامی لمبے لمبے لقمے حلق کے نیچے جلدی، جلدی اُتارتا رہا۔ بار بار اُس کی سہمی ہوئی نظریں کمرے کی جانب اُٹھ جاتیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی بات ہی تھی۔ مار کے معاملہ میں وہ بڑا جلاّد تھا۔ جو چیز ہاتھ میں آتی، کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اُس کی مار سے شامی کا سر اور پیشانی لہولہان ہو چکے تھے۔ اُس روز وہ خوف کے مارے باپ کے کمرے میں نہیں سویا بلکہ ماں سے رضائی لے کر کوٹھڑی کے اندر جا کر پڑ گیا۔

سویرے کسی کے اُٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے ٹھٹھرتا اخبار کے دفتر پہنچا۔ مگر اخبار ابھی چھپ رہا تھا — تھوڑی دیر بعد اُس نے اخباروں کا بنڈل اُٹھایا اور سڑکوں پر آواز لگانے لگا۔

"آگیا، آگیا، آج کا تازہ اخبار آگیا۔"

سنسنی خیز خبروں کی سُرخیاں چیخ چیخ کر سُناتا ہوا، وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ابھی اُس کو بہت سے ٹھکانوں پر اخبار پہنچانا تھا۔ ہر گھر پہ وہ اخبار

کھڑکی کے راستے یا دروازہ کی درزوں سے اندر پھینک دیتا اور جلدی سے آگے بڑھ جاتا۔ جہاں دروازہ کھلوائے بغیر چارۂ کار نہ ہوتا، وہاں وہ آواز لگاتا " اخبار والا " اسی طرح گھروں پر اخبار پہنچاتا ہوا جب وہ ایک مکان پر پہنچا تو آواز لگاتے ہی ایک شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اُس وقت وہ تولئے سے چہرہ پونچھ رہا تھا۔

شامی کو دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر بولا " تم اتنی دیر سے اخبار کیوں لاتے ہو؟"

شامی معذرت کرنے لگا " آئندہ جلدی لاؤں گا جی۔ آج ذرا اخبار دیر سے چھپا تھا " وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ لیکن اُس شخص نے اخبار اُٹھاکر اُس کے منہ پر پھینک دیا۔

" لے جاؤ اپنا اخبار، مجھے نہیں چاہیئے "

" کہہ تو رہا ہوں کہ اب دیری نہیں ہوگی "

وہ بگڑکر بولا " بس کہہ دیا کہ اخبار نہیں چاہیئے۔ کیوں بیکار میں دماغ کھائے جا رہا ہے " شامی مجرموں کی طرح گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب وہ شخص دروازہ بند کرنے لگا تو شامی نے دبی زبان سے کہا۔

" ساب! پچھلے مہینہ کا پیمنٹ ابھی تک نہیں ہوا! "

وہ آنکھیں نکال کر بولا " جاؤ کوئی پیمنٹ ویمینٹ نہیں ہوگا، اُلّو کے پٹھے!" اُس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔

شامی کو غصّہ تو بہت آیا۔ مگر اُس نے سوچا اگر کوئی جھگڑا ٹنٹا ہوگیا، تو دوسری جگہ بھی اخبار دیر سے پہنچے گا اور وہاں بھی ڈانٹ پڑے گی۔ ورنہ وہ اپنا پیمنٹ تو اسی وقت وصول کر لیتا۔

وہاں سے بڑھ کر وہ اپنے دوسرے ٹھکانوں کی جانب چل دیا۔ لیکن

اُس کے لئے سب سے بڑا مرحلہ اُس انجینئر کا بنگلہ تھا، جہاں ایک خطرناک السیشن کتا پلا تھا۔ کتا اُسے دیکھتے ہی غرّا کر بھونکنا شروع کر دیتا۔ اُس کی آواز اس طرح نکلتی گویا گنبد کے اندر گونج رہی ہو۔ جیسے ہی شامی پھاٹک پر پہنچتا، وہ بھونکتا ہوا اُس کی طرف جھپٹتا۔ ایک بار تو اُس پر اس طرح جھپٹ کر سوار ہو گیا کہ خوف کے مارے شامی کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ شاید اس بنگلے پر کبھی اخبار نہ لگاتا، مگر بات یہ تھی کہ بل ادا کرنے کے معاملہ میں انجینئر بڑا کھرا گاہک تھا۔ کبھی اُس کے یہاں پیمنٹ نہیں رکا۔ اسی لئے کتّے کے خوف کے باوجود وہ پابندی سے اب تک وہاں اخبار پہنچا رہا تھا۔

نو بجے کے قریب وہ اخبار بیچ کر تھکا ہارا گھر پہنچا تو ماں نے کمر بھی سیدھی نہ کرنے دی۔ کہنے لگی: "جا جلدی سے دکان پر چلا جا۔ آج تیرے باپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

شامی چُپ چاپ دکان کی طرف چل دیا۔ اُس کے باپ کی بازار میں چھوٹی سی بساط خانے کی دکان تھی۔ وہ دکان پر رُک رُک کر بیٹھا کھانس رہا تھا۔ اُس نے شامی کو صرف گھور کر دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ شامی نے خدا کا لاکھ لاکھ شُکر ادا کیا کہ مصیبت اُس کے سر سے صاف ٹل گئی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر دکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد سات آٹھ سال کی ایک لڑکی سیپ کے بٹن خرید کر لے گئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔ کہنے لگی "سیپ کے نہیں پلاسٹک کے بٹن چاہیئے ہیں۔" شامی نے پلاسٹک کے بٹن دے دیئے۔ مگر چند ہی منٹ بعد لڑکی پھر موجود تھی۔ اس دفعہ اُس کو بڑے بٹن درکار تھے۔ شامی نے بٹن تو دے دیئے مگر جل کر اُس کے بازو میں چٹکی بھر لی۔ وہ تلملا کر چیخی تو باپ کو بھی اس کی حرکت کا پتہ چل گیا۔ اُس نے غصہ سے آنکھیں نکال کر کہا:

"ابے او حرام کے تخم! تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا؟"
وہ دیر تک گالیاں دیتا رہا اور شامی خاموش بیٹھا گالیاں سنتا رہا۔ اس کا باپ دمہ کا پرانا مریض تھا۔ وہ دکان پر بیٹھ کر تمام دن کھانسا کرتا یا شامی کو گالیاں دیتا۔ زیادہ غصّہ آتا تو دو چار تھپیڑ رسید کر دیئے۔ ایک آدھ لات ٹکا دی۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ بازار پر پھیلنے لگا تھا۔ گاہکوں کی آمد و رفت کم ہوگئی تھی۔ دکان دار لاپرواہی سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ شامی کا باپ تو یوں بھی ہر وقت مجہولوں کی طرح پڑا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اسی اثنا میں برابر والی دکان کے ایک بساطی نے اس سے کہا۔

"اماں دلاور خاں جمتی ہے؟"
یہ جوا کھیلنے کی دعوت تھی۔ شامی کے باپ نے فوراً جواب دیا۔
"یہاں کب انکار ہے؟"
وہ بولا "پھر نکالو رقم"
شامی کے باپ نے ٹین کے ڈبے سے روپیہ نکالا "لو یہ رہی رقم"
دونوں نے ایک ایک روپیہ نکالا۔ اپنا اپنا روپیہ صابن سے اچھی طرح دھو کر صاف کیا اور دکان کی گدّی کے سامنے ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ دونوں ذرا ہٹ کر پاس پاس بیٹھ گئے اور پوری توجہ سے روپیوں کو دیکھنے لگے کہ مکھی کس کے روپے پر بیٹھتی ہے۔ داؤ کی شرط یہ تھی کہ جس کے روپے پر پہلے مکھی بیٹھ جائے وہ دونوں روپے اٹھالے۔
ذرا دیر بعد ایک مکھی اڑتی ہوئی آئی۔ شامی کا باپ گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا۔
"آؤ آؤ، رانی ادھر آؤ!"
دوسری طرف سے بھی یہی آواز آئی "ادھر کہاں چلیں چھبیلی۔ ادھر آؤ،

ادھر، اے اے "۔ مکھی اس وقت شامی کے باپ کے روپے پر منڈلا رہی تھی۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

" وہ آئی شیخ جی! آج تو دونوں روپے اپنی جیب میں گئے۔"

شیخ نے فوراً کہا۔" ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار۔" مگر اُس کا چہرہ فق ہوتا جارہا تھا۔ اس لئے کہ مکھی نے اُس کے روپے کی جانب رُخ ہی نہیں کیا۔

مکھی بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ شامی کے باپ کے روپے پر برابر منڈلاتی رہی مگر بیٹھی نہیں۔ شامی کے باپ کے دل کی دھڑکن کئی بار تیز ہوئی۔ کئی بار مسرت سے اُس کی آنکھیں چمکیں۔ مگر بات نہ بنی۔ ادھر شیخ جی کی حالت دگرگوں تھی۔ مکھی دوسری ہی طرف چکر کاٹ رہی تھی۔ ایک بار بھی ادھر کا رُخ نہ کیا۔ مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو ڈھارس دیتا رہا۔

" بھائی وہ بیٹھے گی تو اسی روپے پر، بڑی کھری کمائی کا روپیہ ہے۔"

شامی کا باپ بگڑ کر بولا۔" اور یہاں تو حرام کی رقم آتی ہے۔"

وہ کہنے لگا۔" اِس کا پتہ تو ابھی چل جائے گا۔"

شامی کا باپ کہنے لگا۔" اِس طرح شیخی بگھارنے سے کام نہیں چلے گا۔ گمٹی والے شاہ جی سے روپیہ پڑھوا کر لاؤ۔ تب شاید کچھ ہو جائے۔ یہ روپیہ تو سمجھو اپنی جیب میں گیا۔"

مگر اس کی باتوں کا سارا طنطنہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مکھی ایک بار پھر سے اُڑ گئی۔ شامی کا باپ جل کر بولا۔" دھت تیری کی۔" اُس نے مکھی کی ماں کو ایک عدد گالی دے ڈالی۔ شیخ جی نے فوراً جلتی آگ پر تیل چھڑکا۔" میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ اب چاہے تم گالی دو یا آنسو بہاؤ۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے کے لئے آئی ہی نہیں تھی۔"

دونوں بچوں کی طرح چہلیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کس رہے

تھے۔ اسی اثنا میں مکھی پھر بھنبھناتی ہوئی آگئی۔ وُہی تھی یا کوئی دوسری۔ لیکن اس دفعہ جو آئی تو سیدھی شیخ جی کے روپے کی طرف۔ وہ اُسے اِس طرح چمکارنے لگے۔ جیسے وہ واقعی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

"آ، آ، تچ تچ۔ میری جان ایک بار تو کلیجہ ٹھنڈا کر دے۔"

مکھی واقعی اُن کے چمکارنے میں آگئی۔ اُس نے ایک بار پر سمیٹے اور عین اُن کے روپے کے اُوپر آگئی۔ اُسی وقت شامی کے باپ کو کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھوں کھوں کر کے زور زور سے کھانسنے لگا۔ مکھی فوراً اُڑ گئی۔

شیخ جی بگڑ کر بولے۔ "لگے تم چوٹا پن کرنے۔ اُڑا دیا نا کھانس کر۔"

شامی کا باپ مسکرا کر بولا۔ "اماں کھانسی آگئی تو میں کیا کروں۔"

شیخ جی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "کچھ خدا کے خوف سے ڈرو۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ تم جان بُوجھ کر کھانسے تھے۔"

بات بھی دراصل یہی تھی۔ شامی کا باپ مکھی کو بھگانے کے لئے کھانسا تھا۔ مگر وہ اُس کو تسلیم کیسے کرتا۔ کہنے لگا۔ "کھانسی کا تو بہانہ ہو گیا۔ وہ تمہارے روپے پر بیٹھنے والی ہی کب تھی؟"

دونوں بُڈھوں میں ایک بار پھر نوک جھونک شروع ہو گئی۔ شامی اُن کی حرکتیں بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ روزانہ دوپہر کو اسی طرح جوا ہوتا اور بہت کم ایسا ہوتا کہ کوئی جیت جاتا۔ البتہ دونوں میں تکرار روزانہ ہوتی۔ اکثر گالی گلوچ تک نوبت آجاتی۔ مگر دوسرے دن جہاں دوپہر ہوتی۔ دونوں کو ہڑک اُٹھتی۔ روپے نکالے جاتے اور صابن سے دھو کر رکھ دئے جاتے۔

مکھی شیخ جی کے روپے سے اُڑ کر ایسی گئی کہ پھر نہ لوٹی۔ کسی دوسری مکھی نے بھی اِدھر کا رُخ نہ کیا۔ دوپہر کا سناٹا اور بڑھ گیا۔ بازار کی رونق مضمحل ہو گئی — دونوں بیٹھے بیٹھے اُونگھنے لگے۔ اُنہوں نے اپنے روپے اُٹھائے۔ آنکھیں

بند کیں اور تھکے ہوئے سے لیٹ گئے۔

دھوپ اب سامنے کے رُخ پر آگئی تھی۔ شامی کا باپ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں کبھی کبھی کوئی گاڑی پہیئے کھڑکھڑاتی ہوئی گزر جاتی۔ بازار پہ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ٹرنک بنانے والے کارخانے میں دھڑا دھڑ ٹین کی چادریں پیٹنے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ خالی بیٹھے بیٹھے شامی کا جی اُکتا گیا۔ اُس نے باپ کی جانب دیکھا۔ وہ بے خبر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ شامی اپنی جگہ سے اُٹھا اور چپکے سے دکان کے باہر آگیا۔

باہر تیز بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ موسم کچھ ایسا تھا کہ سائے میں بیٹھنے سے سردی معلوم ہوتی اور دھوپ میں سورج کی سُلگتی ہوئی کرنیں جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتیں۔ دکان سے نکل کر شامی ٹہلتا ہوا بازار کے دوسرے نکڑ کی جانب چل دیا۔ وہاں نیم کا گھنا پیڑ تھا جس کے نیچے اکثر دوپہر کو راجہ گداگر کی گاڑی لاکر کھڑا کرتا تھا۔ دونوں دھوپ میں بیٹھ کر کپڑوں سے جوئیں نکالتے تھے۔ راجہ اس وقت مل جاتا تو وہ اُس کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ کے دو چار کش لگا لیتا۔

وہ کچھ ہی دُور گیا تھا۔ اچانک بازار کے درمیان سے مُڑنے والی گلی میں ملی جُلی آوازوں کا شور اُبھرا۔ شامی لپک کر گلی کے اندر گھس گیا۔ دیکھا، مسجد کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اُس نے ایک شخص سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا؟"

وہ بولا۔ "چور پکڑا گیا ہے۔"

شامی نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا چُرا یا تھا؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "سالا مسجد سے جُوتے چُرا رہا تھا۔"

شامی نے حیرت زدہ ہوکر کہا۔ "اچھا!"

"ہاں جی، نمازی بے چارے تو ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سالا ان کے جوتوں کی تاک میں تھا۔"

شامی نے اُس شخص سے مزید کوئی بات نہ کی۔ آگے بڑھ کر مجمع میں گھس گیا۔ دیکھا لمبے قد کا ایک آدمی لوگوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کا سر ننگا تھا، وہ ایک گندی سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں بالکل سیدھا سادا لگ رہا تھا۔

شامی گھور گھور کر اُسے دیکھنے لگا۔ اِس لئے کہ وہ صرف چور ہی نہیں تھا بلکہ اُس نے اللہ میاں کے گھر میں چوری کی تھی۔ ابھی وہ چور کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ہجوم سے ایک ٹھگنا سا آدمی تہبند سنبھالتا ہوا نکلا اور اُچھل کر چور کے منہ پر کس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پھر تو ہر طرف سے چور پر مار پڑنے لگی۔ طمانچے مکّے، لاتیں۔ ہر شخص بھپر بھپر کر اُسے مار رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا، اور چور بالکل خاموش کھڑا مار سہہ رہا تھا۔ نہ اُس نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی۔ نہ فریاد کے لئے گڑگڑایا۔ مزے سے کھڑا مار کھاتا رہا۔

اِسی اثنا میں ایک بوڑھا وہاں آگیا۔ اُس کی سفید لمبی داڑھی تھی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو روکا۔ اُونچی آواز سے بولا۔ "اِس طرح مارنے سے کیا ہوگا اسے ایسی سزا ملنی چاہیئے کہ ہر ایک کو عبرت حاصل ہو۔"

اس نے سزا کے لئے جو اسکیم بتائی وہ شور میں شامی نہ سُن سکا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور دیکھا کہ ایک شخص ہاتھوں میں کالک بھرے ہوئے آیا اور چور کا سارا چہرہ سیاہ کر دیا۔ اب وہ واقعی خوفناک نظر آرہا تھا۔ سیاہی کے اندر سے اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہورہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے ایک گدھا بھی آگیا۔ چور کو گدھے پر بٹھایا گیا۔ گلے میں پُرانے جوتوں کا ہار ڈالا گیا۔ اور گدھے کو ہانک کر آگے بڑھا دیا گیا پیچھے پیچھے

لوگوں کا غول تھا۔ کچھ لڑکے ٹین کا ایک پیپا اُٹھا لائے اور اُس کو زور زور سے بجانے لگے۔ شامی بھی اس جلوس میں شامل ہو گیا۔ اُس نے کئی بار لڑکوں سے پیپا چھین کر زور زور سے بجایا اور سب کے ساتھ مل کر نعرے لگائے۔ نعرے لگانے والے دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

ایک گروہ گلا پھاڑ کر کہتا "جوتے چور کا؟"

دوسرا گروہ جواب دیتا "منہ کالا"

جلوس گلی میں سے نکل کر بازار میں آگیا۔ دکاندار اُٹھ اُٹھ کر چور کو دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا زندہ دل تھے، وہ دکانوں سے نیچے اُتر کر جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔ شامی کو بڑا لطف آرہا تھا۔ ایک بار اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ قہقہہ لگاتے ہی اُس کی گدّی پر زنّاٹے کا ہاتھ پڑا۔ شامی چکرا کر گرتے گرتے بچا۔ پلٹ کر دیکھا، باپ، بھوت کی طرح سر پر سوار تھا۔

جوتے چور کا جلوس تو پیپے بجاتا، شور مچاتا آگے بڑھ گیا۔ مگر شامی پر بیچ بازار میں دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ نہ جانے اُس کے باپ کے مریل ہاتھوں میں کہاں سے قوت آگئی تھی، ایسے کس کس کے جوتے مار رہا تھا کہ شامی بلبلا کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ بعض دکانداروں کو اس کی حالت پر ترس آگیا۔ قریب جا کر اُس کے باپ کو سمجھانے بجھانے لگے۔

"اماں خاں صاحب! اب جانے بھی دو۔ بچہ ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

ایک نے بڑھ کر شامی کے باپ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ مگر وہ بار بار ہاتھ چھڑا کر شامی پر جھپٹتا۔ "چھوڑو جی، میں اس حرامی کی آج ہڈی پسلی برابر کر دوں گا۔ اماں' ذرا آنکھ بچی اور یہ سالا دکان سے رفو چکر ہوا۔ حال یہ ہے کہ لوگ خدا کے گھر کو تو چھوڑتے نہیں۔ دکان تو پھر دکان ٹھہری۔ میاں سو یا مرا برابر ہوتا ہے۔ کوئی اُٹھا کر

پھوے جائے تو اس سالے کی گرہ سے کیا جائے گا" وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ اور ساتھ ہی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

آخر دکانداروں نے منّت سماجت کی۔ شامی کے باپ کا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ قسمیں دیں کہ اب اور نہ مارے۔ باپ نے اِس کے بعد شامی کو مارا تو نہیں، البتہ کئی بار جھنجھلا کر مارنے کے لئے ضرور اُٹھا۔ جب بھی شامی سسکی بھرتا وہ جل کر اُسے گالیاں دیتا۔

شامی دکان پر بیٹھا، دیر تک سسکیاں بھرتا رہا اور باپ کی گالیاں سُنتا رہا۔ سہ پہر ہو گئی۔ بازار کی رونق لوٹ آئی۔ گاہک دکانوں پر منڈلانے لگے۔ رلی مِلی آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔ گاڑیوں کے پہیئے پختہ سڑک پر کھڑکھڑانے لگے۔ اِس شور و غل میں، اس گہما گہمی میں شامی اور اس کا باپ سب کچھ بھُول گئے اور دکانداری میں اُلجھ کر رہ گئے۔

شام گزری، رات آئی۔ باپ نے دکان بند کی۔ شامی کو تنبیہ کی "میں ایک جگہ کام سے جا رہا ہوں تو سیدھا گھر کی طرف جانا"

شامی، دکان سے نِکل کر باپ کی ہدایت کے مطابق، گھر کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں نوشا مِل گیا۔ اس وقت وہ اِترا اِترا کر چل رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اُس نے قمیص کی جیب سے دس دس کے دو کرارے کرارے نوٹ نکالے۔ گردن اکڑا کر بولا۔

"آج تو اپنے ٹھاٹھ ہیں"

شامی نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ پوچھنے لگا "ابے کہاں سے مار لایا؟"

نوشا اسی طرح اِترا کر بولا "مار کہاں سے لاتا۔ مجھے مِلے ہیں"

شامی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ کہنے لگا "کہاں سے مِل گئے؟ ابے اکٹھے بیس روپے ہیں"

نوشا پھر اترایا۔ "بس بل گئے۔"
شامی نے فوراً گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سامنے والے چائے خانے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ "تو پھر ہو جائے، کچھ چائے پانی۔"
"نہیں یار، آج نہیں، پھر کسی اور دن۔"
شامی جل کر بولا۔ "لگے سالے سیانا پن کرنے۔ ابے، تو ایک نمبر کنجوس ہے۔"
نوشا نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "جا بے، تو بھی بس یونہی رہا۔ یہ روپے، میرے کب ہیں۔ مکان کا کرایہ دینے، نیاز کی دکان پر جا رہا ہوں۔"
شامی کہنے لگا۔ "جب ہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایک نہ دو اکٹھے اتنے روپے کہاں سے پار کر دئے۔"
نوشا نے کہا۔ "ابے چلتا ہے نیاز کی دکان تک۔ ذرا دیر کی تو بات ہے۔"
شامی کہنے لگا۔ "چائے پلاؤ تو چلتا ہوں۔"
مگر نوشا کے پاس چائے پلانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ لہذا شامی اُس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ نوشا آگے بڑھا اور نیاز کی دکان کی جانب روانہ ہو گیا۔

(۴)

نیاز کی دکان، بازار سے ذرا ہٹ کر گلی کے اندر تھی۔ پہلے وہ فرنیچر تیار کرنے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ مگر اب اُس نے کباڑ خانے کی دکان کھول لی تھی۔ دکان کے پچھلے حصے میں ایک کمرہ تھا، جس میں اُس کی رہائش تھی۔ بیوی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی۔ اولاد بھی اُس نے کوئی نہ چھوڑی۔ شادی کے دو سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی، وہ چھ ماہ بعد نمونیہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ بیوی، شادی کے بعد آٹھ سال تک

زندہ رہی اور اولاد کی حسرت دل میں لئے ہوئے ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئی۔

نیاز نے اب تک دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ کنواروں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یوں وہ ابھی جوان تھا۔ اس کی عمر ۳۵ سے کچھ اُوپر تھی۔ البتہ جسم میں چربی بڑھ جانے کے باعث وہ اب کسی قدر بھدّا لگتا تھا۔ کام بھی کچھ ایسا تھا۔ کہ زیادہ جسمانی مشقت نہ کرنا پڑتی۔ تمام دن دکان پر بیٹھے بیٹھے گزر جاتا۔ صرف اتوار کو وہ نیلام میں جاتا تھا یا کبھی اتفاقیہ سودے کے سلسلہ میں دکان سے نکلتا۔ مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ کہنے کو تو وہ کباڑیہ تھا۔ مگر، دراصل کام کرتا تھا، چوری کا مال فروخت کرنے کا۔

اُس وقت نیاز کی دکان میں لالٹین جل رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نوشا دکان میں داخل ہوا۔ نیاز نے اُس کو دیکھتے ہی پوچھا۔۔۔ "کیسے آنا ہوا ؟"

نوشا نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ قمیص کی جیب سے دونوں نوٹ نکالے اور اُس کو دے کر بولا "اماں نے دو مہینے کا کرایہ بھیجا ہے۔"

نیاز نے ناگواری سے کہا۔ "دو مہینے کا کیوں ؟ سارا حساب کیوں نہیں صاف کیا ؟"

نوشا نے ماں کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ "اُنہوں نے کہا ہے، بقیہ دو ماہ کا کرایہ جلد ہی آجائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

نیاز کہنے لگا۔ "ان سے کہہ دینا اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کرایہ وقت پر ملنا چاہیئے۔ ورنہ رہنے کا کہیں اور بندوبست کر لیں۔"

نیاز چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی طرح مکان خالی ہو جائے۔ اُس کے پاس کئی ایسے ضرورت مند آچکے تھے، جو زیادہ کرائے کے علاوہ ہزار بارہ سو پگڑی دینے

کو بھی تیار تھے۔ نیاز ایسے سودے کو ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ محلے میں اُس کے دو مکان تھے، جو اُس نے ایک ہندو دکان دار سے سستے داموں پر خریدے تھے۔ فسادات کی خبروں سے مکانوں کا ہندو مالک بہت سہما ہوا تھا اور کسی نہ کسی طرح ساری جائداد اونے پونے بیچ کر بمبئی جانا چاہتا تھا۔ اس کے بال بچے پہلے ہی بمبئی پہنچ چکے تھے۔

نوشا واپس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ نیاز نے پوچھ لیا "آج کل کیا کر رہا ہے؟"

نوشا نے جواب دیا "عبداللہ مستری کے گیراج میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

نیاز نے مصنوعی حیرت سے کہا "اچھا کب سے؟"

"چھ، سات مہینے ہو گئے۔ اب تو بیس روپے مہینہ تنخواہ بھی ملنے لگی ہے۔"

نیاز کہنے لگا "یہ بہت اچھا ہوا۔ مگر عبداللہ تو ایک نمبر بدمعاش ہے۔ سُنا ہے کاریگروں کو بہت مارتا ہے۔ پر اُس نے کاروبار اب اچھا جمالیا ہے۔ جب یہاں آیا تھا تو ڈپٹی صاحب کی موٹر پر کلینر تھا۔ سالا پاس کھڑا ہو جاتا، تو بو آتی تھی۔"

نوشا چُپ چاپ اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ نیاز کچھ دیر تک عبداللہ مستری اور اُس کے کاروبار کے بارے میں اظہارِ خیال کرتا رہا۔ پھر اُس نے رازدارانہ لہجہ میں آہستہ سے کہا "موقعہ لگے تو کبھی کبھار کوئی پُرزہ یا اوزار اُڑا دیا کر۔ اُس سالے پاپی کا مال کھانا تو ثواب ہے۔" نوشا اُس کی بات سُن کر چونکا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے اُس کا منہ تکنے لگا۔

نیاز کہتا رہا "کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، بس سیدھا یہاں آجایا کر۔ چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا۔ میں نے سُنا ہے تجھے تو سنیما کا بھی بہت شوق ہے۔" لمحہ بھر رُک کر اُس نے سوال کیا۔

"بول کیا کہتا ہے ؟"

نوشا سے کچھ نہ کہا گیا۔

نیاز نے اِس دفعہ اصرار کرکے پوچھا "تو پھر کیا ارادہ ہے ؟"

نوشا سہما ہُوا تھا۔ کہنے لگا "کہیں مستری جی کو پتہ چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔"

نیاز اُس کو پھُسلانے لگا "ابے جب اُس سالے کو پتہ لگے تب۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ دیکھ میں تجھے ترکیب بتاؤں۔" اور اس کے بعد اُس نے پُرزے چرانے کی نوشا کو کئی ترکیبیں بتائیں۔ پھر بھی نوشا کسی طرح آمادہ نہ ہُوا۔

لیکن نیاز نے اُس کو اپنے پھندے سے نکلنے نہ دیا۔ جب نوشا جانے لگا تو اُس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیا۔ مسکرا کر بولا "تُو آج میری طرف سے جاکر سنیما دیکھ۔"

نوشا روپیہ لینے سے انکار کرنے لگا تو نیاز نے اصرار کرکے اُس کی جیب میں ڈال دیا۔ زیادہ ضد نہیں کیا کرتے۔ میرے کہنے پر چلیگا تو عیش کرے گا۔" نوشا نے اُس کی باتیں خاموشی سے سنیں اور شرمایا ہُوا سا دکان سے باہر آ گیا۔

بازار سے گزر کر وہ گلی میں داخل ہُوا۔ دیکھا میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے محلّے کے لڑکے جمع تھے۔ ممّد جو ہوٹل میں بیراگیری کرتا تھا، مزے سے بیٹھا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ راجہ بھی وہاں موجود تھا اور منہ سے طبلہ بجا بجا کر تھاپ دے رہا تھا۔ نوشا پر ممّد کا بڑا رعب پڑا۔ وہ بھی اُس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ ممّد اس وقت ایک فلمی دھن بجا رہا تھا۔ جس کے بول باجے کے سُروں میں سے صاف نکل رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اُس نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا اور منہ صاف کرکے بولا۔

"کھیل ختم پیسہ ہضم"۔

سب لڑکے اصرار کرنے لگے۔ ممّد کو اُن کے اصرار میں مزا آرہا تھا۔ نوشا نے پوچھا "اماں کتنے کا خریدا تم نے یہ باجا" وہ ہنس کر بولا "کیا کرو گے جان کر۔ تمہارا پاجامہ بھی بک جائے گا تب بھی نہ خرید سکو گے۔ نقد ۶ روپے لگتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ ہے ہمّت خریدنے کی؟" چھ روپے کا نام سُن کر نوشا خاموش ہوگیا۔

جب لڑکوں نے بہت اصرار کیا تو ممّد نے ایک نئی دُھن شروع کر دی۔ سب مزے میں آکر گردن ہلانے لگے۔ ممّد باجا بجاتے بجاتے ایک دم اُٹھ کر بھاگ گیا۔ سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ راجہ نے جل کر ایک موٹی سی گالی دی اور نوشا سے کہنے لگا "ابے تھیٹر چلنا ہے؟"

نوشا حسبِ معمول تیار ہوگیا۔ "ہاں ہاں چلو"۔

راجہ ہنس پڑا "پہلے ایک روپیہ تو لے کر آؤ"۔

نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر سامنے کر دیا "یہ لو!"

راجہ چونک پڑا "ابے یہ ٹھاٹھ۔ آج کہاں ہاتھ مار دیا؟"

نوشا نے کہا "تو پھر چلو، کے بجے تھیٹر شروع ہوتا ہے؟"

"کل چلیں گے۔ وہ بھی اگر ایک روپیہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا۔ اپنی تو گاڑی ٹوٹی پڑی ہے۔ ایک حرام کے جنے نے موٹر چڑھا دی۔ یار اللہ نے بال بال بچا دیا"۔ راجہ اپنی پریشانی بیان کرنے لگا۔

نوشا نے کہا "کونسا کھیل ہوگا؟"

راجہ جھٹ بولا "کل تو شیریں فرہاد ہوگا۔ دیکھے گا تو آنکھیں کھُل جائیں گی۔ ابے جب فرہاد، شیریں، ہائے میری پیاری شیریں کہہ کے بیلچہ مارتا ہے اور گر کر مر جاتا ہے تو سچ جان آنسو نکل پڑتے ہیں"۔ راجہ نے سارا منظر کچھ ایسی اداکاری کے

ساتھ بیان کیا کہ نوشا حیرت زدہ ہو گیا۔ پوچھنے لگا۔

"تو کیا وہ سچ مچ مر جاتا ہے؟"

راجہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "تو بھی بس یونہی رہا۔ کہیں وہ سچ مچ مر سکتا ہے ابے یہ تو ایکٹنگ ہے ایکٹنگ۔"

نوشا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کمال ہے بھئی!"

راجہ کہنے لگا۔ "یہی نہیں، پُتلی جان کا ڈانس دیکھے گا تو مجا آجائے گا سالی بالکل ننگی ناچتی ہے۔"

نوشا چونک کر بولا۔ "ننگی ناچتی ہے، سچ؟"

راجہ نے بتایا۔ "بس ذرا سا جانگیہ پہن لیتی ہے۔ سالی کی گوری گوری رانیں روشنی میں ایسی چمکتی ہیں کہ یار طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

نوشا شرما کر رہ گیا۔ "سالے تُو ایک نمبر بدمعاش ہے۔" مگر پُتلی جان کی ننگی رانیں دیکھنے کے لئے اُس کا بھی دل تڑپ رہا تھا۔ ذرا دیر رُک کر بولا۔

"تو پھر کل کی پکی رہی۔"

"ہاں جی کل ضرور چلیں گے۔ اب اسی بات پہ ایک ایک چائے ہو جائے۔"

نوشا تیار تو نہیں تھا مگر انکار بھی نہ کر سکا۔ اس لئے کہ روز راجہ سے چائے پیا کرتا تھا۔ سنیما دیکھتا تھا۔ وہ اس کو چائے خانہ میں لے گیا۔ راجہ اُس کو تھیٹر کی ایک ایک تفصیل اس دلچسپی کے ساتھ بتاتا رہا کہ نوشا کا شوق اور بڑھ گیا۔ مگر جب دونوں چائے خانے سے باہر نکلے تو نوشا کے پاس کل ۴ آنے رہ گئے تھے۔

راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ اب تھیٹر کا پروگرام کیسے بنے گا۔ دوسرے دن

ورکشاپ گیا تو وہاں بھی بار بار یہ خیال اُسے ستاتا رہا۔ شام کو چھٹی ہوئی تو اتفاق ایسا ہُوا کہ جس شیڈ میں وہ کام کر رہا تھا وہاں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اُس نے ایک پُرزہ اُٹھایا۔ چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا، اور جلدی سے اُس کو ٹِفن کے ڈبے میں رکھ لیا، جس میں وہ اپنا کھانا لاتا تھا۔ مگر جب اُس کو لے کر چلا تو قدم کانپ رہے تھے، اور سانس پھُولی ہُوئی تھی۔ گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ اُس کی جانب دیکھے بغیر جھٹ باہر نکل گیا۔ گھبراہٹ کے باعث اُس کے قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

وہ سیدھا نیاز کی دکان پر پہنچا، اور جاتے ہی پُرزہ نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔ نیاز نے اُلٹ پُلٹ کے اُسے دیکھا۔ کہنے لگا۔

" ابے یہ کیا اُٹھا لایا۔ کسی اچھے مال پہ ہاتھ ڈالا ہوتا"۔

نوشا بُجھ کے رہ گیا۔ مگر نیاز نے اُس کو زیادہ دیر نا اُمیدی میں مبتلا نہ رکھا اور ڈیڑھ روپیہ نکال کر دے دیا۔ خوشی کے مارے نوشا کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ نیاز نے پیٹھ ٹھونک کر شاباش دی اور اُس بات پر آمادہ کیا کہ آئندہ کوئی قیمتی پُرزہ چُرا کر لائے۔

نیاز کی دکان سے نکل کر، نوشا آج بھی گھر جانے کے بجائے گلی میں پہنچا۔ راجہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اُس نے بھی کچھ رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اب شامی کا انتظار تھا۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دونوں اُس کے گھر کی جانب چل دئے۔ قریب پہنچے تو گھر کے اندر اودھم مچا ہُوا تھا۔ شامی چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور اُس کا باپ گالیاں بک رہا تھا۔

راجہ نے آہستہ سے کہا۔ " معلوم ہوتا ہے شامی سالا پکڑا گیا"۔

نوشا بولا۔ " چلو یار! اُس کے ابا نے دیکھ لیا تو ہم دونوں پر بھی گالیاں پڑیں گی"۔ دونوں چُپ چاپ لوٹ آئے اور "شیریں فرہاد" دیکھنے تھیٹر

کی جانب چل دئے۔

تھیٹر سے واپسی پر صبح ہوگئی۔ جیسے ہی دونوں گلی میں داخل ہوئے کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ نوشا سہم کر رہ گیا۔ ڈرتے ڈرتے دیوار پر چڑھا، اور جیسے ہی کود کر گھر کے اندر پہنچا، ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے نوشا کو کمرے کے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اُسی وقت اُٹھ کر اُس کی پیٹھ پر ایک ایسا زوردار دوہتڑ مارا کہ نوشا فرش پر گر پڑا۔ وہ زور زور سے کوسنے لگی۔ اس ہنگامہ سے سب کی آنکھ کھل گئی۔ نوشا مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور اس پر پھٹکار پڑ رہی تھی۔

لیکن دوسرے دن نوشا نے کارخانے سے پھر ایک پُرزہ چُرایا۔ اور اُسے لئے ہوئے نیاز کے پاس گیا۔ روپیہ ڈیڑھ روپیہ جو کچھ اس نے دیا جیب میں ڈالا۔ راجہ کے ساتھ مسلم ہوٹل میں جاکر چائے پی، بسکٹ کھائے اور فلمی ریکارڈ سُنے۔

پھر تو اُس کا یہ معمول ہوگیا، جہاں موقعہ لگا، کوئی پُرزہ یا اوزار کارخانے سے چُرا لاتا اور نیاز کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اس رقم سے روزانہ نئے نئے پروگرام بنتے اور رات بھر آوارہ گردی ہوتی۔ نوشا نے غور کیا کہ جب سے اُس کی جیب میں رقم رہنے لگی، شامی اور راجہ دونوں کے انداز میں خوشامد آگئی تھی۔ اب وہ اُس کی ہر بات مان لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا سرغنہ بنتا جا رہا تھا۔

(۵)

نوشا کارخانے سے ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ نوشا صبح کا نکلا

رات کے پچھلے پہر اس وقت لوٹتا جب سب گھر والے سو جاتے تھے۔ ماں اُس وقت بیٹھی نوشا کو کوسنے دے رہی تھی۔ اچانک دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ انو نے باہر جا کر دیکھا۔ دروازے پر نیاز کھڑا تھا۔ اُس نے ماں کو فوراً ہی کی اطلاع دی۔

ماں نے کہا۔ "اندر بُلا لو"۔

ذرا دیر بعد نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ اُس نے نوشا کی ماں کو سلام کیا اور اُس کے قریب ہی فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گیا۔ نیاز کا نوشا کی ماں سے کوئی سگا رشتہ نہیں تھا۔ نیاز کی بیوی رشتے میں سلطانہ کی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتہ سے وہ نوشا کی ماں کا بھتیج داماد لگتا تھا۔

نیاز کو آئے ہوئے چند ہی منٹ گذرے تھے کہ سلطانہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دوپٹے سے سر کو ڈھک کر شرماتے ہوئے کہا۔

"دولھا بھائی سلام"۔

نیاز نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت عرصہ بعد اس گھر میں آیا تھا۔ وہی سُوکھی مریل سی لڑکی، جو بال بکھرائے گھر بھر میں دھبڑ دھبڑ کرتی پھرتی تھی اب چھٹ چھٹا کر، پتھر کے مجسمہ کی طرح سڈول ہو گئی تھی اُس کی آنکھوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور چہرے پر چاندنی کی چھُوٹ تھی۔ نیاز نے دل ہی دل میں سوچا۔ یار یہ لڑکی تو اب قیامت بن گئی ہے۔ اُس روز وہ اپنا سیکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی شکنیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ اُسے چند ہی روز پہلے خریدا گیا تھا۔ سر پہ نئی جناح کیپ تھی۔ گردن میں اُونی گلو بند تھا۔ کباڑیوں کی اصطلاح میں وہ اُس وقت بالکل ٹنا ٹن نظر آ رہا تھا۔

نیاز، آیا تو مکان کے کرائے کا تقاضہ کرنے کی غرض سے تھا مگر سلطانہ اس کی نظروں میں ایسی کھُب گئی کہ وہ کرائے کا سوال تک زبان پر نہ لایا۔ بلکہ جب

نوشا کی ماں نے دو ماہ کا کرایہ بروقت نہ پہنچنے پر اظہارِ معذرت کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"جب جی چاہے بھیج دیجئے گا۔ میں اس ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ اِس طرف سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کی خیریت معلوم کرلوں۔"

نوشا کی ماں اپنی پریشانیوں کا دُکھڑا رونے لگی۔ نیاز نے اُس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "پریشان نہ ہوں، جس بات کی تکلیف ہو مجھ سے کہلوا دیا کریں، بشرطیکہ آپ مجھ کو اپنا سمجھیں، ورنہ مرنے والی کے ساتھ سب ہی نے مجھ سے آنکھیں پھیرلیں۔ حالانکہ میں تو آپ لوگوں کو آج بھی ویسا ہی مانتا ہوں۔" اُس کے لہجہ میں شکوہ کرنے کا انداز تھا۔

نوشا کی ماں بولی۔ "یہ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم اب بھی سب کو اسی طرح سمجھتے ہو، ورنہ پاکستان میں بھائی کہاں کی عزیزداری، کہاں کا رشتہ۔ جسے دیکھو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔"

دونوں دیر تک ایسی ہی گھریلو باتیں کرتے رہے۔ نیاز دوران گفتگو میں باربار سلطانہ کی جانب چور نظروں سے دیکھتا رہا جو ماں کے برابر خاموش بیٹھی تھی۔ ایک بار جب سلطانہ نے بھی شرمائی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھا تو نیاز کا سارا جسم سُن سا ہوگیا۔ اُس نے کوٹ کے بٹن کھول دئے اور سینہ تان کر جوان پٹھوں کی طرح ذرا ترچھا ہو کر، اکڑ کے بیٹھ گیا۔ کسی عاشق مزاج سے اُس نے سُن رکھا تھا کہ عورت پیسے کوڑی پر اتنا نہیں ریجھتی جتنا مرد کے جسم پر مرتی ہے۔

دکان سے وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ کھڑے کھڑے دو باتیں کرکے واپس آجائے گا۔ مگر اُس کا وہاں ایسا دل لگا کہ اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ نوشا کے گھر سے نکلا تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ سنسان

گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو اُسے تنہائی کا شدت سے احساس ہوُا۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر نوشا کے گھر پہنچا۔ چھوٹے موتیوں کا ایک ہار بھی لیتا گیا۔ ہار بڑی نفاست سے تیار کیا گیا تھا۔ نیاز نے اُسے انگلستان واپس لوٹنے والے کسی انگریز خاندان کے سامان سے نیلام میں خریدا تھا اور عرصہ سے کباڑ خانے کی الماری میں پڑا تھا۔ نیاز نے ڈبہ کھول کر ہار نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیا۔ جھجکتے ہوئے بولا۔

"آج ایک شخص زبردستی یہ ہار میرے سر چپکا گیا ہے، دیکھئے کیسا ہے ؟"

نوشا کی ماں نے ہار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور اس کی تعریف کرنے لگی "بڑا خوب صورت ہار ہے"

سلطانہ لمحہ بھر تک اُسے بے چینی سے دیکھتی رہی۔ مگر اُلھڑ لڑکی سے زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے ماں کے ہاتھ سے ہار لیا۔ نظر بھر کر دیکھا اور گلے میں پہن کر ماں سے پوچھنے لگی۔

" کیوں اماں دکھیسا لگ رہا ہے ؟"

ماں نے اُس کو فوراً ڈانٹا " اے ہے سلطانہ! تجھے تو کسی آئے گئے کی بھی غیرت نہیں۔ کیسے جلدی سے ہار مٹکا کر بیٹھ گئی۔ اُتار کمبخت، آنکھیں نکالے کیا دیکھ رہی ہے"

نیاز کو تو ایسے ہی موقعہ کی تلاش تھی۔ کہنے لگا " پہنے رہنے دیجئے " مگر سلطانہ نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ ہار اُتار کر ڈبے میں ڈال دیا اور منہ لٹکا کر خاموش بیٹھ گئی۔ نوشا کی ماں نے نیاز سے کہا " تمہاری بات دوسری ہے۔ تم ٹھیرے گھر کے آدمی، مگر لڑکیوں میں یہ عادت نہیں ہونا چاہیئے۔ کسی اور کے سامنے یہ ایسی حرکت کر بیٹھی تو وہ اُس کے جنم پہ کیا تھوکے گا۔ میں لڑکیوں کو

سر پر چڑھانے کی قائل نہیں۔ اولاد کو نوالا کھلائے سونے کا مگر دیکھے ہمیشہ قہر کی نظر سے۔ ورنہ یہ آج کل کی اولادیں تو آفت کی پرکالہ ہیں۔"

نوشا کی ماں نے اولاد کی تربیت پر اپنا لیکچر ختم کیا تو نیاز نے کہا "اب اُس نے پہن لیا ہے تو اسی کو دے دیجئے۔"

وہ پوچھنے لگی "کتنے کا لیا تم نے؟"

نیاز نے ہنس کر کہا "کیا کیجئے گا پوچھ کر۔ میں اب اس کی قیمت تو آپ سے لینے سے رہا۔"

وہ ذرا دیر اصرار کر کے خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس روز بھی وہ رات گئے واپس گیا۔

اب نیاز کا یہ معمول ہو گیا کہ رات کا کھانا ہوٹل سے کھا کر، ہر دوسرے تیسرے دن نوشا کے گھر پہنچ جاتا، اور گھنٹوں بیٹھا اس کی ماں سے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔

ایک روز وہ آیا تو نوشا کی ماں پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھی۔ نوشا حسبِ معمول گھر سے غائب تھا۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی اور انّو تھا، جو لیمپ کے پاس پڑھتے پڑھتے وہیں لڑھک کر سو گیا تھا۔ سلطانہ نے نیاز سے زیادہ بات چیت نہ کی اور چلنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

نیاز نے پوچھا "کہاں چلیں؟"

وہ بولی "اماں کو بُلانے جا رہی ہوں، سامنے والے گھر میں تو گئی ہیں۔"

وہ باہر جانے کے لئے مُڑی تو نیاز نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ہاتھ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ کلائی میں پڑی ہوئی تمام چوڑیاں چھن چھنا کے ٹوٹ گئیں۔ وہ منہ بسور کر بولی۔

"لیجئے آپ نے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں، کل ہی تو پہنی تھیں۔

نیاز ہنس کر بولا : "اور پہن لینا"

وہ آہستہ سے بولی "بڑی مشکل سے تو اماں نے چوڑیاں پہنائی تھیں آپ نے میرا پورا ہاتھ ننگا کر دیا۔ اماں دیکھیں گی تو میرا فضیحتہ کرکے رکھ دیں گی۔" اُس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔

نیاز کی جیب میں اُس وقت کئی سو کے نوٹ موجود تھے۔ اُس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے کر دی "تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ لو کتنے کی چوڑیاں پہنو گی" سلطانہ نے کبھی اتنے بہت سے روپے نہیں دیکھے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت جھلکنے لگی۔" لمحہ بھر خاموش رہ کر بولی۔

" جی نہیں مجھے آپ کے روپے نہیں چاہیئے "

نیاز نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے کہا "مگر تم بیٹھو تو، میں تمہیں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا۔"

وہ شرمائی ہوئی سی، ذرا ہٹ کر، وہیں دری پر بیٹھ گئی۔ لیمپ کی گہری بسنتی روشنی میں وہ پیاری لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی پلکیں، اور رخساروں پر کندن کی سی چمک، سمٹتا اور پھیلتا ہوا سڈول جسم۔ نیاز نے اُس کو اس عالم میں دیکھا تو بے قابو ہو گیا۔ کہنے لگا۔

" ایک بات کہوں ؟"

وہ بولی: " کہئے "

نیاز کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہا نہ گیا۔ اُلجھی ہوئی سانس بھر کر صرف اس قدر کہا " تمہاری اماں سے بات کروں گا۔"

سلطانہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔ کہنے لگی " مجھ سے کہنے میں کوئی ہرج ہے۔"

نیاز نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔" سلطانہ

تم مجھ کو بہت اچھی لگتی ہو۔" اُس نے بڑی سادگی سے دل کی بات کہہ دی۔

سلطانہ خاموش بیٹھی پیروں کے ناخن توڑتی رہی۔ نیاز کہنے لگا۔" تمہیں پتہ ہے میں روز روز کیوں آتا ہوں ؟" وہ اس وقت سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

وہ بے نیازی سے بولی۔" مجھے کیا معلوم ؟"

" اور جو میں یہ کہوں کہ صرف تمہاری خاطر یہاں آتا ہوں۔"

سلطانہ نے تڑاخ سے جواب دیا۔" بالکل جھوٹ۔"

نیاز ہنس پڑا۔" اب تم کو کیسے یقین دلاؤں۔"

وہ دیدے مٹکا کر بولی۔" واہ! بیٹھے اماں سے باتیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے لئے آتے ہیں۔ میرے لئے کیوں آنے لگے۔"

نیاز برابر مسکراتا رہا۔" لیکن میری آنکھیں تو برابر تم کو ڈھونڈا کرتی ہیں۔" وہ اس وقت بڑے شاعرانہ موڈ میں تھا۔

سلطانہ نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔" کیوں ؟"

" میرے قریب آکر بیٹھو تو بتاؤں۔"

اُس نے گردن ہلا دی۔" میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

سلطانہ کی ایک ایک ادا نیاز کو ڈسے جا رہی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر بولا۔" تو پھر میں تمہارے پاس آجاؤں ؟"

وہ اسی تیزی کے ساتھ بولی۔" آپ وہاں بیٹھے کیا بُرے لگ رہے ہیں۔"

نیاز نے اُس کو پھر چھیڑا۔" اچھا ذرا میری طرف تو دیکھو!"

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔" لیجئے!"

نیاز اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے قراری سے بولا۔" ہائے! دل کی بات ٹھنڈی سانس کے ساتھ بہہ گئی۔ سلطانہ کے لئے نیاز کی یہ تمام حرکتیں کچھ عجیب سی تھیں۔ بہت سی باتیں اُس کی سمجھ میں آگئیں اور بہت سی

وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

نیاز کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ اسی وقت ماں دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ نیاز سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نوشا کی ماں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"ارے تم کب آئے؟ میں تو برابر والے مکان میں تھی، بلوا لیا ہوتا؟"

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔" آئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی۔"

ماں کہنے لگی۔" اے سلطانہ تم نے نیاز کو پان بھی کھلایا۔" اُس نے پاندان کھولا اور پان بنانے لگی۔

پان کھا کر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ سلطانہ ذرا دیر تک وہاں بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کر اپنے بستر میں جا کر دبک گئی۔ نیاز اُس روز بڑا خوش تھا۔ بات بات پر ہنس پڑتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

(۶)

شام ہو چکی تھی۔ نیاز لالٹین کی مٹیالی روشنی میں ایک شخص سے رازدارانہ انداز میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ کسی مال کا سودا ہو رہا تھا، جو کسی طرح طے ہی نہ ہو پاتا۔ نیاز سو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا اور وہ شخص بضد تھا کہ ایک سو دس سے کم نہ لے گا۔

نیاز نے آخری دام لگاتے ہوئے کہا۔" پانچ اور بڑھا لو۔ پسند آئے تو دے دو، نہیں تو دوسری جگہ دکھا دو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا اگر دوسری جگہ بھی اتنے دام لگیں تو یہیں دے دینا۔"

وہ آدمی بولا۔" بیچوں گا تو تمہارے ہی ہاتھ اور پورے ایک سو دس لوں گا۔ لو یہ سنبھالو اپنا مال۔" اُس نے دو گھڑیاں نیاز کے سامنے ڈال دیں۔

نیاز آمادہ نہ ہوا۔" نہیں بھئی اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔"

وہ شخص بولا" خدا قسم بازار میں صرف ایک کی قیمت دو سو سے زیادہ ہے۔ روز ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ آج تم کو ہماری بات ماننی پڑے گی۔"

نیاز بولا" دیکھنے میں تو دونوں ٹھیک ٹھاک لگتی ہیں مگر ان کا نکالنا کتنا جوکھوں کا کام ہے۔ ہر وقت پولیس کا خطرہ۔ چوری کا مال بیچنا تم کوئی آسان کام سمجھتے ہو۔"

وہ کہنے لگا" نیاز بھائی تم زیادہ دکان داری نہ کیا کرو۔ تمہارے ساتھ کوئی آج پہلا معاملہ کر رہا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بُلوائے، ان ہاتھوں سے تم کو ہزاروں کا مال دے چکا ہوں۔ ہر وقت کی بزنس اچھی نہیں ہوتی۔ لاؤ نکالو سیدھے ہاتھ سے روپے۔"

وہ اپنی بات پر اڑا رہا" ہوں گے وہی ایک سو پانچ۔"

" لا یار نکال جو تیرا جی چاہے۔"

نیاز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ایک سو پانچ روپے گن کر اُس کی طرف بڑھا دئے۔ وہ بولا" اماں چائے پانی کو تو کچھ دے دو۔" نیاز نے اٹھنی اور دے دی۔ جل کر بولا۔

" لو یہ بھی لو۔ تمہارے اسی لیچڑپن سے مجھے چڑ ہے۔"

وہ شخص ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ اُس نے نوٹ گن کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور مُسکراتا ہُوا دکان سے باہر چلا گیا۔ نیاز نے دونوں گھڑیوں کو لالٹین کی روشنی میں غور سے دیکھا، بالکل نئی تھیں۔ پھر اُس نے دکان کے پچھلے حصے میں جا کر الماری کھولی۔ گھڑیاں رکھیں اور الماری میں تالہ لگا دیا۔

نیاز کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ دیکھا نوشا بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اُس روز موٹر سائیکل کے انجن کا کوئی پُرزہ لایا تھا۔ نیاز نے پُرزے کو صرف ایک نظر دیکھا اور جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوشا کو دیا۔

"جا آج ٹھاٹھ سے عیش کر۔"

نوشا کے ہاتھ میں پورا دس روپے کا نوٹ آیا تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ نیاز اُس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا۔ کہنے لگا۔ "ابے میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ اِسے جیب میں ڈال لے۔"

نوشا نے جلدی سے نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اُس وقت اُس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ نوشا دکان سے نکلا اور راجہ کی تلاش میں چل دیا۔ گلی میں صرف شامی موجود تھا۔ مگر راجہ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نوشا کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ جلد سے جلد راجہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بےچین کہ اُس کی جیب میں پورے دس روپے کا کرارا نوٹ ہے۔

شامی نے بتایا کہ راجہ کالے صاحب کے گھر تمبولا کھیلنے گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ نوشا آئے تو اس کو وہیں لیتے آنا۔ نوشا نے سوچا آج تو ٹھاٹھ سے تمبولا ہوگا۔ وہ شامی کے ساتھ اسی طرف چل دیا۔

کالے صاحب کا گھر وہاں سے کوئی فرلانگ، سوا فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ بیچ میں دو گلیاں پڑتی تھیں۔ اس کے بعد عیسائیوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ وہیں کالے صاحب کا گھر تھا۔ دونوں جب وہاں پہنچے تو اُس وقت سُرنگ کی طرح لمبے کمرے میں، بوسیدہ بنچوں پر بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر ملگجا روشن تھا۔ ہر طرف تمباکو کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر کالے صاحب، اُونچی باڑھ کی ہیٹ لگائے، ہاتھ میں جادوگروں کی طرح سیاہ چھڑی لئے کھڑا تھا۔ اُس کے سامنے چوکور میز تھی جس پر ایک تھیلا رکھا تھا۔ چار پانچ سال کا ایک گول مٹول بچہ تھیلے کے اندر سے ٹکٹ نکال نکال کر دیتا جا رہا تھا جن پر لکھے ہوئے نمبر کالے صاحب سرکس کے مسخروں کی طرح گردن مٹکا مٹکا کر اُونچی آواز سے پڑھ رہا تھا۔

کمرے میں ایک طرف بنچ پر راجہ بھی بیٹھا تھا۔ کالے صاحب نمبر بولتا جا رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذوں پر پنسل سے جلدی جلدی نمبر کاٹ رہے تھے۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص کے کان کالے صاحب کی آواز پر لگے تھے، جو دھڑا دھڑ نمبر بول رہا تھا۔

اچانک ایک موٹے تگڑے سیاہ فام آدمی نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ کسی دل جلے نے چیخ کر کہا۔

"دھت تیرے کی۔"

کمرے کے اندر اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

شامی نے راجہ کو آواز دی۔ اُس نے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور اُٹھ کر اُن کے پاس آگیا۔ نوشا نے تمبولا کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ راجہ نے اُس کو ڈانٹ دیا۔ "یار یہ کالے صاحب ایک نمبر بے ایمان ہے۔ سالا ضرور گڑبڑ کرتا ہے۔"

راجہ شام سے بیٹھا تمبولا کھیل رہا تھا اور برابر ہار رہا تھا۔

کالے صاحب کے مکان پر ہر سنیچر کی شام تمبولا ہوتا تھا۔ راجہ کئی ہفتوں سے وہاں جا رہا تھا اور ہر بار ہار کر آتا تھا۔ تمبولا کھیلنے کے لئے وہ ہفتہ بھر تک پیسے جمع کرتا اور سب ہار آتا۔ بعد میں کالے صاحب کو گالیاں دیتا۔

نوشا کا دل تمبولا کھیلنے کو چاہ رہا تھا۔ اُس نے دبی زبان سے کئی بار اصرار بھی کیا مگر راجہ نے ایک نہ سُنی۔ وہاں سے نکل کر تینوں باہر آئے۔ نوشا نے دس روپے کا نوٹ نکال کر دکھایا۔ راجہ پر بڑا رعب پڑا۔

ذرا دیر کے لئے تو وہ چکرا گیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "ابے آج تو بڑی لمبی رقم مار لایا۔"

نوشا نے کہا۔ "اسی لئے تو تمبولا کھیلنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

راجہ نے اس دفعہ بھی اُس کی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ "ابے تمبولا میں

کیا رکھا ہے۔ میں تو بھنگی کو دیکھنے چلا آیا۔ پر سالی وہ آج آئی نہیں۔"

نوشا نے کہا۔" یار تو تعریف تو اُس کی بہت کرتا ہے، کسی دن اس کو دکھا تو دے۔"

شامی بیچ میں بول اُٹھا۔" ابے کیا کرے گا دیکھ کر۔ میری دکان پر روز سودا لینے آتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ بالکل کالی کلوٹی۔"

راجہ کو اُس کی بات سخت ناگوار گزری۔ اُس نے گھُور کر شامی کو دیکھا۔ جل کر بولا۔" سالے وہ تمہاری عشوتو جیسے پرستان کی پری ہے۔ سالی بھینگی کہیں کی۔"

اُن کی باتیں سُن کر نوشا کو شدید احساس کمتری ہوا۔ بے چارگی سے بولا۔ " یار تم دونوں نے تو ایک ایک معشوق چھانٹ لیا۔ یہاں تو سالی کوئی کلوٹی بھی نہیں ملتی۔"

دونوں اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنس پڑے۔ شامی کہنے لگا۔" اُستاد اس کے لئے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے تب جا کر کہیں لونڈیا پھنستی ہے۔"

راجہ کہنے لگا۔" سالا یہ دکان پر بیٹھا دن بھر یہی تو کام کیا کرتا ہے۔"

شامی نے جھٹکا دے کر اپنے بڑے بڑے بالوں کو ایکٹروں کی طرح پیچھے پلٹا اور فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔

راجہ بولا۔" ابے نوشا میں تجھے ایک تدبیر بتاؤں۔ وہ جو اُدھر سیٹھ ہے نا۔ دہی جس کا چوراہے پر پکا مکان ہے تو اُس کی لونڈیا گانٹھ لے۔ روز اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ باپ قسم بڑی زوردار چیز ہے۔ میں نے تو اُس کے بھائی سے یارانہ کر لیا ہے۔ چاہے تو تو بھی ساجھا کر لے۔ پٹ گئی تو موج کریں گے۔ لا ملا، اِسی بات پر پلاؤ والا ہاتھ۔" اُس نے گرم جوشی سے نوشا کا ہاتھ دبوچ لیا۔

تینوں دیر تک محلّے کی لڑکیوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ راجہ اور شامی، جو لگ بھگ نوشا ہی کے ہم عمر تھے اور کسی کا بھی سِن ۱۴، ۱۵ سال

سے زائد نہ ہوگا۔ اِس انداز سے ایک ایک بات کھُل کر بیان کر رہے تھے کہ نوشا ہونّق کی طرح اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

تمبولا کھیلنے کا پروگرام منسوخ ہُوا تو راجہ نے ایک نیا پروگرام بنایا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ شامی نے ضد کی تو اُس نے ڈانٹ دیا "بس کہہ دیا کہ ایک جگہ چلیں گے، تجھے چلنا ہو تو چل۔"

شامی نے پوچھا "کب تک واپسی ہوگی؟"

راجہ بولا "کوئی ٹھیک نہیں۔ گیارہ تو بج ہی جائیں گے۔"

شامی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "نا بابا! میں اتنی دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ ابا مولانا قدوس کا وعظ سُننے گئے ہیں۔ دس بجے لوٹ آئیں گے۔ مجھے گھر میں نہیں دیکھا تو اودھم مچادیں گے۔ میں تو بھئی چلا۔" یہ کہہ کر وہ تو اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ راجہ اور نوشا باتیں کرتے ہوئے بازار کی جانب مُڑ گئے۔

بازار کی چہل پہل اب اُجڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں اِکا دکا دکانیں کھُلی تھیں۔ چوکیداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا اور دکانوں کے تالے ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے۔ راجہ اور نوشا نے بازار عبور کیا اور ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی کے اندر گھُپ اندھیرا تھا۔ آگے آگے راجہ تھا، اور اُس کے پیچھے نوشا چل رہا تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک موڑ پر تیز روشنی نظر آئی۔ قریب ہی مِلی جُلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ دونوں اُسی طرف مُڑ گئے۔ جس قدر وہ آگے بڑھتے گئے، شور نزدیک آتا گیا۔ آخر راجہ ایک اُونچی دیواروں والی قدیم وضع کی عمارت کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔

بڑا پھاٹک بند تھا اور اندر خوب شور ہو رہا تھا۔ راجہ نے کھڑکی نما دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔ اُس کے ساتھ ہی نوشا بھی چلا گیا۔ دروازے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اُس کے بعد لمبی لمبی محرابوں والا طویل دالان تھا جس میں گیس بتیاں جل رہی تھیں۔ جگہ جگہ ٹین کی کرسیاں اور لکڑی کی بھدّی میزیں پڑی تھیں۔ میزوں پر شراب

تھی - گلاس تھے۔

اس شراب خانے میں دیسی شراب ملتی تھی۔ دالان میں شرابیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ شراب پی رہے تھے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا کرسیاں کھینچ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر راجہ نے نوشا سے دس روپے کا نوٹ لیا اور کاؤنٹر پر جاکر ٹھرے کی ایک بوتل لے آیا۔ اُس نے بوتل کھول کر میز پر رکھی۔ اپنے گلاس میں شراب اُنڈیلی۔ لیکن جب وہ دوسرے گلاس میں شراب ڈالنے لگا تو نوشا گھبرا کر بولا۔

" یار یہ تو کس کے لئے اُنڈیل رہا ہے ؟"

وہ ہنس کر بولا" ابے تیرے لئے اور کس کے لئے ؟"

نوشا سہمی ہوئی ہوئی آواز سے بولا" نہیں یار مجھ کو نہ پلا "

راجہ اصرار کرنے لگا۔ مگر نوشا برابر انکار کرتا رہا۔ اُسی وقت دالان کے اندر ڈھولک ٹھکنے لگی۔ ایک ہیجڑا لہک لہک کر گانے لگا۔

" بریلی کی باجار میں جھمکا گرا رے۔ او جھمکا گرا رے ؟"

گانے کے ساتھ ساتھ وہ کمر لچکا کر ناچنے بھی لگا۔ ایک شرابی جھومتا ہوا اُٹھا، اور ہیجڑے کے ساتھ ناچنے لگا۔ وہ آدمی بھاری بھرکم جسم کا تھا۔ دھم دھم کر کے ناچتا تو چھت تک ہل جاتی۔ دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ اُس کو ناچتے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ دونوں کے ناچ نے شراب خانے کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ نوشا بھی اس ہاؤ ہو میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اسی اثنا میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے دونوں کے قریب آکر پوچھا:

" کھانے کو کچھ لاؤں "

راجہ نے کہا" کباب ہوں گے ؟"

وہ بولا" کباب تو ابھی ابھی ختم ہو گئے "

راجہ بولا "اچھا تو آلو چھولے لے آؤ مگر خوب چٹ پٹے ہوں۔"

"ابھی لو جی، ابھی۔"

یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا اور ذرا دیر بعد المونیم کی ایک گندی سی پلیٹ میں آلو چھولے لے آیا، جن پر پسی ہوئی لال لال مرچیں پڑی ہوئی تھیں۔

بھاری بھر کم جسم والا شرابی ابھی تک ہیجڑے کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ وہ اپنے چوڑے چوڑے کولھے مٹکا کر ناچتا تو نوشا کو بڑا لطف آتا۔ راجہ نے کہا۔ "ابے ذرا سی لگائے بغیر کیا مزا آئے گا۔" اُس نے گلاس نوشا کے منہ سے لگا دیا۔

نوشا نے ایک گھونٹ پی کر بُرا سا بنایا۔ "یار یہ تو بہت کڑوی ہے۔"

راجہ نے آلو چھولے کی پلیٹ سامنے کر دی۔ "لے آلو کا ایک قتلہ کھا لے۔"

نوشا نے پلیٹ سے آلو کے کئی قتلے اُٹھا کر کھا لیے۔ راجہ نے گلاس اُٹھا کر اپنے آنکھوں کے سامنے کیا۔ گہری گلابی شراب کو روشنی میں دیکھا۔ گلاس کو بوسہ دیا اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ نوشا نے بھی گلاس اُٹھا کر تھوڑی سی پی لی اور راجہ سے کہنے لگا۔

"یار تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔"

راجہ بولا "نہیں بے! بس دو تین بار اس سے پہلے اور پی تھی اور یہاں تو دوسری دفعہ آیا ہوں۔"

نوشا نے کہا "لگے سالے جھوٹ بولنے۔ تُو پکا شرابی معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں یار! قسم لے لے۔" راجہ نے صفائی پیش کی۔

دونوں باتیں کرتے رہے اور ٹھرّے کے گھونٹ چڑھاتے رہے۔ جب گلاس ختم ہو جاتا تو راجہ اور اُنڈیل دیتا۔

نوشا پیتے پیتے ذرا دیر بعد بولا " یار راجہ مجھ کو تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے "

راجہ ہنس کر بولا " ابے ابھی سے چڑھنے لگی۔ چل تھوڑی سی اور لگا "

نوشا نے تھوڑی اور پی اور خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔ یہ ہنسی بڑی بیڈھنگی تھی۔ اُس نے گلاس اُٹھایا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ بھاری بھرکم جسم والا شرابی ناچتے ناچتے لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔ اور اب چاروں شانے چت، فرش پر لیٹا بھینس کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ دالان میں بیٹھے ہوئے شرابی ٹھٹھا مار کر ہنس رہے تھے۔

ہیجڑے نے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ ہر میز پر جاتا۔ کسی سے گندا مذاق کرتا۔ کسی کو دو چار بازاری فقرے سناتا اور دونی چونّی وصول کر کے دوسری میز پر چلا جاتا۔ وہ باری باری ہر میز پر جا رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اُس نے ہاتھ مٹکا مٹکا کر تالیاں بجائیں اور زور سے تان لگائی :

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلّی کھیلیں

نوشا تو اس کی حرکتوں پر شرما گیا۔ مگر راجہ نے بڑی بے باکی کے ساتھ اُٹھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ چٹاخ سے اُس کے گال کو چوم لیا۔ ہیجڑا ہاتھ پھیلا کر بولا :

" اسی بات پر ایک چونّی دلا دو "

راجہ نے فوراً جیب سے چونّی نکال کر اس کو دے دی۔ وہ کولہے مٹکاتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔ دونوں دیر تک بیٹھے ٹھرّا پیتے رہے۔ ٹھرّے کی خاصیت ہے کہ اس کا نشہ طوفان کی طرح چڑھتا ہے۔ راجہ نے غضب یہ کیا کہ بوتل ختم ہونے کے بعد ایک اَدھا اور لے آیا۔ اَدھا ختم بھی نہیں ہُوا تھا کہ راجہ بہکنے لگا۔ اب وہ خواہ مخواہ ہنس رہا تھا۔ بات کہتے کہتے بھول جاتا۔ کبھی نوشا کے گلے میں

باہنیں ڈال دیتا۔ کبھی اس کا اس طرح چہرہ بگاڑتا جیسے وہ رو پڑے گا۔

یکایک نوشا لڑکھڑا کر فرش پر گرا۔ اُٹھ کر اُس نے میز کا سہارا لیا تو میز اُلٹ گئی۔ بوتل لڑھک گئی۔ گلاس گر کر چکنا چُور ہو گئے۔ راجہ نے ایک گندی گالی دی۔ ساتھ ہی ایک زناٹے کا ہاتھ نوشا کے گال پر پڑا۔ نوشا نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، راجہ خونخوار نظروں سے گھُور رہا تھا۔ پھر اُس کو نہ جانے کیا سُوجھی کہ دالان سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ پیچھے سے راجہ نے آواز دی۔ نوشا کو ایسا محسوس ہُوا جیسے راجہ کنویں کے اندر سے بول رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر اُس کو دیکھا بھی نہیں پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر باہر گلی میں آ گیا۔

اسی عالم میں وہ ڈگمگاتا ہُوا ایک طرف چل دیا۔ اُس کو مطلق علم نہیں تھا کہ کہاں جا رہا تھا، کدھر جا رہا تھا۔ آدھ گھنٹے تک سنسان گلیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر آ گیا۔ لیکن سڑک پر کچھ ہی دُور گیا ہو گا اچانک اُس کا جی متلانے لگا۔ اُس نے وہیں سڑک پر قے کر دی۔ اُٹھ کر لڑکھڑاتا ہُوا چند قدم گیا۔ ہر چیز اُس کے سامنے گردش کر رہی تھی۔ مکانوں کے دریچوں پر جھلکتی روشنیاں جگنوؤں کی مانند اس کی نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگیں۔ پھر وہ سپیرے کی بین پر جھُومنے والے ناگ کی طرح لہرایا اور چکرا کر گر پڑا۔ سڑک ٹھنڈی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ نوشا کو بڑا سکون ملا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور بے خبر سو گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے لاش کی طرح بے جان پڑا تھا۔ دفعتاً ایک موڑ سے ایک کار بڑی تیز رفتار سے نکلی اور آناً فاناً نوشا کے سر پر پہنچ گئی۔ نوشا پہیئے کی لپیٹ میں آ کر دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک بار وہ کلیجہ پھاڑ کر چیخا "ہائے" اور پھر خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے۔ کار شور کرتی ہوئی زور سے اُچھل کر رُک گئی۔ کسی نے کار کے اندر سے جھانک کر نوشا

کو دیکھا۔ وہ دُھندلی روشنی میں مُردے کی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔

"مر گیا؟" جھانکنے والے کی گھبرائی ہوئی آواز اُبھری۔

موٹر کے اندر سے پھر آواز اُبھری۔ "کار اسٹارٹ کرو۔"

موٹر کا انجن گھڑگھڑایا اور کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

بہت دیر بعد ایک راہ گیر اُدھر سے گزرا۔ یہ سلمان تھا۔ وہ ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا اور فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اُس نے نوشا کو دیکھا تو رُک گیا۔ جھجکتا ہُوا اُس کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ اُسی وقت نوشا نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ سلمان جھک کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کے تمام جسم پر خاک ہی خاک تھی۔ اُس نے نوشا کا ہر طرف سے جائزہ لیا۔ چوٹ زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صرف کندھے کے پاس خون کا گہرا سُرخ نشان تھا۔

وہ اس کو بیچ سڑک سے اُٹھا کر فٹ پاتھ پر لے آیا۔ دُور دُور تک کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ ہر طرف ویرانی برس رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے نوشا کا نام اور پتہ معلوم کیا۔ اتفاق سے ایک خالی تانگہ آتا ہُوا نظر آیا۔ اُس نے تانگہ روکا۔ کوچوان کی مدد سے نوشا کو تانگے میں ڈالا اور خود بھی اُس میں سوار ہوگیا۔ تانگہ نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

سڑک کا راستہ تو تانگے میں اطمینان سے گزر گیا۔ لیکن گلی اتنی پتلی تھی کہ تانگہ اندر نہیں جا سکتا تھا۔ سلمان نے تانگہ والے کو کرایہ دیا اور نوشا کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر گلی کے اندر داخل ہوگیا۔ اندھیرے میں دو بار وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔

رات کا وقت اور اجنبی جگہ۔ سلمان کے لئے نوشا کے گھر کا پتہ لگانا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔ نہ جانے کتنی دیر اُسے اندھیری گلی میں بھٹکنا پڑتا۔ خوش قسمتی سے

محلّہ کا ایک آدمی مل گیا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھا اور اس وقت اپنی ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ اُس نے نوشا کا مکان بتا دیا۔ سلمان نے نوشا کو گھر کے دروازے پر لٹایا۔ اور ذرا دیر تک کھڑا ہانپتا رہا۔ وہ چھریرے جسم کا دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس قدر مشقت کا عادی نہ تھا۔ اُس کا سارا بدن پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

سلمان نے دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گھر کے اندر سب بے خبر سو رہے تھے۔

بہت دیر بعد آہٹ سے نوشا کی ماں کی آنکھ کھلی۔ اُس روز اُس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ لہٰذا خُود تو دروازے پر نہ جا سکی، اُس نے آواز دے کر سلطانہ کو بیدار کیا۔ وہ کچی نیند سے اُٹھی تھی، دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز سُنی تو ڈر کر ماں سے بولی۔

"اے امّاں! یہ اتنی رات گئے دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟"

ماں غصّہ سے بولی "ہو گا کون، وہی حرام خور ہو گا نوشا۔ ساری رات وہی تباہی گھومنے کے بعد اب لاٹ صاحب کو گھر کی سُوجھی ہے۔ جا بیٹی دروازہ کھول دے۔ ورنہ وہ کمبخت سونے بھی نہ دے گا۔"

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ آنگن میں پہنچ کر سردی کا احساس ہُوا تو جسم کپکپا کے رہ گیا۔ اوّل شب موسم خوشگوار تھا۔ مگر اب خنکی بڑھ گئی تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور گردن باہر نکال کر بولی۔

"نوشا! اے نوشا!"

سلمان بھونچکا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ سلطانہ گہری نیند سے اُٹھی تھی۔ اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی بھی نہ دیا۔ نوشا کی آواز نہ آئی تو وہ بولی "ارے کہاں چلا گیا، بولتا کیوں نہیں؟"

سلمان سے اب خاموش نہ رہا گیا۔ جلدی سے بولا "کار سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایکسیڈنٹ کا نام سُنتے ہی سلطانہ بدحواس ہو کر چیخی "ہائے اللہ"

اور تیزی سے بھاگتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی۔

ماں نے گھبرا کر پوچھا" ارے کیا ہو گیا ؟"

سلطانہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔" نوشا موٹر سے کچل گیا۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

ماں بھی چیخ مار کر رونے لگی۔ شور سُن کر انو جاگ اُٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت تک سلمان، نوشا کو ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کا جسم سلمان کے ہاتھوں پر بارش سے بھیگی ہوئی درخت کی کسی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔ سلمان نے نوشا کو دری پر لٹا دیا اور ماں بیٹی کو تسلی دینے لگا۔

" گھبرائیے نہیں، خدا نخواستہ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے۔ بال بال بچ گیا ہے۔"

دونوں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ اُن کو آنسو بہاتے دیکھ کر انو بھی منہ بسور کر رونے لگا۔ سامنے نوشا آنکھیں بند کئے بے سُدھ پڑا تھا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ لاش کی طرح خاکستری نظر آرہا تھا۔

سلمان نے پھر اُن کو ڈھارس دی۔" آپ اِس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ کندھے پر ذرا سا زخم آگیا ہے۔"

ماں نوشا کا سر زانو پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ بھی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ دونوں بے قرار ہو کر رو رہی تھیں۔ یہ بڑا المناک منظر تھا۔ سلمان سے زیادہ دیر دیکھا نہ گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔

" اب میں چلوں ؟ "

ماں اُس کو دُعائیں دینے لگی۔

سلمان کچھ نہ بولا۔ نوشا کی ماں کی دُعاؤں سے لدا پھندا باہر گلی میں آگیا۔

اور سیدھا اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر جب بستر پر لیٹنے لگا تو اُسے خیال آیا کہ گھر لے جانے کی بجائے وہ نوشا کو اسپتال کیوں نہ لے گیا۔ ممکن ہے چوٹ جسم کے اندرونی حصّوں میں آئی ہو۔ وہ دل گرفتہ ہو گیا۔ سوچنے لگا نہ جانے نوشا کی اب کیا حالت ہو۔ گھر میں کوئی ایسا مرد بھی نظر نہ آیا تھا کہ اگر رات میں طبیعت زیادہ گڑبڑ ہو جائے تو نوشا کو اسپتال لے جائے۔

یوں تو سلمان بڑا لاابالی نوجوان تھا۔ یہاں اس کا کوئی سرپرست بھی نہ تھا۔ تنہا رہتا تھا اور بڑی غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ ان طالب علموں کے زمرے میں شامل تھا، جو زمانۂ طالب علمی میں ہی زندگی کے بہت سے تجربات حاصل کر لیتے ہیں۔ فلش یا رمی کھیلنے پر آتا تو رات رات بھر کھیلتا رہتا اور ایک ایک پیسہ ہار جاتا۔ محفل جم جاتی تو کبھی کبھار شراب بھی پی لیتا۔ گھر سے جس روز منی آرڈر آتا تھا، اُس روز وہ کسی بالاخانے پر جاکر گانا ضرور سنتا تھا۔ مگر ان تمام کمزوریوں کے باوجود بڑا نرم دل بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔

صبح اُٹھتے ہی نوشا کے گھر پہنچا۔ نوشا کی ماں نے اُسے اندر بُلا لیا۔ کمرے میں جاکر اُس نے دیکھا نوشا ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ ماں نے بتایا کہ سویرے بہت تڑکے اُسے ہوش آیا تھا۔ بات چیت بھی کی تھی۔ اب طبیعت ذرا ٹھیک ہے۔

سلمان وہیں دری پر بیٹھ کر نوشا کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ سلطانہ کمرے کے باہر تھی۔ اُس نے کئی بار دروازے کی آڑ سے جھانک کر سلمان کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور برابر سگرٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سلطانہ نے انّو کو اشارہ سے قریب بُلایا۔ اُس نے کہا کہ پڑوس سے کرسی مانگ لائے۔ اُسے سلمان کا پتلون پہن کر فرش پر بیٹھنا بڑا بے تکا لگ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد انّو

کرسی لے کر آگیا۔ کرسی بوسیدہ تھی۔ اُس کا ایک پایہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کرسی کمرے کے اندر بھجوادی۔

نوشا کی ماں نے اصرار کر کے سلمان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ لمحہ بھر بعد اُس نے پہلو بدلا تو کرسی ڈگمگا کر اُلٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سلمان دھڑام سے فرش پر آرہا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ کمرے کے باہر سلطانہ کی ہنسی کی آواز اُبھر رہی تھی۔ سلمان جھینپ کر مسکرانے لگا۔

ماں بچوں کو خواہ مخواہ کوسنے لگی "خدا سمجھے ان کم بختوں کو اچھی بھلی کرسی توڑ ڈالی"۔ اُس نے کرسی اُٹھائی۔ دیوار سے ٹکائی اور سلمان کو اُس پر زبردستی بٹھا دیا۔ اس وقت وہ اس طرح چوکنا ہو کر کرسی پر بیٹھا تھا جیسے فوٹو کھنچوا رہا ہو۔ اب وہ عین دروازے کے مقابل بیٹھا تھا۔ کئی بار اُس نے سلطانہ کو دروازے سے جھانکتے ہوئے دیکھا اور کئی بار اس کی نظریں سلطانہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔

لگ بھگ آدھ گھنٹے تک نوشا کی ماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جب وہ چلنے لگا تو نوشا کی ماں نے بڑے اِصرار سے کہا "آئندہ بھی آتے رہنا"۔ اُس کے لہجے میں خلوص تھا، محبت تھی۔ دراصل سلمان اُسے بڑا شریف اور سعادت مند لڑکا معلوم ہوا تھا۔

○

فصلِ دوم

(۱)

سردی جا رہی تھی۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ درختوں میں پت جھڑ لگ چکا تھا۔ دن بھر تیز ہوائیں چلتیں۔ راستوں پر خزاں کے مارے ہوئے زرد پتے کھڑکھڑاتے۔ دھوپ کی تپش بڑھ گئی تھی۔ مگر راتیں بڑی سُہانی ہوتیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ چاند نکلتا تو در و بام آئینہ خانہ بن جاتے۔ شفاف چاندنی سے دل میں کسک اُٹھتی۔ کتنی ہی دبی ہوئی خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں۔

ایک ایسی ہی سُہانی رات تھی۔ نوشا کی ماں دالان میں سائبان تلے بیٹھی تھی۔ اُس نے سہ پہر کو غسل کیا تھا۔ دُھلے ہوئے اُجلے کپڑے پہنے تھے۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اُس نے ماں کا سفید دوپٹہ اُتار کر اپنا بسنتی دوپٹہ اوڑھا دیا۔

ماں نے احتجاج کیا۔ "اری لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے۔ لا میرا دوپٹہ تو

دے۔"

وہ ہنس کر بولی۔" اللہ قسم اماں یہ بسنتی دوپٹہ تو تم پر کھل گیا۔"

بات بھی ایسی ہی تھی۔ اُس کی ڈھلکی چھپی جوانی بسنتی دوپٹے میں جاگ اُٹھی تھی۔ باہر صحن میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ماں کا چہرہ دمک رہا تھا۔ جگمگا رہا تھا۔ یوں اُس کی عمر ایسی زیادہ نہیں تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ سال بھر بعد سلطانہ پیدا ہوئی، جو اب ۱۷ سال کے لگ بھگ تھی۔ اِس حساب سے اُس کا سِن ۳۲ سال کے قریب تھا۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد کچھ تو دُکھوں نے اُس کا حُلیہ بگاڑ دیا اور کچھ اُس نے اپنی وضع قطع بھی بڑی بوڑھیوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ورنہ ایک زمانہ میں وہ بڑی طرحدار عورت تھی۔ شوہر چاہنے والا ملا تھا۔ تھا تو کچہری میں محرر، مگر اُس نے کبھی بیوی کا دل میلا نہیں کیا۔ آدھی رات کو بھی اگر اُس نے کسی چیز کی فرمائش کی تو وہ اُسی وقت جاکر لے آتا۔ مگر اب اُسے مرے ہوئے پانچ سال ہوگئے تھے اور ان پانچ سالوں میں اُس کے سارے جتن ہوگئے۔ کون سی مصیبت تھی جو اُس نے نہیں جھیلی، کون سی پریشانی تھی جس سے اُس کا سابقہ نہیں پڑا۔

اوڑھنے کو تو اُس نے بسنتی دوپٹہ اوڑھ لیا۔ مگر ڈر رہی تھی کہ کسی محلے والے والی نے دیکھ لیا تو نکّو بن جائے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ رنڈاپا چھوڑ چھاڑ اب بننا سنورنا شروع کر دیا ہے۔ مارتے کا ہاتھ سب پکڑ لیتے ہیں، کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔ وہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز آگیا۔

اُس روز وہ بالکل چھیلا بن کر آیا تھا۔ سفید ململ کا کُرتا، اُس کے نیچے شربتی بنیائن، کھڑکھڑاتی ہوئی کلف دار لٹھے کی شلوار، ٹوپی بھی اُس نے اُتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے بالوں کو جمایا تھا، جن پر چپڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں چنبیلی کے پھولوں کا گجرا پڑا تھا۔ کان میں

عطر کا پھویا تھا۔ نیاز آکر بیٹھا تو سارا گھر مہکنے لگا۔ اُس وقت وہ تھا بھی بڑا خوش۔ نوشا کی ماں کو بسنتی دوپٹہ پہنے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔

"ارے آج تو آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا"

سلطانہ جو قریب ہی بیٹھی تھی، کہنے لگی" دولھا بھائی میں اُن سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا خاصا اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ جب دیکھو یہ نگوڑا موٹا سفید دوپٹہ سر سے منڈھے بیٹھی ہیں"

نیاز نے مڑ کر سلطانہ کو دیکھا۔ اُس کا حُسن سفید لباس میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی شگفتگی تھی۔ وہ اُس کی ہاں میں ہاں ہلانے لگا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے سلطانہ۔ خدا قسم! یہ دوپٹہ آپ پر بڑا اچھا لگ رہا ہے"

نوشا کی ماں شرما کر بولی" کیوں تم دونوں مل کر مجھے بنا رہے ہو"

سلطانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نیاز کو اُس کی یہ ہنسی بڑی اچھی لگی۔ وہ اُسے خوش کرنے کے لئے بولا" سلطانہ تم ان کو روز رنگین دوپٹے پہنایا کرو۔ ذرا دیکھو تو کیسی نچ رہی ہیں۔ بھئی اسی بات پر سب کا منہ میٹھا ہو جائے۔ وہ اُس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں۔ ابھی ابھی اُس نے چوری کے ۱۶ موٹر ٹائر فروخت کئے تھے، جس میں اُس کو کئی سو روپے کا منافع ہوا تھا۔ اُس نے اننو کو بلایا اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بولا۔

"ذرا لپک کر سیر بھر گرم گرم بالو شاہی تو لانا"

نوشا کی ماں نے بہت منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ ضد کر کے اننو کو مٹھائی لانے کے لئے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد اننو مٹھائی لے کر آگیا۔ نیاز نے بڑے اصرار سے نوشا کی ماں کو

خود اپنے ہاتھ سے ایک بالوشاہی کھلائی۔ پھر مٹھائی تقسیم کی گئی۔ سب خوش تھے۔ ہنس رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ گھر بھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ نوشا بھی اُسی وقت آیا تھا اور سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ آخر نوشا اور انو اپنے اپنے بستروں میں جا کر دبک گئے۔ تھوڑی دیر میں سلطانہ بھی جمائیاں لینے لگی۔ وہ جانے کے واسطے اُٹھی تو نیاز نے اس طرح دیکھا کہ اُس کی نظریں صاف کہہ رہی تھیں "کچھ دیر تو اور بیٹھو" مگر وہ اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ نیاز بار بار مڑ کر کمرے کی جانب تکتا رہا کہ شاید سلطانہ واپس آ جائے۔ مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔

نیاز ذرا دیر تک بجھا بجھا سا بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے سوچا چلو، آج لگے ہاتھوں سلطانہ کے ساتھ رشتے کی بات چھیڑ دی جائے۔ وہ اپنی گھریلو تکلیفوں کا رونا رونے لگا۔ ہوٹل کے خراب کھانے سے، گھر کے اکیلے پن تک، ساری باتیں سُنا ڈالیں۔ سلطانہ کی ماں چُپ چاپ اُس کی باتیں سُنتی رہی۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اس نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر کہا۔

"میرا کہا مانو تو تم اپنا گھر بسا لو۔ اس طرح کب تک تکلیفیں اُٹھاؤ گے۔"

نیاز یہی بات اُس کی زبان سے سُننے کا عرصہ سے خواہشمند تھا۔ اُس نے فوراً کہا "سوچ تو میں یہی رہا ہوں، مگر یہ میرا یہاں کون بیٹھا ہے جو کہیں سلسلہ چھیڑا جائے۔ لے دے کے ایک آپ کا گھر ہے جہاں چلا آتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی "کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟"

نیاز کے ذہن میں ایک بار یہ خیال اُبھرا کہ صاف بات کہہ دے، مگر ہچکچاہٹ کے باعث اپنی بات کہہ نہ سکا۔ اُس نے صرف اس قدر کہا "یہ تو آپ ہی کو سوچنا پڑے گا۔"

وہ اُس کی بات کا مطلب کچھ کچھ بھانپ گئی۔ کہنے لگی "بھئی میں کیا

کیا بتاؤں، اگر میری سلطانہ کچھ بڑی ہوتی تو میں خدا قسم اُس کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی۔"

نیاز کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ بوکھلا کر بولا۔ "آپ میری عمر کتنی سمجھتی ہیں؟"

وہ کہنے لگی۔ "یہ تو میں جانتی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سلطانہ کی اور تمہاری عمر میں آدھوں آدھ کا فرق ہوگا۔"

نیاز یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ "آپ بھی کمال کر رہی ہیں۔ اتنا فرق کیسے ہو سکتا ہے؟"

نوشا کی ماں بولی۔ "بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہیئے۔" وہ اُس وقت سب کچھ سُننے کو تیار تھا۔

سلطانہ کی ماں نے دبی زبان سے کہا۔ "سچ پوچھو تو سن میں تو دو چار سال مَیں تم سے چھوٹی ہوں گی۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ "جی"

وہ بتانے لگی۔ "میری عمر تم کیا سمجھتے ہو، تیس سے زیادہ نہ ہوگی۔" دو تین سال کی اُس نے اپنی طرف سے ڈنڈی مار دی تھی۔

نیاز نے اس دفعہ اُسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی ابھی تک خاصی جوان تھی۔ سر کے سارے بال سیاہ تھے اور بڑے سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش کا تیکھا پن گو کہ ماند پڑ چکا تھا، پھر بھی ان میں تازگی تھی۔ البتہ جسم ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کُولھے، جو کسی قدر پھیل گئے تھے۔ پھر بھی اُس میں ایک دلفریب سج دھج اور کشش تھی۔ نیاز نے اب تک اُس کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُسے صرف سلطانہ کی ماں کی حیثیت سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اُس وقت اُسے صرف ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا، اور وہ بھی ایک مرد کی نظر سے۔

سلطانہ کی ماں نے اُسے اِس طرح ٹٹولتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا تو شرما کر دوپٹہ سر پر سرکا لیا۔ پہلی بار اُس کو احساس ہُوا کہ وہ نیاز کے سامنے

شرما بھی سکتی ہے۔ اس احساس میں خوف تھا، لذت تھی۔ ایسی لذت جس سے وہ ناآشنا نہیں تھی اور جیسے وہ تھپک کر سُلا چکی تھی۔ اُس نے اپنے جسم کے اندر پسینے کی نمی محسُوس کی، وہ گھبرا رہی تھی، اور اس گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے اُس نے جلدی سے پاندان کھول کر پان لگایا اور نیاز کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے، لو پان کھاؤ۔"

نیاز نے ہاتھ بڑھا کر پان لیا۔ دونوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے سے مَس ہوئیں۔ نوشا کی ماں کا ہاتھ کپکپایا اور پان نیچے گر پڑا۔

دونوں چونک کر ایک ساتھ بولے "ارے"

دونوں خاموش ہو گئے۔ اور کئی منٹ تک چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ چاندنی اور نکھر گئی تھی۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی اور نیاز کی کلائی میں پڑے ہوئے گجرے کے پھُول مہک رہے تھے۔ اچانک کمرے کے اندر لیمپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی، جہاں گھُپ اندھیرا تھا۔

جتنی دیر وہ کمرے کے اندر رہی، یہ تمام وقت نیاز نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ کیا وہ اُٹھ کر یہاں سے چُپ چاپ چلا جائے؟ کئی سوال اُس کے ذہن میں اُبھر اُبھر کر غوطے لگا رہے تھے۔ اُجلی چاندنی باہر صحن میں بکھری ہوئی تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور چنبیلی کے پھُول مہک رہے تھے۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ نیاز نے گردن مُڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی۔ نیاز کی نظریں برابر اُس کے جسم کے پیچ و خم پر منڈلاتی رہیں۔ مگر جب وہ اُس سے ہٹ کر دُور بیٹھنے لگی تو نیاز کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہاں میرے قریب آ جائیے!"

وہ کھسک کر اُس کے قریب ہو گئی۔ مگر نظر اُٹھا کر نہ دیکھا۔ دونوں چُپ چاپ

بیٹھے رہے۔ اُجلی چاند کے جھلکتے ہوئے عکس میں، دونوں دالان کی تنہائی میں گُم صُم بیٹھے تھے۔ نیاز نے پھولوں کا گجرا ہاتھ سے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ لمحہ بھر تک وہ اُس کے ساتھ اُنگلیوں سے کھیلتا اور برابر سوچتا رہا کہ کیا بات کرے۔

پھر کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "بہت رات ہوگئی۔" اُس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

نیاز کہنے لگا: "گیارہ بجے ہوں گے۔"

دونوں پھر خاموش ہوگئے۔ یہ خاموشی بڑی ہیجان خیز تھی۔ نیاز نے گھبرا کر انگڑائی لی۔ اُسے غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا: "ذرا اور قریب آجاؤ۔" اور وہ خود اُس کی طرف جُھک گیا۔ وہ کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ گئی۔

نیاز نے اُس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہا: "یوں نہیں یوں" اور اُسے اپنی جانب کر لیا۔

اندر کمرے میں سُلطانہ اور اُس کے دونوں بھائی گھُپ اندھیرے میں بےخبر سو رہے تھے۔

نیاز بہت تڑکے اُٹھ کر نوشا کے گھر سے چلا گیا۔ رات کے حادثے کی یادگار گجرے کے مَسلے ہوئے پھول رہ گئے تھے، جو دالان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

اب اکثر ایسا ہوتا کہ نیاز سرِ شام نوشا کے گھر آجاتا۔ رات گئے تک بیٹھا باتیں کیا کرتا اور علی الصبح اُٹھ کر چُپکے سے چلا جاتا۔ لیکن سلطانہ ابھی تک اُس کی نظروں میں چڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ ماں اور بیٹی جب ساتھ بیٹھی ہوتیں تو ماں اُس کو بھدی اور بدوضع معلوم ہوتی۔

موقعہ مِل جاتا تو نیاز سُلطانہ سے ہنس کر بات بھی کر لیتا۔ مگر ماں اب

اُس کی کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ کسی وقت بھی اُس کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ذرا ذرا سی بات بات پر سختی سے ڈانٹ دیتی۔ نیاز کی موجودگی میں سلطانہ کا بیٹھنا دوبھر ہو جاتا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ نیاز سلطانہ کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کسی رشتہ دار کے یہاں کوئی تقریب تھی۔ ماں اور بیٹی ذرا دیر پہلے وہاں سے لوٹی تھیں۔ سلطانہ ابھی تک اپنا ریشمی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اُس کی خوب صورتی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ وقار جھلک رہا تھا۔ نیاز کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی اُس وقت اپنی دل کشی کا پورا پورا احساس تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود اُس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا اور وہیں ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی رہی۔

نیاز نے ایک بار نظر اُٹھا کر دیکھا تو سلطانہ کی نگاہیں بھی اُس کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی، وہ بھی مُسکرا دیا۔ ماں سر جھکائے پان لگا رہی تھی۔ اچانک اُس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔ اُس نے سلطانہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ قہر آلود نظروں سے اُسے گھورا۔ ڈانٹ کر بولی۔

"جا اندر جا کر بیٹھ، جب دیکھو سر پر سوار ہے۔"

سلطانہ اِترانے لگی۔" ابھی نیند نہیں آرہی ہے۔"

ماں نے غصّے سے کہا" جاتی ہے کہ نہیں۔" پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر غصّے سے کھینچتی ہوئی کمرے کے اندر لے گئی۔ اُس نے سلطانہ کے رخسار میں زور سے چٹکی بھر کر دبی زبان سے کہا" حرامزادی مَیں تیرے سب کرتُوت جانتی ہوں۔" سلطانہ منہ بسُور کر رہ گئی۔

ماں کے انداز میں جذبۂ رقابت صاف جھلک رہا تھا۔ یہ بات سلطانہ نے

تو محسوس نہیں کی۔ البتہ نیاز کو اس کا شدت سے احساس ہوا۔

دوسرے ہی دن سے نیاز محسوس کرنے لگا کہ سلطانہ اب اُس کے سامنے آتے ہوئے کتراتی تھی۔ کمرے کے اندر سے کبھی کبھار صرف اُس کے بولنے کی آواز آجاتی۔ اُس نے ایک آدھ بار باتوں باتوں میں ماں سے سلطانہ کا ذکر کیا تو وہ بے رُخی سے ٹال گئی۔ نیاز کے ذہن میں اچھی خاصی اُلجھن پیدا ہو گئی۔ کئی روز اسی اُلجھن میں گزر گئے۔

ان ہی دنوں ایک روز نیاز خلافِ توقع دن کے وقت نوشا کے گھر چلا گیا۔ دس ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ ماں کی طبیعت خراب تھی۔ وہ انو کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ نوشا ورکشاپ جا چکا تھا۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی۔ نیاز نے ماں کو غیر حاضر پایا تو سیدھا سلطانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اُسے اپنے رُوبرُو دیکھ کر گھبرا گئی۔ نیاز نے سب سے پہلی بات جو اُس سے پوچھی وہ یہ تھی۔

"اب تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ ہر وقت کمرے کے اندر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟"

اُس نے صاف صاف بتا دیا۔ "اماں نے آپ کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے۔"

نیاز کے ذہن کو زبردست دھچکا لگا۔ گھبرا کر بولا "کیوں؟"

اُس نے سادگی سے جواب دیا۔ "اُنھوں نے کہا ہے کہ دُولھا بھائی سے پردہ کیا کرو۔"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی سلطانہ نے اُس کے سامنے آنا بند کر دیا۔ اچانک اُس نے سلطانہ کی ماں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر اُس نے محبت بھری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولا "سلطانہ!"

وہ آہستہ سے بولی۔ "جی"

چند ثانیے کے لئے دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلطانہ کی گھبرائی ہوئی آواز اُبھری۔ "آپ جائیے۔ اماں آتی ہوں گی۔ آپ کو یہاں دیکھ لیا تو مصیبت آجائیگی۔"

نیاز نے سوچا واقعی ان حالات میں اُس کا وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ وہ فوراً باہر آگیا۔ اُسے رہ رہ کر سلطانہ کی ماں پر غصّہ آرہا تھا اور اُس کے ساتھ ہی سلطانہ کو حاصل کر لینے کی تمنّا شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ اسی اُدھیڑبن میں دکان کی جانب جارہا تھا کہ راستے میں کالے صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

کالے صاحب نے ملتے ہی کہا "مسٹر نیاز! بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو، کیابات ہے؟"

نیاز نے ٹالنا چاہا تو کالے صاحب اُس کے سر ہوگیا۔ "میں کہتا ہوں تم اپنی لائف انشور کرالو، کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔"

نیاز اس وقت جھنجلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ "کالے صاحب تمہیں ہر وقت بیمہ ہی کرانے کی پڑی رہتی ہے۔ نہ وقت دیکھتے ہو نہ موقع۔ ہر وقت سالا بیمہ تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے۔" کالے صاحب ہنسنے لگا۔ ناراض ہونا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اس قدر کامیاب انشورنس ایجنٹ نہ ہوتا۔

"ارے تم تو ناراض ہوگئے۔ آؤ میں تم کو چائے پلاؤں۔" کالے صاحب نرمی سے بولا۔ مگر نیاز اُس کے ہمراہ جانے پر رضامند نہ ہوا۔

کالے صاحب اصرار کرنے لگا۔ "بیمہ نہ کراؤ مگر میری چائے تو پی لو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ نیاز کو گھیر گھار کر قریب کے ایک چائے خانے میں لے گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مگر بیمہ کا ذکر کئے بغیر کالے صاحب زیادہ دیر تک خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آگیا۔ کہنے لگا۔

"زندگی میں گارنٹی بہت بڑی چیز ہے اور وہ صرف انشورنس سے ملتی ہے۔ تم تجربہ کے لئے دو ہزار کی پالیسی لے کر دیکھو، پھر خود ہی اُس کے فائدے جان لوگے۔"

نیاز نے سنجیدگی کے ساتھ بیمہ کرانے کے بارے میں نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اب اس کا ارادہ تھا۔ اُس نے صرف کالے صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔"دیکھو کالے صاحب۔ بیمہ ویمہ تو میں کراؤں گا نہیں، البتہ کوئی ایسی ترکیب تم کو معلوم ہو تو بتاؤ جس سے سال سوا سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم مل جائے۔"

کالے صاحب کہاں میدان چھوڑنے والا تھا، بڑی سنجیدگی سے بولا۔"اس کا بھی ایک ہی طریقہ ہے۔ انشورنس اور صرف انشورنس۔ اپنے کسی بچّے یا وائف کا بیمہ کرادو۔ اگر سال بھر کے اندر وہ فوت ہو گیا تو پچاس ہزار کیا اگر تم ایک لاکھ کی بھی پالیسی لوگے تو تم کو کمپنی اتنا ہی روپیہ دے گی۔"

نیاز سوچ میں پڑ گیا۔ کالے صاحب سمجھا کہ وہ اُس کی باتوں پر ناراض ہو گیا لہٰذا معذرت کرنے کے انداز سے بولا۔"دیکھو بھئی اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ انشورنس ایجنٹ موت اور زندگی کی بات ہمیشہ ڈاکٹر کی طرح صاف صاف کرتا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔"یہ بات نہیں۔ در اصل مَیں اس وقت ایک پریشانی میں ہوں۔ بات یہ ہے!" نیاز آگے کچھ اور کہتا مگر کالے صاحب نے اُس کو بات بھی پوری نہ کہنے دی۔ لگا اپنی ہانکنے۔"میں تمہاری پریشانی خوب جانتا ہوں۔"

نیاز نے گھور کر اُسے دیکھا اور چائے کا گھونٹ پی کر سوچنے لگا۔ یہ کالے صاحب بھی عجیب مسخرا ہے، میری پریشانی، یہ کیا جانے! مگر کالے صاحب قطعی کاروباری موڈ میں تھا۔ اُس نے دیکھا شکار پھنس رہا ہے، اب اس کو نکلنے نہ دو۔ یہیں گردن دبوچ لو کہ پھڑپھڑا بھی نہ سکے۔ وہ جوش میں آکر بولنے لگا۔"دیکھو مسٹر نیاز آگے کا حال کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کیا ہے؟" یہ بات تو خود کالے صاحب

کو بھی نہیں معلوم تھی۔ بات بات کہتے لمحہ بھر کے لئے وہ اُلجھا کہ اب کیا کہے۔ پھر اُس نے میز پر رکھی ہوئی چینی کی پلیٹ اُٹھالی اور اُسے نیاز کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"زندگی کی مثال اس پلیٹ کی طرح ہے۔ اِس پلیٹ کو اُٹھاتے ہوئے تم ڈرو گے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن اگر اس کا بیمہ ہو چکا ہے تو ڈر کی بات نہیں۔ اس کی قیمت تو تمہاری جیب میں ہے۔ تم اِس کو یوں اُٹھا کر پھینک سکتے ہو۔"

اور کالے صاحب نے واقعی پلیٹ اُٹھا کر اُچھال دی۔ وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ پلیٹ کے ٹوٹنے کا چھناکا ہُوا تو کالے صاحب بھی چونکا کہ یہ اُس نے کیا کر دیا۔ چائے خانے میں ذرا دیر کے لئے سنسنی پھیل گئی۔

ایک بیرا لپک کر اُس کے پاس آیا۔ پوچھنے لگا: "صاحب آپ نے پلیٹ کیوں توڑ ڈالی؟"

کالے صاحب بڑا چکرایا۔ پھر کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ نیاز کو بھی ہنسی آگئی۔ بیرا کہنے لگا: "ساب ہنسی کی بات نہیں، دو روپیہ ڈنڈ بھرنا پڑے گا۔"

ہوا بھی یہی۔ چائے کے بل کے ساتھ کالے صاحب کو پلیٹ کے بھی دو روپے دینا پڑے۔ اس دو روپے کی چپت سے کالے صاحب کی ساری تیزی رفو چکر ہو گئی۔ بھیگی بلّی کی طرح مری ہوئی آواز سے کہنے لگا: "مسٹر نیاز! اب کہاں تم سے مُلاقات ہو گی؟"

"آج کے دن سے پہلے اگر کالے صاحب یہ بات نیاز سے پوچھتا تو وہ جل کر کہتا "جہنم میں" مگر اب وہ واقعی کالے صاحب سے بیمہ کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا: "پرسوں سہ پہر کو آجاؤ، اُس وقت کام

بھی نہیں ہوتا۔ اطمینان سے بات ہوگی۔"
دوبارہ ملنے کا پروگرام طے کر کے دونوں اپنے اپنے راستے پر چل دئے۔
دکان پر پہنچ کر کانے صاحب کی باتوں پر نیاز دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو صرف روپیہ پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُسی کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک روز چپ چاپ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔
نیاز نے سوچا کہ اگر بیمے کے ذریعے سال، دو سال میں چالیس پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگ جائے تو مزا آجائے۔ بات کچھ سمجھ میں بھی آتی تھی۔ لیکن اس کے لئے پہلے ایک عدد بیوی کی ضرورت تھی۔ سوچتے سوچتے اُس نے ایک اسکیم تیار کی اور اُس روز معمول سے کچھ پہلے نوشا کے گھر پہنچ گیا۔
سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی آواز اُبھرتی تو نیاز کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ نوشا کی ماں کی ہر بات اُس کو زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ اُس وقت نیاز کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کر پڑوس کی ایک عورت کا قصہ سُنا رہی تھی، جس کی شلوار میں چوہیا گھس گئی تھی۔
جب پہر رات گزر گئی اور گھر پر گہرا سناٹا چھا گیا تو نیاز نے خلوت میں اُس سے بڑے پیار سے کہا" اس طرح کب تک یہ چوری چھپے کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ میرا تو اب تمہارے بغیر ایک گھڑی جی نہیں لگتا۔"
وہ مسکرا کر بولی " دن میں گھڑی، دو گھڑی کو چلے آیا کرو۔"
وہ کہنے لگا" میں تو کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک روز قاضی کو بُلوا کر دو بول پڑھوا لئے جائیں۔ اللہ رسول بھی خوش اور دنیا کا خوف بھی نہیں۔"
سلطانہ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی۔ مگر اُس کے اپنے پروگرام کے مطابق ابھی اس نیک کام کا وقت نہیں آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ اُسے نیاز کی نیت پر

شُبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی پہلے سلطانہ کا کسی کے ساتھ بیاہ کر دے۔ لہٰذا اُس نے نیاز کی بات خوش اسلوبی سے ٹال دی۔

(۲)

سہ پہر کا وقت تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ سلمان کہیں سے تھکا ہارا آ رہا تھا۔ راستے میں اُس کی اتو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ گھر نزدیک تھا۔ وہ اصرار کر کے سلمان کو گھر لے آیا۔ ماں نے اندر بُلا لیا۔

سلمان ان دنوں پریشانیوں میں گھرا ہُوا تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں مگر اس دفعہ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ باپ اُس سے ناراض تھا۔ ہر ماہ کے اخراجات کے لیے جو رقم گھر سے آتی تھی وہ بھی بند کر دی گئی تھی۔ وہ پیسے پیسے کو محتاج تھا۔ اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے۔ صحت خراب ہو گئی تھی۔ چہرہ بیماروں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔

نوشا کی ماں نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو تعجب سے پُوچھا "کیا تم بیمار پڑ گئے تھے؟"

وہ صاف جھُوٹ بول گیا "جی ہاں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔"

"جب ہی تو میں کہوں کہ تم اُس روز کے بعد سے آئے کیوں نہیں۔"

سلمان کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے جانے لگا تو نوشا کی ماں نے اُسے روک لیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ وہ تھی بھی کچھ باتونی عورت، اور اُس روز تو اُس پر باتوں کا دَورہ پڑا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سُناتی رہی۔ سلمان خاموشی سے بیٹھا اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ اس عرصہ میں کئی بار دروازے پر سلطانہ کی جھلک نظر آئی۔ سلمان جو ماں کی بے سروپا باتوں سے اُکتا گیا تھا، سلطانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ ماں کی نظریں بچا کر اُس کی جانب بھی دیکھ لیتا۔

سلمان نے سوچا، لڑکی خوب صُورت ہے، الھڑ ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اُس کی ذات میں دلچسپی بھی لے رہی ہے۔ یہ احساس خود اپنی جگہ کم کشش انگیز نہیں تھا۔ ان دنوں وہ پریشانیوں میں گھرا ہُوا تھا۔ اُس کو پناہ کی ضرورت تھی۔ ذہنی فرار کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کمرے کے اندر گرمی اور حبس کے باوجُود دیر تک بیٹھا نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔

دن ڈھلنے لگا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ نوشا کی ماں کسی ضرورت سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے میں وہ تنہا رہ گیا تھا اور اس تنہا کمرے میں سلطانہ کے جوان جسم کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک میں ایک لذّت اور وارفتگی تھی، جس کو وہ چپ چاپ بیٹھا محسُوس کر رہا تھا۔

شام کا دُھندلکا اُفق کی سیڑھیوں سے اُترتا ہُوا در و دیوار پر پھیل گیا۔ گلی کی چہل پہل بڑھ گئی۔ گھروں کے اندر بچوں کا شور اُبھرنے لگا۔ موسم گرما کی یہ ایک ایسی شام تھی جس کی گہما گہمی کو وہ صرف آوازوں سے محسُوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں میں سلطانہ کی بھی آواز شامل تھی۔ وہ خواہ مخواہ اِٹھلا اِٹھلا کر اس طرح بول رہی تھی جیسے اُسے بخوبی احساس تھا کہ کوئی اُس کی آواز سُن رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آگیا۔ کھانے میں خاصا تکلّف کیا گیا تھا۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ کھانا اُس کو پسند آیا اور اُس نے تعریف بھی کی۔ نوشا کی ماں اِصرار کر کے ایک ایک چیز کھلاتی رہی۔ اُس کی یہ شام بڑی مزے دار گزری۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر وہاں پہنچا۔ نوشا کی ماں اس روز بھی بڑی محبت سے پیش آئی۔ باتوں باتوں میں نوشا کے باپ کا ذکر آگیا۔ وہ ایک لمبی چوڑی داستان سُنانے لگی۔ نہ جانے وہ کب تک اس قصّے کو جاری رکھتی، اِسی اثناء میں کسی نے آکر اطلاع دی کہ سامنے والی گلی میں جو منشی جی رہتے تھے، اُن کا اِنتقال ہوگیا ہے۔ اُن کے گھر سے نوشا کی ماں کے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ

جذباتی قسم کی عورت تھی۔ اس خبر کے سُنتے ہی بدحواس ہو گئی۔ اُس نے سلمان سے بات بھی نہیں کی اور فوراً منشی جی مرحوم کے گھر کی طرف چل دی۔

کمرے میں اب سلمان کے پاس نوشارہ گیا تھا اور کمرے کے باہر سلطانہ تھی جو کھانا پکانے میں مشغول تھی۔ وہ نوشا سے باتیں کرنے لگا۔ اب زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ اُس نے جانے کا قصد کیا تو سلطانہ نے خود دروازے پر آکر کہا۔

"کھانا کھا کر جائیے گا۔ امّاں تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔"

وہ دروازے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ صاف چھُپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والی کیفیت تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں جھک گئیں اور سلمان نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نیاز آیا تھا۔ پہلے تو سلطانہ گھبرا گئی کہ کیا کرے۔ پھر اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اُسے گھر کے اندر نہ بُلائے اُس نے نوشا کو قریب بُلا کر کہا: "دُولہا بھائی سے کہہ دو۔ امّاں گھر میں نہیں ہیں۔ آپ رات کو آئیے گا۔ اُس وقت تک وہ واپس آجائیں گی۔"

نیاز نے نوشا کی زبانی یہ بات سُنی تو تلملا کر رہ گیا۔ سلطانہ پر تو اُس کو ذرا شبہ نہ ہوا۔ البتہ اُس کی ماں پر سخت غصّہ آیا۔ اُس نے سوچا گھر سے جاتے ہوئے وہ سلطانہ کو منع کر گئی ہو گی۔ وہ جھنجھلایا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

نوشا دیر سے باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ دیکھا موقعہ غنیمت ہے۔ وہ بھی وہاں سے کھسک گیا۔ کمرے میں سلمان تنہا رہ گیا تھا۔ اس تنہائی نے اُسے شدید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ اب گھر میں وہ تھا اور سلطانہ تھی۔ اُن کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی اور اس دیوار میں ایک دروازہ تھا، جس کا ایک پٹ

کھلا تھا۔ شام کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آرہے تھے۔ لیمپ کی لَو بار بار بھڑک اُٹھتی۔

ایک بار سلطانہ دروازے کے سامنے سے گزری۔ دوبارہ گزری۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ کمرے کے اندر بھڑکتی ہوئی لَو جیسے بار بار کہہ رہی تھی:

"کچھ ہونے والا ہے۔"

"کچھ ہو کے رہے گا۔"

اچانک گہری خاموشی میں شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا۔ سلمان چونک پڑا۔ کمرے کے باہر شیشے کا کوئی برتن گر کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ چھناکا کچھ اس طرح گونجا کہ سلمان کو گھبرا کر پوچھنا پڑا۔

"کیا ہو گیا؟"

باہر سے سلطانہ کی آواز اُبھری۔ "کچھ نہیں چوہوں نے طاق سے گلاس گرا دیا تھا۔"

"چوٹ تو نہیں آئی؟" سلمان نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کی آواز سُن کر سلمان کو اپنے سوال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔

کچھ اور وقت خاموشی میں گزر گیا۔

سلمان نے خاموشی سے اُکتا کر اونچی آواز میں کہا۔ "یہ نوشا کہاں چلا گیا؟" سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلمان کو سخت کوفت ہوئی۔

ذرا دیر بعد باہر لان میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ سلطانہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا؟"

وہ بولا۔ "جی ہاں! دیواروں سے تو میں باتیں کرنے سے رہا۔"

"ارے!" وہ بے پرواہی سے ہنسنے لگی۔
سلمان کہنے لگا۔"اب میں چلوں گا۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
وہ شوخی سے بولی۔" اکیلے کمرے میں آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا ہے ؟"
کالج کا کھلنڈرا نوجوان شرارت پر اُتر آیا۔ کہنے لگا۔" بات کچھ ایسی ہی ہے۔"
اِس دفعہ سلطانہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
سلمان کہنے لگا۔" ایسا کیجئے آپ یہاں کمرے میں آ کر بیٹھ جائیے اور میں کھانا تیار کروں گا۔"
وہ بولی۔" واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
" ایسا فرسٹ کلاس کھانا تیار کروں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔"
" کہاں سیکھا آپ نے ؟"
وہ بولا۔" باقاعدہ امتحان پاس کیا ہے۔"
وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔" اچھا تو کھانا پکانے کا بھی امتحان ہوتا ہے۔"
سلمان نے کہا۔" بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔"
دونوں باتیں کرتے کرتے بالکل آمنے سامنے آ گئے تھے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر سلطانہ شرما گئی اور دروازے کی اوٹ میں چھپنے لگی۔ سلمان نے فوراً کہا۔
"اب کیا کیجئے گا پردہ کر کے۔"
سلطانہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔"اُوں ہُوں۔" پھر اُس نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔" اماں ناراض ہوں گی۔"
سلمان مسکرانے لگا۔" اُن کے سامنے پردہ کر لیا کیجے۔ ٹھیک ہے نا۔"
وہ کمرے سے باہر نکل کر اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ نے

اُسے اپنے رُوبرُو اس طرح پایا تو گھبرا کر بولی۔

"ہائے اللہ!"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھُپا لیا۔ سلمان کو اُس کی یہ ادا بھا گئی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے سلطانہ کے شانے پر اپنا ہاتھ اس طرح رکھ دیا، جیسے وہ دہکتی ہوئی انگیٹھی تھی، جس سے اُس کا ہاتھ جھلس کر رہ جائے گا۔ سلطانہ کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ سلمان نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

ذرا دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ سلمان کسی نامعلوم خوف سے گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔ "مجھے اب چلنا چاہیئے۔" اُس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہُوا گھر کے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ کیا کہے۔

نوشا کے گھر سے نکلا تو اُسے بھُوک نے ستانا شروع کر دیا۔ آج بھی صبح سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ نہ اُس کی جیب میں کوئی پیسہ تھا اور نہ کہیں سے کوئی رقم ملنے کی اُمید تھی۔ اُس کے پاس ایک گھڑی رہ گئی تھی جسے وہ کئی روز سے فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ راستے میں نیاز کی دکان پڑتی تھی۔ وہ جھجکتا ہُوا دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دکان میں لالٹین روشن تھی۔ اُس کی پیلی پیلی روشنی میں نیاز خاموش بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر بولا "کہیئے؟"

سلمان گھبرایا ہُوا تھا، کہنے لگا "میں یہ گھڑی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

نیاز نے گھڑی لی۔ اُلٹ پُلٹ کر دیکھی۔ کان کے پاس لے جا کر اندازہ لگایا کہ آیا گھڑی چل رہی ہے یا بند ہے۔ جب وہ اس کو اچھی طرح دیکھ بھال چکا تو کہنے لگا۔

"آپ ہی کی ہے نا؟"

سلمان کو اس بے تکے سوال پر حیرت بھی ہوئی، کچھ تاؤ بھی آیا۔ جی چاہا کہ

جواب دے۔ "جی نہیں چوری کی ہے" مگر وہ جھگڑنے نہیں آیا تھا، گھڑی فروخت کرنے آیا تھا۔ اُس نے صرف اس قدر کہا۔

"جی ہاں میری ہی ہے۔"

نیاز طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اگر آپ کی نہیں بھی ہے، تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔"

سلمان تیزی سے بولا۔ "جی ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ناراض نہ ہوں۔ میں نے مان لیا کہ آپ ہی کی ہے۔" نیاز بدستور مسکراتا رہا۔

سلمان نے پوچھا۔ "آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں؟"

نیاز بڑی بے نیازی سے بولا: "خرید لوں گا۔ ویسے عام طور پر میں ایسی چیزیں خریدتا نہیں۔ یہ مشینری کا معاملہ ہے۔ اِس میں بڑی چارسو بیس ہوتی ہے۔"

سلمان سوچنے لگا۔ عجیب نامعقول آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ اُلّو کا پٹھا خواہ مخواہ ایک کے بعد دوسرا الزام عائد کرتا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں۔"

نیاز نے سلمان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ کہنے لگا۔ "صورت سے تو آپ بھلے مانس لگتے ہیں۔" لمحہ بھر وہ خاموش رہا۔ اُس کی یہ خاموشی سلمان کو بیحد شاق گزری۔ جی چاہا کہ گھڑی واپس لے لے۔ دو تین موٹی موٹی گالیاں دے کر دکان سے چلا جائے۔

نیاز نے کہا۔ "اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ یہ کیسے لے گیا؟"

سلمان نے کہا۔ "یہ اُمیگا واچ ہے۔ میں نے اِسے ۳۲۵ روپے میں خریدا تھا۔"

نیاز خالص کاروباری لہجہ میں بولا" ۳۲۵ میں تو آپ نے اس کو خریدا تھا۔ چار پانچ سال سے استعمال بھی کر رہے ہوں گے۔ اِس سے کم تو پُرانی نہیں لگتی۔"

"جی ہاں کوئی چار سال تو اسے خریدے ہوئے ہو گئے۔"

وہ ہنس کر بولا" یوں سمجھئے اس کی قیمت تو آپ نے وصُول ہی کر لی۔"

سلمان نے جلدی سے کہا" نہیں صاحب۔"

نیاز نے بات کو زیادہ طول نہ دیا۔ سیدھی سیدھی معاملہ کی بات کی۔" میں تو اس کے پچاس روپے سے زیادہ نہ دوں گا۔ جی چاہے تو گھڑی رکھ جائیے اور نہ روپے لیتے جائیے۔"

سلمان پچاس روپے پر گھڑی فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔

بڑی مشکل سے نیاز نے پندرہ روپے اور بڑھائے۔ سلمان کو گھڑی بیچتے ہوئے دُکھ تو بہت ہوا مگر اس کے بغیر چارۂ کار بھی نہ تھا۔ اُس نے نیاز سے ۶۵ روپے لے کر جیب میں ڈالے اور دکان سے باہر جانے کے لئے مُڑا۔ نیاز نے ٹوک کر کہا۔ آئندہ بھی کسی چیز کو فروخت کرنے کا ارادہ ہو تو یہیں آجایا کیجئے۔ انشاء اللہ دوسری جگہ کے مقابلہ میں آپ یہاں سے خوش جائیں گے۔"

سلمان نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔" بہت اچھی بات ہے۔" وہ دکان سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

رات سُہانی تھی اور سلمان کی جیب میں ۶۵ روپے پڑے تھے۔ عرصے سے دبی ہوئی خواہشیں اچانک جاگ اُٹھیں۔ وہ سیدھا ایک بار میں گیا۔ بیئر کی دو بوتلیں چڑھائیں۔ ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ حسب معمول وہاں رمی ہو رہی تھی۔ سلمان بھی جاکر شامل ہو گیا۔

سنیچر کی رات تھی۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ لہذا تمام رات کھیل ہوتا رہا۔ اُس روز سلمان کا ستارہ عروج پر تھا۔ جیسے کارڈ اُس نے چاہے، ویسے ہی ملے۔

دو آنے پوائنٹ سے کھیل رہا تھا۔ سلمان کے وارے نیارے ہوگئے۔

جب وہ رمی کھیل کر اُٹھا تو مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سرمئی دُھند پھیلی تھی۔ سلمان کی جیب میں کچھ اُوپر تین سو روپے تھے اور آنکھیں شب بیداری سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

تمام دن وہ کمرے میں پڑا بے خبر سوتا رہا۔ کمرے کی ہر چیز اُس کی زندگی کی طرح بے ترتیب تھی۔ وہ دن ڈھلے نوشا کے گھر کی طرف جانے کے ارادے سے نکلا۔ راستے میں اکبر مل گیا۔ وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ دونوں نے بار میں جا کر کئی گلاس بیئر کے پیئے اور وہیں یہ پروگرام بنا کہ کسی عشوہ ساز اور البیلی طوائف کا گانا سُنا جائے۔

دونوں نے کئی بالاخانوں کے چکّر کاٹے۔ آخر ایک گانے والی اُن کو پسند آئی۔ گانا تو وہ کچھ واجبی سا جانتی تھی۔ مگر آواز ایسی رسیلی تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ سن بھی زیادہ نہیں تھا۔ اداؤں میں الّھڑپن تھا۔ ایک ایک بول کے ساتھ یوں بھاؤ بتاتی تھی کہ آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی۔

سلمان کو وہ سانولی سلونی طوائف کچھ اس قدر بھا گئی کہ کئی گھنٹے تک بیٹھا گانا سنتا رہا۔ شروع میں کچھ دوسرے تماش بین بھی موجود تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب چلے گئے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔ سلمان کی فرمائش پر طوائف ایک ٹھمری گا رہی تھی:

تم بن نا ہیں آوت چین

اب اُس نے پیروں میں گھنگھرو باندھ لئے تھے اور آہستہ آہستہ ناچتی بھی جا رہی تھی۔ ٹھمری کے بول اُونچے اُٹھتے گئے۔ ناچ تیز ہوتا گیا۔ طبلچی جھوم جھوم کر ٹھیکہ دے رہا تھا۔ طوائف کے جسم میں یوں پیچ و خم پیدا ہو رہے تھے کہ

سلمان کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لہراتی ہوئی قریب آتی تو وہ بے تاب ہو کر گہری سانس بھرتا۔ جھک کر اکبر کے کان میں کہتا۔

"یار ہم تو قتل ہو گئے۔"

"بڑی زور دار لونڈیا ہے۔"

ناچ اور ٹھمری کے پھڑک دار بولوں نے سلمان کو وارفتہ کر دیا تھا۔ وہ بے قابو ہو کر چیخ چیخ پڑتا۔

"ہائے کیا بات ہے، میری جان!"

"ہے جیو۔ جُگ جُگ جیو۔"

"ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا ئیں۔"

عین ہنگام طرب ایک بھدّا اور بے ڈول شخص دروازے پر نمودار ہُوا۔ اُس کی گھنی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں اُلّو کی طرح گول گول تھیں۔ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وضع قطع سے بھڑوا لگتا تھا۔ اندر آ کر اُس نے دونوں کو غور سے دیکھا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سلمان بھی اُسے بھڑوا ہی سمجھا۔ بے تکلفی سے مخاطب ہُوا۔

"اماں کچھ شراب وراب کا بھی بندوبست کراؤ گے۔"

اُس نے سلمان کی جانب تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر طوائف سے کہا۔

"بند کرو جی یہ ناچ واچ۔ بس ہو چکا مجرا۔"

طوائف نے فوراً ناچ بند کر دیا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر ایک طرف کھسک کر بیٹھ گئی۔

سازندے بھی خاموش ہو گئے۔ سارنگیا، سارنگی پہ غلاف چڑھانے لگا۔ طبلچی ہتھوڑی لے کر طبلوں کو ٹھونکنے لگا۔ سلمان کو سخت طیش آیا۔ وہ سو روپے سے زائد خرچ کر چکا تھا اور جب محفل رنگ پہ آئی تو اس نامعقول آدمی نے جو ہر طرف سے بھڑوا لگتا تھا، رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

سلمان نے تیکھے لہجے میں پوچھا "آپ یہاں کے چودھری ہیں؟"
اس شخص نے سگرٹ کا لمبا کش لگا کر بڑے فخر سے کہا "جی نہیں ہزار روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ یہ ملازم ہے میری۔ کیا سمجھے؟"
سلمان ترنگ میں تھا۔ کہنے لگا "بہت سستا سودا کر لیا۔ یہاں تو صرف رات بھر کے ہزار روپے دینے کا ارادہ تھا۔"
وہ کہنے لگا "آپ لوگوں کا افیون کا ٹھیکہ تو نہیں ہے؟" اُس نے تو سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی، مگر سلمان سمجھا کہ چوٹ کر رہا ہے۔ تڑ سے بولا۔ "آپ بتا سکتے ہیں آج کل کوئلہ کا کیا بھاؤ ہے؟" وہ زیرِ لب مسکرایا "کوئلہ کی دلالی ہی کرتے ہیں نا؟"
اس شخص کا رنگ کالا تھا۔ تملا کر بولا "دیکھیے صاحب! میں اس قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔"
سلمان نے کہا "رنڈی کے کوٹھے پر تمیز تو لکھنؤ کے نوابوں کے صاحبزادے سیکھا کرتے ہیں۔ ہم تو روہیل کھنڈی ٹھہرے۔"
وہ جل کر بولا "آپ روہیل کھنڈی ہوں یا بندھیل کھنڈی۔ بس اب آپ شرافت کے ساتھ یہاں سے تشریف لے جائیں۔"
اکبر جو اَب تک خاموش بیٹھا تھا، بیچ میں بول پڑا "ورنہ؟"
اُس نے اکبر کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ اُونچی آواز سے پکارنے لگا "ابے جھلرو! کہاں مر گیا ذرا یہاں تو آ۔"
ذرا دیر بعد ایک لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر آ گیا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا "کیا حکم ہے سیٹھ! ذرا سلفے پر دم لگا رہا تھا۔"
وہ جھلرو سے کہنے لگا "کمرہ خالی کرا کے دروازہ بند کر دو۔ یہ دونوں جھگڑا کرنا چاہتے ہیں، انہیں یہاں سے چلتا کرو۔"

جھلرُو نے دونوں کو بغور دیکھا "چلو جی بڑھاؤ ٹوٹو۔اب گانا وانا نہیں ہوگا"۔
سلمان کو اُس کی بدتمیزی پر غصّہ آگیا۔ ڈانٹ کر بولا "ٹھیک سے بات کرو"۔

وہ بولا "سیدھی طرح جاؤ گے یا پھلے کر"۔

اُس نے لپک کر سلمان کا بازو پکڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے کھڑا کر دیا۔ سلمان نے گھبرا کر طوائف کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ سلمان سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جھلرُو نے اپنے مضبوط ہاتھ سے اُس کی گردن دبوچ لی اور دروازے کی جانب لے چلا۔ سلمان نے بہت ہاتھ پاؤں ملائے مگر اُس کی گرفت سے نہ چھوٹ سکا۔ جھلرُو نے دروازے پر جا کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوُا سڑک پر آگیا۔

سلمان ذرا دیر تک سڑک پر دم سادھے پڑا رہا۔ سب کچھ اس قدر اچانک ہوُا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُسے فوراً ہی اکبر کا خیال آیا۔ اُسی وقت اکبر آکر اُس کے اُوپر دھم سے گرا۔ دونوں بوکھلا کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔

ذرا دیر بعد اُنھوں نے اُٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی۔ صرف جسم پر کہیں کہیں خراشیں آئی تھیں۔ اکبر کی گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی تھی۔

سلمان کہنے لگا "سالے کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے"۔

اکبر کھسیانا ہو کر بولا "یار بڑی بے عزّتی ہوئی"۔

سلمان نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دائیں ہاتھ کی کہنی کو جھک کر دیکھنے لگا جس پر چوٹ آئی تھی۔ کچھ دیر ٹھیر کر دونوں چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔

(۴)

سلمان اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ دھوپ مکانوں کی اُونچی منڈیروں کو چوم رہی تھی۔ سائے جھک گئے تھے اور ان جھکے ہوئے سایوں میں، دروازے کے پاس دلربا ریسٹورنٹ کا مالک روشن خاں کھڑا تھا۔ سلمان اُسے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

روشن خان نے بلا کسی تمہید کے کہا "مسٹر آج ہمارا حساب بے باق ہو جانا چاہیئے۔"

اُس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر سلمان کو اندازہ ہوگیا کہ وہ قرض کی رقم لئے بغیر نہیں جائے گا۔ ادھر اُس کی حالت یہ تھی کہ پاس کھوٹا پیسہ تک نہ تھا۔ رات وہ جوئے میں سب کچھ ہار آیا تھا اور صبح سے اب تک پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ اِس بَلا کو کس طرح ٹالا جائے۔ اُس نے خوشامد کا پہلو اختیار کیا، بے تکلفی سے بولا "خاں صاحب کیا کسی سے لڑ کر آرہے ہو؟"

وہ بغیر کسی لگاوٹ کے بولا "نہیں مسٹر! ہم دکان دار آدمی کس سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔"

اِس دفعہ سلمان نے ہمدردی جتائی "تو پھر کچھ طبیعت خراب ہوگی۔ دیکھنے سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔"

"گرمی کے دن ہیں جی۔ آج کل طبیعت کا معاملہ بس گڑبڑ ہی رہتا ہے۔"

اس کے تیور مدھم پڑتے جارہے تھے۔ وہ ایک جھنجھلائے ہوئے قرض خواہ کے بجائے عام آدمی نظر آنے لگا تھا۔ سلمان اُس کو اسی عالم میں دیکھنا چاہتا تھا لاپرواہی سے بولا "خاں صاحب! گھر سے ابھی میرا خرچہ نہیں آیا۔ کل پرسوں

تک منی آرڈر آجائے گا تمہارا بل فوراً ادا کر دوں گا۔"

یہ بات وہ دو ہفتے پہلے بھی کہہ چکا تھا اور پرسوں رات چائے پیتے ہوئے بھی یہی بات کہہ کر وہ اُسے صاف غچّا دے گیا تھا۔ لہٰذا بات کچھ بنی نہیں۔

روشن خاں اچانک بھڑک اُٹھا۔ آنکھیں نکال کر بولا "مسٹر اس طرح کام نہیں چلے گا۔ حساب آج صاف کرنا ہوگا اور ابھی۔"

اِس دفعہ وہ اس قدر اونچی آواز سے بولا کہ کئی راہگیر راستہ چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ سلمان پریشان ہو کر بولا "اماں دروازے پر کھڑے کیوں چیخ رہے ہو۔ اندر آجاؤ۔"

وہ کہنے لگا "بس جی میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

سلمان نے پھر مسکہ لگایا "خاں صاحب تم ضرور کسی سے لڑ کر آ رہے ہو" اس نے خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش کی "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لگتا ہے بیگم سے لڑ کر آ رہے ہو۔"

روشن خاں نے بیراگیری کرتے کرتے خود اپنا چائے خانہ بنا لیا تھا۔ اپنی بیوی کے لئے بیگم جیسا معزز لفظ اُسے کچھ عجیب سا لگا۔ بہرحال اُسے خوشی ضرور ہوئی۔ اس دفعہ وہ مسکرا کر بولا "وہ تو میکے گئی ہے جی۔ لڑوں گا کس سے!"

سلمان کو موقعہ مل گیا۔ ہنس کر بولا "یاد ستا رہی ہوگی۔"

روشن خاں اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنس پڑا۔ سلمان کی جان میں جان آئی۔ اُس نے اصرار کر کے روشن خاں کو کمرے میں بُلا کر بٹھایا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

اس طرح اُسے کچھ روز کی اور مہلت مل گئی۔ مگر آج کی باتوں سے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر جلد ہی روشن خاں کو کچھ نہ دیا گیا تو وہ کوئی نہ کوئی بدتمیزی کر بیٹھے گا۔ روشن خاں، کمرے سے باہر گیا تو اُس نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا اور تھکا ہوا سا کرسی

پر بیٹھ گیا۔ اُس نے سگریٹ کی طلب محسوس کی۔ مگر سگرٹ موجود نہیں تھی۔ البتہ کمرے کے ایک گوشے میں سگرٹوں کے خالی کئی ڈبے اور مختلف برانڈ کے پیکیٹ پڑے تھے۔ فرش پر جابجا سگرٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک اَدھ جلی سگرٹ فرش سے اُٹھا کر سلگائی۔ کش لگاتے ہی خالی معدہ سُلگنے لگا۔ جھنجھلا کر اُس نے سگرٹ پھینک دی۔ غصّہ سے اس کو مَسل ڈالا۔

کچھ دیر وہ بُت کی مانند ساکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ سوچتے سوچتے اُس کی نظر میز پر رکھے ہوئے تھرماس پر پہنچ گئی۔ پچھلے سال وہ اُسے گھر سے لایا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ سفر میں تکلیف نہ ہو، برف بھروا کر یہ تھرماس ساتھ کر دیا تھا۔ وہ خوابناک نظروں سے اُسے تکتا رہا۔ پھر اس نے اُٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور تھرماس اخبار میں لپیٹ کر باہر آ گیا۔

نیاز کی دکان اُس کے گھر سے دُور تھی۔ تھرموس لے کر اتنی دُور پیدل چلنا اُسے کھل رہا تھا۔ بھوک کی نقاہت اور بھی نڈھال کئے دے رہی تھی۔ جب وہ نیاز کی دکان پر پہنچا تو گلا خشک پڑ گیا تھا اور سانس بوجھل ہو گئی تھی۔ خیریت ہوئی کہ نیاز اس وقت دکان پر موجود تھا۔

نیاز نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "آج اِدھر کیسے بھول پڑے؟"

اُس کی یہ بے تکلفی سلمان کو اچھی نہ لگی۔ وہ کوآپریٹو سوسائٹیز کے رجسٹرار کا بیٹا تھا۔ کسی کباڑیئے کا اِس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اُس کے نزدیک انتہائی بدتمیزی تھی۔ اُس نے نیاز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے تھرموس پر لپٹا ہوا کاغذ علیحدہ کیا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔ تھرموس بالکل نیا تھا۔

نیاز نے قدرے حیرت سے کہا۔ "بیچنے لائے ہو؟"

سلمان نے گردن ہلا دی۔ "جی ہاں !"

نیاز نے تھرموس اُٹھایا۔ گھما پھرا کر اندر باہر سے دیکھا۔ کہنے لگا۔ "اپنا ہی ہے نا؟" یہ بات اُس نے ایک آنکھ دبا کر رازدارانہ طور پر کہی۔

سلمان جل کر بولا۔ "دیکھئے آئندہ آپ مجھ سے ایسی بات نہ کہیں"۔

نیاز بے باکی سے ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی آپ تو بُرا مان گئے۔ اچھا یہ بتائیے اس کا کیا دے دُوں ؟"

سلمان بولا۔ "جو آپ مناسب سمجھیں"۔

نیاز کہنے لگا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ میں کہوں کہ مفت دے دیں تو آپ دے دیں گے ؟"

سلمان بھی ترنگ میں آگیا۔ "آپ مانگ کر تو دیکھیں، مفت بھی دے دُوں گا"۔

خوب صورت چہرے والے سلمان کی یہ ادا نیاز کے دل میں کھُب گئی، خوش ہو کر بولا۔ "بھئی بزنس کی بات تو بعد میں ہوگی۔ آپ پہلے چائے پئیں گے"۔ اُس نے گردن بڑھا کر چائے خانے کے بَیرے کو آواز دی۔

وہ دکان کے اندر آگیا۔ نیاز اُسے چائے اور پیسٹری لانے کا آرڈر دینے لگا سلمان "تکلفاً" انکار کرنے لگا۔ مگر نیاز نے ایک نہ سُنی۔ گردن اکڑا کر بولا۔ "واہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے!" اُس نے بیرے سے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے! منہ کیا دیکھتا ہے۔ جا جلدی سے ایک سٹ چائے لے کر آ۔ پیسٹری تازہ لانا۔ سویرے کا مال نہ لانا۔ شیخ جی سے بولنا، بیکری سے جو مال ابھی آیا ہے، اس میں سے بھیجیں۔ ورنہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔" بیرا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد بیرا چائے لے کر آگیا۔ نیاز نے اپنے ہاتھ سے سلمان کو چائے بنا کر پلائی۔ اصرار کر کے تازہ پیسٹریاں بھی کھلائیں۔ اِس خاطر و مدارات میں نیاز کی

کی کوئی غرض وابستہ نہ تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ چھریرے جسم والا، صورت شکل اور وضع قطع سے تعلیم یافتہ اور شائستہ نظر آنے والا۔ سلمان اُسے بہت اچھا معلوم ہُوا تھا۔

چائے پیتے پیتے اچانک اُس نے سلمان سے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟"

سلمان نے صاف بات کہہ دی۔ "پریشان نہ ہوتا تو یہ تھرموس لے کر یہاں کیوں آتا؟"

نیاز کو اس پر ترس آگیا۔ بڑی شفقت سے بولا۔ "کتنے روپے کی ضرورت ہے؟"

سلمان اُس کے احساسات کا اندازہ نہ لگا سکا۔ کہنے لگا "تھرموس کی آپ جو قیمت لگائیں۔"

نیاز نے بے نیازی سے مسکرا کر کہا "بھئی حد ہوگئی۔ اماں تھرموس گیا ایسی تیسی میں۔" اُس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اُس کی طرف بڑھائے۔ "لو اس سے کام چل جائے گا؟"

سلمان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچنے لگا آخر ماجرا کیا ہے۔ یہ کباڑیہ اچانک اس پر اس قدر مہربان کیوں ہوگیا۔

اُس کو خاموش دیکھ کر نیاز نے فوراً کہا "اماں پہلے ان کو جیب میں تو رکھو۔" سلمان نے روپے لے لئے۔ نیاز کہنے لگا "یہ تھرموس جی چاہے تو لیتے جاؤ۔"

سلمان نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

نیاز نے اُس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کہا "یار ہم تو شرافت پر جان دیتے ہیں۔ پیسہ سالا تو ہاتھ کا میل ہے۔ ادھر آیا اُدھر گیا۔ سچ پوچھو تو

اُس روز بھی مَیں تمہاری گھڑی نہ رکھتا۔ پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ پہلا سابقہ ہے۔ تم نہ جانو کیا سوچو۔ یہ زمانہ سالا بہت خراب ہے۔"

حالانکہ یہ بات اُس نے بالکل جھوٹ کہی تھی۔ اُس دن اُس نے کوئی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ گھڑی کے بیس روپے سے زائد نہ دیتا۔ مگر آج اُس کا رویہ بالکل مختلف تھا۔

سلمان اُس کی باتوں سے بہت متأثر ہوا۔ گردن جھکا کر جھجکتے ہوئے گویا ہوا۔" کفر موس اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں آپ کی رقم دے کر اسے واپس لے جاؤں گا۔"

نیاز تیکھے لہجے میں بولا :" یار اب تم دل نہ توڑو۔ دوستوں کا حساب دل میں رہتا ہے۔ یہ لینا دینا تو چلتا ہی رہے گا۔" وہ ضرورت سے زیادہ بے تکلّف ہوتا جارہا تھا اور سلمان کو اُس کی یہ بے تکلّفی ذرا بھی بُری نہ لگی۔ وہ دیر تک بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا۔

شام ہوگئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ سلمان نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور دکان سے باہر آگیا۔ لیکن جس وقت وہ باہر نکل رہا تھا عین اُسی وقت نوشا بھی پہنچ گیا۔ اُس نے سلمان کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ سلمان کی اُس پر نظر نہ پڑی۔ نوشا چاہتا بھی یہی تھا۔ جیسے ہی سلمان آگے بڑھا۔ نوشا جھٹ دکان کے اندر داخل ہوگیا۔

اُس روز نوشا خالی ہاتھ آیا تھا اور اس ارادے سے آیا تھا کہ نیاز سے ایک روپیہ اُدھار لے جائے۔ اُس شام اُس نے راجہ اور شامی کے ساتھ سینما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نیاز نے صاف انکار کر دیا۔ بے رُخی سے بولا :

" جب کچھ پاس ہُوا کرے تب ہی یہاں آیا کرو۔"

نوشا خوشامد کرنے لگا۔" کل مَیں ضرور کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گا۔ بس آج ایک روپیہ دے دو۔"

وہ بگڑ کر بولا "بس ایک بار کہہ دیا، خواہ مخواہ جان نہ کھا"

نوشا ذرا دیر گردن لٹکائے چپ بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر چل دیا۔ لیکن جب وہ دروازے پر پہنچا تو پیچھے سے نیاز کی آواز آئی۔

"ابے اب چلا ہی جائے گا؟"

نوشا نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ نیاز بیٹھا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے نوشا کو بلایا۔ وہ پالتو کتے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا۔

نیاز نے پوچھا "سنیما کے لئے روپیہ چاہیئے ہے نا؟"

نوشا نے انکار نہ کیا۔ گردن ہلا کر بولا "ہاں!"

نیاز نے ایک ہی سانس میں اُس کو کئی گالیاں دیں۔ پھر جیب سے ایک روپیہ نکال کر سامنے پھینک دیا "لے! مگر یاد رکھنا سالے یہ سنیما کی چاٹ تجھ کو تباہ کردے گی" نوشا نے چپ چاپ روپیہ اُٹھا لیا۔

نیاز تیوری پر بل ڈال کر بولا "دیکھ! کل کچھ نہ کچھ لے کر ضرور آنا۔ ورنہ سالے خاں آئندہ ایک پیسہ نہ دوں گا" نوشا خوش خوش باہر چلا گیا۔

سڑک عبور کر کے نوشا گلی کی طرف مڑ گیا۔ میونسپلٹی کی لالٹین روشن ہو چکی تھی مگر وہاں راجہ موجود نہیں تھا۔ قریب ہی ایک مکان کے چبوترے پر شامی اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کی قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا جسے وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ آستین پر جگہ جگہ خون کے لال لال دھبے بھی نظر آرہے تھے۔

شامی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا اور ہونٹ سے رستا ہوا خون پونچھنے لگا۔

نوشا نے قریب جا کر گھبرائے ہوئے لہجہ میں دریافت کیا "ابے کیا ہو گیا۔

ابّا نے مارا ہے؟"

اُس نے گردن ہلا دی۔ "نہیں"

نوشا نے جلدی سے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

شامی نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ نوشا اور گھبرا گیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "ابے کچھ منہ سے تو بول۔ ہوا کیا؟"

شامی بھرّائی ہوئی آواز سے بولا۔ "سالے ڈاکٹر موٹو کے لڑکے اور اُس کے نوکر نے مل کر مارا ہے۔" وہ اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نوشا نے کہا۔ "اچھا تو وہ سالا بھورا تھا۔ وہ تو ایک نمبر حرامی ہے۔ پر تو اس سے کہاں ٹکر گیا۔"

شامی نے سسکیاں بھر کر بتایا۔ "بات کچھ بھی نہیں تھی۔ دوپہر کو میں دکان سے کھانا کھانے کے لئے گھر آرہا تھا۔ بڑے میدان میں وہ مل گیا۔ کہنے لگا آؤ گلّی ڈنڈا کھیلیں۔ پہلے تو یہی بدمعاشی کی کہ داؤ اپنا رکھا۔ پھر دیر تک دھوپ میں پدایا۔ جب میری باری آئی تو کہنے لگا کہ داؤ نہیں دوں گا۔ میں نے کہا۔ داؤ دئے بغیر جانے نہ دوں گا۔ کیوں ٹھیک بات کہی نا میں نے؟" اُس نے اپنی بات کہتے کہتے پوچھا۔

نوشا بولا۔ "بالکل ٹھیک بات تھی۔ ہاں پھر کیا ہوا؟"

شامی بتانے لگا۔ "بس سالے نے چھوٹتے ہی ناک پر گھونسا مارا۔ خدا قسم! میرے آنسو نکل آئے۔ پھر تو مجھے بھی تاؤ آگیا۔ سالے کو اُٹھا کر دھوں سے وہیں دے مارا۔ روتا ہوا چلا گیا۔ اب شام کو اپنے نوکر کے ساتھ آیا۔ دونوں کے پاس اسٹکیں تھیں۔"

نوشا نے حیرت سے کہا۔ "اچھا تو سالے اسٹکیں لے کر آئے تھے؟"

"ہاں جی۔ آتے ہی مارنا شروع کر دیا۔"

نوشا بولا۔ "ان کی تو ایسی کی تیسی۔ آخر سمجھا کیا ہے۔ تو پرواہ نہ کر، سالوں کو گھر میں گھس کر نہ مارا تو نام نہیں" شامی کا سارا دُکھ اُڑن چھُو ہو گیا۔ جلدی سے بولا۔

"راجہ کو بھی ساتھ لئے لیتے ہیں"

نوشا نے کہا۔ "ہاں اُس کو بھی لے لے۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں؟"

"پتہ نہیں، کیوں نہیں آیا اب تک"

نوشا نے مشورہ دیا۔ "چل پہلے اُسے ڈھونڈ لیں"

شامی جھٹ چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ دونوں راجہ کی کھولی کی جانب چل دیئے۔

راجہ خلافِ معمول دروازے پر منہ لٹکائے گم صُم بیٹھا تھا۔ قریب ہی لکڑی کی وہ بھدی گاڑی تھی جس میں بوڑھے گداگر کو بٹھا کر وہ پھیری پر جاتا تھا۔ کھولی کے اندر گہری تاریکی پھیلی تھی۔ دونوں نے اُسے افسردہ دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ نوشا سمجھا کہ راجہ بھی کہیں سے لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔ قریب جا کر بولا۔

"ابے یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھا ہے؟"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن سے بجایا۔ "بول کیا کہتا ہے؟"

اس دفعہ وہ بیزاری سے بولا۔ "یار پریشان نہ کر، اپنا یوں ہی ڈبہ گُل ہو رہا ہے"

شامی بیچ میں بول پڑا۔ "اُستاد سے جھگڑا ہو گیا؟"

"نہیں یار اُستاد بے چارے کو تو پولیس والے پکڑ کر لے گئے"

راجہ کی زبان سے یہ بات سُن کر دونوں چونک پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُسے انسدادِ گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر کے سرکاری محتاج خانے بھیج دیا گیا تھا۔ راجہ یہ باتیں کہتے کہتے بہت اُداس ہو گیا۔ اُداس ہونے کی بات

ہی تھی۔ گداگر کے گرفتار ہو جانے کے باعث اس کی آمدنی کا ذریعہ اچانک بند ہو گیا تھا۔

دونوں جس ارادے آئے تھے، راجہ کو غمگین دیکھ کر اس کا ذکر بھی نہ کیا ــــ سنیما جانے کا پروگرام بھی منسوخ ہو گیا۔ تینوں نے جاکر مسلم ہوٹل میں چائے پی اور دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے کہ راجہ کو اب کیا کرنا چاہیئے۔ رات گئے جب اُن کی محفل برخاست ہوئی تو نوشا نے وعدہ کیا کہ وہ اُسے اپنے ورکشاپ میں کام دلانے کے لئے حاجی فرّے سے بات کرے گا۔

مگر نوشا کی کوئی کوشش کام نہ آئی۔ راجہ کئی کئی وقت کے فاقے کرنے لگا۔ اُس نے بھیک مانگنے کی کوشش کی تو ایک روز پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دوسرے گداگروں کے ساتھ اُسے بھی مویشیوں کی طرح ہانک کر پولیس کی لاری میں بند کر دیا گیا۔ مگر راجہ کا نڈر پن کام آگیا۔ ہُوا یہ کہ جب گداگروں کو تھانے کے احاطے میں لاری سے اُتارا گیا تو راجہ سب کی نظریں بچاکر لاری کے نیچے دبک گیا اور موقعہ لگتے ہی احاطہ کی دیوار پھاند کر ایسا رفو چکر ہُوا کہ پولیس والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کئی روز تک وہ اپنی کھولی میں پولیس کے ڈر سے چھُپا رہا۔ نوشا اور شامی آجاتے تو پیٹ بھرنے کا سہارا ہو جاتا۔ شامی ان دنوں دیر سے آتا تھا۔ آتے ہی قمیص کے اندر چھُپی ہوئی روٹیاں نکالتا اور راجہ کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ یہ روٹیاں وہ گھر سے چُرا کر لاتا تھا۔ نوشا کو جس روز نیاز سے کچھ رقم مِل جاتی وہ ہوٹل سے سالن منگوا دیتا۔ ورنہ راجہ کو رُوکھی سُوکھی روٹیوں پر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔

ان دنوں نوشا، قریب قریب ہر روز کچھ نہ کچھ اُڑا لاتا اور سیدھا نیاز کے پاس پہنچتا۔ مگر روز روز کی چوری سے کارخانے میں کھلبلی پڑ گئی۔ عبداللہ مستری چیخ چیخ کر سارے کاریگروں کو گالیاں دیتا۔ پھاٹک پر ہر کاریگر کی سختی کے ساتھ

تلاشی لی جاتی مگر نوشا اپنے کام میں ایسا منجھ گیا تھا کہ چوکیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاف نکل جاتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اُس ہتھے کوئی پُرزہ یا اوزار نہ چڑھا۔ لہٰذا اُس نے موقعہ ملتے ہی تانبے کے تار کا گچھا اٹھا کر ایک پرانی موٹر کی سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ ورکشاپ میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر پہلے اُس نے کاریگروں کی نظریں بچا کر تار قمیص کے اندر چھپایا اور جھٹ پیشاب خانہ میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور پاجامہ اُتار کر تار کسی نہ کسی طرح ران سے باندھا اور باہر آ گیا۔ سیر سوا سیر کا وزن تھا چلنے میں قدم ٹھیک سے نہ پڑتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا پھاٹک سے گزرا تو چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے دیکھ کر ٹوکا۔ "خو تم کیسا چلتا ہے۔ تمارا ٹانگ میں کیا ہو گیا ہے؟"

نوشا نے جلدی سے چہرے پر تکلیف کے تاثرات پیدا کیے اور بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "لالہ بڑا درد ہو رہا ہے۔ سالا پورا راڈ آ کر ٹانگ پر گر پڑا۔" یہ کہتا ہوا وہ پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

گھبراہٹ میں اُس نے تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر اس طرح پھاٹک کے سامنے گرا کہ تار کا لچھا پاجامے کے اندر سے نکل کر باہر آ گیا۔ چوکیدار اُسے برابر دیکھ رہا تھا۔ فوراً اُس کی نظر تار پر پڑ گئی۔ وہ لپک کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔

"چوری کرتا اے بولتا ہے ٹانگ میں درد اے۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر نوشا کی گردن اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں دبوچ لی۔ چیخ کر بولا۔ "خو چل اب سیٹھ کے پاس چلو۔"

نوشا گڑگڑانے لگا مگر چھ فٹے پٹھان چوکیدار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کو گھسیٹتا ہوا پھاٹک کے اندر لے گیا۔

عبداللہ مستری اُس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔

اُس کے سامنے جیم خانہ وہسکی کی بوتل رکھی تھی۔ ہاتھ میں گلاس تھا۔ چوکیدار نے نوشا کو اُس کے رُوبرُو پیش کیا اور تار کا لچھا میز پر ڈال کر بولا۔

"ساحیب اِس خنزیر نے چوری کیا تھا، ہم نے اس کو پکڑ لیا۔"

عبداللہ نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔" خان تم بہت اچھا چوکیدار ہے۔ ہم تم سے بہت خوش ہوا۔" چوکیدار نے اُس کو فوراً سلام کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

عبداللہ نے تار کا لچھا چھو کر دیکھا۔ پھر نوشا پر نظر ڈالی۔ غصّہ سے اُس کی آنکھیں اُبل کر سُرخ پڑ گئیں۔ چیخ کر بولا۔" کیوں بے حرامی ؟"

اُس نے غضب ناک ہو کر میز پر رکھا ہوا رجسٹر اُٹھا کر نوشا کے منہ پر دے مارا۔ نوشا زور زور سے رونے لگا۔ عبداللہ نے اُس کے رونے پر مطلق توجہ نہ دی۔ اُس نے لوہے کی تین لمبی لمبی میخیں نکالیں، جنہیں وہ کاریگروں کو سزا دینے کی غرض سے ہمیشہ میز کی دراز میں رکھتا تھا۔ عبداللہ نے کھڑے ہو کر ایک میخ دیوار میں ٹھونکی۔ اُس کو ہلا کر دیکھا کہ مضبُوط لگی ہے کہ نہیں۔ نوشا سہما ہوا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

"مستری جی اب کبھی چوری نہیں کروں گا۔"

"اب چوری کروں تو جو جی چاہے سزا دینا۔"

"مستری جی بس اب کے معاف کر دو۔"

عبداللہ شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور اُس کے منہ پر زور کا تھپّڑ مار کر بولا۔" چُپ! سالے آواز نکلی تو یہیں دفن کر دوں گا۔"

نوشا کو سانپ سُونگھ گیا۔ اُس نے چوں تک نہ کی۔ عبداللہ نے اُس کے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ اُنگلیاں ہتھیلی کے اندر ہی

رہیں۔ اس کے بعد اُس نے نوشا کو اُٹھا کر میخ پر لٹکا دیا اور عین اُس کے تلوؤں کے نیچے فرش پر دو میخیں گاڑ دیں، جن کے نکیلے سر اُوپر اُبھرے ہوئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے ڈپٹ کر کہا۔

" دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں پوری اندر اُتر جائیں گی۔"

نوشا نے جھک کر میخوں کو دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔ تکلیف سے اُس کی اُنگلیاں ٹوٹے جا رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک اُنگلی کی ہڈی دوسری کی ہڈی توڑ کر اندر پیوست ہو جائے گی۔ وہ درد سے بلبلا کر رونے لگا۔

"مستری جی! اللہ کے لئے چھوڑ دو۔"

"مستری جی! ہائے مستری! مَیں مرا۔"

" ہائے میری اُنگلیاں ٹوٹے جا رہی ہیں۔"

نوشا گڑگڑاتا رہا، تکلیف سے بلکتا رہا۔ خدا اور رسول کی دُہائی دیتا رہا۔ مگر مستری اطمینان سے بیٹھا چُسکی لے لے کر دیسی وہسکی کے گھونٹ حلق کے نیچے اُتارتا رہا۔ جب نوشا زیادہ شور مچاتا تو وہ گالیاں دے کر چیختا۔

" چُپکا رہے گا یا سالے دو چار ہاتھ بھی لگاؤں۔"

" سالے رات بھر لٹکاؤں گا تُو نے مجھے سمجھا کیا ہے!"

لمحہ بھر کے لئے نوشا چُپ ہو جاتا، پھر گڑگڑانے لگتا۔ عبداللہ وہسکی کی چُسکی لگا کر کہتا۔ " چوری کرو بیٹا، چوری کرو۔"

دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر طرف اندھیرے کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ عبداللہ پر جیم خانہ وہسکی کا تیز نشہ چڑھ رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگے پن سے اپنی بھونڈی آواز میں جھوم جھوم کر گنگنانے لگا۔

او دُور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا۔

او دُور جانے والے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عبداللہ نشہ کی دُھن میں کسی دُور جانے والے کو یاد کر رہا تھا! اور نوشا جو قریب کی دیوار سے لٹکا ہُوا تکلیف سے بلبلا رہا تھا، اُسے بھُول چکا تھا۔ دفعتاً نوشا زور سے چیخا۔ "ہائے مستری جی مَیں مرا۔"

عبداللہ نشہ کی جھونک میں بولا۔ "ابے تو ابھی تک لٹکا ہُوا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لٹکے رہو بیٹا! بالکل چمگادڑ لگ رہا ہے اس وقت تو۔" اپنی بات پر وہ خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

لیکن نوشا کی ٹانگیں لوہے کے اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی مانند گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اِس دفعہ عبداللہ نے مُڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُوپر سے خون کا ایک قطرہ فرش پر گرا۔ پھر دوسرا، تیسرا، ٹپ، ٹپ، ٹپ، خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ اُنگلیوں کی کھال پھٹ گئی تھی۔ نوشا کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔ وہ کب کا ہاتھ چھوڑ چکا ہوتا، مگر عبداللہ نے اُنگلیاں اِس طرح پھنسا کر لٹکایا تھا کہ وہ کھُل نہ سکتی تھیں۔ خون دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے عبداللہ کا چہرہ فکرمند ہو گیا۔ وہ ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے گلاس میں پڑی ہوئی وہسکی ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھالی۔ نوشا کو ایک گندی سی گالی دی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

قریب جا کر اُس نے نوشا کو نیچے اُتارا۔ اُس کی اُنگلیاں ابھی تک آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ اُن سے جیتا جیتا لہو بہہ رہا تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے پاجامہ میں پیشاب کر دیا۔ عبداللہ نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔ نوشا تکلیف سے بلبلا کر زور سے چیخا۔ اُنگلیاں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو گئیں۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔

عبداللہ خاموش کھڑا نشہ سے جھُومتا رہا۔ پھر اُس نے ڈانٹ کر کہا۔ "جا پہلے ہاتھ دھو کر آ۔"

نوشا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔ عبداللہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے گلاس میں تھوڑی سی وہسکی اُنڈیلی اور آہستہ آہستہ چُسکی لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد نوشا واپس آگیا۔ عبداللہ نے اُسے گھور کر دیکھا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چُپ چاپ جیب سے بیس روپے کے نوٹ نکالے۔ نوشا کے سامنے پھینک کر بولا ”لے یہ بھی لیتا جا۔ مگر اب کبھی یہاں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ابے منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا دفان ہو“ وہ زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔

نوشا نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ اُٹھائے اور سسکیاں بھرتا ہوا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اُس کی اُنگلیاں سُوج چکی تھیں۔ ہاتھوں پر ورم آگیا تھا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ ماں نے دیکھا تو بدحواس ہوگئی۔ جلدی سے پوچھا۔

”ارے یہ کیا کر لیا ہاتھوں کا؟“

نوشا نے جیب سے بیس روپے نکال کر ماں کے سامنے ڈال دیے۔ آہستہ سے بولا ”مستری جی نے مجھے نکال دیا“ مگر اُس نے صاف بات نہ بتائی۔ بہانا یہ بنایا کہ ایک قیمتی پُرزہ ٹوٹ گیا تھا۔ ناراض ہو کر عبداللہ مستری نے اُس کو مارا بھی اور برطرف بھی کر دیا۔ ماں عبداللہ کو کوسنے لگی۔

نوشا جب ورکشاپ سے نکلا تھا، اُسی وقت اُس کا جسم بخار سے تپنے لگا تھا اب بخار کی شدّت اور بڑھ گئی۔ ماں نے جرّاح سے مرہم منگوایا اور اُنگلیوں پر لگا کر اُوپر سے پٹّی لپیٹ دی۔ نوشا بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے اُس نے بخار کے عالم میں سُنا۔ نیاز گھر میں آیا تھا اور ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

وہ اس وقت نوشا ہی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا ”میں کہتا ہوں کہ یہ تو آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر پرلے درجے کا حرام خور ہو گیا ہے۔ اِس نے ضرور

کوئی ایسی حرکت کی ہوگی، جس پر عبداللہ مستری نے اِس طرح مارا، ورنہ وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے۔ کاریگروں کو اپنی اولاد کی طرح رکھتا ہے۔"

نوشا کو اُس کی باتیں سُن کر سخت غصہ آیا۔ اُس نے دل ہی دل میں اُس کو کئی گالیاں دیں۔ اور کروٹ بدل کر دُوسری طرف منہ پھیر لیا۔

(۴)

نیاز کی دکان پر کالے صاحب کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ کسی نہ کسی وقت وہاں پہنچ جاتا۔ دیر تک بیٹھا انشورنس کی خوبیاں بتاتا رہتا۔ نیاز بھی اُس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتا۔ پچاس ہزار کی پالیسی کا معاملہ تھا۔ کمیشن اچھا بنتا تھا۔ کالے صاحب چاہتا تھا کہ جلد از جلد معاہدہ پر دستخط ہو جائیں۔ ایک روز اُس نے آتے ہی اپنا بریف کیس کھولا۔ بیمہ کمپنی کے کچھ کاغذات نکالے اور نیاز سے کہنے لگا۔

"مسٹر نیاز! اللہ کا نام لے کر آج تم فارم تو بھر ہی دو۔"

نیاز نے فوراً کہا۔ "مگر بیمہ تو میں اپنی بیوی کا کراؤں گا۔"

کالے صاحب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ خود پالیسی لیں یا بیگم کے نام سے لیں، بات ایک ہی ہے۔" لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولا۔ "تو پھر ایسا کیجئے کہ اُن کے نام سے فارم بھروا کر دستخط کروا دیجئے۔ اس کے ساتھ پہلی قسط بھی ادا کرنی ہوگی۔"

نیاز مسکرا کر بولا۔ "مگر بیوی تو میری موجود نہیں۔"

کالے صاحب، اُس کی بات کا مفہوم سمجھ نہ سکا۔ پوچھنے لگا۔ "میکے دیکھنے گئی ہیں؟"

نیاز اسی طرح بے تکلفی سے مُسکراتا رہا۔ "اُس کو تو مرے ہوئے بھی کئی سال

ہو گئے۔"

کالے صاحب سناٹے میں آگیا۔ جھنجھلا کر بولا۔ "تو گویا آپ اب تک مجھ سے مذاق کر رہے تھے۔"

وہ غصّہ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتا۔ مگر نیاز فوراً بیچ میں بولا۔ "بھئی کالے صاحب! تم تو خواہ مخواہ بُرا مان گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں عنقریب دوسری شادی کرنے والا ہوں۔"

کالے صاحب کے چہرے کی کرختگی کم ہوگئی۔ کہنے لگا۔ "تو یوں کہئے نا۔"

"تم نے میری پوری بات ہی کب سُنی، خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔"

"تو پھر کب تک ارادہ ہے۔ ایک عدد دعوت تو ضرور ہوگی۔"

"دعوت ہوگی اور بہت جلد ہوگی۔"

اِس کے بعد دونوں بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد کالے صاحب نے اپنے کاغذات سمیٹ کر بریف کیس کے اندر رکھے۔ اور دکان سے باہر چلا گیا۔

کالے صاحب کے جانے کے بعد نیاز خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ وہ نوشا کی ماں سے نکاح کرلے گا۔ پچاس ہزار روپے میں اُس کا بیمہ بھی کرا دے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اُسے کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ بیمے کی رقم جلد سے جلد مل جائے اور سلطانہ بھی اُس کے قابو میں آجائے۔

سوچتے سوچتے ایک تجویز اُس کے ذہن میں آئی۔ اُس نے اُٹھ کر دکان بند کی، تالا ڈالا اور ڈاکٹر موٹو کے مطب کی جانب چل دیا۔

نیاز نے مطب کے اندر جا کر دیکھا۔ ڈاکٹر اُس وقت پہنچا نہیں تھا۔ کمپاونڈر نے بتایا کہ وہ گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد مطب میں آئے گا۔ نیاز نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ مطب میں وہ مریضوں کی موجودگی کے باعث ٹھیک سے بات نہ کر سکتا تھا۔

گھر پر اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔ وہ وہاں سے سیدھا ڈاکٹر کے مکان پر پہنچا۔

ڈاکٹر گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔ اسی اثناء میں نیاز پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے کمرے میں بٹھایا۔ مُسکرا کر بولا "کہو میاں نیاز! آج ادھر کیسے آ گئے؟"

نیاز اپنی بات کہتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر موٹو سے اُس کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ وہ بیمار پڑتا تو اسی کے زیرِ علاج رہتا۔ مگر اس وقت جو بات وہ کہنا چاہتا تھا ایسی نہ تھی کہ بے دھڑک کہہ دی جائے۔ گو کہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر موٹو کو رقم کھلائی جائے تو وہ ہر کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ڈاکٹر موٹو کا نام تو خیرات محمد تھا مگر اپنے بے ڈول اور تنومند جسم کے لئے عرفِ عام میں ڈاکٹر موٹو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کرنال کا رہنے والا تھا اور وہاں ایک ڈاکٹر کی ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر تھا۔ فسادات کے بعد مہاجر بن کر پاکستان آیا تو اُس نے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ اب اُس نے اپنے نام کے ساتھ ایک بوگس ڈگری بھی لگا لی تھی اور ٹھاٹھ سے ڈاکٹری کرتا تھا۔ اُس کو یہاں آئے ہوئے پورے چار سال بھی نہیں ہوئے تھے مگر اس عرصہ میں وہ کئی سنگین مقدمات میں ملوث ہو چکا تھا اور ہر بار جیل جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ لیکن اس بدنامی کے باوجود وہ اپنی خطرناک حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔

ڈاکٹر خیرات محمد عرف موٹو نے نیاز کو خاموش دیکھا تو ہنس کر کہنے لگا: "کیا کہیں سے کوئی پوشیدہ بیماری لے آئے ہو جو کہتے ہوئے جھجک رہے ہو۔ میرا کہنا مانو تو اب تم گھر بسالو، اور یہ بازاری عورتوں کا چکر چھوڑ دو۔"

کسی اور وقت ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہوتی تو نیاز اُس کے سر ہو جاتا۔ مگر اُس وقت تو وہ غرض مند بن کر آیا تھا۔ مُسکرا کر اُس کی بات ٹال گیا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو گھر بھی بسالوں گا مگر اس وقت میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔"

ڈاکٹر کہنے لگا ’’لوگوں کی خدمت کرنا تو اپنا پیشہ ٹھہرا، کہو کیا کام ہے؟‘‘
نیاز بات کہتے کہتے رُک گیا۔
ڈاکٹر بولا ’’کہو کہو گھبرا کیوں رہے ہو۔ کوئی خاص بات ہے؟‘‘
’’خاص ہی بات ہے۔‘‘
ڈاکٹر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ’’اچھا! تو پھر کہتے کیوں نہیں۔‘‘
نیاز جھجکتے ہوئے بولا۔ ’’بات یہ ہے ڈاکٹر صاحب!‘‘ وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ گھبرا کر ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگا۔
ڈاکٹر نے فوراً کہا ’’بھئی اب کہہ بھی چکو۔ تم نے تو خواہ مخواہ تشویش میں ڈال دیا۔‘‘
نیاز گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ’’پھر کسی وقت آ کر بات کروں گا۔‘‘
ڈاکٹر نے فوراً ٹوکا۔ ’’یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تو تم اپنی بات کہہ کر ہی جاؤ گے۔ چلو بیٹھو، کہاں چل دئیے؟‘‘
نیاز کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ اُس نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا ’’میں نے سُنا ہے کہ کوئی چیز سلو پوائنزننگ ہوتی ہے۔‘‘
ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ اچھا تو یہ بات تھی جس کو بتاتے ہوئے اس قدر جھجک محسوس ہوتی تھی۔ وہ نہ تو خائف ہوا اور نہ ہی کسی طور گھبرایا۔ لمحہ بھر تک نیاز کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر مُسکرا کر پوچھا۔
’’خیریت تو ہے۔ یہ سلو پوائزننگ کے بارے میں معلوم کرنے کی ضرورت تم کو کیوں محسُوس ہوئی۔‘‘
نیاز نے جلدی سے کہا۔ ’’کچھ ایسی ہی بات ہے۔‘‘
ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک اُبھر آئی۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ ’’میرا کہنا مانو تو سلو پوائزننگ کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ طریقہ خطرناک ہے اور

اس میں بڑا جھنجٹ بھی ہے۔"

نیاز کسی قدر نا اُمید ہو کر بولا۔" تو پھر کیا کیا جائے ؟"

ڈاکٹر نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔" گھبراؤ نہیں، ذرا صبر سے کام لو۔ ایسے کاموں کے لئے اب تو ایک سے ایک نیا طریقہ نکل آیا ہے۔"

نیاز خاموش بیٹھا اُس کی بات سُنتا رہا۔

ڈاکٹر کہنے لگا۔" صرف چند انجکشن لگانے ہوں گے، جن سے دل کمزور پڑ جائے گا اور حرکتِ قلب بند ہونے سے موت واقع ہو جائے گی۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ کام ہمیشہ ہاتھ پاؤں بچا کے کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں دھر لئے جاؤ۔ میری رائے پوچھتے ہو تو یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اب یہی چل رہا ہے۔"

نیاز کو ڈاکٹر کا مشورہ پسند آگیا۔ اُس نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" جیسی آپ کی مرضی۔"

ڈاکٹر کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا۔ اُس نے دروازے کا بولٹ چڑھایا، نیاز کے قریب پہنچا۔ کوٹ کی جیب سے ایک ڈبہ نکال کر کھولا اور نیاز کے سامنے رکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔

" دیکھو یہ ہیں وہ انجکشن۔ ایسی چیزیں میں مطب کے بجائے گھر میں رکھتا ہوں۔"

نیاز نے ڈبّے کے اندر رکھے ہوئے انجکشنوں کو حیرت اور خوف سے دیکھا۔" یہی ہیں وہ انجکشن ؟" اُس نے پوچھا۔

" ہاں۔" ڈاکٹر بولا۔" مگر اس کام کا میں پانچ ہزار روپیہ لوں گا۔"

نیاز نے پانچ ہزار کا نام سُنا تو سناٹے میں آگیا۔ مری ہوئی آواز میں کہنے لگا
" ڈاکٹر صاحب یہ تو بہت ہیں۔"

"بس اتنا ہی لوں گا - اس سے کم نہ ہوگا۔ سوچ سمجھ لو۔ سچ پوچھو تو ایسے خطرناک کاموں کے لئے لاکھوں بھی تھوڑے ہیں۔"

نیاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر بھی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نیاز نے کہا "کچھ کم نہیں کیجئے گا؟"

"نہیں" ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔

"میری اتنی حیثیت نہیں۔"

"تو پھر یہ خیال چھوڑ دو۔" ڈاکٹر بے مروتی سے بولا۔

نیاز لمحہ بھر بیٹھا سوچتا رہا ــــ پھر اُس ڈاکٹر کی بات مان لی۔ "چلئے آپ ہی کی بات رہی۔ مگر اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "چار پانچ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔"

نیاز نے کہا۔ "آپ چاہیں تو اور بھی زیادہ وقت لے سکتے ہیں مگر سال بھر سے زیادہ نہ لگے۔"

"نہیں بھئی، سال بھر کی مدت تو بہت ہوئی۔"

دونوں نے کچھ اور ضروری باتیں کیں اور یہ طے ہوا کہ نیاز، ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ پیشگی دے گا۔ اور جب مریض کی حالت خطرناک صورت اختیار کرنے لگے گی تو مزید دو ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ بقیہ رقم موت واقع ہو جانے کے بعد فوراً ادا کر دی جائے گی۔

نیاز نے تمام باتیں طے تو کر لیں، مگر جب دکان پر واپس پہنچا، تو نامعلوم خوف سے سہما ہوا تھا۔ ہر چند کہ وہ چوری کا مال بیچ بیچ کر خاصا نڈر ہو گیا تھا لیکن اتنا خطرناک جرم اُس سے اب تک سرزد نہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اسی اُلجھن میں وہ اُس روز نوشا کے گھر بھی نہیں گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور چُپ چاپ بستر پہ لیٹ گیا۔

رات کے کوئی گیارہ کا عمل ہو گیا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا، سلمان سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، بال بے ترتیب تھے۔ چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔

نیاز اُسے اپنے ہمراہ اندر لے آیا۔ رات گئے آنے کا سبب پوچھا۔ سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "نیاز بھائی اس وقت تمہارے پاس بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔ اگر تم سو روپے کا انتظام کر دو تو تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔"

نیاز اُس کی باتوں سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ "مجھے تو آج کل خود روپے کی سخت ضرورت ہے، اور اس وقت تو میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔"

سلمان خوشامد کرنے لگا۔ "نہیں بھائی اس وقت تو تم کو کہیں نہ کہیں سے بندوبست کرنا ہی پڑے گا، میں بڑی پریشانی میں مبتلا ہوں۔"

حالانکہ نیاز کے پاس اُس وقت کئی سو روپے موجود تھے مگر وہ اُسے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ سلمان جس روز سے تھرموس دے کر گیا تھا، اُس کے بعد سے اب پلٹا تھا۔ نیاز نے اس عرصہ میں کئی بار سوچا کہ سلمان مل جائے تو وہ اس سے روپے کا تقاضا کرے۔ اب وہ آیا بھی تو روپے مانگتا ہوا، وہ بھی دس بیس نہیں، پورے سو۔ کچھ یہی سوچ کر اُس نے بڑی بے رُخی سے کہا۔

"بھئی معاف کرنا تم نے پہلے ہی جو رقم لی تھی، وہی نہیں دی۔ اب اور مانگ رہے ہو۔"

سلمان پھر بھی اصرار کرتا رہا۔ بات یہ تھی کہ وہ دوپہر سے بیٹھا فلش کھیل رہا تھا اور اس وقت ایک ایک پیسہ ہار کر نکلا تھا۔ ہارے ہوئے جواری کی جو حالت ہوتی ہے وہی اُس وقت اُس کی تھی۔ اُسے روپیہ چاہیئے تھا۔ چاہے کسی طرح ملے۔

جب نیاز کسی طرح روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا تو سلمان نے کہا۔ "اگر آپ

کو میرا اعتبار نہیں تو رسید لکھا لیجئے۔"

نیاز اچانک بھڑک اُٹھا۔ کہنے لگا۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھئی واہ! اچھا یارانہ پالا۔ رسید ہی لکھوانا ہوتی تو پھر تم ہی رہ گئے تھے؟"

سلمان شرمندہ ہو کر بولا۔" آپ میری بات کا مطلب غلط سمجھے۔"

نیاز نے کہا۔" میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ میرے پاس اس وقت ایک پیسہ نہیں۔"

سلمان ذرا دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر منہ لٹکائے ہوئے اُٹھ کر چلا گیا۔

نیند ایسی اُچاٹ ہوئی تھی کہ دیر تک نہ آئی۔ نیاز کروٹیں بدلتے بدلتے اُکتا گیا تو خیال آیا کہ نوشا کے گھر چلنا چاہیئے۔ اُس نے کپڑے تبدیل کئے اور نوشا کے گھر کی طرف چل دیا۔

جس وقت نیاز وہاں پہنچا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر نوشا کے گھر میں رت جگا ہو رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ جب سے نوشا کی ملازمت ختم ہوئی تھی سلطانہ اور اُس کی ماں کو زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ دونوں اس وقت لیمپ کی دُھندلی روشنی میں کارخانے کے لئے بیڑیاں تیار کر رہی تھیں۔

گھر میں نیاز کے داخل ہونے سے قبل سلطانہ دالان سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ لیکن نیاز نے جاتے جاتے بھی اُس کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ چُست لباس میں وہ اس وقت آم کی قاش معلوم ہو رہی تھی۔ نیاز نے بڑے جذباتی انداز میں گہری سانس بھر کر سوچا کہ اب اُس کو اپنی اسکیم پر جلد ہی کام شروع کر دینا چاہیئے۔

○

فصل سوم

(۱)

نوشا کے ہاتھوں کے زخم مُندمل ہو گئے تھے۔ مگر اب وہ دن بھر لاوارث کُتوں کی طرح گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتا۔ راجہ بھی ہنوز فاقہ مستی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اِن دنوں، دونوں عام طور پر ساتھ ساتھ نظر آتے۔

کچھ عرصہ سے اُنھوں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ دن چڑھے دونوں میں سے کوئی نہ کوئی، راشن کے دفتر کے سامنے برگد کے پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ جاتا اور دوسرے کا انتظار کرتا۔ یہاں سائیکلوں کی مرمت کرنے کی چھوٹی سی ایک دکان تھی۔ اس کا مالک مجید نامی ایک نوجوان تھا۔ جس سے اُنھوں نے یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ دن کا زیادہ وقت دونوں اُس کے پاس گزارتے۔ وہ اکیلا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی گاہک ایک ساتھ آجاتے تو وہ پہیئوں میں ہوا بھرنے یا ایسے ہی چھوٹے موٹے کاموں پر اُن کو لگا دیتا۔ اِس کے صلہ میں سگرٹ اور کبھی کبھار چائے بھی پلا دیتا۔

ایک روز ایسا ہؤا کہ مجید کے پاس کام بالکل نہ آیا۔ راشن کے دفتر کے سامنے اسٹینڈ پر بہت سی سائیکلیں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ راجہ اور نوشا حسبِ معمول دکان پر موجود تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سڑک پر سناٹا چھایا تھا۔ مجید کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سُوجھی۔ دونوں سے بولا "ابے آج تم ہی کچھ بازیگی دکھاؤ، گاہک نے تو آنے کی قسم کھائی ہے"۔

اُنہوں نے غور سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔ مگر اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ مجید نے خود ہی وضاحت کی۔ کہنے لگا "یار جاکر دو چار سائیکلوں میں پنکچر ہی کر دو، کچھ تو سالا کام آئے گا"۔

نوشا تو چپ رہا۔ لیکن راجہ نے کہا "یار پکڑے گئے تو بڑی مار پڑے گی"۔

مجید نے کہا "ابے تُو تو بڑا ڈرپوک نکلا۔ بس ٹائر میں جاکر ذرا پن ہی تو چبھونا ہے، اور کون سا بڑا تم کو ڈاکہ ڈالنا ہے"۔

راجہ رضامند ہوگیا۔ کہنے لگا "یار بُرا کیوں مناتا ہے، آج یہ بھی سہی"۔

وہ اُٹھ کر دفتر کی عمارت کی طرف چل دیا۔ احتیاطاً اُس نے نوشا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہ تھا۔ نوشا کو پہرہ پر لگاکر، راجہ نے جھپاک جھپاک کئی سائیکلوں میں پنکچر کر دئے۔

مجید کا خیال ٹھیک نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد سائیکلوں کے پنکچر جڑوانے والے اُس کی دکان پر آنا شروع ہوگئے۔ دن ڈھلے جب دکان بند کرنے لگا تو اُس نے راجہ اور نوشا کو فی پنکچر ایک آنہ کے حساب سے سات آنے دئے۔

تجربہ کامیاب رہا تھا۔ لہٰذا دوسرے دن اُنہوں نے پورے ایک درجن پنکچر کئے اور اُس کے صلہ میں نقد بارہ آنے کمائے۔ اب تو اُن کا یہ معمول ہوگیا۔ کہ سائیکلوں کے اسٹینڈ کے اِردگرد منڈلاتے رہتے۔ اُنگلیوں میں نوکیلی تیز پنیں دبی ہوتیں۔ جہاں موقعہ ملا، آنکھ بچاکر کام کر جاتے۔

وہ اپنے کام میں اِس قدر منجھ گئے تھے کہ اکثر بے دھڑک پنکچر کر دیتے۔ اُن کی اِس دیدہ دلیری پر مجید نے ایک آدھ بار ڈانٹا بھی، مگر اُن کو تو اب خطرہ مول لینے میں لطف آنے لگا تھا۔ ایک دفعہ اُنھوں نے بدمعاشی کی حد کر دی، ایک سرے سے تمام سائیکلوں کے پنکچر کر ڈالے۔ بڑی کھلبلی مچی۔ کچھ لوگوں نے مشتبہ نظروں سے اُن کو بھی دیکھا مگر وہ ذرا نہ گھبرائے۔ اُس روز اُنھوں نے کچھ کم تین روپے کمائے۔

چند روز بعد کا ذکر ہے، راجہ نے ایک سائیکل کا پنکچر کیا۔ عین اُسی وقت دفتر سے وہ آدمی باہر نکلا، جس کی سائیکل تھی۔ اُس نے راجہ کو ٹائر میں پن چبھوتے دیکھ لیا۔ پہلے بھی دو بار اُس کی سائیکل میں اسی اسٹینڈ پر پنکچر ہو چکا تھا، اُس نے جھپٹ کر راجہ کی گردن دبوچ لی۔ شور سُنکر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ان میں بیشتر ایسے تھے، جن کی سائیکلوں کے پنکچر ہو چکے تھے۔ پہلے تو راجہ پر گالیاں پڑیں۔ پھر مار پڑنے لگی۔ نوشا بھی ہجوم میں موجود تھا اور گھبرایا ہوا سوچ رہا تھا کہ کس طرح راجہ کو بچایا جائے۔ اُسی وقت کسی نے کہا۔

"اس کے ساتھ ایک لڑکا اور بھی ہوتا تھا، اُس سالے کی بھی خبر لو۔"

نوشا نے یہ بات سُنی تو اُس کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ بھیڑ کو چیر کر دھکا دیتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ لوگوں نے شور مچایا۔ "پکڑنا، پکڑنا۔ جانے نہ پائے۔" مگر نوشا کہاں ہاتھ آنے والا تھا۔ سڑک چھوڑ کر فوراً ایک گلی میں گھُس گیا اور گلیوں، گلیوں ہوتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

شام کو راجہ ملا۔ نوشا نے دیکھا، اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی، ایک آنکھ سوج گئی تھی۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کہنے لگا "یار سالوں نے بہت بُری طرح مارا۔"

نوشا نے پوچھا۔ "مجید نے نہیں بچایا؟"

راجہ نے جواب دیا۔ "وہ سالا تو خود ڈرا ہوا تھا۔ دُور سے کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔"

دونوں گلی کے نکڑ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں شامی آگیا۔ وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی پانچ روپے کا ایک نوٹ دکھایا اور چہک کر بولا۔ "سینما چلتے ہو؟" نوشا اور راجہ فوراً تیار ہو گئے۔

سینما جانے سے قبل تینوں نے مسلم ہوٹل میں چائے پی اور وہیں شامی نے بتایا کہ پانچ روپے کا نوٹ اُس نے دکان سے اُڑایا تھا۔ اُس روز اُس کے باپ کو دمہ کا سخت دورہ پڑا تھا، لہذا وہ دکان نہیں گیا۔ جس روز باپ دکان نہیں جاتا تھا، شامی کے ٹھاٹھ ہو جاتے۔ خوب گلچھرّے اُڑاتا۔ پکڑا جاتا تو مرمّت بھی خوب ہوتی۔

راجہ اور نوشا نے شامی کے پانچ روپوں سے سینما بھی دیکھا اور تفریح بھی کی۔ بڑے مزے کی شام گزری۔

دوسرے روز نوشا سویرے ہی سویرے راجہ کے پاس پہنچ گیا۔ مجید کی دکان پر جانے کی اب گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے راجہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "دیکھو جی اب تم یہاں نہ آنا، ورنہ خواہ مخواہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ساری دکانداری چوپٹ پڑ جائے گی۔"

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وقت کہاں گزارا جائے۔ کچھ دیر تک دونوں کھولی کے اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ شامی کی دکان پر پہنچے مگر شامی وہاں موجود نہ تھا، البتہ اس کا باپ بیٹھا کھانس رہا تھا۔

دونوں نے بازار کا ایک چکّر لگایا۔ پھر راجہ کی تجویز پر ندی پر جانے کا پروگرام بنا۔

پروگرام یہ تھا کہ ندی کے اُس پار سے آنے والی سبزیوں اور پھلوں کو کشتیوں پر سے اُتارنے کا دھندا کیا جائے۔ مگر چار میل کا راستہ پیدل طے کر کے جب دونوں وہاں پہنچے تو ہر طرف سنّاٹا تھا۔ کشتیاں موجود ضرور تھیں۔

لیکن سب کی سب ریت پر دُور تک کچھوؤں کی طرح اُلٹی پڑی تھیں۔ قریب ہی ملّاح بیٹھے اُونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔ راجہ کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ بالو کے ایک ٹیلے پر کھڑا کشتیوں کو دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک ملّاح قریب سے گزرا۔ اُس سے دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ میونسپلٹی نے کشتیوں پر ٹیکس بڑھا دیا تھا، لہذا بطور احتجاج ملّاحوں نے ہڑتال کر دی تھی۔ اِس اطلاع سے دونوں کو بڑی کوفت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے۔ وہاں بھی سنّاٹا تھا۔ گھاٹ آثارِ قدیمہ کے کسی کھنڈر کی طرح شکستہ تھا۔ اُس کا ایک حصّہ دریا کی طغیانیوں سے کٹ کٹ کر منہدم ہو چکا تھا۔ صرف ایک بُرج باقی تھا۔ اِس میں بھی بڑا سا شگاف تھا۔ دونوں سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بُرج کے اُوپر پہنچ گئے۔

اب دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا تھا۔ دُھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ دونوں تھکے ہارے تھے۔ تیز دھوپ میں کئی میل چل کر آئے تھے۔ بُرج کے اندر پہنچتے ہی ہوا کا ایسا بھیگا ہُوا جھونکا آیا کہ مزا آ گیا۔ دونوں شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ گئے۔ نشیب میں دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ دُور تک پانی ہی پانی تھا۔ نوشا کو بُرج کے اندر بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرنے میں بڑا لُطف آ رہا تھا۔ مگر راجہ چُپ چُپ تھا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ نوشا نے کئی بار بات کرنے پر اُکسایا، مگر وہ بیزاری سے کچھ نہ کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ آخر نوشا نے پوچھا۔

"اماں راجہ! بات کیا ہے، جو تم اتنے چُپ چاپ بیٹھے ہو؟"

وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "یار پریشان نہ کرو۔"

نوشا باز نہ آیا۔ "آخر ہُوا کیا، یار! تُو خواہ مخواہ رُوٹھا ہُوا سا بیٹھا ہے؟"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اماں کچھ بتاؤ تو۔" نوشا نے اِصرار کیا۔

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہا۔ نوشا بھی چپ ہوگیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

سورج کی سنہری کرنیں دریا کی لہروں پر جھلملاتی رہیں۔ پانی کے آہستہ آہستہ بہنے کی گنگناہٹ اُبھرتی رہی۔ بھیگی ہوا کے جھونکوں سے اُن کے سر کے بال بار بار بکھر کر چہرہ پر آجاتے۔ بُرج کے اندر گہرا سکُوت تھا اور اس سکُوت میں دونوں شکستہ محراب کے نیچے اُلوؤں کی طرح گول گول آنکھیں نکالے خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک راجہ کھسک کر آگے چلا گیا۔ اُس نے اپنی دونوں ٹانگیں باہر لٹکا دیں۔

نوشا نے راجہ سے تو کوئی بات نہیں کی، البتّہ جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ لہریں بار بار اُمڈ کر گھاٹ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُن کے ٹکرانے سے سفید سفید جھاگ اُٹھتا۔ پانی کے چھینٹے دُور تک بکھر جاتے۔ ہر بار ایسا شور اُٹھتا جیسے کوئی کراہ رہا ہو، سسکیاں بھر رہا ہو۔ خوف سے اس کا جسم لرز اُٹھا۔ اُسی وقت لہروں کے شور میں راجہ کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یار جی چاہتا ہے، مر جاؤں۔"

نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ اُس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی، آنکھیں آسمان کی جانب تھیں، اور ٹانگیں دریا کی طرف لٹک رہی تھیں۔ نوشا اس کی بات سُن کر کچھ اس قدر خوف زدہ ہوگیا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا "سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے!"

نوشا نے دیکھا اُس کا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے ایسا محسُوس ہوتا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہے۔ راجہ نے گہری سانس بھری اور گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ اُس کی ٹانگیں کھسک کر آگے بڑھ گئی تھیں، آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا۔

نوشا نے جھپٹ کر اُسے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ گھبرا کر بولا "یار راجہ تجھے کیا ہوگیا ہے؟"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا کی گرفت سے خود کو چھڑانے لگا۔ دونوں ایک دُوسرے کے ساتھ گتھ گئے۔ راجہ نے بگڑ کر کہا " نوشا مجھے چھوڑ دے۔" مگر نوشا باز نہ آیا۔ وہ اس کو اپنی جانب گھسیٹ رہا تھا۔ اور راجہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی زور زور سے ہل رہی تھیں۔ نیچے دریا کی لہریں اُبھر اُبھر کر گھاٹ کی دیوار سے ٹکراتیں۔ پانی اُچھل کر دُور تک بکھر جاتا۔ سطح آب پر سفید سفید جھاگ پھیل جاتا۔ ہر بار شور اُٹھتا، جیسے کوئی کراہتے ہوئے ہائے کرے۔

لہریں ٹکراتی رہیں، شور اُبھرتا رہا۔

"ہائے، ہائے، ہائے!"

"نوشا مجھے چھوڑ دے، نوشا مجھے چھوڑ دے۔" راجہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اُس کی آنکھیں سُرخ پڑ گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے بال جُھک کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ اچانک راجہ نے چیخ کر کہا۔

"چھوڑ دے مجھے، ورنہ تُو بھی میرے ساتھ جائے گا۔"

نوشا نے کچھ کہنا چاہا، اسی وقت بلبلا کر راجہ نے اس کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ لمحہ بھر کے لئے نوشا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ راجہ نے ڈانٹ کر کہا " ابے حرامی چھوڑ مجھ کو۔"

نوشا نے جلدی سے بازو پکڑ کر اُسے زور سے گھسیٹا۔ اُس کا تمام جسم اُوپر آ گیا۔

راجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ نڈھال ہو کر فرش پر پڑا رہا۔ اُس کا چہرہ جُھکا ہوا تھا، جیسے اُس نے ایک ہاتھ سے چھُپا لیا تھا۔ نوشا اس کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ گھاٹ کے شکستہ برج کے اندر آہستہ آہستہ سسکیوں کی آواز اُبھرنے لگی۔ راجہ فرش پر پڑا رو رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ نوشا کھسک کر اور نزدیک ہو گیا

اُس کا بازو جھنجوڑ کر بولا۔

"ابے کب تک یوں عورتوں کی طرح روتا رہے گا"۔

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا، چہرہ ہاتھ سے چھپائے ہوئے سسکیاں بھرتا رہا۔

نوشا کہنے لگا۔ "آ! اب گھر چلیں"۔

راجہ بیزاری سے بولا۔ "نہیں یار، مَیں کہیں نہیں جاؤں گا"۔

نوشا جل کر بولا۔ "ابے کچھ دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

راجہ ذرا دیر خاموش رہا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "یار تُو نے ناحق روک لیا۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دُکھ نہ ہوتا، کوئی نہ روتا۔ میرا یہاں بیٹھا ہی کون ہے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن، کوئی بھی تو نہیں، کوئی نہیں"۔ اُس نے گہری سانس بھری اور بڑے دُکھ سے بولا۔ "ہائے میرا کوئی نہیں"۔ اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

دفعتاً دوپہر کے سنّاٹے میں بندوق چلنے کی آواز اُبھری۔ دونوں خوفزدہ ہو کر بُرج سے باہر دیکھنے لگے۔ دریا کے اُوپر پرندے شور مچاتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ گھاٹ کے مشرقی جانب، نشیب میں سرکنڈوں کے جھُنڈ تھے، جن کی اوٹ سے شکاریوں کی اُبھری ہوئی گردنیں نظر آرہی تھیں۔ اوپر فضا میں آبی پرندوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ دونوں ذرا دیر تک خاموشی کے ساتھ ان کو دیکھتے رہے، پھر بُرج سے نیچے اُتر کر اسی طرف چل دیئے۔

شکاری دبے دبے قدموں آگے بڑھتے۔ دھائیں دھائیں کرکے بندُوقیں چلتیں۔ کوئی پرندہ زخمی ہو کر چیختا ہوا نیچے گرتا راجہ اور نوشا کیچڑ اور پانی میں گھُس کر اُسے نکال لاتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ بہت دیر بعد جب شکاری تھکے ہارے پڑاؤ پر آکر اکٹھا ہوئے تو اُنہوں نے دونوں کو بھُنا ہوا گوشت اور ڈبل روٹی کے

ٹکڑے دیئے۔ سہ پہر کو چائے پلائی۔ دن ڈھلے تک وہ شکاریوں کے ساتھ ہاؤ ہُو کرتے رہے۔

شام ہو گئی۔ سورج مغرب میں اُتر گیا۔ درختوں کے سائے طویل ہو گئے۔ اُفق پر گہری نارنجی روشنی پھیل گئی۔ ندی کی لہریں دُلہن کے سُرخ آنچل کی طرح لہرانے لگیں۔ شکاریوں کی ٹولی جیپ میں سوار ہو کر جا چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ مغرب میں گہرے رنگ ماند پڑتے جا رہے تھے۔ دونوں دن بھر کے تھکے ہوئے شہر کی جانب چل دیئے۔

نوشا جب گھر میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ ماں بیروزگاری کے باعث اُن دنوں اُس سے یوں بھی بیزار تھی۔ بات بات پر برس پڑتی۔ نوشا تمام دن غائب رہا۔ لہٰذا وہ اور بھی جلی بھُنی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی وہ صحن میں پہنچا، ماں اُسی وقت باورچی خانے سے نکل کر دالان میں آ گئی۔ نوشا نے چاہا کہ اُس کی نظریں بچا کر کمرے میں گھُس جائے۔ مگر اُس کی نظر پڑ گئی۔ چیخ کر بولی۔

"حرام خور نکھٹو! اب کیوں واپس آیا۔ دن بھر جہاں آوارہ گردی کرتا رہا، وہیں جا۔ یہاں کس لئے آیا ہے؟"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں دالان میں کھڑی دیر تک کوسنے اور طعنے دیتی رہی۔ وہ چُپ چاپ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ کھانا لے کر آ گئی۔ گرم گرم کھانے کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی تو وہ مریل کتّے کی طرح سہما ہوا اس طرف بڑھا۔ ماں نے فوراً ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار جو کھانے کو ہاتھ لگایا۔ میں اپنی ہڈیاں پیل پیل کے اس لئے نہیں محنت کرتی کہ تو مشٹنڈا حرام کی کھا کھا کر اینڈتا پھرے۔"

نوشا کے قدم جہاں تھے، وہیں رُک گئے۔ سلطانہ نے سفارش کی۔ ماں نے اُس کو بھی ایسی سختی سے ڈانٹا کہ وہ سہم کر چُپ ہو گئی۔ اُسی وقت انّو بھی آ گیا۔ ماں نے

اُس کو اپنے قریب بُلا کر بٹھا لیا۔ تینوں نوشا کے سامنے بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ کسی نے اُس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ چُپ چاپ بیٹھا رُک رُک کر اُن کی جانب نظریں اُٹھا کر دیکھ لیتا۔ اُسے توقع تھی کہ ماں ضرور کھانے پر بُلائے گی۔ مگر جب سب کھانا کھا چکے اور سلطانہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف چل دی تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اُسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ غصّے اور دُکھ سے اُس کا دل بھر آیا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا اور اندھیرے میں بیٹھا سسکیاں بھر کر روتا رہا۔

ذرا دیر بعد وہ کمرے سے نکلا اور دالان سے ہوتا ہُوا باہر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ ماں نے تیکھے لہجے میں ٹوکا۔ " پھر چلا باہر"

نوشا نے جواب نہیں دیا۔

ماں چیخ کر بولی۔ " ایک باپ کا جنا ہے تو اب واپس نہ آنا"

اُس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ " نہیں آؤنگا"

وہ تیزی سے چلتا ہُوا گھر سے باہر نکل گیا۔

گلی میں پہنچ کر اُس نے آنسو پونچھے اور سیدھا راجہ کے پاس گیا۔ وہ اپنی کھولی کے دروازے پر کبڑوں کی طرح جھکا ہُوا بیٹھا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

" ابے بہت جلدی آگیا تُو!"

نوشا نے اُس کی بات خاموشی سے سُنی اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر چُپ چاپ قریب جا کر بیٹھ گیا۔ راجہ نے اُس کے تمتمائے ہوئے چہرے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ کہنے لگا۔

" کیا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہ؟"

نوشا نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ " راجہ میں اگر تیرے ساتھ یہاں رہوں، تو مجھے رکھ لے گا؟"

"کیوں؟" راجہ اور حیرت زدہ ہو گیا۔

"میں اب گھر نہیں جاؤں گا۔"

راجہ نے چونک کر کہا۔ "آخر بات کیا ہوئی؟"

نوشا نے آبدیدہ ہو کر بتایا "اماں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ بے اختیار رو پڑا۔ راجہ نے فوراً تسلی دی — "ابے تو رونے لگا۔ گھبراتا کیوں ہے۔ دونوں مزے سے یہاں رہیں گے۔"

نوشا سسکیاں بھر کر شکوہ کرنے لگا۔ "سب مجھے ذلیل سمجھتے ہیں۔ ہر ایک برا کہتا ہے۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں رہا۔"

"ابے میں تو موجود ہوں۔ تُو کسی بات کی پرواہ نہ کر۔" راجہ نے اُس کی دلجوئی کی۔ "یہ مائیں تو سالیاں، سب ایک نمبر حرام کی جنی ہوتی ہیں۔ اب میری ہی ماں کو دیکھ، سُنا ہے بہت ٹھاٹھ سے لاہور میں رہتی ہے اور میں یہاں بھیک مانگتا پھرتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے دُکھ کا گہرا سایہ اُس کے چہرے پر پھیل گیا۔

نوشا کو اُس کی بات پر تعجب ہوا۔ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر بولا —

"ابے تیری ماں بھی ہے؟"

راجہ ترش رُوئی سے بولا۔ "کیوں نہیں ہے؟"

"اور باپ؟" نوشا نے دریافت کیا۔

راجہ نے گہری نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ دُکھ بھرے لہجہ میں بولا۔ "یار وہ تو فسادات میں مارے گئے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ بھی قتل کر دیئے گئے۔ ہم دونوں کو تو دلّی سے وہ سالا بشیر لایا تھا۔ ایک نمبر حرامی تھا۔ مجھ کو بہت مارا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے جل کر گالی دے دی۔ سالا میرے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ جلتی سگرٹ سے میرا منہ چیر کر زبان جلا ڈالی۔ یہ دیکھ۔" اُس نے منہ کھول کر زبان نکالی۔ جس کے ایک گوشہ میں بھُورا سا دھبہ تھا۔ نوشا نے غور سے اُس کی جلی ہوئی زبان دیکھی —

اظہارِ ہمدردی کے طور پر بولا۔

"سالا بڑا حرامی تھا"

"ایک نمبر حرام کا تخم تھا۔ میری زبان چلانے پر اماں کو بھی بڑا غصہ آیا تھا۔ اس سالے سے تو کچھ کہا نہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن مجھے یتیم خانہ میں داخل کرا دیا۔"

نوشا نے ایک بار پھر اُسے احمقوں کی طرح گول گول آنکھیں نکال کر دیکھا حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ابے تو یتیم خانہ میں بھی رہ چکا ہے؟"

راجہ نے جواب دیا۔ "یہ سالی بھیک مانگنے کی عادت وہیں سے تو پڑی ہے۔ وہاں سالا ایک ملّاں تھا۔ یہ لمبی ڈاڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبری تھا۔ سب اُس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا اچھا تھا، مگر بڑا بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا۔ اُس وقت اُس کے ہاتھ میں بید ہوتا، جو لڑکا پیسے کم لاتا، بس اُس کی شامت آجاتی۔ یار ایسی مار مارتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" راجہ نے یتیم خانہ کے بڑے مہتمم کو ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار ہلکا کیا۔ "ایک روز مجھے صرف گیارہ آنے ملے۔ بس اس بات پر اُس کے آگ لگ گئی۔ سالے نے بہت مارا۔ اُسی رات میں یتیم خانہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔"

نوشا نے پوچھا۔ "وہاں سے تم ماں کے پاس گئے ہو گے؟"

"نہیں یار! وہ پھر یتیم خانے بھجوا دیتی۔ پھر تو وہ سالا ڈھیل میری کھال اُدھیڑ ڈالتا۔"

"اس کے بعد سے تم اپنی ماں کے پاس نہیں گئے؟"

راجہ نے جھنجلا کر کہا۔ "نہیں یار، کیا کرتا اُس کے پاس جا کر۔"

"یاد تو کرتی ہو گی۔" نوشا نے دبی زبان سے کہا۔

راجہ نے جواب دیا "پتہ نہیں - پر میں تو اب اُس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا"

نوشا نے سوال کیا "کیوں ؟"

راجہ خاموش بیٹھا رہا -

نوشا اصرار کرتے لگا " یار بتا آخر بات کیا ہے ؟"

راجہ کا چہرہ سُرخ پڑ گیا - کہنے لگا " اب اُس کے پاس جاکر کیا کروں گا سالی رنڈی بنا کرتی ہے - کبھی مل گئی تو خدا قسم قتل کر دوں گا " وہ اب بے حد غصہ میں تھا - نوشا نے مارے ڈر کے کوئی بات نہیں کی - پھر راجہ خود ہی بولا " یہ بات میں نے تجھ کو بتا تو دی ، لیکن اگر تُو نے کسی سے کچھ کہا سُنا تو سمجھ لینا اچھا نہ ہوگا " نوشا نے جلدی جلدی قسمیں کھا کر اُسے یقین دلایا -

دونوں اچانک خاموش ہو گئے - کسی نے کوئی بات نہیں کی - راجہ کے چہرے پر چھائے ہوئے غصّے کے تاثرات آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے اور دُکھ کا احساس ، سائے کی طرح پھیلتا جا رہا تھا - کھولی کے پچھواڑے ، کھنڈر میں ایک کتّا خوفناک آواز میں رو رہا تھا - بہت دیر بعد راجہ کی آواز اُبھری -

" یار میرا تو جی چاہتا ہے ، اس سالے شہر ہی کو چھوڑ دیں - بول کیا کہتا ہے ؟"

" مگر جائیں گے کہاں ؟"

" ابے کراچی چلیں گے - بڑا زوروں کا شہر ہے - کام تو وہاں پھٹ سانی مل جاتا ہے " راجہ نے مسکرا کر بتایا -

نوشا فوراً رضامند ہو گیا " میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا - یار واقعی اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا "

راجہ خوشی سے چیخ کر بولا " تو پھر ملا پیلا ڈو والا ہاتھ "

دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا - اُس وقت وہ

ایک نامعلوم خوشی محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے لیئے اس احساس میں بڑی دل کشی تھی کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دیں گے، جس میں اُن کے لیئے دُکھ ہی دُکھ تھے۔ ان دُکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اب اُنھوں نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ ابھی اس لذّت سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ شامی بھی پہنچ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی راجہ نے زور کا نعرہ لگایا۔

"آ یار، بس تیری ہی کمی تھی۔"

لیکن شامی اس پُرجوش خیر مقدم سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ وہ کچھ اُداس اور مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نوشا نے اُس کی یہ حالت دیکھ کر پوچھا "ابے چپ چپ کیوں ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ راجہ نے ڈانٹ کر دریافت کیا "ابے منہ سے تو بول، آخر بات کیا ہے؟"

اُس نے آہستہ آہستہ بتایا "سالے ڈاکٹر موٹو نے ابّا سے میری شکایت کر دی۔ بس اِسی بات پر اُنھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اب تک کمر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ اپنی کمر سہلانے لگا۔

راجہ نے کہا "تو نے ابّا سے کہا نہیں کہ اصلی بات کیا تھی۔"

"یار اُنھوں نے میری بات ہی کب سُنی۔ بس ایک دم مارنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر موٹو کے ساتھ سالا اس کا لڑکا بھی تھا۔ خوب خوش ہو رہا تھا۔ یار کتنی ذلّت کی بات ہے۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔

نوشا نے اُسی وقت کہا "ہم دونوں تو کراچی جا رہے ہیں۔ یہاں اب رہنا بالکل بیکار ہے۔ جسے دیکھو گالیاں دے رہا ہے، مار رہا ہے۔"

شامی نے حیرت زدہ نظروں سے پہلے نوشا کو دیکھا، پھر راجہ سے پوچھا۔ "کیوں راجہ! یہ نوشے ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

وہ بولا "ہاں جی، اپنا تو بس یہی پروگرام ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے، کہ تُو بھی ہمارے ساتھ چل۔ تینوں ٹھاٹھ سے وہاں رہیں گے۔ نہ کسی سالے کا ڈر، نہ کسی کا خوف"۔

شامی پہلے تو کچھ جھجکا، پھر آمادہ ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ سفر کے لئے رقم کہاں سے مہیّا کی جائے۔ یہ مسئلہ شامی نے حل کر دیا۔ اُس کے پاس اُس روز اخباروں کی بکری کے تیس روپے موجود تھے۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ گھر گیا اور چُپکے سے سارے روپے نکال لایا۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ پونے گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین کراچی جاتی تھی۔ اُنہوں نے سوچا کل تک کا انتظار کیوں کیا جائے۔ سیدھے اسٹیشن پہنچے۔ ٹکٹ خریدے اور ٹرین میں سوار ہو کر کراچی روانہ ہو گئے۔

(۲)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ راجہ، نوشا اور شامی ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ راجہ فرش پر ٹانگیں پھیلائے بے خبر سو رہا تھا۔ قریب ہی نوشا اور شامی بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ بجلی کی زرد زرد روشنی میں مُسافر سامان کے بنڈلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ کچھ اُونگھ رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو جاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نوشا نے اچانک راجہ کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بڑی گہری نیند میں تھا۔ کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ نوشا نے جل کر اس دفعہ زور سے جھنجوڑا۔ راجہ نے ایک آنکھ کھول کر اُس کی جانب دیکھا۔ بگڑ کر بولا "یار سونے دے۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا "ابے اُٹھ تو"۔

راجہ لمحہ بھر تو آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہا۔ پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ پوچھا "کیا بات ہے؟"

نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، البتہ شامی کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا، جو دیوار کی طرف منہ کئے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وحشت زدہ نظروں سے گھور گھور کر شامی کو دیکھنے لگا۔ ذرا دیر وہ اسی عالم میں بیٹھا رہا پھر کھسک کر شامی کے قریب گیا۔ محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ تھپ تھپایا۔

"ابے رو رہا ہے؟"

شامی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برابر سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ راجہ نے اُس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کی۔ "ابے بات کیا ہے؟"

کئی بار دریافت کرنے پر شامی بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "گھر یاد آرہا ہے۔"

راجہ کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ اُس نے شامی کو گندی سی گالی دی ڈانٹ کر بولا۔ "جب یہی بات تھی تو سالے پھر ہمارے ساتھ آیا ہی کیوں تھا؟"

نوشا نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اور بھی سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ اب اُس کی آواز کمپارٹمنٹ کی خاموشی میں صاف سُنائی پڑ رہی تھی۔ جو مسافر جاگ رہے تھے، وہ مُڑ مُڑ کر تینوں کی جانب دیکھنے لگے۔ راجہ نے پریشان ہو کر نوشا سے کہا "یار یہ سالا تو سب کو پکڑوائے گا" اُس کے لہجے میں تشویش تھی۔

نوشا بھی سہما ہوا تھا۔ کہنے لگا "سب ہماری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

دونوں نے چمکار کر خاموش کرانے کی کوشش کی تو شامی اور بھی پھوٹ پھوٹ

کر رو نے لگا۔ راجہ غصہ سے تلملا اُٹھا، اُس کا جی چاہا کہ شامی کی گردن دبوچ کر خوب مارے مگر مسافروں کے ڈر سے کچھ نہ کر سکا۔ آخر دونوں نے طے کیا کہ اگلے اسٹیشن پر شامی کو سمجھا بجھا کر منانے کی کوشش کی جائے۔ اب سفر جاری رکھنا اُن کے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ لہذا جیسے ہی ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی، دونوں شامی کے ہمراہ ریل گاڑی سے باہر آ گئے۔

یہ ایک اُجاڑ اسٹیشن تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ ٹرین ذرا دیر رُک کر روانہ ہو گئی۔ اسٹیشن کے سناٹے میں چند لمحوں کے لئے ہلچل پیدا ہوئی، پھر ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ اسٹیشن کی مختصر عمارت کے اندر دُھندلا سا لیمپ روشن تھا جو ہر سمت پھیلے ہوئے اندھیرے میں بڑا پُر اسرار معلوم ہو رہا تھا۔

تینوں اسٹیشن سے باہر جانے کے بجائے پلیٹ فارم ہی کے ایک گوشہ میں ٹھہر گئے۔ شامی ابھی تک سسکیاں بھر رہا تھا۔ راجہ جلا ہوا تو تھا ہی، اُس نے جھنجلا کر کئی گالیاں دیں۔ مارنے کے لئے بھی جھپٹا، مگر نوشا نے سمجھا بجھا کر روک دیا۔ شامی نے خوفزدہ ہو کر رونا بند کر دیا۔

تینوں نے طے کیا کہ صبح تڑکے جو ٹرین آتی تھی، اُس سے سفر کیا جائے۔ شامی نے گھر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب وہ کسی حد تک مطمئن نظر آ رہے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تینوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ نیند کا غلبہ ہوا تو تینوں اونگھنے لگے اور وہیں پتھریلے فرش پر سو گئے۔

سب سے پہلے راجہ کی آنکھ کھلی۔ اُس نے دیکھا ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ ایک خارش زدہ کتا برابر بیٹھا ہوا اپنی گردن زور زور سے کھجا رہا تھا۔ راجہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتا دُم دبا کر بھاگ گیا۔ راجہ کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ نوشا تو وہیں پڑا سو رہا تھا۔ مگر شامی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے فوراً نوشا کو جگایا۔ دونوں دیر تک

شامی کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کہیں اِدھر اُدھر چلا گیا ہو تو آجائے۔

مگر شامی رات کے پچھلے پہر آنے والی ٹرین سے واپس جا چکا تھا۔ اُس نے کسی کو خبر تک نہ ہونے دی۔ چپکے سے کھسک گیا۔

راجہ اور نوشا اس قدر گہری نیند سوئے تھے کہ کراچی جانے والی گاڑی جب صبح تڑکے آئی تو اُن کی آنکھ نہ کھلی۔ دوسری گاڑی سہ پہر کو آتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ساری رقم شامی ہی کے پاس تھی، جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان دونوں کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ ٹکٹ راجہ کے پاس رہ گئے تھے۔

دن بھر وہ پلیٹ فارم پر ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔ چار بجے کے قریب ٹرین آئی تو اُس میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہو گئے۔ جب وہ کراچی پہنچے تو پہر رات گزر چکی تھی۔ اجنبی شہر، نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ رات کا وقت۔ دونوں جاتے بھی کہاں۔ سفر کے تھکے ہارے اور دن بھر کی بھوک سے نڈھال، وہ مسافر خانے کے ایک کونے میں جا کر پڑ گئے

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ مُسافر خانے کے اندر اِکّا دُکّا مُسافر رہ گئے تھے۔ وہ ٹانگیں پسار کر سو گئے تھے یا اُونگھ رہے تھے۔ مگر راجہ اور نوشا کو بھوک کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔

رات گئے مسافر خانے میں ایک شخص داخل ہوا۔ وہ دُبلا پتلا تھا۔ اُس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ مُسافر خانے کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا۔ اچانک اُس کی نظر ان دونوں پر پڑی۔ لمحہ بھر کے لئے وہ ٹھٹکا اور تیکھی نظروں سے دیکھتا ہوا اُن کے قریب چلا گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے اُن کے پاس بیٹھ گیا۔

اُس نے بیٹھتے ہی پوچھا "گھر سے بھاگ کر آئے ہو ؟"

نوشا تو ڈر کر سہم گیا، البتہ راجہ نے کسی قدر نڈر ہو کر جواب دیا۔" جی نہیں، ہم تو اپنے ماموں کے پاس آئے ہیں۔"

اُس شخص نے فوراً پوچھا۔" کہاں رہتا ہے تمہارا ماموں ؟"

اس غیر متوقع استفسار پر راجہ گھبرا گیا۔ اُسے شہر کے کسی علاقہ کا نام ہی نہیں معلوم تھا۔ پہلی بار آیا تھا۔ ہکلا کر بولا۔" وہ - - - - وہ - - - - وہاں رہتے ہیں۔"

وہ شخص ایک آنکھ دبا کر بدمعاشی سے مسکرایا۔" جھوٹ بولو گے تو اُستاد سیدھے حوالات میں ہوگے۔" اس بات پر راجہ کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ سہمی ہوئی نظروں سے چپ چاپ اس آدمی کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ اُس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، دونوں کی طرف بڑھا کر بولا۔" لو پہلے تم سگریٹ پیو۔" نوشا تو خاموش بیٹھا رہا۔ مگر راجہ نے جھجکتے ہوئے ایک سگریٹ نکال ہی لی۔

اُس نے ماچس جلا کر راجہ کی سگریٹ سلگائی اور کندھے کو تھپتھپا کر بولا۔" ڈرو مت، مجھ سے تم کو کچھ فائدہ ہی پہنچ جائے گا۔ ویسے یہ کراچی سالا بہت خراب شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا نمبری پڑا ہے۔"

دونوں خاموشی اُس کی باتیں سُنتے رہے۔ لمحہ بھر رُک کر وہ بولا۔" کسی ایسے ویسے کے چکّر میں پڑ گئے تو سمجھ لو بس گئے کام سے۔"

اُنھوں نے خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اُن کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے جیب سے دوبارہ سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اس دفعہ اُس نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ لمبا سا ایک کش لگایا۔ سنجیدگی سے بولا۔" نوکری کرو گے ؟"

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر اُسے دیکھا۔ جلدی جلدی گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ ذرا دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر بڑے تیکھے لہجہ میں بولا۔" دھندے سے تو میں تم دونوں کو لگوا دوں گا مگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔"

اُن کی سمجھ میں اس شخص کی بات کا مطلب نہ آیا۔ وہ احمقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگے۔ مگر اُس نے اُن کی طرف توجہ نہ دی۔ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں اُس کے ہمراہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے نکل کر باہر سڑک پر آئے۔ اور مختلف راستوں کے چکر کاٹتے ہوئے کوئی پون گھنٹے بعد ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہر گئے۔ یہ علاقہ شہر کی گنجان آبادی سے کسی قدر الگ تھلگ تھا۔ مختصر سی بستی تھی، جس میں زیادہ تر نیچی نیچی چھتوں والے نیم پختہ مکانات تھے۔ مگر وہ مکان پختہ تھا۔ اُس کی دیواریں بلند تھیں۔ اور دُھلے ہوئے کپڑوں کی طرح اُجلی نظر آ رہی تھیں۔

چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ گلی کے اندر اندھیرا بھی تھا۔ راجہ اور نوشا خاموش کھڑے رہے۔ اُس شخص نے آگے بڑھ کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ تو نہیں کھلا۔ البتہ کسی نے کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر پوچھا ــــ

"کون؟"

"میں ہوں جی رحمان۔" وہ شخص بولا۔

"اچھا اچھا!" اندھیرے میں کسی کی آواز اُبھری۔ لیکن اُس کا چہرہ نظر نہ آ سکا۔

ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رحمان دونوں کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اندھیرے دالان سے گزر کر وہ کمرے میں پہنچے، جہاں لیمپ کی دُھندلی روشنی میں ایک گٹھے ہوئے جسم کا آدمی آنکھیں بند کئے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ وہ گھٹنوں تک اُونچی لنگی باندھے ہوئے تھا۔ بدن پر صرف بنیان تھی۔ رحمان نے کھنکھار کر اُس کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ بے تکلفی سے بولا:

میں نے کہا "شاہ جی! بہت زوروں کی چھپی ہو رہی ہے۔"

شاہ جی نے بغیر آنکھیں کھولے ہوئے کہا "کہاں رہا اتنے دنوں تک؟"

رحمان نے مسکین سی صورت بنا کر کہا "بیمار پڑ گیا تھا جی۔"

وہ بگڑ کر بولا "او تیرا خانہ خراب، بے ایمان! ہر بار یہی کہتا ہے۔" اس دفعہ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مگر جیسے ہی راجہ اور نوشا پر نظر پڑی وہ چونک پڑا۔ فوراً پوچھا "دونوں تیرے ساتھ آئے ہیں؟" اُس نے قدرے توقف کیا "اسٹیشن سے لایا ہے؟"

رحمان نے آنکھ مار کر جلدی سے کہا "ہاں جی۔ بے چارے گھر سے رُوٹھ کر چلے آئے۔ مُسافر خانے میں پڑے تھے، یہاں ان کا کوئی جان پہچان کا بھی نہیں۔ میں اپنے ساتھ لے آیا۔ رکھ لو پڑے رہیں گے۔"

شاہ جی نے اُس کی باتیں سُن کر ایک لمبی "ہُوں" کی۔ دونوں کو گہری نظروں سے دیکھا "ویسے تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔"

رحمان نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً کہا "مصیبت کے مارے ہوئے ہیں جی۔ دھندے سے لگ جائیں گے۔ تم کو زندگی بھر دُعائیں دیں گے۔"

وہ گردن ہلا کر بولا "اچھا، اچھا۔" پھر اُن سے مخاطب ہوا "کب آئے جی تم دونوں یہاں؟"

راجہ نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا "آج ہی آئے تھے۔"

شاہ جی نے گردن گھما کر رحمان کو دیکھا۔ کہنے لگا "تو پھر ان کو رکھ لیا جائے؟"

وہ بولا "ان کو لایا تو اسی لئے ہُوں۔"

شاہ جی بے تکلفی سے مُسکرایا "اچھا جی، میں نے تیری بات مان لی۔ ویسے بھی کب تیرا کہا ٹالا ہے۔" اُس نے دونوں کی جانب نظر بھر کر دیکھا "تم نے روٹی شوٹی بھی کھائی؟"

دونوں سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ شاہ جی نے چمچی کرنے والے ماشٹے سے کہا۔ "او دُتے! جا ہوٹل سے ان کے لئے روٹی لے کر آ۔"

دُلّا جانے لگا تو اُس نے ٹوکا۔ "دیکھ وہ کونے والا کمرہ خالی کرا دینا۔ دونوں اُس میں رہیں گے۔ آج تو اِن کو کہیں اور سُلا دے۔" پھر وہ نوشا اور راجہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"جاؤ جی تم اس کے ساتھ ڈٹ کر کھاؤ اور اینڈ کر سوؤ۔ کل تم سے بات ہوگی۔"

دونوں خاموشی سے دُتے کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد شاہ جی نے رحمان سے دریافت کیا۔ "ہاں جی اب معاملہ کی بات کرو۔ کیا لوگے؟"

رحمان ہنس کر بولا۔ "شاہ جی آج تو سیدھے ہاتھ سے سَو سَو کے ۲۰ کرارے کرارے دلوا دو۔ خدا قسم بڑے کام کے چھوکرے ہیں۔"

شاہ جی نے اُس کو ڈانٹ دیا۔ "ٹھیک ٹھیک بات کر۔ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہ ملے گا۔"

"ارے شاہ جی! کیا ظلم کر رہے ہو۔ اتنے میں سودا نہ ہوگا۔ واپس بُلوا لو۔ ابھی تو اُنہوں نے تمہارا نمک بھی نہیں چکّھا۔"

شاہ جی نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "دلالی کرتے کرتے تُو نے داداگیری کب سے شروع کر دی۔ بندہ بن بندہ۔ ورنہ ککڑ کی بولی بولنی پڑے گی۔"

رحمان رونی صورت بنا کر بولا۔ "جب ہی تو میں تمہارے لئے مال نہیں لاتا۔"

"چل چل، ٹسوے نہ بہا۔ سَو اور لے لے۔"

رحمان نے تھوڑی دیر حیل وحجت کرنے کے بعد شاہ جی کو پندرہ سو روپے پر راضی کر لیا۔ سَو روپے اُسی وقت مل گئے، بقیہ چودہ سو کے لئے شاہ جی نے وعدہ کیا کہ تیسرے دن ادا کر دئے جائیں گے۔

رحمان سَو روپے لے کر چلا گیا۔ شاہ جی خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دُلّا واپس

آگیا۔ شاہ جی نے پُوچھا" دونوں کو روٹی کھلا دی ؟"

وہ بڑی مستعدی سے بولا" ہاں جی"

" اچھا تو ذرا دونوں کو بُلا کر یہاں لا"

دُلّا فوراً جا کر دونوں کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ شاہ جی نے اُن کو دیکھ کر کسی قدر شفقت سے کہا" روٹی پیٹ بھر کر کھائی ؟"

اِس تمام عرصہ میں نوشا پہلی مرتبہ بولا" خوب پیٹ بھر کر کھائی ہے"

وہ ہنسنے لگا" ارے تو بھی بولنے لگا"

نوشا شرما گیا۔ شاہ جی بڑے اچھے مُوڈ میں تھا۔ پُوچھنے لگا" چائے پیو گے ؟"

دونوں نے آمادگی کا اظہار کیا تو وہ دُتّے سے بولا" دُتّے دو سنگل چائے منگوا"

راجہ کو سگرٹ کی طلب ستا رہی تھی۔ دبی زبان سے بولا" شاہ جی! ایک سگرٹ بھی منگوا دو"

شاہ جی بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا" او تیرا خانہ خراب، سگرٹ بھی پیتا ہے" پھر دُتّے سے بولا" ان کے لئے پاسنگ شو کا ایک پاکٹ بھی لا دے"

دونوں کے چہروں پر تازگی آگئی۔ شاہ جی اُس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا پُوچھا۔ " اور کچھ" راجہ اور نوشا نے اِنکار میں گردن ہلا دی۔ شاہ جی نے دونوں کا جائزہ لیا۔ اُن کے لباس بڑے گندے تھے۔ راجہ ننگے پَیر تھا۔ نوشا جوتا پہنے ہوئے تھا۔ مگر اُس کی حالت بھی خستہ تھی۔ اگلے حصّے سے انگوٹھا جھانک رہا تھا۔

" کیوں جی تم دونوں کے پاس کپڑے لتّے بھی ہیں ؟"

دونوں ایک ساتھ بولے" نہیں"

" اچھا، اچھا" شاہ جی ہمدردی سے بولا۔ اُس نے دُتّے کے لئے ایک اور حکم جاری کیا" کل تُو نے بازار جانا ہے۔ اِن کے لئے دو دو شلواروں اور قمیصوں کا کپڑا لے آنا۔ ماسٹر سے کہنا فٹا فٹ سی کر دے۔ اِس کے علاوہ موچی گلی سے دو پشوری

چیلیاں اور ٹوپیاں بھی۔ ڈُتّے نباب بنادے ان کو۔"

وہ ان کو" نباب" بنانے کے لئے ابھی اور نہ جانے کیا کچھ کرتا، اسی اثنا میں باہر سے دروازہ کھُلنے کی آواز آئی۔ شاہ جی نے چوکنّا ہو کر دروازے کی جانب دیکھا۔ باہر دالان میں بھاری بھاری قدموں کی آواز اُبھری۔ پھر ملی جُلی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سُنائی دی۔ شاہ جی ننگی ٹانگ کے اُوپر چڑھاکر، ایک ہاتھ سے ران کو کھجانے لگا۔

"تم جاکر اب سو جاؤ۔ ڈُتّے! ان کو سونے کی جگہ بتادے۔" شاہ جی نے دونوں کو رخصت کر دیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈُتّے کے ہمراہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

(۴)

نوشا کے اچانک غائب ہوجانے سے گھر بھر میں کھلبلی پڑ گئی۔

رات کو وہ واپس نہیں پہنچا تو سویرے ہی سویرے ماں نے پوچھا "ارے یہ نوشا اب تک نہیں آیا؟" کوئی اُس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ وہ جھنجلا کر نوشا کو کوسنے لگی اور دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ دن چڑھ آیا۔ ہر طرف دُھوپ پھیل گئی۔ الّو کتابیں سنبھال کر اسکول چلا گیا۔ گلی میں پھیری لگانے والوں کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ محلّے کے بچّوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ لیکن نوشا کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ماں نے بڑبڑانا بند کر دیا تھا۔ اب اُس کو تشویش ہوئی۔ بار بار دروازے کی جانب نظر اُٹھ جاتی۔ آج تک نوشا اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر رات کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ ہر بار سوچتی، کہیں وہ سچ مچ ناراض ہو کر کسی طرف چلا تو نہیں گیا۔ اپنے اِس خدشہ کا اظہار اُس نے سلطانہ سے بھی نہیں کیا جو دالان میں بیٹھی بیڑی کے پتّے تراش رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں ساری آئی گئی اُس کے سر نہ آجائے۔ جب وہ

اِن خدشات کے بارے میں سوچتی تو دل ہی دل میں نوشا کو کوسنے دیتی۔ حرامی نے خواہ مخواہ پریشانی میں ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں واہی تباہی گھوم رہا ہوگا۔

اِسی اُدھیڑ بن میں دوپہر ہوگئی۔ کسی کام میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گلی میں کسی کی آواز اُبھرتی، وہ چونک پڑتی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور اُس کے کان کھڑے ہوئے۔ سلطانہ بھی اب پریشان ہوگئی تھی۔ دونوں ماں بیٹی بیٹھ کر قیاس آرائیاں کرنے لگیں کہ نوشا کہاں ہوسکتا ہے۔ جس قدر وہ سوچتیں اسی قدر دل میں نئے نئے وسوسے پیدا ہوتے۔ بہت دیر بعد اسکول سے انّو واپس آیا۔ ماں نے اُسے فوراً نوشا کی تلاش میں بھیجا اور اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

گھنٹہ بھر بعد انّو آیا تو وہ اکیلا تھا۔ اُس کو تنہا دیکھ کر ماں کے دل پر گھونسا سا لگا۔ انّو کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ بالوں پر گرد اور آنکھوں میں تھکن تھی۔ وہ صبح کا بھوکا پیاسا تھا۔ ماں نے اُس کو کھانا نکال کر دیا۔ مگر خود کچھ بھی نہ کھایا۔ نڈھال ہوکر کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پیشتر سلمان آیا۔ ماں نے نوشا کی گمشدگی کی اُس کو بھی اطلاع دی۔ وہ اُسی وقت انّو کو اپنے ہمراہ لے کر نوشا کی تلاش میں نکل گیا۔ جہاں جہاں اُس کے اڈے تھے، ہر جگہ ڈھونڈا، محلّے کے ہر لڑکے سے دریافت کیا۔ کسی نے کوئی سراغ نہ دیا۔ شامی سے بھی اُنھوں نے پوچھا۔ مگر وہ ڈر کے مارے صاف جھوٹ بول گیا۔ کہنے لگا۔

"میں نے تو اُس کو ہفتہ بھر سے نہیں دیکھا۔"

دیر تک وہ جگہ جگہ نوشا کو تلاش کرتے رہے۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا۔ روشنیاں جھلملانے لگیں۔ مگر نوشا کی کوئی خبر نہ ملی۔

جب سلمان انّو کے ساتھ نوشا کے بغیر واپس پہنچا تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کمرے میں سلطانہ کی سِسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔

سلمان سر جھکائے دالان میں خاموش بیٹھا تھا۔ لیمپ کی یرقان زدہ زرد روشنی میں سب کے چہرے پرچھائیوں کی طرح دُھندلے نظر آرہے تھے۔

سلمان کچھ دیر ٹھہر کر چلا گیا۔

اُس روز گھر میں کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ انو تو دیوار کے ساتھ اُونگھتے اُونگھتے سو گیا۔ مگر سلطانہ اور اُس کی ماں کو نیند نہ آئی۔ رات کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ گلی کی چہل پہل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں اُونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ پھر اس سکوت میں ماں کی آواز اُبھری۔

"بیٹی اللہ سے دُعا کرو۔"

اُس نے آنسو پونچھے اور اُٹھ کر اُسی وقت غسل کیا۔ دُھلے ہوئے اُجلے کپڑے پہنے اور مصلا بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ سلطانہ بھی وضو کر کے اُس کے پاس آ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر ماں دیر تک سجدے میں پڑی رو رو کر دُعائیں مانگتی رہی۔

جب رات آدھی ہو گئی اور ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو گیا تو ماں سلطانہ کے ہمراہ باہر صحن میں آ گئی۔ آسمان کے نیچے برہنہ سر ہو کر دونوں گڑگڑا کر دُعا مانگنے لگیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی ماں بے قرار ہو کر اُونچی آواز سے کہتی۔

"اللہ! میں بہت مصیبت زدہ ہوں۔ میرے بچّے کو مجھ سے ملا دے۔ میں رانڈ بیوہ ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں، میرا کوئی نہیں، ہائے میرا کوئی بھی تو نہیں۔"

وہ بے اختیار رونے لگتی۔ سلطانہ کی آواز بھی بھرا جاتی، اُس کی سسکیاں اُبھرنے لگتیں۔

آسمان پر تارے آنسوؤں کے قطروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ رات ڈھلتی گئی۔ ستاروں کی رنگت کافوری پڑ گئی۔ ہوا سرد ہو گئی۔ اوس سے در و دیوار بھیگ گئے۔

دونوں برہنہ سر صحن میں ٹہل ٹہل کر دُعائیں مانگتی رہیں، گڑگڑاتی رہیں، اشک بہاتی رہیں۔

ساری رات پریشانی اور بے قراری میں گزری۔ پھر کئی راتیں اسی عالم میں گزریں۔ ماں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت چُپ بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کر بے خیالی میں کہتی۔

"یا اللہ! میرا بچہ نہ جانے کہاں ہوگا۔ ہائے یہ کیا ہوگیا"

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ بیٹھے بیٹھے خود کو کوسنے لگتی۔ نوشا کے چلے جانے کا اُس کو بے حد صدمہ تھا۔ اُس نے نوشا کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اُس کا لاڈ کیا تھا۔ اُس کی وجہ بھی تھی۔ سلطانہ کے بعد اُس کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ مگر سال ڈیڑھ سال زندہ رہ کر فوت ہوگئے۔ نوشا بھی بچپن میں دائم المریض تھا۔ اُس کے علاج معالجہ کے لیئے اُس نے نہ جانے کیا کیا جتن کئے تھے۔

اُن ہی دنوں ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہوگئی آمدنی کا سلسلہ اچانک منقطع ہوگیا۔ یہ بہت بڑی مار تھی۔ ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ اُف بھی نہ کر سکی۔ صرف ایک ہی خیال بار بار ذہن میں سوال بن کر اُبھرتا تھا۔ "اب کیا ہوگا؟" ہوتا کیا، چند ہی روز میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔

نیاز اُن دنوں اپنے کسی کام سے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ البتہ سلمان اکثر آتا رہتا۔ مگر وہ بھی پریشان پریشان سا نظر آتا۔ لباس میں بے نیازی، بال اُلجھے ہوئے۔ آنکھوں میں کسی دبے ہوئے کرب کے سائے۔ عام طور پر وہ خاموش رہتا۔ گھڑی دو گھڑی بات کرتا، وہ بھی اَنّو کے بارے میں۔ اُس کا ارادہ تھا کہ انّو کو کسی اچھے اسکول میں داخلہ دلا دیا جائے۔ اُس کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ انّو اگر موجود ہوتا تو وہ اُس کو بُلا کر پڑھائی کے متعلق پوچھتا۔ کتابیں منگواتا اور دیر تک اُس کو بیٹھا پڑھاتا رہتا۔ اس عرصہ میں کبھی کبھار سُلطانہ کی جھلک نظر آجاتی۔ یہ لمحہ اُس کو بڑا حسین معلوم ہوتا، جیسے خوشبو

سے مہکتا ہوا کا جھونکا پاس سے گزر جائے۔

شام کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پہ بادل چھائے تھے۔ ہوا سر سراتی ہوئی چل رہی تھی۔ گھر پہ ویرانی چھائی تھی۔ لیمپ کی دُھندلی روشنی میں سب خاموش بیٹھے تھے۔ گھر میں صبح سے کچھ نہیں پکا تھا۔ نقاہت کے باعث سب کی طبیعتیں نڈھال تھیں۔

ماں بُت بنی، کھوئی کھوئی نظروں سے آنگن کی دیوار کو تک رہی تھی، جس پر برابر والے مکان میں لگے ہوئے شیشم کے درخت کا مہیب سایہ، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ انو کو مار کر بیٹھی تھی، جو بھوک سے بے قرار ہو کر رونے لگا تھا اور سمجھانے بجھانے پر بھی روتا رہا تھا۔ اب وہ کمرے میں پڑا ہوا سسکیاں بھر رہا تھا۔ مارنے کو تو وہ مار بیٹھی مگر اب خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اُسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سلمان آیا تھا۔ ماں نے اندر بُلا لیا۔ اُسے دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گئی۔ سلمان کی قمیص پر جگہ جگہ خون کے سُرخ سُرخ دھبے تھے۔ ایک آنکھ سُوجی ہوئی تھی۔ بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے یہ کیا ہو گیا؟"

وہ بے نیازی سے بولا۔ "تانگے سے آ رہا تھا، سڑک گیلی تھی، گھوڑے کا پیر پھسل گیا۔ تانگہ اُلٹنے سے چوٹ آ گئی۔" مگر یہ چوٹ تانگہ اُلٹنے کی نہیں تھی۔ اُس کی لال لال آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ کسی سے لڑ کر آیا تھا۔ لیکن نوشا کی ماں کو اُس کی بات پہ یقین آ گیا۔

ماں نے جلدی سے سلطانہ کو باورچی خانے میں بھیجا۔ پانی گرم کروایا اور اُس کے بازو اور کندھے پر جو زخم تھے اُن کو اپنے ہاتھ سے صاف کرنے لگی۔ بارش یکایک تیز ہو گئی۔ پانی کے موٹے موٹے قطرے شور کرتے ہوئے گرنے لگے۔ رات اور گہری ہو گئی۔ موسلا دھار بارش برابر ہوتی رہی۔ ہوا کے جھکڑ سیٹیاں بجاتے ہوئے

چل رہے تھے۔ ایسی طوفانی رات میں سلمان کے جانے کا کوئی اِمکان نہ تھا۔ وہ گھر جانے کے لئے اصرار کرتا رہا مگر نوشا کی ماں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ دالان میں چارپائی بچھا کر بستر لگا دیا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹا وہ باتیں کرتا رہا مگر زخموں میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں وہ زیادہ دیر باتیں نہ کر سکا۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ بارش کے قطرے شیشم کے پتوں پر گرتے رہے۔ ہوا کی تیز سرسراہٹ رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب بارش کا زور ٹوٹا۔ مینہ بند ہو گیا تھا۔ لیکن ہوا تیز چلتی رہی۔ بادل رہ رہ کر گرجتے۔ اچانک رات کے سناٹے میں، دروازے پر نیاز کی آواز اُبھری۔ نوشا کی ماں تذبذب میں پڑ گئی کہ اس وقت نیاز کو گھر میں بُلایا جائے یا ٹال دیا جائے۔ سلمان کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچے۔ مزاج کا وہ یوں بھی شکی تھا۔ خدا معلوم کیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ وہ خاموش لیٹی یہی سوچ رہی تھی کہ نیاز نے اُونچی آواز سے انّو کو پکارا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اُس کو ناراض بھی کرنا نہ چاہتی تھی۔ بادلِ ناخواستہ اُس نے خود اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ نیاز گھر کے اندر آ گیا۔ سلمان کو دالان میں دیکھ کر بولا۔

"یہ کون لیٹا ہے؟"

سلمان نے نیاز کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ گھبرا گیا کہ اگر نیاز نے اُسے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہو گا۔ اس گھر میں اس کا جو بھرم قائم تھا وہ فوراً خاک میں مِل جائے گا۔ نیاز اس کے سارے حالات سے نوشا کی ماں کو آگاہ کر دے گا۔ وہ کسی قیمت پر یہ نہ چاہتا تھا کہ یہ باتیں اُس کو معلوم ہوں۔ وہ سہما ہوا دم سادھے چپ لیٹا رہا اور آنے والے حادثہ کا انتظار کرتا رہا۔

نیاز کے اچانک استفسار پر نوشا کی ماں لمحہ بھر کے لئے گھبرائی، لیکن فوراً ہی اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ کہنے لگی۔ "بھائی اچھّن کا منجھلا لڑکا ہے۔"

خیریت یہ ہوئی کہ اُس نے سلمان کا نام نہیں بتایا۔ لیکن نیاز کسی بھائی اچھّن کو نہیں جانتا تھا۔ لحظہ بھر کے لئے اُس نے غور کرنے کی کوشش کی۔ پھر بولا۔

"کون بھائی اچھّن؟"

وہ اِس سوال کے لئے تیار تھی۔ "اے وہی خالہ بخّو کے بڑے بیٹے اور کون؟" اُس نے قدرے توقف کیا۔ "مگر تم نے اُن کو کہاں دیکھا ہوگا۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" نیاز نے کہا۔

"وہ لوگ جب سے پاکستان آئے ہیں، مُلتان ہی میں ہیں۔ کبھی یہاں آتے تو تم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ یہ لڑکا کل آیا تھا۔ شام تک اچھا بھلا تھا، اِس وقت بخار میں بھُن رہا ہے۔"

نیاز نے حیرت سے کہا۔ "بارش میں تو نہیں بھیگ گیا؟" وہ سلمان کی طرف بڑھا، قریب جاکر اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کا اندازہ لگایا۔ سلمان کی سانس لحظہ بھر کے لئے رُک گئی۔ "ارے اس کو تو بڑا تیز بخار ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے سلمان کو غور سے دیکھا جو دیوار کی طرف منہ موڑے لیٹا تھا۔ نیاز کو کچھ شبہ ہُوا مگر سلمان کے چہرے پر اندھیرا چھایا تھا۔ لہذا وہ اُس کو پہچان نہ سکا۔

نوشا کی ماں نے جلدی سے بات کا رُخ پلٹ دیا۔ وہ نوشا کے اچانک گھر سے چلے جانے کی خبر سُنانے لگی۔ مگر نیاز نے اُس کی بات سُن کر کسی تشویش کا اظہار نہ کیا۔ اظہارِ ہمدردی بھی نہ کیا۔ بے نیازی سے بولا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن ٹھوکریں کھائے گا۔ ساری آوارہ گردی نِکل جائے گی۔"

نوشا کی ماں کو نیاز کا رویّہ اچھا نہ لگا۔ وہ اُس سے ہمدردی کے دو بول سُننے کی خواہش مند تھی۔ نیاز، نوشا کے ذکر کو نظر انداز کر کے کوئٹہ کی باتیں بتانے

لگا۔ وہ چُپ بیٹھی سب کچھ سُنتی رہی۔

نیاز زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُٹھ کر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ جتنی دیر نیاز بیٹھا باتیں کرتا، اتنی دیر اُس کی جان سُولی پر لٹکی رہی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آئندہ اِس گھر میں آتے وقت اُس کو احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اُن کی باتوں سے یہ تو واضح ہو چکا تھا کہ نیاز، نوشا کی ماں کا رشتہ دار تھا اور وہ نیاز سے اُس کی آمد و رفت چھُپانا بھی چاہتی تھی۔ یہی اُس کے حق میں بہتر ہوا۔ ورنہ وہ دوبارہ اس گھر میں آنے کے قابل نہ رہتا۔

وہ دیر تک اِسی طرح سوچتا رہا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ بادل ایک بار زور سے گرجے اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے قطرے چھت پر شور مچانے لگے۔ سلمان کبھی کبھار درد سے کراہتا۔ بخار تیز ہو گیا تھا۔ اُس کا تمام جسم بھٹّی کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سلگ رہے تھے۔ سر میں شدید درد تھا۔

یکایک اُس نے اپنے قریب گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے کروٹ نہیں بدلی، خاموش لیٹا رہا۔ البتہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پہ ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ کوئی اُس کے سرہانے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ پھر اُس کو اپنے رخسار پہ ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ ایک ہاتھ اُس کے چہرے پر آکر رُک گیا تھا۔

وہ بے قرار ہو کر آہستہ سے بولا "سُلطانہ"

"شی" سلطانہ نے اُس کو خاموش کر دیا۔

سلمان نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اُس نے سلطانہ کا نرم نرم ہاتھ ہونٹوں کے پاس لا کر چُوم لیا۔ سُلطانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ

چُپ چاپ اُس کے پلنگ کے قریب کھڑی رہی - باہر تیز بارش ہوتی رہی - ہوا شیشم کے پتّوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی، بادل زور زور سے گرجتے -

کمرے کے اندر کروٹ بدلنے کی آواز اُبھری - سلطانہ نے سلمان کے چہرے پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور وہاں سے دُور چلی گئی - نہ جانے وہ کب کمرے میں گئی - کب اپنے بستر پر لیٹی - کب اُس کو نیند آئی - سلمان کو کچھ بھی پتہ نہ چلا - وہ دیر تک خاموش لیٹا سلطانہ کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتا - مگر وہ نہ آئی -

صبح ہوئی تو سلمان کا بخار ہلکا پڑ چکا تھا - زخموں میں ٹیس بھی کم تھی - اب ٹھہرنا مناسب نہ تھا - وہ سویرے سے ہی سویرے نوشا کے گھر سے چلا گیا -

(۴)

بیڑی کے کارخانے کی ہڑتال طُول پکڑتی جا رہی تھی، اور اِس کے ساتھ ہی نوشا کی ماں کی پریشانیاں بھی بڑھتی گئیں - کئی کئی وقت کے فاقے پڑ جاتے، گھر میں گرہستی ہی کون سی تھی، تھوڑا بہت جو سامان تھا وہ بازار میں فروخت ہونے لگا - کوئی ایسا کام نہیں مِل رہا تھا، جس سے پیٹ پالا جا سکے - سلائی کی مشین ہوتی تو پاس پڑوس کے کپڑے سی پرو کر بھی گزارہ ہو جاتا - خریدنے کے لئے، نوشا کی ماں نے کئی بار رقم جوڑی، مگر کوئی نہ کوئی ایسا خرچ نکل آتا کہ ساری بچت صَرف ہو جاتی -

وہ بستر پر لیٹی اپنی مالی پریشانیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی - نیند بھی نہیں آ رہی تھی - سلطانہ اور انو کب کے سو گئے تھے اور وہ خاموش پڑی رات کی گھڑیاں گن رہی تھی - اِسی اثناء میں نیاز آ گیا - وہ کئی روز بعد آیا تھا - بہت خوش نظر آ رہا تھا - بات بات پر ہنس رہا تھا - وہ سامان سے لدا پھندا آیا تھا، جس میں

مٹھائی تھی، پھل تھے اور سنگھار کی کچھ اشیاء تھیں۔ آتے ہی سارے بنڈل اُس نے نوشا کی ماں کے سامنے ڈال دیئے اور چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ کر بولا۔

"آج تو میں بہت تھک گیا۔"

وہ بولی۔ "خیریت تو ہے۔ کہاں سے تھکے ہارے آرہے ہو؟"

کہنے لگا۔ "بس کچھ پوچھو نا۔ پہلے تم مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس کے مارے گلا سُوکھ رہا ہے۔"

وہ فوراً پانی لے آئی۔ نیاز واقعی بہت پیاسا تھا۔ پُورا گلاس ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پانی پی کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نوشا کی ماں، نیاز کے لائے ہوئے سامان کو کھول کر دیکھنے لگی۔ شام کو گھر میں کچھ پکا نہیں تھا۔ سلطانہ اور انو بھُوکے سو رہے تھے۔ اُس نے سوچا دونوں کو جگا کر کچھ کھلا دے۔ مگر جب اس نے اپنا یہ ارادہ نیاز پر ظاہر کیا تو اُس نے منع کر دیا۔

"مجھ کو تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ سب اُٹھ جائیں گے تو بات کرنے کا موقعہ نہ ملے گا۔"

وہ چُپ ہو گئی۔ نیاز پلنگ اُٹھا کر باہر صحن میں لے گیا۔ دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ دُور تک ستاروں کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ نرم نرم ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ فضا میں خنکی تھی، مگر ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ نیاز نے اُس کا ہاتھ محبّت سے تھام لیا۔ اور بڑے پیار سے بولا۔

"آج میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ مجھ کو ہاں یا نا کا جواب دے دو۔"

وہ دبی زبان سے بولی۔ "کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔"

وہ اور بھی جذباتی ہو گیا۔ "تم ہر بار یہی کہہ دیتی ہو۔ اِسی آج کل میں کئی مہینے ہو گئے۔"

وہ ناز سے بولی ”کئی مہینے ؟ اے توبہ کرو۔“

وہ کہنے لگا ”بس اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مبارک دن ہے۔ اُسی روز نکاح ہو جانا چاہیئے۔“

نوشا کی ماں گھبرا کر بولی ”ارے، ارے، اتنی جلدی۔“

نیاز نے بڑے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ رخساروں کو تھپک کر بولا ”مجھ سے تو اب گھڑی بھر بھی تم سے الگ نہیں رہا جاتا۔ میری بات تم کو ماننا ہی پڑے گی۔“ نوشا کی ماں نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے جھٹ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم کو میری جان کی قسم جو انکار کیا۔ بس اب پروگرام طے ہو گیا۔“

اُس نے چاہا کہ حسبِ معمول اس وقت بھی نیاز کو ٹال دے۔ مگر وہ اُس کے سر ہو گیا۔ بگڑ کر بولا ”اگر اس جمعہ کو نکاح نہیں ہو سکتا تو پھر کبھی نہ ہو گا۔“ حالات کچھ اس قدر خراب تھے کہ وہ اس دھمکی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ روز روز کی فاقہ کشی اور گھریلو پریشانیوں نے اُس کو بے بس کر دیا تھا۔ اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ چُپ چاپ اُس کی بات مان لی۔

نیاز نے اُسی وقت ضروری اخراجات کے لئے جیب سے نکال کر دو سو روپے دیئے اور پروگرام بھی بتا دیا۔ کہنے لگا ”جمعہ کو فجر کے وقت، میں قاضی جی کو لے کر آجاؤں گا۔ میرے خیال میں یہ سب سے مناسب وقت رہے گا۔ میرے ساتھ صرف چند آدمی ہوں گے۔ تم سارا بندوبست کر لینا۔ جی چاہے تو پڑوس سے کسی بڑی بوڑھی کو بھی بُلا لینا۔“ وہ گویا ساری اسکیم پہلے ہی تیار کر کے آیا تھا۔ ایک ایک بات بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ نوشا کی ماں چُپ بیٹھی اُس کی باتیں سُنتی رہی۔

جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو وہ خلافِ توقع رات ہی کو اُٹھ کر چلا گیا۔

نوشا کی ماں نے حامی تو بھر لی۔ مگر رات بھر بے چینی سے جاگتی رہی۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اُس کو سب سے زیادہ فکر سلطانہ کی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ اسی اُدھیڑبن میں رہی۔ بار بار خاموش نظروں سے سلطانہ کو دیکھتی۔ اُس کی بھری ہوئی جوانی کو، اُس کے نکھرتے ہوئے حسُن کی دلکشی کو، اور ہر بار کسی آنے والے خطرے کے احساس سے کانپ اُٹھتی۔

اب صرف ایک دن اور رات باقی تھے۔ اس کی اُلجھن بڑھتی گئی۔ اس بات کو اب سلطانہ سے چھپایا بھی نہ جا سکتا تھا۔ مگر یہ بات اُس سے کہتی بھی تو کس منہ سے۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود اپنی بیٹی سے ڈر رہی تھی۔ اُس سے بات کرتے ہوئے اُسے خوف معلوم ہو رہا تھا۔ آخر جھجکتے ہوئے اُس نے سلطانہ کو اپنے قریب بُلایا۔

وہ اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے گزُر گئے۔ مگر ماں سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ بہت دیر بعد اُس نے دبی زبان سے کہا۔

"تم سے ایک بات کہنا تھی۔"

ماں کے بدلے ہوئے لہجہ پر سلطانہ کو تعجب ہوا۔ پُوچھنے لگی: "کیا بات ہے اماں؟"

وہ بولی۔ "کیا بتاؤں کیا بات ہے!" وہ آگے نہ کہہ سکی۔ سلطانہ نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

ماں نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "کل رات نیاز آیا تھا۔" سلطانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں ماں نے اُس کا رشتہ نیاز سے تو طے نہیں کر دیا۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

ماں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا!" سُلطانہ کی سانس حلق میں رُک گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے

پوچھا۔ "کس سے؟"

ماں نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ "میرے ساتھ" اور یہ کہتے کہتے اس کا چہرہ پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ اس کا جسم اس طرح جھنجھنایا جیسے کہیں قریب ہی چینی کی پلیٹ گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اُس کی زبان سے ایک نقطہ نہ نکلا۔ ماں بھی چپ ہو گئی۔ کہنا تو اُس کو ابھی بہت کچھ تھا۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنا تھا۔ اور بیٹی سے معذرت کرنی تھی۔ مگر وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔

"جمعہ کو فجر کے وقت نکاح ہے۔"

یہ بات اُس نے اس انداز سے کہی، جیسے کنویں کے اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔ وہ زیادہ دیر سلطانہ کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ سلطانہ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ کیا کہے۔ ماں اُٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ ٹرنک کھول کر سامان اُلٹنے پلٹنے لگی۔

چند منٹ بعد باہر نکلی تو سلطانہ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "میں ایک کام سے بڑی ممانی کے ہاں جا رہی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ گھر سے باہر چلی گئی۔ سلطانہ اُس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ انّو اسکول جا چکا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یا اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کسی انجانے خوف کے احساس سے وہ بار بار کانپ اُٹھتی۔ اچانک سلمان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلے تو وہ جھجکی، پھر ہمت کر کے اُسے اندر بلا لیا۔

سلمان حسبِ معمول کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازے پر سلطانہ کا چہرہ نظر آیا۔ مگر وہ کمرے کے اندر نہ آئی۔ دہلیز سے لگی کھڑی رہی۔ اس روز وہ بڑی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی آنکھیں اور رخساروں پر ڈھلتی رات کی سی دھند۔ اُس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ اب آئندہ وہ اس سے نہ مل سکے گی۔ کل نیاز اُس کا سوتیلا باپ بن جائے گا۔ اور جب وہ اس کا

سوتیلا باپ بن جائے گا تو یہ گھر اُس کا ہو جائے گا۔ وہ کسی صورت میں سلمان کو اپنے گھر میں آنے نہ دے گا۔ سلمان اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا۔ محبت سے اُس کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا۔

"کیا بات ہے۔ تم بہت اُداس لگ رہی ہو۔ امّاں نے کچھ کہا ہے؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "نہیں۔"

"تو پھر بات کیا ہے؟"

مگر وہ کچھ نہ بولی اور اُس کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وہ پیار سے اُس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ دونوں اسی طرح مبہوت کھڑے تھے۔ ناگاہ ماں دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اُن کو اس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ اُس نے دونوں کو اس عالم میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ لمحہ بھر تک وہیں دروازے کے قریب گُم صُم کھڑی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر چلی گئی۔ دروازہ باہر سے بند کیا اور خواہ مخواہ کواڑ کھٹکھٹانے لگی۔ ذرا دیر بعد خود ہی دروازہ کھول کر بڑبڑاتی ہوئی اندر آئی۔

"اے لو دروازہ تو کھُلا ہے۔ میں سمجھی کہ اندر سے بند ہے۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔"

سلطانہ اب وہاں نہ تھی۔ وہ دالان کے کُنکڑے پر کھڑی جلدی جلدی آنسو پونچھ رہی تھی۔ سلمان کمرے کے اندر جا چکا تھا۔ ماں سیدھی وہیں پہنچی اور سلمان کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔ "ارے تم کب آئے؟"

"بس ابھی ابھی آیا تھا۔"

"آج تو بڑا حبس ہے۔" اُس نے دروازے سے منہ نکال کر سُلطانہ سے کہا۔ "سلطانہ! تم ذرا ہمسائی کے پاس چلی جاؤ۔"

سُلطانہ نے وہیں سے جواب دیا۔ "جی اچھا۔" اور یہ کہتی ہوئی وہ گھر سے باہر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔ "یہاں دالان

میں آجاؤ۔ اندر تو گرمی سے دم بولا رہا ہے۔"

سلمان خاموشی سے اُٹھ کر باہر آگیا۔ نوشا کی ماں تھکی ہوئی سی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر سکوت رہا۔ وہ چُپ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اُس نے کہا "میں تو ایسے چکر میں پھنس گئی ہوں۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"خیریت تو ہے؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"اب تم کو کیا بتاؤں کہ کس پریشانی میں گرفتار ہوں"۔

سلمان اصرار کرنے لگا "کوئی خاص بات ہے؟"

بولی "ہاں خاص ہی بات ہے۔ اب تم سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ سلطانہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے کنکھیوں سے سلمان کے ردِ عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ اُس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ گھبرا کر بولا "کب؟"

"کل" اُس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ وہ برابر سلمان کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس نے غور کیا کہ اس دفعہ گھبراہٹ کے بجائے حیرت کا اظہار زیادہ تھا۔ سلمان کہہ رہا تھا۔

"کل یعنی جمعہ کو، آپ نے پہلے نہیں بتایا۔"

وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی "میں خود بھی اتنی جلدی نہیں چاہتی تھی۔ مگر خاندان کے بڑے بوڑھوں نے مجبور کر کے دن تاریخ مقرر کر دی۔"

سلمان کا چہرہ رفتہ رفتہ اُداس ہوتا گیا۔ وہ تھکے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"کہاں رشتہ کیا ہے؟"

"خاندان ہی کا لڑکا ہے۔ برسرِ روزگار ہے۔ مزاج بھی اچھا ہے۔"

سلمان زیادہ دیر تک اُس کی تعریف نہ سُن سکا۔ بات کاٹ کر بولا۔

"خدا مبارک کرے۔" اُس نے بڑا رسمی سا جملہ کہا اور چپ ہو گیا۔ نوشا کی ماں نے بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سلمان اب خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اسی عالم میں وہ اچانک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب میں چلوں گا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بیٹھو، چلے جانا۔"

مگر اب وہ لمحہ بھر بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ نوشا کی ماں چاہتی تھی کہ وہ کچھ دیر اور ٹھہرے۔ کچھ بات چیت ہو۔ اور اُس نے ابھی ابھی جو صاف جھوٹ بولا تھا اُس کا کچھ نتیجہ برآمد ہو۔ مگر سلمان نے اس کا موقعہ ہی نہ دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ اس وقت وہ کچھ عجیب اول جلول لگ رہا تھا۔

وہاں سے نکل کر راستہ میں وہ صرف سگرٹ خریدنے کے لئے ٹھہرا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر یوں گر پڑا۔ جیسے مدّت کا بیمار ہو۔ اُس نے نہ جُوتا اُتارا، نہ کپڑے تبدیل کئے۔ بس خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا اور لگاتار سگرٹ پیتا رہا۔ یہ عجیب سا غم تھا، عجیب سا احساس تھا، ایسا بوجھ تھا جس سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اپنی بے پرواہ زندگی میں، اِس سے قبل اُس نے سلطانہ کی اس قدر اہمیت محسوس نہ کی تھی۔ وہ اُس کو صرف ایک عام سی لڑکی سمجھتا تھا، جو جوان تھی۔ الھڑ تھی۔ خوب صورت تھی۔ آج اچانک وہ معمولی لڑکی، غیر معمولی لڑکی بن گئی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ بار بار چونک پڑتا۔ دل سے ہُوک اُٹھتی۔ کوئی اُس کے وجود میں بار بار چیختا۔

"یہ کیا ہو گیا؟"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اُس کا وجُود سوالیہ نشان بن جاتا۔

شام تک وہ اسی کرب اور اسی دُکھ میں بتلا رہا۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ سگرٹیں پھُونکتے پھُونکتے اُس کا گلا خشک ہوگیا تھا۔ ہونٹ جلنے لگے تھے۔ جب کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تو اُس نے اُٹھ کر دو گلاس پانی کے پیے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ انسانی آوازوں کا شور تھا۔ زندگی ہنس رہی تھی۔ نکھر رہی تھی۔ گرمیوں کی شام کا حُسن جوبن پر تھا۔

اُس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے دیکھا کہ وہ نوشا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ نوشا کی ماں نے اُسے فوراً اندر بُلوا لیا۔ وہ جیسے اُس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولی۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

سلمان گھبرا گیا۔ لمحہ بھر چُپ رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا "ایک بات کہوں، آپ بُرا تو نہیں مانیں گی۔" اُس کی آواز میں ہلکا ہلکا ارتعاش تھا۔

نوشا کی ماں یہی بات اُس کی زبان سے سُننا چاہتی تھی۔ مجسّم سوال بن کر بولی۔ "ہاں ہاں، کہو کیا بات ہے؟"

بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل گیا۔ "آپ سلطانہ کی شادی نہ کریں۔" کہنے کو تو اُس نے یہ بات کہہ دی۔ مگر یہ کہہ کر خود ہی پشیمان بھی ہو گیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سلمان نے فوراً کہا۔ "آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں مانا؟"

وہ بولی۔ "یہ بات نہیں ہے سچ پوچھو تو مجھ کو خود بھی یہ رشتہ زیادہ

پسند نہیں۔ پھر سوچتی ہوں کہ سیانی لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھوں گی۔ کوئی اچھا بَر بھی تو نہیں ملتا۔"

سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا۔" میں اپنے متعلق اگر کچھ کہوں ـــ" وہ پوری بات نہ کہہ سکا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب سُننے کا انتظار کرنے لگا۔

ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر نوشا کی ماں کی آواز اُبھری۔

" یہ بات کاش تم نے چند روز پہلے کہی ہوتی۔" اُس نے لمحہ بھر توقف کیا۔" تمہارے ساتھ سلطانہ کا رشتہ کرتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

بات بھی یہی تھی۔ رات بھر میں وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کل سے نیاز اس گھر کا مالک بننے والا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس رشتے میں کیا کیا رخنے ڈالے۔ اُس نے بڑے دُکھ سے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہی باتیں اُس نے چند روز قبل سلمان سے کہی ہوتیں۔ مگر چند روز قبل اُس کو ان دونوں کی محبت کا علم ہی کب تھا۔ سلمان اُس کو خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔" ابھی تو آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔" پھر وہ بچوّں کی طرح مچل کر بولا۔

" اللہ کے لئے کچھ کیجئے۔"

نوشا کی ماں نے نظر بھر کر اُسے دیکھا اور پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔" اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں سلطانہ کو تمہارے ساتھ کر دوں۔ دنیا زیادہ سے زیادہ یہی تو کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی۔ میں یہ رسوائی بھی قبول کر لوں گی۔" وہ لمحہ بھر کے لئے رُکی۔" کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی قاضی یا مولوی کو اپنے ساتھ لے آؤ کہ میں دو بول نکاح کے پڑھوا دوں۔ تم اس کے لئے تیار ہو؟"

سلمان فوراً آمادہ ہو گیا۔

وہ بولی۔" ابھی جھٹ پٹا ہے۔ تم گیارہ بجے تک آجاؤ۔ میں سلطانہ کو تیار کئے دیتی ہوں۔ جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

سلمان چُپ چاپ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد، وہ باورچی خانے

میں سلطانہ کے پاس گئی۔ سلطانہ کھانا پکا چکی تھی۔ چولھے کے قریب بیٹھی تنکے سے گرم گرم راکھ کُرید رہی تھی۔ ماں نے وہاں پہنچتے ہی سلطانہ سے کہا۔

"جا بیٹی جلدی سے نہالے۔"

اُس نے اچنبھے سے پُوچھا "کیوں اماں ؟"

وہ مُسکرا کر بولی۔ "بس جو مَیں کہہ رہی ہوں، وہ کرلے۔"

وہ اُس وقت بڑی مسرُور نظر آرہی تھی۔ بات بات پر اُس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ سلطانہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اُسے ماں کی معنی خیز مسکراہٹ کا کوئی سبب نظر نہ آیا۔ وہ چُپ چاپ اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

ماں جلدی سے کمرے میں گئی۔ اُس نے ٹرنک کھول کر سلطانہ کا سب سے قیمتی جوڑا نکالا۔ افشاں کاٹی اور مہندی گھول کر، سلطانہ کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل کر کے نکلی۔ ماں قریب بٹھا کر اُس کے ہاتھ پیروں پر مہندی لگانے لگی۔ پھر اُس نے اتّو کو بازار بھیج کر عطر، پھُولوں کے گجرے اور لباس عروسی کی آرائش کا دوسرا سامان منگوایا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی سب کچھ دیکھتی رہی۔ مگر جب وہ اس کو سُرخ ریشمی جوڑا پہنانے لگی تو اُس نے پریشان ہو کر کہا۔

"اماں یہ تم سب کچھ کیا کر رہی ہو ؟"

ماں نے اُس کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مصنوعی غصّہ سے ڈانٹ کر بولی۔ "چُپکی بیٹھی رہ، ہر معاملہ میں نہیں بولا کرتے۔"

سلطانہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں اتّو سارا سامان بازار سے لے کر آگیا۔ ماں نے اپنے ہاتھوں سے سلطانہ کے بال گوندھے۔ سُرخ جوڑے پر عطر سہاگ لگایا۔ بالوں میں افشاں چُنی۔ پھولوں کے گجرے پہنائے۔ جب سلطانہ دُلھن بن گئی تو ماں نے آہستہ سے کہا۔

"گیارہ بجے سلمان تجھ کو لینے آئے گا۔"

سلطانہ حیرت سے دم بخود رہ گئی۔ لمحہ بھر تک سکتے کے عالم میں، ماں کے چہرے کو تکتی رہی۔ پھر اُس نے بیک وقت متضاد کیفیت محسوس کی۔ اس میں خوشی بھی تھی اور بے چارگی بھی۔ ماں نے بڑی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بیٹی! میری تو خوشی تھی کہ میرے گھر بارات چڑھتی۔ میں تجھ کو دھوم دھڑکے سے رخصت کرتی۔ مگر قسمت میں یونہی لکھا تھا، میری بچی مجھے معاف کرنا۔"

سلطانہ نے سر جھکا لیا اور خاموش بیٹھی رہی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ سلطانہ کے بھی آنسو نکل آئے۔ ماں نے اس کو روتے دیکھا تو جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔ زبردستی مُسکرا کر بولی۔

"اری پگلی تُو کیوں روتی ہے۔ لو بھئی یہ بھی ایک رہی۔"

پھر اُس نے سلطانہ کے خود ہی آنسو پونچھے اور اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ سلطانہ خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کا سارا جسم تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ چہرے پر چاندنی راتوں کا عکس تھا۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ دل میں وہ دبا دبا خوف تھا جو ہر دوشیزہ لباسِ عروسی پہننے کے بعد محسوس کرتی ہے۔ ذرا دیر بعد ماں اُس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک طشتری میں پھل اور مٹھائی لائی تھی۔

بھادوں کی مدھ ماتی رات باہر آنگن میں اُتر آئی تھی۔ شیشم کے پتّے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ بادلوں کے ہلکے پھُلکے ٹکڑے، عُود و لوبان کے مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔ رات بھیگتی گئی۔

گیارہ بج گئے۔

ماں کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ سلطانہ کا دل بار بار دھڑک رہا تھا۔ اور یہ دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ رات کی آنکھوں کا کاجل پھیل گیا۔ تاریکی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ بہت دیر ہو گئی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ نہ کسی کے قدموں کی آہٹ اُبھری نہ

دروازے پر دستک ہوئی۔

رات آدھی ہوگئی۔

رات ڈھلنے لگی۔ راستے قبرستان کی طرح سُنسان ہوگئے۔ ہر طرف ہُو کا عالم ہوگیا۔ دونوں جاگ رہی تھیں۔ ہر آہٹ پر ماں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ پھر مدھم ہوتے ہوتے اس قدر سُست پڑ جاتی کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔

رات اور ڈھل گئی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ اُفقی سرحدوں پہ کافوری شمعیں روشن ہوگئیں۔ اُجالا مشرق کے غاروں سے سر اُبھار رہا تھا۔ ماں کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں۔ اچانک گلی میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز اُبھری۔ کہیں دُور چاپ سُنائی دی۔ کوئی آرہا تھا۔

کھٹ، کھٹ، کھٹ۔

قدموں کی آہٹ قریب ہوتی گئی۔ قریب اور قریب!

قدموں کی آہٹ عین دروازے پر پہنچی تو سلطانہ کا دل دھڑکتے دھڑکتے جیسے ٹھہر گیا۔ ماں ایک ٹک دروازے کو تکتی رہی۔ پھر پاگلوں کی طرح اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

دروازے پر کوئی دستک نہ ہوئی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ جانے والا آگے چلا گیا۔ چاپ، دُور ہوتی گئی۔ دُور اور دُور۔ اُسی وقت برابر والے گھر میں مُرغ نے بانگ دی۔ سحر ہو رہی تھی۔ رات کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

ماں لڑکھڑا کر سلطانہ کے قریب بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ مُردے کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بجھتے ہوئے چراغوں کی مانند نظر آرہی تھیں۔ ذرا دیر وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی! یہ لباس اُتار دو!" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اُس نے

سلطانہ کو اپنے سینہ سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دونوں سسکیاں بھر کر دیر تک روتی رہیں۔

باہر صبح کاذب کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ وقت کم تھا۔ ماں جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سلطانہ سے کہا "میں نہانے جا رہی ہوں۔ تم دالان میں چاندنی بچھا دو۔ وہ لوگ اب آتے ہی ہوں گے۔" یہ کہتی ہوئی وہ غسل کرنے چلی گئی۔

ماں غسل کر کے نکلی۔ اُس نے دیکھا۔ سلطانہ دالان میں چاندنی بچھا رہی تھی۔ سُرخ لباس اُس نے اُتار دیا تھا۔ افشاں پونچھ ڈالی تھی۔ پھولوں کے گجرے، مٹی کے گھڑوں پر لٹک رہے تھے۔ ماں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اُس سے نظریں نہ ملا سکی۔ چُپ چاپ کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی۔

جب مسجدوں میں فجر کی نماز ختم ہو گئی اور گلی میں تھوڑی بہت چہل پہل شروع ہو گئی تو نیاز گھر میں داخل ہوا۔ قاضی کے علاوہ اُس کے ہمراہ چار آدمی اور تھے۔

برسات کی اس دُھندلی صبح چُپ چپاتے نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد حبیب احمد مرحوم کی بیوہ مسماۃ رضیہ بیگم، نیاز کی منکوحہ اور سلطانہ، سوتیلی بیٹی بن گئی۔ اب وہ اس کنبہ کا سربراہ تھا، اس گھر کا مالک تھا۔

○

فصل چہارم

(۱)

شاہ جی کے سفید دیواروں والے مکان میں رہتے ہوئے نوشا اور راجہ کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں نہ تو شاہ جی سے اُن کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ نہ کوئی کام کرنا پڑا۔ دونوں وقت ہوٹل سے کھانا آجاتا۔ صبح و شام ایک ایک پیالی چائے کی ملتی اور روزانہ ایک پیکٹ بگلا مارکہ سگرٹ کا بھی مل جاتا۔ کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے مکان کی چار دیواری کے اندر رہنا پڑتا۔ دروازے پر ہر وقت ایک پٹھان اسٹول پر بیٹھا رہتا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو ٹوکتا۔ ایک بار دونوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو وہ آنکھیں نکال کر چیخا۔

"خو تم کیدھر جاتا ہے۔ تمارا باہر جانے کا منادی ہے۔ جاؤ کمرے میں جاؤ۔ ایدھر مت آؤ۔"

اُس کے چلانے سے وہ اس قدر خائف ہوئے کہ دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کیا۔ رہنے کو کمرہ مل گیا تھا۔ دونوں تمام دن اسی میں پڑے رہتے۔ کمرے

میں ایک کھڑکی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی، دل گھبراتا تو بندروں کی طرح جھک جھک کر باہر جھانکتے۔ اس طرف گلی تھی جس کے دونوں طرف اونچے نیچے مکانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ گلی میں دن بھر، ننگ دھڑنگ گندے بچے شور مچاتے۔ عورتیں دروازوں کی دہلیز پر بیٹھ کر اونچی آوازوں سے باتیں کرتیں۔

دن کے وقت مکان میں سناٹا چھایا رہتا۔ کبھی کبھار شاہ جی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی۔ وہ عام طور پر کمرے کے اندر رہتا تھا۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ نکل کر باہر آتا۔ رات کے وقت البتہ نئی نئی شکلیں نظر آتیں۔ جو بھی آتا، سیدھا شاہ جی کے کمرے میں جاتا، جہاں سے آدھی رات تک باتیں کرنے کی آوازیں ابھرتی رہتیں۔

ایک بار چھت پر قوالی بھی ہوئی۔ بڑا جشن رہا۔ اس روز سہ پہر ہی سے چھت پر چھڑکاؤ شروع ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہی دو گیس بتیاں بھی آگئیں۔ چھت پر دری اور چاندنی کا فرش ہو گیا۔ قوالوں کی چوکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ پہر رات گزری۔ شاہ جی چھت پر آیا اور مسند سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی لباس میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ ململ کا کلف دار کرتا، کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے کی شلوار، ہاتھ میں ریشمی رومال اور بالوں میں پڑا ہوا خوشبودار تیل، جو تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔

شاہ جی نے اشارہ کیا اور قوالی شروع ہو گئی۔ نوشا اور راجہ بھی اس محفل میں شریک تھے اور ایک کونے میں دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ شاہ جی قوالی سنتا رہا۔ جھومتا رہا اور قوالوں کو روپے بانٹتا رہا۔ ایک کے بعد دوسری چوکی آتی رہی۔ اپنے کمالات دکھا کر داد پاتی رہی۔ انعام لیتی رہی۔ ساری رات یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راجہ اور نوشا قوالی سنتے سنتے وہیں چھت پر سو گئے تھے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ مگر وہ اس زندگی سے جلد ہی اُکتا گئے۔ ایک دن راجہ نے پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔" یار ہم دونوں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔ نہ کوئی کام ہے، نہ کاج۔ ہر وقت گھر کے اندر بند۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتے۔ مجھے تو کچھ معاملہ گڑ بڑ لگتا ہے۔"

نوشا نے اُس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔" ابے تجھ کو ہر جگہ گڑ بڑ ہی نظر آتی ہے۔"

راجہ نے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔" یار نہ جانے کیوں مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔"

دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے اُسی روز شاہ جی کے پاس دونوں کی طلبی ہوئی۔ وہ اُس وقت ایک چوڑی سی کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی ہنس کر بولا۔

" ہاں جی! تم دونوں نے خوب آرام کر لیا۔ اب کچھ کام وام بھی ہونا چاہیے۔"

دونوں اُس کے سامنے خاموش کھڑے رہے۔ وہ کہتا رہا۔" سوچتا ہوں آج تمھاری بھی ڈیوٹی لگا دی جائے۔" اُس نے سگرٹ نکال کر سلگائی۔

" لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لو۔ میرے ساتھ ٹھیک ٹھیک کام کرنا ہو گا۔ میں بُرے آدمیوں کے ساتھ بہت بُرا ہوں۔" دونوں نے گردنیں ہلا کر اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

" یوں گائے کی طرح گردن ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میرے سامنے قسم کھاؤ۔"

دونوں نے قسمیں کھائیں۔

شاہ جی نے نورخاں کو آواز دی۔" نورے ادھر آ۔" فوراً ہی ایک لمبا تڑنگا آدمی کمرے کے اندر داخل ہوا۔ دونوں پہلے بھی اُسے گھر میں دیکھ چکے تھے۔ مگر کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی نے نورے سے کہا۔

"یہ دونوں آج سے تیرے چارج میں رہیں گے۔ ویسے ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ اب ان سے تُو نے کام لینا ہے۔ آج ہی ان کو گشت پر لے جا۔"

نور خاں عرف نورے نے بڑی مستعدی سے جواب دیا "اچھا جی۔ جیسا آپ حکم کریں۔ اللہ نے چاہا ویسا ہی ہوگا۔"

شاہ جی اب ان دونوں سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو جی! یہ تم دونوں کو کوٹھیوں پر لے جائے گا۔ صرف تم ہی اندر جاؤ گے۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ وہاں جاکر تم کہنا کہ ہم نوکری کرنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے لئے تھوڑی سی اپنی مصیبت بھی بیان کر دینا تاکہ آسانی سے ملازمت مل جائے۔ جو تنخواہ دیں اُسی پر کام شروع کر دینا۔ جس روز تم کو نوکری مل جائے۔ اُس کے دوسرے دن نورے تم سے ملنے آئے گا۔ جو کچھ یہ پوچھے ٹھیک ٹھیک بتانا۔ اس کے بعد یہ جیسا کہے، ویسا ہی کرنا۔ سمجھ گئے نا سب باتیں۔"

دونوں نے فوراً کہا "ہاں جی سب سمجھ گئے۔"

وہ بولا "اچھا تو اب تم دونوں جاؤ۔" اُس نے نورے کو ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا "لے یہ چائے پانی کو رکھ لے۔"

نورے نے سلام کیا اور دونوں کے ہمراہ کمرے سے باہر آگیا۔ وہ اُنہیں قریب کے کمرے میں لے گیا اور وہاں دیر تک بہت سی باتیں سمجھاتا رہا۔ یہ باتیں تقریباً وہی تھیں جو شاہ جی اُن سے کہہ چکا تھا۔

شام ہونے سے کچھ دیر قبل نورے دونوں کو اپنے ہمراہ جمشید روڈ کی طرف لے گیا۔ بس سے اُتر کر اُس نے سڑک کے دونوں جانب بنی ہوئی کوٹھیوں کو غور سے دیکھا۔ اُس کی نظروں میں سراغ لگانے والے کھوجی کی سی چمک تھی۔ کچھ دُور چل کر وہ عامل کالونی کی جانب مُڑ گیا۔ تینوں آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آگے آگے نورے تھا۔ اُس کے پیچھے راجہ اور نوشا تھے۔ آخر ایک موڑ

پر نورُے ٹھہر گیا۔ اُس کی نظریں ایک دو منزلہ کوٹھی کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں جس کے لان میں کئی بچے کھیل رہے تھے۔ ذرا دیر وہ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر دونوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"بس جی یہیں سے بسم اللہ کرو۔"

ایک بار پھر اُس نے ضروری ہدایتیں دیں اور اُنہیں دو منزلہ کوٹھی کی جانب روانہ کر دیا۔ نورُے وُہیں کھڑا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ گئے۔ نوشا اندر جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ مگر راجہ جھٹ اندر داخل ہو گیا۔ نوشا بھی چلا گیا۔ نورُے دونوں کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

چند ہی منٹ بعد دونوں واپس آگئے۔ دریافت کرنے پر اُنہوں نے بتایا کہ فی الحال وہاں کسی ملازم کی ضرورت نہیں۔ نورُے نے اُن کو دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ ہنس کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ دوسری جگہ کوشش کرتے ہیں۔"

وہ اُن کو ایک اور کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں بھی کام نہ بنا۔ نورُے کی ہدایت کے مطابق وہ کئی کوٹھیوں میں گئے۔ مگر کام کہیں نہیں ملا۔ آخر رات گئے تینوں اڈے پر واپس آگئے۔

دوسرے دن نورُے سویرے ہی سویرے اُن کو لے کر گشت پر نکل گیا۔ اس بار وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گئے۔ دن چڑھے تک دونوں نے کئی جگہ کوشش کی۔ ایک کوٹھی میں ملازمت مل رہی تھی مگر وہاں پٹھان چوکیدار تھا اور اُس سے بھی زیادہ خطرناک وہ کتا تھا، جس کے بھونکنے کی آواز دُور سے سُنائی پڑتی تھی۔ جس وقت نورُے نے دونوں کو اس کوٹھی میں بھیجا تھا، چوکیدار کتے کے ساتھ کہیں گیا ہُوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگیا۔

اُسے دیکھا تو نورے نے فوراً پروگرام بدل دیا۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے اُن کا کام بن گیا۔ مگر ملازمت صرف راجہ کو ملی۔ نوشا ڈھیلا ڈھالا لگتا تھا۔ بولتا بھی شرما شرما کر تھا۔ مگر راجہ خوب چاق چوبند تھا۔ اُس نے بڑی مستعدی سے تڑاق پڑاق باتیں کیں۔ یہ ایک انجینئر کی کوٹھی تھی۔ وہ خود تو اُس وقت دفتر میں تھا۔ گھر پر اُس کی بیوی تھی۔ وہ تیز طرار قسم کی عورت تھی۔ راجہ کی تیزی اُس کو پسند آگئی۔ اُس نے ۲۵ روپے ماہوار اور دونوں وقت کے کھانے پر اُس کو ملازم رکھ لیا۔ راجہ تو وہیں رُک گیا۔ نوشا واپس آگیا۔ اُس نے یہ اطلاع آکر نورے کو دی۔ اُس کے چہرے پر کامیابی کی خوشی لہرا گئی۔ نورے اور کہیں نہیں گیا۔ نوشا کے ہمراہ واپس آگیا۔

اُس رات نوشا کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ اکیلے کمرے میں اُس کا دل گھبرا رہا تھا۔ پہلے وہ راجہ کو یاد کرتا رہا۔ پھر راجہ کی یاد کے سہارے وہ بہت دُور چلا گیا۔ جہاں اُس کا اپنا گھر تھا۔ ماں تھی، بہن تھی، چھوٹا بھائی تھا۔ اُس کو گھر کی ایک ایک بات یاد آنے لگی اور اُن کو یاد کرتے کرتے وہ رو پڑا۔ دیر تک خالی کمرے میں اُس کی سسکیاں آہستہ آہستہ اُبھرتی رہیں۔ وہ اسی طرح روتے روتے سو گیا۔

دوسرے دن بھی اُس کی طبیعت پریشان رہی۔ تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ بے چینی کے عالم میں وہ اکیلے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ تھک جاتا تو لیٹ جاتا۔ گھنٹوں گلی میں کھلنے والی کھڑکی سے لگا خواب ناک نظروں سے باہر تکتا رہا۔ شام ہوئی تو نورے اُس کے پاس آیا اور اپنے ہمراہ ہاؤسنگ سوسائٹی لے گیا۔

نورے کوٹھی سے کچھ فاصلے پر ٹھیر گیا۔ اُس نے نوشا کو کوٹھی کے اندر بھیجا کہ راجہ کو بُلا لائے۔ نوشا نے جا کر دیکھا۔ ایک شان دار کمرے میں راجہ بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ریڈیو پر گانے سُن رہا تھا۔ اُس کے برابر دو سُنہری بالوں

والے خوب صورت بچے بیٹھے تھے۔ راجہ نے نوشا کو دیکھا تو اُٹھ کر اُس کے پاس آگیا۔

نوشا نے کہا۔" ریڈیو پر گانے سُنے جا رہے تھے۔"

وہ ہنس کر بولا۔" اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں پیارے۔"

" مزے میں ہو!"

راجہ نے جواب دیا۔" ہاں یار! میں تو یہاں بڑا خوش ہوں۔"

نوشا نے سرگوشی میں کہا۔" نورے باہر کھڑا ہے۔ تم کو بُلایا ہے۔"

نورے کا نام سُنتے ہی راجہ کی مُسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولا۔" اچھا چلو۔" دونوں کوٹھی سے باہر آ گئے۔

نورے ایک سُنسان جگہ پر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اُس نے پوچھا۔" سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

راجہ نے مختصر سا جواب دیا۔" ہاں۔"

" کسی کو تم پر کوئی شبہ وبہ تو نہیں ہُوا؟"

" بالکل نہیں۔" راجہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

" تمہارے علاوہ اور کتنے نوکر ہیں؟"

راجہ لمحہ بھر تک کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے بتایا۔" ایک، دو، تین۔ ہاں تین ہیں۔"

نورے نے پُوچھا۔" سب کوٹھی ہی میں رہتے ہیں؟"

" نہیں، آیا اور رحمت تو شام کو گھر چلے جاتے ہیں۔ بوڑھا خانساماں ہے، وہ باہر اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے۔"

نورے نے ایک لمبی 'ہوں' کی اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ذرا دیر بعد

اُس نے پھر سوالات شروع کر دئے۔ "گھر میں کتنے مرد ہیں ؟"

وہ جھٹ بولا۔ "صرف بڑے صاحب ہیں۔ اور تو سب بابا لوگ ہیں۔"

"صاحب رات کو باہر جاتے ہیں ؟"

"میرے سامنے تو گئے نہیں۔"

"رحمت کیسا آدمی ہے ؟"

راجہ بولا۔ "سالا ہر وقت بیٹھا اُونگھا کرتا ہے۔ بی بی کہتی ہیں، روز سنیما دیکھتا ہے۔ وہ اُس کو خوب ڈانٹتی ہیں۔"

نورے نے اُس کی پیٹھ کو گرم جوشی سے تھپتھپا کر کہا۔ "تُو تو بہت ہوشیار نکلا۔ جیو میرے شیر۔ بس تھوڑا سا کام تم کو اور کرنا ہے۔"

اُس نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اُس کی جانب بڑھایا۔ "لو اِس کو رکھ لو۔ شاہ جی نے خرچے کو دیا ہے۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ میں نوشا کے ہاتھ پہنچوا دوں گا۔"

راجہ نے جھجکتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ کہنے لگا۔ "ابھی تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

نورے نے پیشہ ور مجرموں کی طرح ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "اب تم یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ بی بی زیور اور نقدی کہاں کہاں رکھتی ہیں۔ جب بھی موقعہ لگے، اِس کمرے کو اچھی طرح دیکھ لینا۔ جن جن بکسوں اور الماریوں میں قیمتی سامان رکھا ہو اُن کو اچھی طرح بھانپ لینا۔"

راجہ یہ سُنتے ہی لرز اُٹھا۔ نورے اُس کے خوف سے بے نیاز کہتا رہا —
"اِس کے علاوہ یہ بھی پتہ لگاؤ کہ رات کو صاحب اور بی بی جی کا کیا پروگرام رہتا ہے۔ کس روز سنیما جا رہے ہیں۔ کس روز دعوت میں جا رہے ہیں اور کب تک واپسی ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ —" مگر اُس نے مطلب کی بات نہ

بتائی۔ صاف گول کر گیا۔ صرف اِس قدر کہا: "اب میں تم سے پانچویں دن ملوں گا۔" ذرا دیر وہ کھڑا کچھ شمار کرتا رہا۔ "آج منگل ہے۔ گویا اب میں تمہارے پاس سنیچر کو آؤں گا۔ اس وقت تم ساری باتیں معلوم کر لینا اور مجھ کو پوری رپورٹ دینا۔ سمجھ گئے نا۔"

راجہ نے گردن ہلا دی: "سمجھ گیا سمجھ گیا۔"

نورے نے اِس کے بعد اور کچھ بات نہ کی۔ سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ راجہ کو سگرٹ پلائی اور خود اپنے لئے بھی سُلگائی۔ دونوں لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بھبکے چھوڑنے لگے۔ نوشا خاموش کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ اُس کو رہ رہ کر راجہ پر رشک آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد راجہ کوٹھی کی طرف چلا گیا اور وہ نورے کے ساتھ اڈے پر واپس آ گیا۔

(۲)

سنیچر کا دن تھا۔ راجہ کو کوٹھی پر کام کرتے ہوئے ساتواں روز تھا۔ اس عرصہ میں وہ کوٹھی کے ماحول سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ سب بچّوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ دن بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔

روزانہ کا پروگرام یہ رہتا کہ سویرے سویرے ہی گرم گرم چائے پینے کو مل جاتی۔ ناشتے کی میز سے جو کچھ بچ کر آتا، اس میں سے ایک آدھ ٹوسٹ انڈا، یا ایسی ہی کوئی چیز کھانے کو مل جاتی۔ اس وقت تک سات ساڑھے سات کا وقت ہو جاتا تھا۔ آیا ناشتے کے بعد دونوں بچّوں کو تیار کر دیتی اور راجہ اُن کو ہمراہ لے کر اسکول چلا جاتا۔ واپسی پر نو بج جاتے۔ یہ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہوتا۔ وہ دوڑ دوڑ کر مستعدی سے ان کا ہر کام کرتا۔ اُس کے کان اُن کی آواز پر لگے رہتے۔ اِدھر اُنہوں نے کچھ کہا اور وہ لپکا۔ اُن کا کام زیادہ نہیں تھا۔ مگر وہ شور بہت مچاتے تھے۔ پہلے روز تو وہ ڈر کر سہم گیا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتا گیا۔ جب وہ دفتر جانے لگتے

تو اُن کا ایک ایک سامان اُٹھا کر کار کے اندر رکھتا۔ اُس کی مستعدی دیکھ کر وہ ایک روز بیوی سے کہنے لگے۔

"بھئی یہ راجہ تو بڑے کام کا لڑکا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "دیکھ لیجئے میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی روز تاڑ لیا تھا کہ بڑا ہوشیار ہے۔"

وہ کہنے لگے "ارے بھئی تمہارے انتخاب کی کیا بات ہے۔"

دونوں ہنسنے لگے اور راجہ اپنی تعریف سُن کر جھوم اُٹھا۔ اُس روز سے وہ اور بھی مستعد ہو گیا۔ اُس کے سپرد زیادہ کام نہیں تھا۔ بارہ بجے بچوں کو اسکول سے واپس لاتا تو سہ پہر تک اُس کے لئے کوئی کام نہ ہوتا۔ مگر وہ نچلا نہ بیٹھتا، کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا۔ کبھی فرنیچر جھاڑ رہا ہے، کبھی جوتوں پر پالش کر رہا ہے۔ کبھی بچوں کے کپڑے دھو رہا ہے۔ یہ کام رحمت اور آیا کے سپرد تھے۔ مگر وہ اُن کا بھی کام کر ڈالتا۔ ان دونوں نے اُس کے آنے پر بڑی ناک بھوں چڑھائی تھی مگر اب وہ بھی اُس سے بہت خوش تھے۔

سہ پہر کو دونوں بڑے لڑکے کالج سے آجاتے۔ اُن سے بھی اُس نے تھوڑا بہت یارانہ گانٹھ لیا تھا۔ اُن کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ کوٹھی کا لان بہت بڑا تھا۔ پاس پڑوس کی کوٹھیوں کے اور لڑکے بھی آجاتے۔ شام تک کرکٹ ہوتی۔ وہ بھی اُن کے ساتھ کھیلتا۔ اور اب تو اُس کو اُلٹی سیدھی گیند پھینکنا بھی آگئی تھی۔ ایک آدھ رن بھی بنا لیتا تھا۔ صاحب اور بیگم نے اِس بات پر کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایک روز دونوں دیر تک کھیل دیکھتے رہے۔

رات کا کھانا آٹھ سوا آٹھ بجے ختم ہو جاتا۔ اُس کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھ کر ریڈیو سے ڈرامے سُنتا۔ گانے سُنتا۔ کبھی کبھار تھوڑی بہت ٹھٹول بازی بھی کر لیتا۔ ان سے اُس کی خوب پٹتی تھی۔ جب وہ سونے کے لئے

اپنے بستروں پر چلے جاتے تو وہ چھوٹی بی بی، ناہیدہ کی طرف چلا جاتا۔ اس سے بھی وہ خاصا بے تکلّف ہو گیا تھا۔ وہ بھی کالج جاتی تھی۔ علیحدہ کمرے میں رہتی تھی اور موٹی موٹی کتابیں پڑھتی۔ گھنٹوں بیٹھی باتیں کرتی رہتی یا پھر پیانو پر لہک لہک کر گانا گاتی۔ اُس کی آواز سُریلی تھی۔ راجہ کو اُس کا گانا پسند تھا۔ وہ اُس کے پیروں کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ آنکھیں بند کئے گانا سُنا کرتا۔ وہ گانا ختم کرتی۔ اپنے بڑے بڑے سُرخ ناخون اُس کی کنپٹی میں چبھو کر کہتی۔

"ہے، چلو اُٹھو۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔"

وہ مکاری سے رونی شکل بنا کر کہتا۔ "ابھی سے!"

وہ ہنس کر کہتی۔ "چل بھاگ، مجھے ابھی کالج کا بہت کام کرنا ہے۔"

راجہ فوراً کہتا۔ "چھوٹی بی بی اولٹین نہیں پیو گی؟"

ناہید رات کو اولٹین شوق سے پیتی تھی۔ وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی۔ "اچھا جا ایک کپ بنا لا۔ مجھے آج دیر تک کام کرنا ہے۔"

وہ فوراً ہیٹر پر دُودھ گرم کرتا اور ٹرے میں اولٹین کی پیالی سجا کر لے آتا۔ ناہید بڑی نفاست پسند لڑکی تھی۔ لہذا وہ صفائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جتنی دیر وہ اولٹین پیتی، اُس سے کچھ نہ کچھ بات چیت کرتی رہتی۔ وہ نظریں چرا چرا کر اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہتا۔ یہ عجیب سی لذت تھی۔

یوں وہ عمر میں اُس سے کئی سال بڑی تھی۔ مگر وہ اپنے ٹیپیکل انداز میں کبھی کبھی سوچا کرتا۔ یار بڑی غضب کی لونڈیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس سالی کو بیٹھے دیکھا کرو۔ یوں دیکھتی ہے کہ قتل کر کے رکھ دیتی ہے۔

ناہید کے علاوہ محمود اور انور تھے۔ اُن سے بھی اُس کی پٹنے لگی تھی۔ کرکٹ کے علاوہ، رات کو کمرے میں دروازہ بند کر کے اُن کے ساتھ چپکے چپکے

تاش کی بازی لگتی ۔ تاش کھیلنے کا وہ ہمیشہ سے رسیا تھا۔ خوب خوب ہاتھ دکھاتا۔ ایسی چالیں چلتا کہ دونوں دنگ رہ جاتے۔

لیکن کوٹھی کے اندر سب سے زیادہ اس پر مہربان بیگم صاحبہ تھیں۔ جن کو سب ملازم بی بی جی کہتے تھے ۔ وہ ان کا کام بھی جی لگا کر کرتا تھا۔ ایک روز وہ اُن کے جُوتوں پر پالش کر رہا تھا اور اُن کو ایسا چمکایا تھا کہ چما چم کر رہے تھے۔ بی بی جی بھی کہیں سے ٹہلتی ہوئی اُدھر آ گئیں۔ اُس کے قریب کھڑے ہو کر جُوتوں کو دیکھنے لگیں۔ ذرا دیر چُپ رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

"راجہ اگر تُو ٹھیک سے آگے بھی کام کرتا رہا تو سچ کہتی ہوں بہت اچھا رہے گا۔ خدمت سے عظمت ہے۔ دل لگا کر کام کرے گا تو تیری زندگی بنا دوں گی۔ میرا تو ارادہ ہے کہ تُو ذرا بڑا ہو جائے تو صاحب سے کہہ کر تجھ کو اُن کا اردلی لگوا دوں۔"

راجہ نے بچّوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ "میں اردلی بن جاؤں گا۔ وہ جو سفید کوٹ پر سنہری پیٹی ڈالے رہتے ہیں۔" اُس نے بڑے کھلنڈرے پن سے اپنی گردن ہلائی۔ "پھر تو اپنے ٹھاٹھ ہو جائیں گے۔"

وہ کہنے لگیں۔ "ٹھاٹھ تو ہو ہی جائیں گے۔ ساٹھ روپے تنخواہ ملے گی۔ اور بخشیش اُوپر سے۔ کام کاج بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔"

اُس نے فوراً کہا۔ "میں کام کاج سے گھبراتا تھوڑی ہوں۔"

وہ مسکرانے لگیں۔ "بس اب تُو تھوڑا سا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اردلی بن جائے گا تو کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر تیرا بیاہ بھی کرا دوں گی۔ دونوں میاں بیوی یہیں رہنا۔"

اِس بات پر راجہ شرما گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ لو یار اپنی ایک عدد جورو بھی ہو جائے گی۔ مگر یہ خیال اُسے عجیب سا لگا۔ دھت

تیری کی، یہ بھی کیا بات ہوئی۔ لیکن بی بی جی کی باتوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ وہ اور بھی مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا۔ ادھر کسی نے کچھ کہا اور جھٹ اُس کا کام کر دیتا۔

یہ چھ سات دن اُس نے بڑے مزے میں گزارے تھے۔ اب اُس کا رنگ بھی ذرا نکھر گیا تھا۔ بی بی جی نے محمود اور انور کی دو پرانی پتلونیں اور کئی قمیصیں اُس کو دے دیں، جن کو پہن کر پہلے روز جب اُس نے قدِ آدم آئینہ کے سامنے اپنا عکس دیکھا تو حیرت سے چونک کر زیرِ لب بڑبڑایا۔ "اُستاد بالکل اسٹوڈنٹ لگ رہے ہو۔" وہ دیر تک آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

مگر آج سہ پہر سے وہ پریشان تھا۔ شام کو نورے آنے والا تھا، جس کی گھنی مونچھوں اور پان سے رچے ہوئے کالے دانتوں سے اُس کو گھِن معلوم ہوتی تھی۔ جوں جوں دن ڈھلتا گیا، اُس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ وہ اس گھر کے لوگوں سے دغابازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اِس لئے کہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ عمر بھر میں پہلی بار ایسی گھریلو زندگی نصیب ہوئی تھی، جہاں خوشی تھی، سکون تھا۔ نہ کسی کا ڈر تھا نہ خوف۔ بڑے مزے سے ہنستے کھیلتے وقت گزرتا تھا۔ رات کو لمبی تان کر سوتا۔ سویرے اُٹھتا تو طبیعت بشاش ہوتی۔

شام ہوتے ہوتے وہ بے چین ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شاہ جی بے حد خطرناک آدمی تھا۔ اُسے ناراض کر کے جان خطرے میں ڈالنا تھی۔ نہ جانے وہ کیا کرے۔ اس کے تصوّر ہی سے وہ کانپ اُٹھتا تھا۔ دوسری طرف بی بی جی تھیں، جو بڑی مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ ننھے للّی اور اکّو تھے۔ جن سے اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سانولی سلونی ناہید تھی جس کی خوب صورت آنکھیں جادو چلاتی تھیں۔ انور اور محمود تھے، جن کے ساتھ اُن کا یارانہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کو کرکٹ ہوتی اور رات کو تاش کی بازی لگتی۔ دونوں وقت گرم گرم کھانا ملتا۔

اور مزے دار ہوتا۔ صرف سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پینا پڑتی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ بدحواس سا ہو گیا۔ پریشانی اور بے بسی کے عالم میں باہر درختوں کے نیچے اندھیرے میں چلا گیا اور بے اختیار رو پڑا۔

شام کا دھندلکا جب رات کے اندھیرے میں ڈھلنے لگا تو دروازے پر نوشا کا چہرہ نظر آیا۔ زندگی میں پہلی بار راجہ نے نوشا کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس کے منہ پر تھوک دے اور چیخ کر کہے "نکل جا سالے کمینے یہاں سے۔" لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا اور خاموش کھڑا رہا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔

"نورے نے بلایا ہے۔"

راجہ اس طرح خاموش رہا، جیسے اُس نے نوشا کی بات ہی نہیں سُنی۔

نوشا نے دوبارہ کہا۔ "باہر نورے کھڑا تم کو بلا رہا ہے۔"

راجہ نے گھور کر اُسے دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "کھڑا ہے تو کھڑا رہے۔ میں اُس سالے کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

نوشا حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "کیا کہا، نہیں جاؤ گے؟"

راجہ جھنجلا کر بولا۔ "ہاں جی نہیں جاؤں گا۔ میں اب ان سالے بدمعاشوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" لمحہ بھر کے لئے اس کا لہجہ نرم ہوا۔ "میرا کہنا مانو تم بھی ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ کسی کوٹھی میں تم کو بھی کام دلا دوں گا۔ مار گولی ان سالے حرامیوں کو۔"

نوشا نے جلدی سے کہا۔ "یار کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں کب ان کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ تو بڑے خطرناک لوگ ہیں۔"

راجہ نے کہا "خطرناک ہیں تو ہوا کریں۔ صاحب سے کہہ دوں گا۔ سب سالوں کو بند کروا دیں گے۔ جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ مذاق نہیں ہے۔"

نوشا اور خوف زدہ ہو گیا "نہیں یار ایسی بات نہ کرنا۔ خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ شاہ جی بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ اُس سے بگاڑنا اچھا نہیں۔"

مگر راجہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ فیصلہ کُن لہجہ میں بولا "اچھا جی میں تو کسی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اور دیکھو آئندہ تم یہاں نہ آنا" یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے برابر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

نوشا اُس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ذرا دیر گُم صُم کھڑا رہا۔ پھر کوٹھی سے نکل کر سیدھا فوڑے کے پاس پہنچا۔ نوشا کو اکیلا آتا دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ گھبرا کر پوچھا۔

"راجہ کیوں نہیں آیا؟"

نوشا صاف صاف بات بتانے میں جھجکنے لگا تو اُس نے ڈانٹ کر کہا۔

"ٹھیک ٹھیک بتا، بات کیا ہے؟ وہ سالا راجہ کیوں نہیں آیا؟"

نوشا کو مجبوراً کہنا پڑا "وہ کہتا ہے، میں نہیں آؤں گا۔"

فوڑے بڑبڑایا "اچھا تو یہ بات ہے۔"

نوشا نے بتایا "اور اُس نے آئندہ مجھ کو بھی آنے سے منع کر دیا ہے۔ بہت غصّہ میں تھا۔"

وہ بولا "سالے کا سب غصّہ تکلے کے بَل کی طرح نکل جائے گا۔"

وہ نوشا کے ہمراہ اڈے پر پہنچا اور شاہ جی کو ساری بات بتا دی۔ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔

"اُس کا دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

کمرے میں گہری خاموشی چھاگئی۔ چند لمحوں بعد اُس کی بھاری بھرکم آواز اُبھری۔
"نورُے!"

نورُے نے فوراً جواب دیا۔ "ہاں جی!"

شاہ جی بولا "رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اب تُو جاکر آرام کر۔ کل اپنے ساتھ لوٹن کو لینا اور ترکیب نمبر ۹ لگانا۔ ضرورت ہو تو اور بندے بھی ساتھ لے جانا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ چھوکرا ایک نمبر حرامی لگتا ہے۔ خیر بچ کر کہاں جائے گا۔"

نورُے نے فوراً کہا "تمہارا حکم چاہیئے شاہ جی! کہاں جائے گا نِکل کے۔"

مزید بات چیت نہ ہوئی۔ نورُے کمرے سے باہر آگیا۔ اُس کے ساتھ ہی نوشا بھی نِکل آیا۔ مگر وہ بہت ڈرا ہؤا تھا۔ اُس کو رہ رہ کر راجہ پر ترس آرہا تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ یہ لوگ نہ جانے بے چارے کا کیا حال کریں۔ خوف کے مارے اُس نے نورُے کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چپکے سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن کوئی آٹھ بجے رات کو شاہ جی نے اپنے کمرے سے نوشا کو آواز دی۔ وہ فوراً سہما ہؤا وہاں پہنچا۔ شاہ جی بستر پر کروٹ کے بل لیٹا تھا اُسے دیکھتے ہی بولا "تُو بھی کسی کام آئے گا۔ آ ذرا میری پنڈلیوں پر مکیاں تو لگا۔ وہ سوئر کا جنا دُلا نہ جانے کہاں مرگیا۔"

نوشا خاموشی سے جاکر پائینتی بیٹھ گیا اور پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ مکّیاں لگانے لگا۔ شاہ جی خاموش لیٹا رہا۔ کمرے کے اندر گہرا سکوت تھا۔ اچانک باہر دروازے پر موٹر کے رُکنے کی آواز اُبھری۔ پھر دھڑ سے موٹر کا دروازہ بند ہؤا۔ کمرے کے باہر مِلے جُلے قدموں کی آواز اُبھری۔

ذرا ہی دیر بعد نورُے اور لوٹن کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کے نرغہ میں راجہ بھیگے ہوئے چوہے کی طرح سہما نظر آیا۔ لوٹن نے راجہ کی گردن پکڑ کر زور سے

دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔

نورٹی کہنے لگا "لو جی! یہ آگیا حرام کا تخم"۔

شاہ جی اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ سامنے فرش پر اوندھے منہ پڑے ہوئے راجہ کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر اس کی آواز گونجی "زنانیوں کی طرح نخرا کیا دکھا رہا ہے۔ سیدھا کھڑا ہو"۔

راجہ خوف سے کانپتا ہوا اُٹھا۔ مگر وہ پورے طور پر کھڑا ابھی نہ ہوا تھا کہ شاہ جی نے کود کر اُس کے گال پر ایک بھرپور تھپڑ مارا۔ راجہ ہائے کر کے زمین پر گر پڑا۔ شاہ جی نے اُس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔ پھر دوسری۔ کئی ٹھوکریں تابڑ توڑ راجہ کے جسم پر لگیں۔ وہ گیند کی طرح فرش پر لڑھکنے لگا۔ اُس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ جس سے جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

ہر ٹھوکر پر وہ چیختا "ہائے مر گیا"۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر شاہ جی کے سامنے جوڑ دیئے۔ اُس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ شاہ جی گردن ہلا کر بولا "بس ابھی سے"۔ پھر وہ نورے سے مخاطب ہوا۔

"کچھ مزا نہیں آیا۔ ذرا اس کا ٹین پاٹ تو بنا، تاکہ اس کو یاد ہو جائے کہ قسم کھا کر مُکر جانا کیا ہوتا ہے"۔

نورے لپک کر راجہ کے پاس پہنچا۔ اُس نے اپنے چوڑے چوڑے بھدے ہاتھ سے راجہ کی گردن دبوچ کر جھکائی اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹانگ پکڑ کر گردن کے اُوپر چڑھا دی۔ راجہ بلبلا کر چیخا "ارے مر گیا۔ ارے مر گیا"۔ نورے نے راجہ کی کنپٹی پر کہنی سے ایک ٹھڈ لگایا۔ فوراً اُس کی آواز بند ہو گئی۔ نورے نے راجہ کی دوسری ٹانگ بھی اُٹھا کر گردن پر چڑھا دی۔

راجہ ذرا دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئی تھیں اور دونوں ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی اُس کی گردن سانپ کا پھن

بن گئی۔

راجہ اس عالم میں لمحہ بھر سے زائد نہ بیٹھ سکا۔ اُس کا جسم کپکپایا اور وہ فرش پر منہ کے بَل آگرا۔ مگر اس طرح بھی چین نہ آیا تو وہ جاپانی کھلونے کی طرح اِدھر اُدھر جھُولنے لگا۔ ہر بار وہ پہلو بدل کر بڑی دردناک آواز نکالتا۔

"ارے میری گردن ٹوٹی۔"

"ہائے میری ٹانگیں پھٹے جارہی ہیں۔"

"اللہ کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں مر جاؤں گا۔"

"شاہ جی میری توبہ۔"

"شاہ جی میں تمہارے قدموں پڑتا ہوں۔"

راجہ کی دلدوز چیخیں کمرے کے اندر گونجتی رہیں۔ نوشا سہما ہوا سارا تماشا دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑگیا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آخر جب راجہ کی آواز بیٹھنے لگی۔ اور وہ رُک رُک کر تھکے ہوئے خچر کی طرح منہ پھاڑ کر ہانپنے لگا تو شاہ جی نے کہا۔

"نورے کھول دے ابھی کچا ہے یہ۔"

نورے نے حکم پاتے ہی راجہ کو ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بے حال ہو کر وہیں پڑ گیا اور گہری گہری سانسیں بھر کر ہانپتا رہا۔ شاہ جی زور سے دھاڑا۔ "یہ پہلا کورس ہے۔ ابھی چھ اور ہیں اور سب سے آخری یہ ہے۔" اس نے تکیہ کے نیچے سے یہ لمبا چاقو نکالا اور اُس کے سامنے کر دیا۔ "ٹکڑے کر کے یہیں دبا دیتا ہوں۔ اِس گھر کا آنگن اسی لئے کچا رکھا ہے۔ تاکہ زمین کھودنے میں دُشواری نہ ہو۔"

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، اور خوف سے لرز کر گڑگڑانے لگا۔ "نہیں، نہیں۔" اُس نے بڑی بے چارگی سے ہاتھ جوڑ دئے۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اُٹھا

اور جاکر شاہ جی کے پیر پکڑ لیے۔ "اس دفعہ معاف کر دو۔ پھر غلطی کر دوں تو جان سے مار دینا۔" وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ شاہ جی نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ کہنے لگا۔

"آئندہ سب کام ٹھیک ہو گا؟"

راجہ قسمیں کھا کر یقین دلانے لگا۔ شاہ جی ڈپٹ کر بولا "قسمیں تُو نے پہلے بھی بہت سی کھائی تھیں۔ یاد رکھنا دوبارہ کوئی اُلٹ پھیر کی تو تیری یہاں لاش ہی نظر آئے گی۔ میں خطرناک بندے کو زندہ نہیں چھوڑا کرتا۔"

راجہ گردن جھکائے اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ ابھی تک اُس کی ٹانگیں قابُو میں نہیں تھیں۔

شاہ جی نے ہوٹل سے مکھن کی دو ٹکیاں منگوا کر راجہ کو کھلائیں۔ چائے بھی پلائی۔ سگریٹ بھی سُلگا کر دی۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو راجہ نے کوٹھی اندر کی ایک ایک تفصیل بتائی۔ شاہ جی کرید کرید کر ہر بات پوچھتا رہا۔ پھر اُس کو یہ ہدایت دی کہ آئندہ نورے اُس کے پاس نہیں جائے گا۔ وہ خود آکر رپورٹ دے گا۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے وہ نورے کے ساتھ دروازے پر کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف چلا گیا۔

(۳۱)

رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کوٹھی اونگھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ سارے دروازے بند تھے۔ راجہ کمرے کے اندر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں انجینئر کی بوڑھی ماں تھی۔ وہ سرِ شام ہی سو جاتی۔ اُس وقت وہ نکڑ والے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی۔ کوٹھی کے دوسرے لوگ ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے اُن کے واپس

آنے کی توقع نہیں تھی ۔ راجہ شام ہی کو اس بات کی رپورٹ شاہ جی کو دے آیا تھا اور اب سہما ہُوا بیٹھا تھا۔ اُس کی پشت کمرے کے دروازے کی جانب تھی۔ ذرا سی آہٹ ہوتی، اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔

رات اور سُنسان ہوگئی۔ کہیں دُور سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ عین اُس وقت کوٹھی کے باہر تین بار سیٹی بجنے کی آواز اُبھری۔ یہ اِس بات کا سِگنل تھا کہ شاہ جی کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ راجہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہی۔ پھر کوٹھی کے پچھواڑے جہاں گھنے درخت تھے، خشک پتوں پر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ کوئی رُک رُک کر چل رہا تھا۔

کچھ دیر سکوت رہا، پھر پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ۔ ہر آہٹ کے ساتھ راجہ کی ٹانگیں کانپ اُٹھتیں۔ سانس رُک رُک کر چلتی۔ دروازے پر کئی بار آہٹ ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے سوچا کہ وہ دروازہ نہ کھولے۔ لیکن وہ اپنے اِس ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ آہستہ سے کمرے کے باہر آیا اور اُس دروازے پر پہنچا، جس پر آہٹ ہو رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ کسی نے باہر سے دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ دھندلی روشنی میں شاہ جی کا خوفناک چہرہ نظر آیا۔ اُس کے پیچھے کئی اور آدمی تھے، سب اندر آ گئے۔

شاہ جی نے ایک آدمی کی ڈیوٹی دروازے پر لگائی۔ چار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر وہ راجہ کے ساتھ اس کمرے کے قریب پہنچا، جس میں قیمتی سامان رکھا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ شاہ جی نے بالم کو اشارہ کیا۔ اُس نے جھٹ تالا کھول دیا۔ سب اندر چلے گئے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ راجہ نے سوئچ دبا کر روشنی کر دی۔ اور اُن الماریوں اور بکسوں کی نشان دہی کرنے لگا، جن میں زیورات اور نقدی

تھی۔

آن کی آن میں بالم نے ہر الماری کا تالا توڑ دیا۔ سارے بکسوں کے ڈھکنے کھول دئیے گئے۔ شاہ جی عین دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس وقت کسی چٹان کی طرح پُرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر صرف ہاتھ اور آنکھوں کے اشاروں سے اپنے گُرگوں کو ہدایتیں دے رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں کمرے کے اندر ہر طرف سامان ہی سامان بکھر گیا۔ کمرہ کسی کباڑیے کی دکان معلوم ہونے لگا۔

باہر بوڑھے خانساماں کے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ سب ٹھٹک کر جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ کمرے کے اندر سناٹا چھا گیا۔ خانساماں کی کھانسی رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔ شاہ جی نے خونخوار نظروں سے سب کو گھور کر دیکھا اور اُن کے ہاتھ پھر بجلی کی سی پھُرتی کے ساتھ چلنے لگے۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ تمام قیمتی اشیاء نکال کر ایک بڑے سوٹ کیس میں بھر چکے تھے۔ دو آدمیوں نے اُسے سنبھالا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ سب سے آخر میں شاہ جی نکلا۔ راجہ بھی اُس کے ساتھ ساتھ سہما ہوا چلتا رہا۔ پچھلے دروازے سے جب سب باہر چلے گئے تو وہ ٹھٹکا۔

شاہ جی نے دبی زبان سے کہا، "راجہ تُو نے بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا ہے۔"

سب کوٹھی کے لان سے گزر کر باہر سڑک پر آ گئے۔ پھاٹک کے قریب ہی اندھیرے میں سیاہ رنگ کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ اُس میں جلدی سے سوٹ کیس رکھا گیا۔ سب پھُرتی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ وہ سُنسان سڑک پر تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔

ٹیکسی شاہ جی کے مکان پر رُکی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سوٹ کیس اندر بھیجا گیا اور شاہ جی سب آدمیوں کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ راجہ

کو اُس نے نوشا کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ راجہ کو دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں کئی لمحوں تک ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر نوشا نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"تم آگئے؟"

"ہاں!" راجہ کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

نوشا نے سادگی سے پوچھا "اب تم کوٹھی پر واپس نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں" راجہ نے بیزاری سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"یہ شاہ جی سے پوچھو"

راجہ سخت بیزار نظر آ رہا تھا۔ وہ چُپ چاپ فرش پر چت لیٹ گیا اور چھت کو تکنے لگا۔ نوشا اُس کو دیکھتا رہا۔

"یار اب کیا ہوگا؟" اُس نے دریافت کیا۔

راجہ بولا "جو تقدیر میں لکھا ہے"

نوشا نے غور کیا۔ راجہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہر بات کا اُکھڑا اُکھڑا جواب دیتا تھا۔ اُس نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔

دوسرے ہی دن سے دونوں کی کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ شاہ جی اُن کے کمرے میں دوپہر کو خود آیا۔ اُن کو ہدایت کی کہ کمرے کے اندر رہا کریں۔ نہ باہر نکلیں اور نہ اڈے کے کسی آدمی سے بات چیت کریں۔ لیکن اس دفعہ خونخوار نظروں سے گھور کر بات چیت کرنے کے بجائے وہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔

اُس کی یہ شفقت دونوں کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اکثر اُن کے کمرے میں آجاتا۔ کبھی اُن کے لئے پھل اور مٹھائی لاتا۔ کبھی سگریٹوں کے نئے نئے قسم کے پیکٹ۔ اُس نے دونوں کے لئے کئی نئی قمیصیں اور کٹ پیس کی پتلونیں بھی بنوادی تھیں۔ دل بہلانے کے لئے ایک کیرم بورڈ اور تاش کی دو گڈیاں بھی منگوا دی تھیں۔ مگر اس قدر ناز برداری کے باوجود دونوں سہمے سہمے رہتے تھے۔ اُن کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ رُخساروں کی ہڈیاں اُبھرنے لگی تھیں۔

شاہ جی بھی کم پریشان نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ انجینئر کا ایک بھائی پولیس کا بڑا افسر تھا۔ لہٰذا اِس واردات کی بڑی چھان بین ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ پولیس کو سب سے زیادہ تلاش راجہ کی تھی، جس سے سارا سُراغ مل سکتا تھا۔ شاہ جی کو اپنے مخبروں کے ذریعہ پولیس کی کارروائیوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں۔ ایسی صورت میں راجہ کی موجودگی اڈے پر بے حد خطرناک تھی۔ روزانہ نت نئی اطلاع آتی۔ ہر اطلاع پر شاہ جی گہری فکر میں ڈوب جاتا۔

اُنہی دنوں اڈے پر ایک بردہ فروش آیا۔ وہ شاہ جی کا پُرانا واقف کار تھا۔ پہلے بھی کئی بار سودا کر چکا تھا۔ شاہ جی نے اُسے دیکھا تو اُس کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ ٹھگنے قد کا باتونی آدمی تھا۔ پان بے حد کھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا وہیں پیک تھوک دیتا۔ ذرا ہی دیر میں اُس نے پان کھا کھا کر کمرے کا سارا فرش گندہ کر دیا۔ یہ اُس کی پُرانی عادت تھی۔

ایک بار شاہ جی نے جل کر اُسے گالیاں بھی دی تھیں، اِس لئے کہ گرمیوں میں وہ فرش پر لیٹ کر مالش کراتا تھا۔ مگر اُس وقت وہ بالکل مشتعل نہ ہوا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

وہ شخص ڈیڑھ سال بعد شاہ جی سے مِلا تھا، اور اس تمام عرصہ کی اپنی سرگذشت سُنا دینا چاہتا تھا۔ اُس کی باتوں سے شاہ جی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اب وہ صرف

نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو اُٹھوانے اور اِدھر سے اُدھر کرنے کا دھندا کرتا تھا۔ یہ بات شاہ جی کو بھی کھٹکی۔ اُس نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔

"چودھری میرے پاس دو چھوکرے ہیں۔ بہت سدھے ہوئے اور کام کے بندے ہیں۔"

وہ بے نیازی سے بولا۔ "گل ایہہ ہے، میں نے تو جی یہ لین ہی چھوڑ دی ہے ایسے مال کی آج کل کھپت کم ہی ہوتی ہے۔"

شاہ جی نے کسی فوری ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس شخص نے پوچھا۔ "خوب یاد آیا، سکھر سے اس طرح کا ایک آرڈر آیا تھا۔ کیوں جی یتیم خانے میں چل سکیں گے؟"

شاہ جی فوراً بولا۔ "یہ مت پوچھ چودھری! دونوں بلا ہیں بلا۔ تو یتیم خانے کی گل بات کرتا ہے۔ وہ تو سکہ سازی اور جعلی کرنسی تک میں بڑوں بڑوں کے کان کاٹ لیں گے۔ خرکاروں کے پاس بھی چل سکتے ہیں۔"

وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑ کر بولا۔ "اچھا! کہاں سے ہاتھ لگ گئے؟"

شاہ جی کہنے لگا۔ "ٹریننگ دی ہے۔ رقم خرچ کی ہے۔"

اُس نے دریافت کیا۔ "بولو کیا لوگے اُن کا؟"

شاہ جی نے جواب دیا۔ "تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، پورے تین ہزار میں خریدے تھے۔ پر اب پانچ ہزار سے کم میں مال نہیں اُٹھے گا۔"

"یہ تو زیادہ ہے۔ ویسے یہ سمجھ لے، مجھے اُن سے کچھ نہیں لینا۔"

"چل تیرے لئے کچھ کم کر دوں گا۔"

شاہ جی تو خدا سے چاہتا تھا کہ دونوں کسی طرح کراچی سے باہر چلے جائیں۔ لہٰذا تھوڑی حیل و حجت کے بعد ۴ ہزار میں سودا ہو گیا۔ اُس نے اُسی وقت پانچ سو بیعانہ دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے روز وہ پوری رقم ادا کر دے گا اور رات

گئے دونوں کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ نوشا اور راجہ ابھی سوئے نہیں تھے۔ دونوں بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ راجہ نے بڑے دُکھ سے کہا "یار بہت بُرے پھنس گئے"۔

نوشا بولا۔" ہاں یار سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ خدا قسم اب تو بہت جی گھبراتا ہے"۔

راجہ نے آہستہ سے کہا۔" یہاں سے اب نکلنے کی کوئی صورت ہونی چاہیئے"۔

نوشا ڈر کر بولا۔" ابے ایسی بات مت کر، جان سے مارا جائے گا"۔

" جان سے تو یوں بھی مارے جائیں گے"۔

نوشا خوف سے لرز کر بولا" کیوں؟"

" تجھے پتہ ہے کہ ہم دونوں پر اتنی پابندی کیوں لگائی گئی ہے!"

" یار مجھے کیا معلوم؟"

وہ جل کر بولا۔" ابے تو تُو یونہی رہا۔ اس لئے کہ سالے پکڑے نہ جائیں"۔

" اچھا تو یہ بات ہے۔ جب ہی تو شاہ جی کمرے سے بھی باہر نکلنے نہیں دیتا"۔

وہ کہنے لگا۔" یار اِسی لئے تو ڈر لگتا ہے کہ سالا ہم دونوں کو قتل نہ کر دے۔ تاکہ کسی کو پتہ بھی نہ لگے۔ ان بدمعاشوں کو تُو کیا جانے۔ ایک نمبر حرامی ہوتے ہیں"۔

نوشا بے حد ڈر گیا۔ آہستہ سے بولا۔" یار تُو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ شاہ جی بڑا ظالم ہے"۔

راجہ بولا۔" میرا کہنا مان تو جان بچ سکتی ہے"۔

" یار میں نے تیری اب تک کون سی بات نہیں مانی"۔

"بس ذرا ہمت کی بات ہے۔ سالوں کو صفا غچّا دے جاؤں گا۔"

نوشا بولا۔" ڈر لگ رہا ہے۔"

راجہ نے اُس کو ڈانٹا۔" دیکھ یار تُو زنخا پن مت کر۔ لگ گیا موقعہ تو آج ہی نکل جائیں گے۔"

"آج؟" نوشا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

راجہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر اطمینان سے بولا۔

"یہ سب تُو مجھ پر چھوڑ دے۔"

اُسی وقت کمرے کے باہر شاہ جی کی آواز سُنائی دی۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر شاہ جی اندر نہیں آیا۔ کسی سے ذرا دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔ دونوں دم سادھے پڑے رہے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سنّاٹا بڑھتا گیا۔ بہت دیر بعد جب محلّے پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی تو راجہ اُٹھ کر دروازے پر آیا۔ اُس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ سامنے دالان میں نورُے بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ بیرونی دروازے پر چوکیدار کے کھانسنے کی آواز اُبھر رہی تھی۔

پہلے راجہ کمرے سے باہر نکلا۔ اُس کے پیچھے پیچھے نوشا تھا۔ دونوں نے دبے قدموں چل کر صحن عبُور کیا۔ دالان میں پہنچے۔ نورُے اُن کے قریب ہی لیٹا تھا۔ وہ اُس کے پاس سے آہستہ سے گزرے اور چھت پر جانے والے زینے کے دروازے پر پہنچ گئے۔

دونوں لمحہ بھر کھڑے کانپتے رہے۔ اُن کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ راجہ نے ہمت سے کام لیا۔ پنجوں کے بَل اُٹھ کر زینے کی چٹخنی کھولنے کی کوشش کی ـــــ مگر گھبراہٹ میں ہاتھ بے تُکا پڑا۔ گہری خاموشی میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی ـــــ دونوں کا دم نکل کر رہ گیا۔ اُسی وقت نورُے نے کروٹ بدلی اور اپنی پیٹھ کھجانے لگا۔

جب نورے، خرّاٹے بھرنے لگا تو راجہ پنجوں کے بَل پھر اُٹھا۔ اِس دفعہ اُس نے چٹخنی کھول لی۔ آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ دروازہ چرچرایا۔ راجہ نے دل ہی دل میں دروازے کو ایک گندی سی گالی دی۔ دونوں زینے میں داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر پہنچ گئے۔

دُور تک چٹیل چھت پھیلی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر راجہ نے نوشا کو اشارہ کیا۔ وہ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ گئے۔ جس میں لگا ہُوا پائپ دیوار کے ساتھ ساتھ نیچے گلی میں چلا گیا تھا۔ راجہ نے پائپ ہاتھ سے پکڑ کر ہلایا۔ وہ مضبوطی سے لگا تھا۔

راجہ پائپ کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے گلی میں اُتر گیا۔ نوشا منڈیر پر جُھکا ہُوا دیکھتا رہا۔ جب راجہ تاریکی میں غائب ہو گیا تو نوشا نے پائپ پکڑا۔ اور نیچے اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اُس کے پَیر پھسلنے لگے۔ وہ منڈیر سے چمٹ گیا۔ نیچے راجہ شی شی کر رہا تھا۔ یہ اس بات کا سگنل تھا کہ وہ جلدی سے اُتر آئے۔ مگر نوشا جھجک رہا تھا۔ اتنے میں نیچے گلی سے راجہ کی آواز آئی۔

"ابے اُتر، نہیں تو میں چلا۔"

نوشا نے بدحواس ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور پائپ پر پھسل پڑا۔ نیچے راجہ کھڑا تھا، اُس نے فوراً سنبھال لیا۔ ورنہ وہ منہ کے بَل زمین پر گر تا۔ راجہ نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی۔ خوشی سے بولا۔

"شاباش میرے شیر، بس اب بن گیا کام۔"

دونوں اندھیری گلی میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ اُنہوں نے گلی عبور کی۔ آگے میدان تھا۔ دوسری طرف سڑک تھی، جس پر ایک کار تیز روشنی بکھیرتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ وہ اسی سمت چل دئے۔ لیکن جیسے ہی وہ میدان میں آئے۔ نہ جانے

کہاں سے کئی کتے نکل پڑے اور اُن پر بھونکتے ہوئے جھپٹے۔

دونوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا۔

(۴)

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ رات بہت سنسان تھی۔

راجہ اور نوشا ایک شکستہ دیوار کی آڑ میں دبکے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ اب وہ شاہ جی کے اڈے سے کئی میل دُور آ چکے تھے۔ دونوں خوف سے سہمے ہوئے سوچ رہے تھے کہ رات کہاں گزاری جائے۔ نہ اُن کا کوئی شناسا تھا اور نہ ہی وہ شہر کے راستوں سے شناسا تھے۔ شاہ جی کے گھر سے نکل کر، جس طرف منہ اُٹھ گیا، اسی طرف چل دیے۔ اگر کتے اُن کو نہ دوڑاتے تو وہ کسی اور سمت نکل جاتے۔

جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہاں آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ اُن کے سامنے اُونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ تھا، جو اندھیرے میں دُور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ جس سڑک پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے، وہ ان ٹیلوں کے دامن میں اژدھے کی طرح بل کھاتی چلی گئی تھی اور ایک موڑ پر نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والی ایک کار کی روشنی اُبھری۔ اُنھوں نے گھبرا کر اُس طرف دیکھا۔ ذرا دیر میں کار اُن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اُس کی تیز روشنی میں وہ دُور سے صاف نظر آ رہے تھے۔ کسی نامعلوم خوف سے دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کی طرف منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔

کار کی رفتار، اُن کے قریب پہنچتے پہنچتے سُست پڑ گئی۔ پھر بریک لگنے کی آواز اُبھری۔ دونوں کے جسم لرز کر رہ گئے۔ مگر کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ کوئی اُن کے قریب نہ آیا۔ کار جس رفتار سے آئی تھی، اُسی رفتار سے سُنسان سڑک

پر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جب کار دُور نکل گئی تو جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ پھر مصیبت میں پھنس گئے۔ اب اُن کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جس جگہ کو انہوں نے محفوظ سمجھا تھا، وہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ وہاں کھڑے ہونے سے خواہ مخواہ شُبہ پیدا ہوتا تھا۔

نوشا نے کہا ”ابے یہ تو بڑی خطرناک جگہ ہے۔ کسی اور طرف چلیں۔ راہ گیروں سے اسٹیشن کا راستہ معلوم کریں۔ رات وہیں اچھی گزر سکتی ہے۔ گھر جانے کے لئے ریل گاڑی بھی مل جائے گی۔“

راجہ نے گھُور کر اُسے دیکھا۔ ڈانٹ کر بولا ”سالے کچھ تیرا دماغ خراب ہوا ہے۔ گھاس تو نہیں کھا گیا۔ تُو ضرور پکڑا جائے گا اور تیرے سنگ میری گردن بھی پھنسے گی۔“

نوشا نے گھبرا کر پُوچھا ”کیوں؟“

وہ کہنے لگا ”ابے تُو شاہ جی کو اُلّو کا پٹھا سمجھتا ہے۔ وہ نورے اور لوٹن کو سب سے پہلے اسٹیشن بھیجے گا۔ پھر پولیس الگ اپنی تلاش میں ہے۔“

نوشا حیرت سے منہ پھاڑ کر بولا ”اچھا تو یہ بات ہے۔“

”تُو ابھی لونڈا ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔“

”یار تُو بہت پہنچا ہُوا نکلا۔ لیکن اب یہ تو بتا کہ اس وقت جائیں کہاں؟“

راجہ نے آہستہ سے کہا ”ابے یہی تو مَیں بھی سوچ رہا ہوں۔“

اس کے بعد دونوں خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے اپنے دلوں کو مضبُوط کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اُن کے ایک طرف کئی سو گز لانگ تک پھیلا ہوا احاطہ تھا، جس کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ وہ چل رہے تھے۔ دوسری طرف بنجر اور ویران ٹیلے تھے۔ ہر طرف

ویرانی چھائی تھی۔

اُنھوں نے میل بھر سے کچھ کم ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ سڑک کے موڑ پر ٹیلوں کے نشیب میں اُن کو روشنی نظر آئی۔ اُنھوں نے اپنی رفتار کسی قدر تیز کر دی اور روشنی کی سمت بڑھنے لگے۔ قریب جا کر دیکھا، یہ ایک خانقاہ تھی۔ چاروں طرف گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ خانقاہ پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اندر تیز روشنی تھی۔ لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھیں۔

دونوں چُپ چاپ درختوں کے نیچے سے گزر کر خانقاہ کی حدُود میں داخل ہو گئے۔ خانقاہ خاصی کشادہ تھی۔ بیچ میں وسیع احاطہ تھا، جس کے ایک رُخ پر حجرے اور صحنچیاں تھیں۔ سامنے گنبد کے نیچے مزار تھا، جس پر ڈھیروں ہار پھول بکھرے تھے۔ مزار کے چاروں طرف دیواروں میں طاق تھے، جن میں چراغ جل رہے تھے۔ مزار کے قریب دو آدمی سجدے میں پڑے تھے، اور کچھ آنکھیں بند کئے جھوم رہے تھے۔

مزار سے متصل کشادہ حجرہ تھا۔ حجرے میں گیس بتّی روشن تھی۔ فرش پر اُجلی چاندنی تھی۔ مسند سے ایک بوڑھا شخص لگا بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ سر پر عمامہ تھا۔ ہاتھ میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح تھی۔ اُس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وضع قطع سے خانقاہ کا سجادہ نشین یا متوّلی نظر آتا تھا۔ اُس کے رُو برُو کچھ لوگ عقیدت سے سر جھکائے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ راجہ اور نوشا دُور کھڑے حجرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک سمت سے شور بلند ہُوا۔

"یا سائیں بابا۔ ہُو حق اللہ!"

دونوں نے پلٹ کر اُس طرف دیکھا۔ ایک صحنچی میں کچھ لوگ حلقہ بنائے

بیٹھے تھے ۔ دونوں اسی طرف چل دئے ۔ وہاں روشنی کم تھی ۔ وہ بھی خاموشی سے حلقے میں شامل ہو گئے ۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں ، کہاں سے آئے ہیں ۔ اُن میں ملنگ تھے ، قلندر تھے ، اور ایسے ہی دوسرے لوگ تھے ۔ کچھ نیم برہنہ تھے ۔ کچھ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے ۔ جسموں سے پسینے کی بو اُٹھتی تھی ۔ لمبے لمبے گندے چیکٹ بال اور کالے کالے چہروں پر سُرخ سُرخ آنکھیں ۔ وہ گلوں میں مونگوں کے منکے اور ہاتھوں میں کڑے پہنے ہوئے تھے ۔ ایک ملنگ کے ہاتھ میں لمبی چلم تھی ۔ اُس نے چلم پر دم لگایا ۔ سُرخ شعلہ لہرایا وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور چلم برابر بیٹھے ہوئے ملنگ کی جانب بڑھا دی ۔

چلم اسی طرح ایک دوسرے سے ہوتی ہوئی راجہ تک پہنچی ۔ وہ اُس کو لیتا ہوا جھجکا ۔ اُس شخص نے جس کے ہاتھ میں چلم تھی ، گھور کر راجہ کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھا ۔ اور اُونچی آواز سے گرج کر نعرہ لگایا "یا سائیں بابا" اس نعرے سے راجہ ایک دم گھبرا گیا ۔ اُس نے جلدی سے چلم لے کر کش لگایا ۔ اُس کا کلیجہ تک سُلگ گیا ۔ سانس حلق میں گھٹنے لگی ۔ اُس نے کھانستے ہوئے چلم فوراً نوشا کی طرف بڑھا دی ۔ نوشا نے بغیر کچھ سوچے سمجھے چلم پر دم لگایا ۔ اور جلدی سے چلم آگے بڑھا دی ۔

سُلفے پر دم لگانے سے دونوں کے کلیجے جلنے لگے تھے ۔ حلق خشک پڑ گئے ۔ کچھ ایسا محسوس ہُوا ، جیسے اُن کا جسم بہت ہلکا پھُلکا ہو گیا ہے ۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا ۔ دونوں بے اختیار جھُوم اُٹھے ۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے پردے لہرانے لگے ۔ جسم رفتہ رفتہ بے قابو ہوتے جا رہے تھے ، چرس کا نشہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا ۔ دونوں خاموش بیٹھے جھُومتے رہے ۔ اُن کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے ۔ غنودگی بڑھنے لگی ۔ دونوں وہیں ایک طرف لُڑھک کر گہری نیند

سو گئے۔

دن چڑھے تک وہ سوتے رہے۔ باہر احاطہ میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ اچانک کسی نے راجہ کی ٹانگ کھینچ کر زور سے جھنجوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا بڑے بڑے بالوں والا ایک نیم برہنہ ملنگ اُس پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ ڈانٹ کر بولا۔

"لنگر بٹ جائے گا۔ جاؤ جلدی سے جا کر لے آؤ۔"

وہ اپنے ہاتھوں کے کڑے بجاتا آگے بڑھ گیا۔ راجہ نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ہاتھوں سے مَلا اور انگڑائی لے کر کسل مندی دُور کرنے لگا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ گلا خشک تھا۔ ہاتھ پیر ٹوٹ رہے تھے۔ جب وہ گرد و پیش کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہو گیا تو اُس نے پاس لیٹے ہوئے نوشا کو جگایا جو اب تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بھی آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھ گیا۔ دونوں کو سخت پیاس لگی تھی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کہاں جا کر پانی پئیں۔ اسی اثنا میں وہ ملنگ پھر واپس آ گیا جس نے راجہ کو جگایا تھا۔

"تو ابھی تک لنگر لینے نہیں گیا"۔ وہ برہم ہو کر چیخا۔

راجہ نے جلدی سے پوچھا"کہاں سے؟"

"وہ سامنے لنگر خانہ ہے"۔ اُس نے اس طرف ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا، جہاں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ملنگ ایک طرف چلا گیا اور وہ دونوں لنگر خانے کی جانب چل دئے۔ وہاں کنگلوں اور ملنگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف دھکم پیل مچی تھی۔ لنگر لینے والے زور زور سے چیخ رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے۔ کتّوں کی طرح لڑنے کے لئے بپھتے تھے۔ اُن کے سامنے اونچے چبوترے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ڈھیر سی تنوری روٹیاں دبی تھیں۔ دوسرا بڑی سی بالٹی لٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بالٹی میں ڈونگا ڈال کر دال نکالتا تھا۔ ادھر

سامنے پھیلے ہوئے ٹین کے ڈبّوں اور المونیم یا مٹی کے میلے میلے پیالوں میں ڈالتا جاتا تھا۔ کنگلے لنگر لینے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور لنگر تقسیم کرنے والے اُن کو نفرت سے جھڑک رہے تھے۔

"خنزیرو! پیچھے ہٹو۔"

"تو دوبارہ آیا ہے۔ او حرام کے تخم، پیچھے ہٹ!"

"شور مت مچا۔ او تیرا بیڑا غرق۔"

نیم برہنہ جسموں والے کنگلے اور ملنگ گالیاں سُن رہے تھے۔ بندروں کی طرح دانت نکالے بے غیرتی سے ہنس رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ راجا اور نوشا سہمے ہوئے اُن کو دیکھتے رہے۔ آخر راجہ نے نوشا کا ہاتھ پکڑا اور دونوں بھیڑ میں گھس گئے۔ اُنہوں نے دھکے کھائے۔ گالیاں سُنیں۔ مگر ڈٹے رہے۔ اُن کو بھی دو دو روٹیاں مل گئیں۔ اُن کے پاس برتن نہ تھے۔ لہٰذا دال روٹیوں پر ہی ڈال دی گئی۔

لنگر لے کر دونوں ایک درخت کے نیچے پہنچے۔ وہاں دو ملنگ پہلے ہی سے موجود تھے۔ اور ہبڑ ہبڑ لنگر کی دال روٹی کھا رہے تھے۔ قریب ہی ایک مردِ قلندر دھوپ میں بیٹھا اپنے لمبے بالوں سے جوئیں نکال نکال کر مار رہا تھا۔ نوشا نے اُسے دیکھا تو جی متلانے لگا۔

"چل یار کہیں اور چل۔" اس نے نفرت سے منہ بگاڑ کر راجہ سے کہا۔

راجہ اُسے جھڑک کر بولا "ابے یہ نخرے چھوڑ۔ بھوک کے مارے اپنا دم نکلا جا رہا ہے۔"

وہ زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ نوشا کو بھی اپنے ساتھ ہی بیٹھا لیا۔ دونوں گردن جھکا کر لنگر کھانے لگے۔ روٹیاں ٹھنڈی تھیں۔ مگر چنے کی دال گرم تھی۔

دال میں مرچیں زیادہ تھیں، اور پتلی بھی تھی۔ دونوں کے منہ میں جیسے آگ لگ گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ کنویں کی طرف بھاگے، جس کی منڈیر کے پاس ہی بڑے بڑے مٹی کے مٹکے ایک پختہ چبوترے پر رکھے تھے۔

دونوں نے المونیم کے گندے، اور بدوضع گلاسوں میں پانی اُنڈیلا اور غٹاغٹ پی گئے۔ پانی پینے کے بعد وہ بھاری بھاری پیٹوں کے ساتھ ایک صحنچی کی جانب بڑھے۔ اندر گئے اور ایک گوشے میں خاموشی سے لیٹ گئے۔ صحنچی میں اُن کی طرح اور بھی کتنے ہی بے فکرے اور ملنگ۔ فرش پر لیٹے اُونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔

دونوں کچھ دیر تک خانقاہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سو گئے۔ تمام دوپہر وہ بے خبر سوتے رہے۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے اُن کی آنکھ کھُل گئی۔ اب خانقاہ کی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔

خانقاہ میں گیس بتیوں کی روشنی پھیل گئی۔ لوگوں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی۔ سفید داڑھی والے سجادہ نشین مزار کے سرہانے بیٹھے تھے اور اشاروں سے مجاوروں کو احکامات دے رہے تھے۔ عقیدت مند آتے، اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ دونوں ہاتھوں پر روپے رکھ کر نذرانہ پیش کرتے اور اُلٹے قدموں لوٹ کر مزار کے پاس ہی ایک طرف بیٹھ جاتے۔

قریب ہی صحنچی میں ملنگوں اور قلندروں کی محفل جمنے لگی تھی۔ وہ چلم پر لمبے لمبے کش لگا رہے تھے اور اُلوہیت سے سرشار ہو کر طرح طرح کے نعرے لگا بلند کر رہے تھے۔ اچانک ایک سب انسپکٹر پولیس چار کانسٹیبلوں کے ہمراہ خانقاہ میں داخل ہوا۔ پہلے وہ سجادہ نشین کے پاس گیا۔ اُن سے آہستہ آہستہ کچھ بات چیت کی۔ پھر کانسٹیبلوں کے ساتھ حجروں اور صحنچیوں میں کسی کو تلاش کرنے لگا۔

پولیس والے جب راجہ اور نوشا کے قریب آئے تو اُن کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ اُنھوں نے ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح اپنی گردنیں لٹکا لیں، اور آنے والی مصیبت کا دھڑکتے دلوں سے انتظار کرنے لگے۔ مگر مصیبت اُن کے سر سے صاف ٹل گئی۔ پولیس والے خاموشی کے ساتھ ان کے پاس سے گزر گئے۔ ذرا دیر بعد اُنھوں نے دیکھا کہ چرسیوں کے غول میں سے کانسٹیبلوں نے ایک پستہ قد آدمی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اُسے حراست میں لے لیا۔

خانقاہ میں سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے لئے کھلبلی مچی۔ ذرا دیر خاموشی رہی اور جب پولیس والے اُس شخص کو حراست میں لے کر خانقاہ سے باہر چلے گئے، تو ملنگوں اور قلندروں نے سُلفے پر دم لگایا۔ چلم کے اُوپر شعلہ لہرایا۔ ہر طرف سے نعرہ بلند ہُوا۔

"یا سائیں بابا"

"ہُو۔ حق اللہ"

خانقاہ کی زندگی میں یہ غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ البتہ راجہ اور نوشا ابھی تک سہمے ہوئے تھے۔ پولیس والوں کے قدموں کی آواز جب دُور ہو گئی تو نوشا نے کہا۔

"یار راجہ یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔ اللہ نے بال بال بچا لیا۔"

"ہاں یار یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

نوشا پوچھنے لگا۔ "مگر اب جائیں تو کہاں؟"

راجہ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "یار میری سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے، مگر تُو مانے گا نہیں۔"

"مانوں گا کیوں نہیں۔ کچھ بتا تو۔"

راجہ سر کے بال کُریدتے ہوئے بولا۔ "میرا تو جی چاہتا ہے کہ بی بی جی کے

پاس جاکر اُن کے پیر پکڑ لوں۔ اُن سے سب کچھ صاف صاف بتا دُوں۔ میں تو دوپہر سے یہی سوچ رہا ہوں۔"

"مگر یار شاہ جی سے دشمنی مول لینی پڑے گی۔ وہ ہم دونوں کو قتل کروا دے گا۔ بڑا خطرناک آدمی ہے۔"

راجہ نے کہا: "یہی تو مجھ کو بھی ڈر ہے۔ مگر جب پولیس اُس کو پکڑ لے گی تو پھر وہ ہمارا کیا بگاڑے گا۔"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ رات کا اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ خانقاہ کی رونق شباب پر تھی۔ جمعرات کا دن تھا۔ عقیدت مندوں کا خوب ہجوم تھا۔

نوشا اور راجہ نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ آخر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اُن کو خانقاہ چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور انجینئر کی کوٹھی پر جاکر بی بی جی سے سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ یہ منصوبہ بنا کر راجہ نے ایک شخص سے ہاؤسنگ سوسائٹی کا راستہ پوچھا، اور دونوں رات کے اندھیرے میں خانقاہ سے باہر آ گئے۔

جس وقت وہ کوٹھی پر پہنچے، رات کے نو بج چکے تھے۔ اُنہوں نے پیدل کئی میل کا راستہ طے کیا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو رہے تھے۔ راجہ وہاں آ تو گیا مگر اندر جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

آخرکار وہ ڈرتے ڈرتے پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ نوشا بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ لان کو عبور کر کے جیسے ہی وہ روشنی میں آیا، نہ جانے اس وقت کہاں سے اکو اور للی نکل پڑے۔ راجہ کو دیکھ کر اُنہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔

"راجہ آ گیا، راجہ آ گیا۔"

دونوں بچے آ کر اُس سے چمٹ گئے۔ شور سُن کر بی بی جی بھی آ گئیں۔ اُنہوں نے راجہ اور نوشا کو دیکھا تو حیرت سے اُن کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ

اُن کے پاس گئیں۔ لیکن فوراً ہی کسی نامعلوم خوف سے ڈر کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ راجہ اور نوشا سر جھکائے اُن کے سامنے گنہگاروں کی طرح کھڑے تھے۔ بی بی جی دونوں کو غصّہ سے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اُسی وقت انجینئر صاحب کی کار آ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور بیگم سے بولے "ارے تم یہاں کھڑی ہو۔ اچانک اُن کی نظر راجہ پر پڑی، وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

"ارے راجہ۔"

وہ لمحہ بھر تک کچھ سوچتے رہے۔ پھر دونوں کو اپنے ہمراہ کوٹھی کے اندر لے گئے۔ اُن کو کمرے میں بٹھایا۔ بیوی کو نگرانی پر مقرر کیا۔ پولیس کو ٹیلیفون کیا۔ اور دونوں کی آمد سے مطلع کر دیا۔

کمرے میں پہنچ کر راجہ نے بی بی جی کے پَیروں کو پکڑ لیا۔ گڑگڑا کر رونے لگا "بی بی جی مجھے معاف کر دو۔ اللہ قسم میری ذرا بھی غلطی نہیں۔"

اُس نے رو رو کر شاہ جی اور اُس کے گروہ کا حال بتایا۔ اپنی مجبوری بیان کی۔ وہ خاموشی سے ساری باتیں سُنتی رہیں۔ اُنہیں حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر متاثر بھی ہوئیں۔ مگر اُن کو سب سے زیادہ فکر اپنے قیمتی زیورات اور سامان کی تھی۔ اُنہوں نے جل کر دل ہی دل میں کہا، دونوں بھاڑ میں جائیں۔ پہلے سامان ملنا چاہیئے۔

اُن کو خاموش پاکر راجہ نے کہا "بی بی جی! سچ کہتا ہوں، میرا تو جی چاہتا ہے۔ زندگی بھر یہیں رہوں۔ آپ ہم دونوں کو پولیس سے بچا لیجئے۔"

"اللہ قسم، ہمارا بالکل قصور نہیں ہے۔" نوشا بولا۔

بی بی جی "اچھا، اچھا" کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ذرا دیر بعد راجہ کو پچھتاوا لگا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ فوراً اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ پریشان ہو کر نوشا سے کہا۔

"لگتا ہے یار چوٹ ہو گئی۔"

اُس نے گھبرا کر دریافت کیا۔"کیا ہو گیا؟"

"کمرہ باہر سے بند ہے۔"

"کیوں؟" نوشا اور گھبرا گیا۔

راجہ اُس کے سوال کا جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا۔ پولیس والے اپنے بھاری بھاری بوٹ پختہ فرش پر بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ راجہ اور نوشا دم بخود رہ گئے۔ پولیس والوں نے دونوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈال دیں۔ اُنہیں تھانے لے گئے۔ مار پیٹ اور دھونس دھمکی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ دونوں نے اپنے بیان میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔ روئے، گڑگڑائے مگر اُنہیں حوالات میں ڈال دیا گیا۔

اُسی رات شاہ جی کے اڈّے پر چھاپہ مارنے کی غرض سے پولیس کی مسلح پارٹی روانہ کر دی گئی۔

شاہ جی کو اپنے گرگوں کے ذریعہ راجہ اور نوشا کی گرفتاری کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ پولیس پارٹی جب شاہ جی کے اڈّے پر پہنچی تو وہاں صرف پٹھان چوکیدار موجود تھا۔ پولیس نے اُس کو حراست میں لے لیا۔ پوچھ گچھ کرنے پر چوکیدار سے معلوم ہوا کہ شاہ جی اور اُس کے ساتھی گھنٹہ، سوا گھنٹہ پہلے گھر سے نکل گئے تھے اور یہ کہہ کر گئے تھے کہ صبح واپس آجائیں گے۔

شاہ جی کے گھر کی نگرانی شروع کر دی گئی۔ شہر کے ہر تھانے اور چوکی کو مطلع کر دیا گیا۔ وائرلیس کے ذریعہ حیدر آباد اور ٹھٹھہ کے تمام تھانوں کو بھی خبر دار کر دیا گیا۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ چند گھنٹوں میں شاہ جی اور اُس کے ساتھی زیادہ دُور نہیں جا سکتے تھے۔ کسی ریل گاڑی کے جانے کا وقت نہیں تھا۔ شاہ جی صرف کار

کے ذریعہ فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔

راجہ اور نوشا حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ راجہ گم صُم تھا۔ مگر نوشا برہم تھا۔ وہ گھور گھور کر راجہ کو خونخوار نظروں سے دیکھتا جس نے اپنے ساتھ اُسے بھی مصیبت میں پھنسوا دیا تھا۔

تھانے میں ایس ایچ او کے کمرے سے بار بار کھانسنے کی آواز اُبھر رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون کے پاس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رات تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ تھانے میں گہرا سناٹا تھا۔ کبھی کبھار فرش پر کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری قدموں کی آہٹ اُبھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

رات کے دو بجنے والے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ انسپکٹر نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ میں شاہ جی کے حُلیے کے ایک شخص کو پانچ افراد کے ہمراہ مشتبہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ایک بڑی ٹیکسی کے ذریعے سفر کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے جواب میں ہدایت دی کہ اُنہیں فوراً اُس کے پاس پہنچا دیا جائے۔

صبح کاذب کے دُھندلکے میں شاہ جی، نورے، لوٹن اور دُتے کو، دو اور افراد کے ساتھ پولیس کی حراست میں تھانے لایا گیا۔ مگر اُن کو تھانے کی حوالات میں بند کرنے سے قبل راجہ اور نوشا کو ریمانڈ ہوم پہنچا دیا گیا تھا۔

شاہ جی اور اُس کے ساتھیوں نے دو روز تک پولیس کو اپنے جرائم کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ ہر الزام سے انکار کیا۔ مگر جب طرح طرح سے ٹارچر کیا گیا تو اُن کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ اُنہوں نے سب کچھ اُگل دیا۔ اُن کی نشاندہی پر چوری کا مال بھی برآمد کر لیا گیا۔

پولیس نے بیانات قلم بند کرنے کے بعد عدالت میں ان کے خلاف چالان پیش کر دیا۔ اُنہیں حوالات سے عدالت کے ریمانڈ پر سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

شاہ جی اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف چوری، ڈاکہ زنی اور بردہ فروشی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ راجہ اور نوشا کو سرکاری گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا۔ چار مہینے تک مقدمہ چلتا رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ شاہ جی کے وکیل نے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو بری کرانے کی بہت کوشش کی۔ اپنے موقف کی تائید میں دلائل کے ساتھ ساتھ گواہ بھی پیش کئے۔ شاہ جی اور اُس کے ساتھی اُن بیانات سے منحرف بھی ہو گئے، جو اُنھوں نے پولیس کے سامنے دئے تھے۔

چوری کا مال پہلے ہی برآمد ہو چکا تھا۔ سارے ثبوت بھی موجود تھے۔ شاہ جی اور اُس کے ساتھیوں کو ڈاکہ زنی اور دوسرے جرائم کی پاداش میں چار، چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ شاہ جی کے وکیل نے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی۔ مگر اپیل خارج ہو گئی۔ ماتحت عدالت کی سزا بحال رکھی گئی۔

راجہ اور نوشا کو صرف سال، سال بھر کی سزا ہوئی۔ دونوں کو ریمانڈ ہوم سے بورسٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جیل نوعمر اور نابالغ مجرموں کے لئے مخصوص تھی۔

فصلِ پنجم

(۱)

شادی کے چند روز بعد ہی نیاز، دکان کی کوٹھری سے اپنا سامان لے کر نوشا کے گھر منتقل ہو گیا۔ اُس نے مکان کی مرمّت کرائی۔ اپنی رہائش کے لئے علیحدہ کمرہ بنوایا۔ دیواروں پلستر کرایا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر روغن پھروایا۔ وہ مکان جو کبھی کھنڈر کی طرح بوسیدہ نظر آتا تھا، اب دُلہن کی طرح سجا ہوُا تھا۔

سلطانہ کے ساتھ اُس کا رویّہ بہت سنبھلا ہوُا تھا۔ وہ اُس سے بہت کم بات کرتا۔ کبھی اُس کمرے میں نہیں گیا، جس میں سلطانہ اور انّو رہتے تھے۔ یوں کاروبار سے اُس کا جس قدر وقت بچتا، وہ گھر ہی پر گزُرتا تھا۔ وہ عام طور پر کمرے کے اندر بیٹھا دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتا۔ اکثر بیوی کو بازار لے جاتا اور سامان سے لدا پھندا لوٹتا۔ دو بار وہ اس کو فلم دکھانے بھی لے گیا۔ رات کو دکان سے واپس آتا تو ایسا کبھی نہیں ہوُا کہ وہ خالی ہاتھ آیا ہو، ہمیشہ پھل، مٹھائی یا کچھ اور کھانے پینے کا سامان لے کر گھر میں داخل ہوتا۔ روزانہ شام کو گُل فروش دروازے پر آواز

دے کر مہکتے ہوئے گجرے اور ہار دے جاتا۔

یہ بڑے ہنسی خوشی کے دن تھے۔ گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی۔ سب سے زیادہ مسرور سلطانہ کی ماں تھی۔ اُس کے رخسار نکھر کر گلابی پڑتے جا رہے تھے آنکھوں میں نرالی چمک دمک تھی۔ شام کو جب وہ بن ٹھن کے بیٹھتی تو عطر اور پھولوں کے گجروں سے اُس کا جسم مہکتا ہوتا۔ اُس پر ایک نئی پھبن آ جاتی۔ وہ بڑی سدا بہار عورت تھی۔ دیکھنے والوں کو اُس پر اور سلطانہ پر چھوٹی بڑی بہنوں کا گمان ہوتا۔ لیکن ماں جس قدر شادمان تھی، سلطانہ اُسی قدر بجھی بجھی اور افسردہ نظر آتی۔ اُس میں دوشیزگی کا جو الھڑ پن تھا، اس پر ایک اُکتا دینے والی خاموشی چھاتی جا رہی تھی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی۔ عام طور تھکی ہوئی سی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

ستمبر کی ایک شام کا ذکر ہے۔ ماں نیاز کے ساتھ سنیما دیکھنے گئی تھی۔ اَنّو بھی ضد کر کے ساتھ لگ گیا تھا۔ سلطانہ گھر میں تنہا تھی اور نڈھال سی باورچی خانہ میں بیٹھی تھی۔ چولھے کے اندر لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ سے نارنجی شعلے اُبھر رہے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شیشم کے درخت سے زرد، زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر آنگن میں گر رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑاتے۔ بڑی پُر اسرار سی آہٹ پیدا ہوتی۔ اِن ہی آہٹوں میں ملی جلی ایک آواز دروازے پر اُبھری۔

یہ سلمان تھا۔ وہ اَنّو کو آواز دے رہا تھا۔ سلطانہ اُس کی آواز سُن کر چونک پڑی۔ وہ خاموش بیٹھی سوچتی رہی کہ اُس کو کیا کرنا چاہیئے۔ کئی لمحے اِسی عالم میں گزر گئے۔ آواز رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔ سلطانہ سکون کے ساتھ بیٹھ نہ سکی۔ بے چینی کے عالم میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر اس دروازے کی جانب دیکھا، جس کے نیچے سلمان کھڑا تھا۔ چھریرے جسم کا وہ نوجوان، جس کی آنکھیں شرمائی

شرمائی رہتی تھیں۔ بالوں میں بے ترتیبی تھی اور چہرے کے تیکھے نقش و نگار میں دلآویزی تھی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ خشک پتے اس طرح کھڑکھڑائے گویا سلطانہ کے کان میں سرگوشی کر رہے ہوں۔

دیکھ وہ واپس چلا جائے گا۔

وہ جو چل کر تیرے در تک آیا ہے۔

جس کے انتظار میں تیری آنکھوں کا کاجل پھیکا پڑ گیا۔

رخسار گیندے کے پھول بن گئے۔

سُہانی راتیں اُداس اور کافوری صبحیں ویران ہو گئیں۔

— وہ واپس جا رہا ہے!

دیکھ واپس جا رہا ہے۔

خزاں رسیدہ پتے آنگن میں کھڑکھڑاتے رہے۔ ہوا سرسراتی رہی۔ دبی دبی سرگوشیاں اُبھرتی رہیں۔ سلطانہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باورچی خانے سے نکلی۔ اُس نے آنگن کو عبور کیا اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔ وہ اس وقت کسی سحر زدہ ہستی کی طرح مبہوت نظر آ رہی تھی۔

سلمان نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ دُھندلی روشنی میں اُس نے سامنے کھڑی ہوئی سلطانہ کو دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

اُس نے آہستہ سے کہا "سلطانہ!"

"جی" وہ اُس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔

دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز اُبھری "اب آپ کیوں آئے ہیں؟" اُس کا لہجہ تلخ تھا۔ سلمان نے اُس کی تلخی کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا۔ سر جھکا کر بولا۔

"تم سے معذرت کرنے آیا تھا۔"

"کاہے کی معذرت ؟"

"بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔"

سلطانہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔

سلمان آہستہ آہستہ کہنے لگا "سلطانہ میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ آج میں تم سے سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھا "بات یہ ہے کہ اُس رات جب میں تمہارے گھر سے نکل کر گیا۔ تو میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ایسی حالت میں، میں تم کو کیسے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ اس رات میں اپنے ہر دوست اور ہر آشنا کے پاس گیا۔ مگر کوئی بھی میرے آڑے وقت پر کام نہ آیا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی۔ جس کو بیچ کر کچھ رقم مہیّا کر لیتا۔ اُس روز میں تمام رات پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا۔ تمہیں کس طرح بتاؤں کہ اُس رات مجھ پر کیا بیتی۔"

سلطانہ اس انکشاف پر چونک پڑی۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کر سلمان کو دیکھا۔ وہ دروازے کی جانب پیٹھ کئے کھڑا تھا اور مدھم لہجے میں رُک رُک کر بول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا۔ چہرے پر دُکھ کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ چُپ چاپ اس کی باتیں سُنتی رہی۔ سلمان کہتا رہا۔

"شاید تمہیں نہیں معلوم کہ مَیں ایک عرصہ سے پریشانیوں میں گھرا ہُوا ہوں۔ ابا جان نے مجھ کو خرچ بھیجنا بند کر دیا ہے۔ میری تعلیم بھی اُدھوری رہ گئی۔ ورنہ میں اس سال گریجوایٹ ہو جاتا۔ ملازمت تلاش کر رہا ہوں، وہ ابھی تک نہیں ملی۔" وہ اس وقت اپنی زندگی پر سے ہر پردہ اُٹھا دینا چاہتا تھا، ہر بات کہہ دینا چاہتا تھا۔

"زندگی میرے لئے عذاب بن گئی ہے، اور اس عذاب میں، مَیں تم کو

شریک کرنا نہ چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ تم میری بن جاتیں اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔"

سلمان نے گہری سانس بھری۔ اُس کا چہرہ اور بھی زیادہ اُداس ہو گیا۔ سلطانہ کو اُس کی باتوں سے صدمہ پہنچا۔ وہ لرز لرز اُٹھی۔ اظہارِ ہمدردی کے طور پر اُس نے کہا۔" تو پھر آپ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

وہ بولا۔" نہیں سلطانہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ زندگی میں اتنی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے تہیّہ کر لیا ہے کہ کسی کی اُنگلی پکڑ کر چلنے کے بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کروں۔ یہ عہد میں نے اُسی رات کیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی عجیب رات تھی۔" ایک بار پھر سلمان نے گہری سانس بھری۔" سچ تو یہ ہے سلطانہ! میں نے بڑی بے راہ روی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ مگر اب چاہتا ہوں کہ زندگی میں کچھ باقاعدگی آجائے اور میں ----"

اپنی بات کہتے کہتے اُس نے اچانک نظریں اُٹھا کر سلطانہ کو دیکھا۔" تم مجھ کو اس طرح نہ دیکھو۔ میں اتنا بُرا نہیں ہوں۔" وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ آواز قدرے بھرا گئی۔ اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ سلطانہ مبہوت کھڑی رہی۔

چند لمحوں کے لئے گہری خاموشی چھا گئی۔ صحن میں خزاں رسیدہ پتے آہستہ آہستہ کھڑکھڑاتے رہے۔ رات کا اندھیرا اور بڑھ گیا۔ سناٹا آسیب زدہ ہو گیا۔ سلطانہ نے سوچا کہیں سب لوگ واپس نہ آجائیں۔ بڑا غضب ہو گا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" ایک بات کہوں تو بُرا نہ مانیئے گا۔" پھر اُس نے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی بات کہہ دی۔" آئندہ آپ یہاں نہ آیا کریں۔"

سلمان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ سلطانہ نے اُس کو خاموش دیکھ کر فوراً کہا۔" بات یہ ہے کہ اماں نے شادی کر لی ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ

گھبرا گئی۔

سلمان حیرت سے چونک پڑا۔ "اماں کی شادی ہوگئی؟" اُس کو سلطانہ کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "جی ہاں۔"

وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ "کس کے ساتھ شادی ہوئی؟"

"آپ اُنہیں نہیں جانتے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہیں نیازؔ، اُن ہی کے ساتھ ہوئی ہے۔"

سلمان نے گھبرا کر پوچھا۔ "وہی تو نہیں، جن کی کباڑ خانے کی دکان ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں وُہی۔ آپ اُن کو جانتے ہیں؟"

وہ صاف مُکر گیا۔ "ایسے ہی ایک بار ملاقات ہوگئی تھی۔"

سلطانہ کہنے لگی۔ "آپ یہاں آئیں گے تو وہ ناراض ہوں گے۔ وہ بڑے شکی آدمی ہیں۔ کسی دن آپ کی بے عزتی کر بیٹھے تو کتنی بُری بات ہوگی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، آپ آئندہ نہ آئیں۔ مجھے بڑا ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

سلمان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اچھا نہیں آؤں گا۔"

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ جیسے اُسے شدید صدمہ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب آپ جائیں۔ سب لوگ سینما گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

"اچھا۔" سلمان سر جھکا کر فرش کو تکنے لگا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" سلطانہ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ سلمان نے اچانک کچھ سوچ کر پوچھا۔ "سلطانہ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

وہ حیرت سے بولی۔ "میری شادی؟"

"اُس رات جب میں تم کو لینے کے لئے آنے والا تھا، اُس کی صبح تو تمہارا

نکاح ہونے والا تھا۔ تمہاری امّاں نے مجھ سے یہی کہا تھا۔"

"لیکن اُس صبح تو امّاں کا نکاح ہوُا تھا۔"

سلمان کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آیا۔ وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔

سلطانہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اُس نے وضاحت کی۔" وہ پہلے میری شادی کردینا چاہتی تھیں۔"

سلمان نے پوچھا۔"کیوں ؟"

" وہ نیاز کو اچھا آدمی نہیں سمجھتیں۔" وہ اپنی بات پوری طرح واضح نہ کرسکی۔ مگر سلمان ذہین نوجوان تھا، فوراً اُس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ آن کی آن میں نیاز اُس کے سامنے رقیب روسیاہ کے روپ میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اپنے دل کے چور کو بہت چھُپانا چاہا مگر اُس نے بے اختیار پوچھ ہی لیا۔

" اور نیاز کے متعلق تمہاری اپنی رائے کیا ہے ؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولی۔" مجھے اُن سے نہ جانے کیوں ڈر لگتا ہے ؟"

اِس سادگی پر سلمان کو پیار آگیا۔ سلطانہ کے رخسار کو تھپتھپا کر بولا۔

" میری بھولی بھالی گڑیا !" اور بے قرار ہوکر اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔

لیکن لمحہ بھر ہی بعد وہ سہمی ہوئی آواز سے بولی۔" آپ جائیے، وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

سلمان بھی گھبرا گیا۔ اُس نے کہا۔" مجھے اب چلا جانا چاہیئے۔ تم جب بھی کسی پریشانی میں ہو، اتّو کے ذریعہ مجھے اپنا پیغام بھجوا دینا۔ میرا خیال ہے کہ تم اُس سے یہ کام لے سکتی ہو۔"

وہ بولی۔" کہیں وہ کسی سے کچھ کہہ نہ دے۔ اس سے ڈر لگتا ہے۔"

" نہیں تم اس کو سمجھا دینا۔"

"اچھی بات ہے۔"

سلمان نے دروازے کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ" اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

گلی میں آکر آگے جاتے جاتے وہ رک گیا۔ سوچا نہ معلوم سلطانہ سے کب ملاقات ہو، کچھ دیر اس سے اور باتیں کر لے۔ پھر یہ موقعہ بھی میسر نہ آئے گا۔ ابھی کتنی ایسی باتیں تھیں جو وہ سلطانہ سے دریافت کرنا چاہتا تھا، جن کا جاننا اس کے لئے ضروری تھا۔ لیکن وہ لوٹ کر دروازے پر نہ گیا۔ آہستہ آہستہ تاریک گلی میں چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دوسری گلی کی جانب مڑنے لگا تو اچانک اس کی نظر نیاز پر پڑی۔ وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک برقع پوش عورت تھی اور ساتھ ساتھ انو بھی چل رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے ان کو پہچان لیا۔ وہ آگے جانے کے بجائے فوراً مڑ کر ایک اور گلی میں گھس گیا۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر بازار میں آ گیا۔

بازار میں دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ نانبائیوں کی دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ اور چائے خانوں میں خاصی رونق تھی۔ اس کو بھوک لگ رہی تھی، لیکن جیب میں بمشکل ۱۲ آنے کی ریزگاری تھی۔ کسی اچھے ہوٹل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا بازار کے اس نکڑ پہ پہنچ گیا، جہاں سے ایک سڑک نشیب میں جاتی تھی۔ اس سڑک پر چند قدم چل کر بائیں ہاتھ کو ایک بھٹیار خانہ تھا۔ ویسے اس کے مالک نے اپنے گاہکوں کی تسکین کے لئے دروازے پر "شاہ پسند ہوٹل" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔

سلمان "شاہ پسند ہوٹل" پہنچا۔ وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ لمبی لمبی بوسیدہ میزوں کے گرد گاہکوں کی بھیڑ تھی جن میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ وہ اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے، بے تکلفی سے ایک

دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

سلمان ہوٹل کے ایک الگ تھلگ کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں روشنی کم تھی اور زیادہ ہنگامہ نہیں تھا۔ اُس کے سامنے صرف ایک آدمی بیٹھا تھا جو جبڑوں سے آواز پیدا کرتے ہوئے کتّے کی طرح جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے نفرت سے ایک بار اُس کو دیکھا اور کھانا لانے کا آرڈر دے دیا۔ ذرا دیر بعد دو گرم تنوری روٹیاں اور سالن کی پلیٹ اُس کے سامنے آگئی۔ کھانا بڑا چیٹ پٹا تھا۔ اُس کا ذائقہ سلمان کو اچھا لگا۔ اُس کے پاس تھوڑے پیسے ہوتے تو وہ اسی سستے ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے چائے بھی پی۔ پُورا بل ساڑھے سات آنے بنا تھا۔

"شاہ پسند ہوٹل" سے باہر نکلتے ہی اُس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ جہاں تھا، وُہیں ٹھیر گیا۔ وہ اُس کے کالج میں تاریخ کا لیکچرار تھا۔ گردن جھکائے کسی گہری فکر میں ڈوبا ہُوا اسی طرف آ رہا تھا۔ سلمان نے چاہا کہ نظر بچا کر گزر جائے مگر وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"مسٹر سلمان!"

اُس نے با دلِ ناخواستہ مُڑ کر اُس طرف دیکھا۔ پروفیسر علی احمد اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ خشک بال، سوچتی ہوئی آنکھیں اور مُرجھایا ہُوا زرد چہرہ۔ لیکن اُس کی مخصوص مسکراہٹ اس وقت بھی ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اُس نے نظر بھر کر سلمان کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولا۔ "بہت دُبلے ہو گئے ہو تم؟"

سلمان صاف جھوٹ بول گیا۔ "بیمار پڑ گیا تھا۔"

وہ پوچھنے لگا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر جانے کا ارادہ تھا۔"

علی احمد نے کہا: "اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو آؤ میرے ساتھ چائے پیو۔ میرا مکان یہاں سے دُور نہیں ہے۔" سلمان اِنکار نہ کر سکا اور خاموشی کے ساتھ اُس کے ہمراہ ہو لیا۔

علی احمد کا مکان واقعی زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا۔ مشکل سے اُنہوں نے ایک فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ علی احمد ایک دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر زینے کا دروازہ کھولا اور سلمان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ زینے کے اندر اندھیرا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے اُوپر پہنچ گئے۔ علی احمد نے جیب سے کنجی نکالی۔ دروازے پر پڑا ہوا تالہ کھولا۔

مکان کے اندر بجلی کا بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہ ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں تاریکی تھی۔ علی احمد نے سوئچ دبایا۔ فوراً روشنی ہو گئی۔ سلمان نے دیکھا، کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ کھڑکیاں کھُلی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ کمرے میں معمولی سا فرنیچر تھا۔ بید کا بنا ہوا سستے قِسم کا صوفہ، تین چار کرسیاں، ایک آفس ٹیبل اور اُس کے برابر کتابوں کی الماری۔ میز پر چند کتابیں اور کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسُوس ہوتا تھا کہ وہ مطالعہ کرتے کرتے اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ علی احمد نے "لائف" کا تازہ نمبر اُٹھایا، اور سلمان کی طرف بڑھا کر بولا۔

"تم اس کی تصویریں دیکھو، میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔"

سلمان بولا: "آپ خواہ مخواہ تکلف نہ کریں، میں ——"

وہ بات کاٹ کر بولا: "اِس میں تکلف کی کونسی بات ہے۔ میں روزانہ اِس وقت چائے پیتا ہوں اور ہمیشہ خُود ہی تیار کرتا ہوں۔ میرا نوکر کھانا کھلانے کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے۔"

"میں آپ کی کچھ مدد کروں۔"

"شکریہ! تم مجھ سے اچھی چائے نہیں بنا سکتے۔ مسٹر یہ سیدھا سادا ٹیسٹ کا سوال ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

علی احمد کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلمان خاموش بیٹھا میگزین کے ورق اُلٹتا پُلٹتا رہا۔ تصویریں دیکھتا رہا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے ٹکرانے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ جہاں علی احمد چائے تیار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر علی احمد کمرے میں تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ سلمان نے غور کیا علی احمد نے چائے بڑی نفاست سے تیار کی تھی۔ دونوں بیٹھے چائے پیتے رہے اور سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آ رہے تھے۔ شہر کے ہنگامے سرد ہوتے جا رہے تھے۔ آوازوں کا شور رفتہ رفتہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔

علی احمد نے غور سے سلمان کے چہرے کو دیکھا۔" ہاں بھئی، اب بتاؤ کہ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" سلمان کا مختصر سا جواب تھا۔

"آئندہ کے متعلق تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

وہ اصرار کرنے لگا۔" بہرحال مستقبل کے بارے میں تم نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔"

سلمان کچھ اور سنجیدہ ہوگیا۔" اس معاشرے نے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بنانے کا حق ہی کب دیا ہے۔ یہ حق تو زندگی میں صرف چند خوش نصیبوں کو حاصل ہے اور ان خوش نصیبوں کی فہرست میں میرا نام نہیں ہے۔" اُس کے لہجے میں تلخی تھی۔

علی احمد مسکرا کر بڑی نرمی سے بولا۔" اصطلاحات میں باتیں کرنے کے

کیوں نہ ہم حقیقت پسندی سے کام لیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم معاشرے کو کوسنے کی بجائے صرف اپنے متعلق بات کرو۔"

سلمان اُسی تلخی کے ساتھ بولا "دیکھئے بات یہ ہے۔ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر جاری نہیں رکھ سکتا۔ ملازمت چاہتا ہوں۔ وہ ملتی نہیں۔ ایک معزز شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے امکانات نہیں۔ سیدھا سادا اقتصادی مسئلہ ہے، اور کوئی اقتصادی مسئلہ معاشرے سے ہٹ کر اپنا وجُود نہیں رکھتا۔"

پروفیسر علی احمد ذرا دیر خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا "تم بڑے ذہین طالب علم تھے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم نے اپنی ذہانت سے کوئی کام نہیں لیا۔"

سلمان نے فوراً کہا "کیا آپ کے خیال میں، مَیں ایک ذہین نوجوان ہُوں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی رائے پر فی الحال نظرِ ثانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں!"

"تو پھر میرے ساتھ کسی انٹرویو میں چلئے، جہاں سے آج تک مجھے ناکارہ اور گھامڑ ہونے کی سند ملتی رہی ہے۔"

علی احمد آہستہ سے بولا "مجھے تم سے پُوری پُوری ہمدردی ہے۔"

سلمان جھنجلا کر بولا "معاف کیجئے پروفیسر صاحب! مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میں کسی بھُوکے کو ایک وقت کا کھانا کھلا کر آسانی کے ساتھ خرید سکتا ہُوں۔"

وہ گھبرا کر بولا "تم واقعی بیمار ہو۔"

سلمان کہنے لگا " یہ بات بھی نہیں۔ آپ بند کمروں میں بیٹھ کر زندگی کو کتابوں کے اندر تلاش کرتے ہیں۔ اور میں نے زندگی کو شراب خانوں میں، بالاخانوں میں، قمارخانوں میں اور تنگ و تاریک گلیوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے کئے ہیں۔ ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔ زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھئے کہ وہ کس قدر مظلوم ہے۔"

وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اُس کے سینے میں مدّت سے جو آگ سلگ رہی تھی، وہ اچانک بھڑک اُٹھی تھی۔ آج اُس کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ وہ ان زخموں کو اپنی تمام آلائش کے ساتھ پروفیسر علی احمد کے سامنے برہنہ کر دینا چاہتا تھا۔ اُس نے یہ بھی لحاظ نہ رکھا کہ وہ علی احمد کا طالب علم رہ چکا تھا۔

لیکن علی احمد نے اُس کی باتوں پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اسی طرح مسکرا کر بولا " مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حالات نے تمہاری شخصیت کو مسخ کر دیا ہے۔ تم انارکی کی طرف جا رہے ہو۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔ مجھے خوف ہے تم اپنی ذات سے انتقام لیتے لیتے کہیں معاشرے سے انتقام لینا نہ شروع کر دو۔ یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ تم ذہین نوجوان ہو اور ذہین نوجوان کسی قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔"

سلمان جیسے اب تھک گیا تھا۔ وہ اس عرصہ میں چائے کی چار پیالیاں پی چکا تھا۔ اور مسلسل سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ اُس نے نڈھال ہو کر صوفے کی پشت سے پیٹھ ٹکا دی۔ اور خاموشی کے ساتھ پروفیسر علی احمد کی باتیں سُنتا رہا۔

" تم مجھے اپنا کچھ وقت دے سکتے ہو؟ " علی احمد نے پوچھا۔

" سلمان بولا " میرے پاس وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ جتنا وقت چاہیں دے سکتا ہوں۔"

"پرسوں شام تم میرے پاس آجاؤ۔ میں تم کو ایک جگہ لے چلوں گا۔"

سلمان نے پوچھا "کوئی خاص پروگرام ہے؟"

علی احمد نے جواب دیا۔ "یہ تم کو وہیں پہنچ کر معلوم ہوگا۔"

سلمان نے اِنکار نہ کیا اور آنے کا وعدہ کرلیا۔ اِس کے بعد زیادہ بات چیت نہ ہوسکی۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی اور سلمان کو دُور جانا تھا۔ لہٰذا وہ پروفیسر علی احمد سے اجازت لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

(۲)

تیسرے دن، سلمان حسب وعدہ پروفیسر علی احمد کے گھر پہنچا۔ وہ اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ دونوں نے گھر پہ زیادہ وقت نہیں گزارا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے باہر سڑک پر آ گئے۔ بڑی خوشگوار شام تھی۔ دونوں کو سڑک پر چہل قدمی کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ راستہ میں علی احمد نے سلمان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ وہ خاموشی میں ڈوبا ہُوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا سلمان سوچ رہا تھا کہ علی احمد اس کو نہ معلوم کہاں لئے جا رہا تھا۔ نہ اس کو منزلِ مقصُود کا پتہ تھا اور نہ یہ خبر تھی کہ وہ کس لئے جا رہا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد پروفیسر علی احمد ایک خوب صورت کوٹھی کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اُس نے لمحہ بھر کے لئے کوٹھی کو غور سے دیکھا اور پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔ سلمان بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں جا کر دونوں نے دیکھا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے، جو کہ گروہوں میں بیٹھے ہوئے گفتگو میں مصرُوف تھے۔ سلمان اُن کی بات چیت سے صرف اِس قدر اندازہ لگا سکا کہ کوئی جلسہ ہونے والا تھا۔ جلسہ کی نوعیت کیا تھی۔ کیوں بلایا گیا تھا؟ کس لئے بُلایا گیا تھا؟ اُسے کچھ علم نہ تھا۔ نہ ہی اُس نے علی احمد سے

اِس کے بارے میں کچھ پوچھا۔

ٹھیک آٹھ بجے سب اُٹھ کر اس کے کمرے میں چلے گئے جس میں جلسہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ خوب کشادہ تھا۔ بیچ میں لمبی میز پڑی تھی جس کے چاروں طرف وارنش سے جھلکتی ہوئی اسپرنگ دار کرسیاں تھیں۔ ہر کرسی کے مقابل میز پر سفید کاغذ اور پنسلیں رکھی تھیں۔ کمرے کی فضا کچھ ٹیکنی کلر قسم کی تھی۔ شیشے کی رنگین دیوارگیریوں کے پیچھے بجلی کے بلب روشن تھے۔ اُن سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں دروازوں اور کھڑکیوں پر لٹکتے ہوئے ریشمی پردے جھل ملا رہے تھے۔

سلمان بھی سب کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے نظر بھر کر صفدر بشیر کو دیکھا، جو اس اجتماع کا روحِ رواں تھا۔ یہ کوٹھی اُس کی تھی۔ اُس کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔ وہ ہونٹوں میں دبے ہوئے پائپ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا طویل قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ وضع قطع سے اچھا خاصہ انٹلکچوئل لگتا تھا۔

کمرے میں علی احمد اور سلمان کے علاوہ تین بے روزگار گریجوایٹ، سرکاری ہسپتال کا ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر، ایک جونیئر کلرک اور دو مقامی کالجوں کے طالبعلم تھے۔ اُن کے چہروں پر دُھندلی، دُھندلی لکیروں کا جال بکھرا تھا۔ آنکھوں میں بجھتے چراغوں کی جھلملاہٹ تھی۔

صفدر بشیر لندن سے تین مہینے پہلے واپس آیا تھا۔ وہ کیمبرج میں معاشیات کا طالب علم تھا۔ اچانک اُسے گھر سے ایک روز تار ملا۔ جس میں اُس کے باپ کے انتقال کی اطلاع تھی۔ اُن کی موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں چیف انجینئر تھے۔ اُنھوں نے ترکے میں کئی لاکھ روپے بنک بیلنس کے علاوہ بہت بڑی جائیداد بھی چھوڑی تھی۔ باپ کا ترکہ چار بھائی بہنوں

میں تقسیم ہوا تو صفدر بشیر کو کوٹھی کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ سے زائد روپیہ بھی حصے میں ملا۔

اِس رقم کے متعلق صفدر بشیر عرصے تک غور کرتا رہا۔ باپ کے ملنے والے ایک صنعت کار کے مشورے پر پہلے پہل اُس نے سوچا کہ ٹیکسٹائل مِل لگانے کی کوشش کرے یا کوئی ایسا کاروبار کرے کہ لاکھ کے کئی لاکھ ہو جائیں۔ شادی کرے، گھر بسائے اور آسائش کی زندگی بسر کرے۔ مگر کاروبار کی طرف اُس کی طبیعت مائل نہ ہوئی۔ دوسرا خیال اُس کے ذہن میں یہ آیا کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے اور لندن میں مستقل رہائش اختیار کر لے۔

مگر وہ لندن نہ گیا۔ اور خدمتِ خلق کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔ وہ سیاسی کارکن بھی رہ چکا تھا۔ اور عقیدے کے اعتبار سے کٹر نیشنلسٹ تھا ایک زمانے میں وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سرگرم کارکن بھی تھا اور ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں عملی طور پر شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا — فی الحال اُس کا ارادہ سیاست میں براہِ راست حصّہ لینے کے بجائے کچھ سماجی بہبود کا کام کرنے کا تھا۔

صفدر بشیر نے اپنے اِن عزائم کا چند مخلص دوستوں سے ذکر کیا۔ اُنہوں نے اپنے دوستوں سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اور یوں ستمبر کی اس خوشگوار رات کو دس ہم خیال افراد ایک جگہ مل بیٹھے تھے۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز صفدر بشیر کی تقریر سے ہوا۔ اُس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ انداز خطیبانہ نہ تھا۔ اُس نے سب سے پہلے ان مقاصد پر روشنی ڈالی، جن کے پیشِ نظر جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اُس نے اپنی تقریر میں لندن کے سماجی کارکنوں اور فلاحی تنظیموں کی سرگرمیوں کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح وہاں کے نوجوان اور دوسرے لوگ مختلف نوعیت اور مختلف ساخت کی انجمنیں

اور ادارے قائم کرکے اپنے ملک اور قوم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کے عزائم اور بے لوث جد و جہد کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے اپنے وطن کے عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالی۔ اُن کے صبر آزما رہن سہن، پس ماندگی اور زبوں حالی کے اسباب بیان کئے۔ آخر میں صفدر بشیر نے سب سے اپیل کی کہ اس کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کی مدد کریں۔

صفدر بشیر کی تقریر دلچسپ اور اثر انگیز تھی۔ حاضرین نے اُس کی باتوں کو توجہ اور انہماک سے سُنا۔ متاثر بھی ہوئے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے طور پر اظہارِ خیال کیا۔ لیکن کسی نے صفدر بشیر کے نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر مقرر نے اُسے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ سب کی خواہش تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے اور عملی طور پر کیا جائے۔

رات کے ساڑھے دس بجے تک جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ سلمان تمام عرصہ خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے کسی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہر بات سُنتا رہا، اور آہستہ آہستہ سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ اس گلابی دیواروں والے کمرے میں جہاں گہری نارنجی روشنی پھیلی تھی، اور خوش رنگ ریشمی پردے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ یہ سارا ہنگامہ بڑا رومانٹک لگ رہا تھا۔

جلسہ برخاست ہوا تو ایک مختصر سی تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ تنظیم کا نام فلک پیما رکھا گیا۔ اور اتفاق رائے سے یہ بھی طے کیا گیا کہ فلک پیما کا ہر رُکن اسکائی لارک کہلائے گا۔ نام میں یہ تنوع اور انفرادیت صفدر بشیر کے مغرب زدہ ذہن کی پیداوار تھی۔ اسکائی لارکوں کا جماعتی نشان سفید پھول تجویز کیا گیا اور اُسے مسرت اور صاف سُتھرے ماحول کی علامت قرار دیا گیا۔

فلک پیما کے ارکان کی تعداد سرِدست دس رکھی گئی۔ یعنی وہ تمام لوگ

جنہوں نے جلسے میں شرکت کی تھی۔ جلسہ ختم ہوا تو سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ صفدر بشیر نے رات کے کھانے کا بھی بندوبست کیا تھا۔ سب لوگ کانفرنس روم سے اُٹھ کر ڈائننگ روم میں پہنچے، جہاں میز پر کھانا لگایا جا چکا تھا۔

کھانا بہت سادا تھا۔ نہ اس میں تکلف تھا، نہ کسی اہتمام سے کام لیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ کھانا کھایا۔ ایک دوسرے سے جو اجنبیت تھی، وہ کھانے کی میز پر بڑی حد تک دُور ہو گئی۔

کھانے کے بعد کافی کا دَور چلا۔ اس موقع پر پروفیسر علی احمد کی تجویز پر فلک پیما کے ہر رُکن نے کھڑے ہو کر خود اپنا تعارف کرایا۔ بڑی دلچسپ اور پُر لطف باتیں سُننے میں آئیں۔ خوب قہقہے لگے۔ ماحول اور خوش گوار ہو گیا۔ اسی نشست میں یہ بھی طے پایا کہ دوسرے روز نو بجے شب کو فلک پیما کا دوسرا اجلاس منعقد کیا جائے جس میں ہر رُکن لازمی طور پر شریک ہو۔

جلسہ برخاست ہوا تو صفدر بشیر کی اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر فلک پیما کے تمام ارکان اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئے۔

سلمان اپنے کمرے میں پہنچ کر دیر تک جاگتا رہا۔ وہ جلسہ سے خاصا متاثر ہو کر لوٹا تھا۔ وہ بہت عرصے بعد اپنی بے ترتیب اور اُجڑی ہوئی زندگی میں ہلچل اور سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔

مقررہ پروگرام کے مطابق دوسرے روز رات کے نو بجے صفدر بشیر کی کوٹھی پر فلک پیما کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں لمبی چوڑی تقریریں نہ ہوئیں۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر زیدی نے کی، جو عمر میں سب سے بڑا تھا۔ اجلاس میں فلک پیما کے اغراض و مقاصد اور تنظیمی ڈھانچے کا ایک خاکہ پیش کیا گیا جسے صفدر بشیر نے تیار کیا تھا۔ اس پر بحث و مباحثہ ہوا اور ضروری ترمیم کے بعد اُسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

ایجنڈے کی دوسری شق کا تعلق فلک پیما کی رُکنیت سے تھا۔ صفدر بشیر نے بریف کیس سے رُکنیت کے فارم نکالے اور صدر کے حوالے کر دیئے۔ صدر نے فارم تقسیم کر دیئے۔ ہر اسکاؤٹ لارک نے فارم کو پڑھا اور دستخط کر دیئے۔ ہر رکن نے سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد بھی کیا کہ وہ پوری دیانت داری اور خلوص دل سے مُلک اور قوم کی خدمت کرے گا۔ فلک پیما کے اغراض و مقاصد کا پُورا پُورا احترام کرے گا۔ انفرادی خواہشات نظر انداز کر کے تنظیم کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہے گا۔

اس کے بعد عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ صفدر بشیر کو صدر، فہیم اللہ کو نائب صدر اور علی احمد کو سیکرٹری جنرل اور ڈاکٹر زیدی کو خازن منتخب کیا گیا۔ چھ ارکان پر مشتمل ایک مجلس عاملہ بھی منتخب کی گئی۔ صدر، نائب صدر، سیکرٹری جنرل اور خازن اس کے مستقل رُکن تھے۔ اسکاؤٹ لارکوں نے تالیاں بجا کر اُن کو مبارکباد دی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اجلاس میں صفدر بشیر کی اس تجویز کو بھی منظور کر لیا گیا کہ جو رُکن برسرِ روزگار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی مُلازمت فلک پیما کی سرگرمیوں کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے، وہ مناسب سمجھیں تو مُلازمت سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ ہر اسکاؤٹ لارک کے لئے اسّی روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ صفدر بشیر نے فلک پیما کے ضروری اخراجات کے لئے بیس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ آئندہ بھی اس کے فنڈ کے واسطے رقم مہیّا کرتا رہے گا۔

اجلاس میں ابتدائی پروگرام کے طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسکاؤٹ لارک مختلف بستیوں کا دورہ کریں۔ عوام سے مل کر اُن کے بنیادی مسائل معلوم کریں اور اُن کی روشنی میں ہفتہ بھر بعد اپنی اپنی رپورٹ آئندہ اجلاس میں پیش کریں۔ تاکہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت کام کا آغاز کیا جائے۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ اسکائی لارکوں کی ٹولیاں عوامی رابطہ کی مہم پر مختلف علاقوں کے دوروں پر نکل گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے علاقے کے رہنے والوں کے ساتھ گھل مل جانے کی کوشش کی۔ ان سے بات چیت کی۔ ان کے سماجی اور اقتصادی مسائل معلوم کئے۔

اسکائی لارکوں کی رہائش کا بندوبست صفدر بشیر ہی کی کوٹھی میں کیا گیا، جس میں وہ تنہا رہتا تھا۔ کوٹھی کے ایک حصّے میں فلک پیما کا ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا گیا۔ کوٹھی کا قدیم نام 'رونق منزل' تھا۔ اُسے تبدیل کر دیا اور نیا نام قطب نما رکھا گیا۔

فلک پیما کا ہفت روزہ اجلاس، حسب معمول رات کے وقت رکھا گیا۔ اُس روز ہر اسکائی لارک نے اپنی اپنی رپورٹ پیش کی۔ ان رپورٹوں پر رات گئے تک بحث ہوتی رہی۔ اُن کا باقاعدہ تجزیہ کیا گیا، اور یہ طے کیا گیا کہ عوام کو سب سے پہلے ان کے شہری اور بنیادی حقوق سے آگاہ کیا جائے، باشعور بنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے تین اہم فیصلے کئے گئے۔

تحریک تعلیم بالغاں کا آغاز کیا جائے۔

دارالمطالعہ قائم کئے جائیں۔

ہر بستی اور ہر محلّہ کے چوراہوں اور گلیوں کے نکڑ پر چھوٹے چھوٹے عام جلسے کئے جائیں اور مختصر تقریروں کے ذریعہ عام فہم انداز میں عوام کی ذہنی تربیت کی جائے۔

اجلاس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تین تین ارکان پر مشتمل تین گروپ تشکیل دئے گئے۔ ڈاکٹر زیدی کو تینوں گروپوں کا نگران مقرر کیا گیا۔ اُن کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی کہ وہ ہر گروپ کے کام کا جائزہ لیں اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دُور کرنے کے لئے مناسب مشورے دیں۔

کام کا آغاز عام جلسوں سے ہوا۔ اِس گروپ کا سربراہ خود صفدر بشیر تھا۔ وہ فلک پیما کا سب سے اچھا مقرر تھا۔ بات کہنے کا اُسے سلیقہ تھا۔ بات اس ڈھنگ سے کہتا کہ لوگ توجہ اور دلچسپی سے سُنتے۔ اپنی دل نشیں تقریروں سے جلد ہی وہ عوام میں مقبول ہوگیا۔

دوسرے گروپ کا اِنچارج علی احمد تھا۔ وہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوچکا تھا اور اب پوری تندہی کے ساتھ فلک پیما کے لئے کام کر رہا تھا۔ اُس کے گروپ میں سلمان کے علاوہ دوسرا اسکائی لارک بھی طالب علم تھا۔ اس گروپ کے سپرد تعلیم بالغاں کا کام تھا۔

ایک شام جب وہ بڑا سا تختہ سیاہ اور پیٹرومیکس لئے، سلمان اور اپنے دوسرے ساتھی اسکائی لارک کے ہمراہ، ایک بستی میں پہنچا، تو لوگوں نے اُنھیں حیرت اور استعجاب سے دیکھا۔ اُنھوں نے خاموشی سے ایک نیم پختہ دیوار کے ساتھ تختۂ سیاہ لٹکایا۔ پیٹرومیکس روشن کیا اور لوگوں کے اکٹھا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے گرد خاصا ہجوم ہوگیا۔ علی احمد نے تعلیم کی اہمیت پہ مختصر تقریر کی۔ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ کتنے ہی لوگ اُسی وقت تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ علی احمد نے اُسی روز پہلا سبق بھی شروع کر دیا۔

وہ ایک مشفق اُستاد کی طرح نرم لہجے میں بول رہا تھا "دیکھئے میرے ہاتھ میں یہ چھڑی ہے" اُس نے ہاتھ میں دبی ہوئی چھڑی اُٹھا کر لوگوں کو دکھائی۔ "اب میں تختہ سیاہ پر اس چھڑی کی اُلٹی شکل بناتا ہوں"

اُس نے بورڈ پر کھریا سے "ل" کی شکل بنائی۔ لوگوں کو مخاطب کیا۔ "اِس اُلٹی چھڑی پر میں نے یہ ایک ڈنڈا سا لگا دیا دیکھ رہے ہیں نا آپ۔ اِس کو کہتے ہیں لا جیسی کھانا لا۔ پانی لا ——— تو صاحب یہ ہوگیا لا۔"

ہجوم میں کھڑے ہوئے لوگ تختۂ سیاہ پر کھریا سے بنی ہوئی "لا" کی شکل دیکھنے لگے، جو گیس بتی کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔ علی احمد خاموش کھڑا اُن کے ردِ عمل کا مطالعہ کرتا رہا۔ سلمان اور دوسرا اسکاؤٹ لارک اُس کے برابر بُت بنے کھڑے تھے۔ منٹ بھر بعد اُس نے تختۂ سیاہ پر "لا" کے برابر کھریا سے ایک اور "لا" بنایا اور مسکرا کر بولا۔ "دیکھئے یہ ہو گیا لالا۔"

اِس دفعہ لوگوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بورڈ کو دیکھا۔ علی احمد مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ "لالا سے اور کچھ مطلب نہیں سمجھئے گا۔ لَالَا، یہی جو اپنے پٹھان بھائی ہوتے ہیں جو رات کے وقت دکانوں اور مکانوں کی چوکیداری کرتے ہیں۔ ہاں تو لَالَا اب آپ کی سمجھ میں آگیا۔"

بہت سی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔ "بالکل سمجھ میں آگیا۔"

علی احمد بولا۔ "ذرا اِس کو تین بار پڑھ تو لیجئے۔"

لوگوں نے اِس زور سے تین بار لَالَا کا ورد کیا کہ ساری بستی گونج اُٹھی۔ علی احمد نے اندازہ لگایا کہ لوگ دلچسپی لے رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ "کل ہم چٹائی بھی لیتے آئیں گے۔ اِس وقت اگر آپ لوگ زمین پر بیٹھ جائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

کئی آوازیں آئیں۔ "اِس میں مہربانی کی کونسی بات ہے جی۔ یہ لیجئے" اور یکے بعد دیگرے سب زمین پر بیٹھ گئے۔

علی احمد نے تختۂ سیاہ پر ایک اور لَا لکھا اور حاضرین کو مخاطب کیا۔

"یہ ہو گیا لَا لَا لا۔ یہ ہم اُس وقت کہیں گے۔ جب لَا لَا سے کچھ مانگنا ہو۔ لالالا۔" اُس نے کئی بار اِس جملے کو دُہرایا۔ پھر بورڈ پر لَا لَا سے پہلے ایک لا اور لکھا اور ہنس کر بولا۔

"اِس دفعہ میں نہیں پڑھوں گا۔ آپ ہی میں سے کوئی صاحب پڑھنے

کی کوشش کریں۔"

لمحہ بھر تک گہری خاموشی رہی۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے گھور گھور کر تختۂ سیاہ کو دیکھا اور ایک بار کسی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لا لا لا لا۔ کیوں ماسٹر جی یہی ہوا نا؟" علی احمد اُس ادھیڑ آدمی کے ماسٹر جی کہنے پر آہستہ سے مُسکرایا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"بالکل ٹھیک پڑھا آپ نے۔"

اسی وقت دو تین آوازیں آئیں۔ "پڑھ تو جی ہم نے بھی لیا تھا۔ پر کہتے ہوئے ڈر لگا۔"

علی احمد نے ان کی حوصلہ افزائی کی غرض سے کہا۔ "یہ تو آپ نے بُرا کیا۔ جو سمجھ میں آئے فوراً کہئے۔ ڈرنے اور جھجکنے سے کام نہیں چلے گا۔" اس کے بعد اُس نے سب سے "لا لا لا لا" کا جملہ پانچ مرتبہ بلند آواز سے پڑھوایا۔

اس روز کے لئے صرف اتنا ہی سبق تھا۔ جب وہ پڑھائی ختم کر چکا تو سب نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگے۔ وہ ایک ایک بات کا تسلی بخش جواب دیتا گیا۔ سلمان ان سب کو اچنبھے سے دیکھتا رہا۔ اُس وقت اُس کو اور بھی زیادہ تعجب ہوا جب اُنہوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ پڑھائی کے لئے وہ نہ صرف جگہ کا بندوبست کریں گے بلکہ چندہ کر کے گیس بتی اور چٹائیوں کا انتظام بھی کریں گے۔ سلمان کا خیال تھا کہ بجائے دلچسپی لینے کے لوگ اُن کا مذاق اُڑائیں گے۔ اِس خدشے کے باعث وہ بستی میں داخل ہوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کو اوّل تو اپنی جہالت کا احساس ہی نہیں، اور اگر تھوڑا بہت ہے تو وہ اس گمراہی سے نکلنا نہیں چاہتے۔ وہ اِن کیڑوں کی طرح ہیں، جو گندگی ہی میں زندہ رہتے ہیں۔ اُسی میں جنم لیتے ہیں اور اُسی میں مرکھپ جاتے ہیں۔

دوسرے روز وہ علی احمد کے ساتھ شام کو وہاں پہنچا۔ اُس نے حیرت سے دیکھا بستی کے نکڑ پر کئی آدمی کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ تینوں کو دیکھ کر خوشی سے مسکرائے۔ ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر سلمان کی بغل میں دبا ہُوا بورڈ اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ دوسرے نے پیٹرومیکس لے لیا اور شکایت کرنے کے انداز میں بولا۔

"ماسٹر جی! آپ لوگ یہ بورڈ اور بتی اب نہ لایا کریں۔ ہم نے سب بندوبست کر لیا ہے۔"

تینوں نے بستی میں جاکر دیکھا، واقعی اُنہوں نے ہر چیز کا انتظام کر لیا تھا۔ پڑھائی کے واسطے جو جگہ بنائی گئی تھی، وہ ایک مکان سے ملحق دالان تھا جس پر ٹین کا سائبان تھا۔ یہاں کل تک ایک تانگے والے کا گھوڑا بندھتا تھا۔ اب گھوڑے کا تھان کہیں اور بنا دیا گیا تھا۔ اس اصطبل کو سب نے مل کر دن بھر میں اس طرح محنت اور لگن سے صاف کیا تھا کہ کہیں سے بھی یہ نہ معلوم ہوتا کہ یہ جگہ کبھی گھوڑے کی لید اور پیشاب سے آلودہ رہ چکی تھی۔ اصطبل کی دیواروں پر چُونے کی سفیدی تھی، جس پر ایک تختہ سیاہ لٹک رہا تھا۔ اُس کے برابر ہی ایک معمولی قسم کی میز اور تین کُرسیاں رکھی تھیں۔ میز کے ایک طرف پیٹرومیکس تھا جس کی تیز روشنی میں سفید دیواریں جھلک رہی تھیں۔ پڑھنے والوں کے لئے فرش پر کھجُور کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ سلمان نے یہ سب اہتمام دیکھا تو بڑا متاثر ہُوا۔

اُس روز علی احمد نے دوسرا سبق پڑھایا۔ اس میں صرف نقطوں کے استعمال سے ابتدائی سبق کو آگے بڑھایا گیا تھا۔ اُس نے اُنگلیوں میں کھریا دبایا اور تختہ سیاہ پر شکلیں بنانے لگا۔

تالا، بالا، پالا

لالاتالالا

لالالا، بالالا

- پالا سے فی الحال کوئی جملہ نہیں بنتا تھا۔ لہٰذا علی احمد نے صرف اس کا مفہوم سمجھایا۔

کل جو لوگ پڑھنے آئے تھے، اُن کی حیثیت تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آج ایک مختصر سے اسکول کی بنیاد پڑ چکی تھی، جس کے طلبا کی تعداد ۲۲ تک پہنچ چکی تھی۔ اُن میں نوجوان بھی تھے۔ ادھیڑ بھی تھے۔ اور ایسے بوڑھے بھی تھے، جن کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں۔ وہ سب نچلے طبقے کے لوگ تھے — فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور، دست کار، کاری گر، ریڑھی پر سامان رکھ کر پھیری لگانے والے اور چھوٹے موٹے دکان دار۔

تین ہی چار دن میں طلبا کی تعداد بڑھ کر ۴۰ تک پہنچ گئی۔ ابھی یہ تعداد اور بڑھتی، مگر علی احمد نے مزید طلبا کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ نئے آنے والوں کی خاطر سابقہ سبق بار بار دُہرانا پڑ رہے تھے۔

طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علی احمد، سلمان اور دوسرے اسکاٹی لڑکے کو بھی تعلیم بالغاں کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ ان کو دن کے وقت ہیڈ کوارٹر میں طریقۂ تعلیم پر لیکچر دیتا۔ شام کو عملی تعلیم و تربیت کے لئے بستی کے اسکول میں لے جاتا۔ اور باری باری اُن کو سبق پڑھانے کا موقع بھی دیتا۔ چند ہی روز بعد وہ اس قابل ہو گئے کہ علی احمد نے قریب کی بستیوں میں ان دونوں کو بھی تعلیم بالغاں کے نئے مرکزوں پر لگا دیا۔ یہ دونوں مرکز ان بستیوں کے لوگوں نے موجودہ مرکز سے متاثر ہو کر کھولے تھے اور علی احمد کے پاس وفد کی صورت میں آ کر درخواست کی تھی کہ وہاں بھی تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

سلمان بڑی تندہی اور لگن کے ساتھ فلک پیما کی سرگرمیوں میں حصہ لے

رہا تھا۔ وہ ہر شام مقررہ وقت پر جاتا، اور پوری توجہ کے ساتھ اپنے مرکز کے طلبا کو پڑھاتا۔ اس کام میں اب اُس کو ایک خاص لُطف مل رہا تھا۔ یہ وہی احساسِ لذت تھا جو انسان میں ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

(۳)

جس روز عدالت سے نوشا کو سزا ہوئی۔ ٹھیک اُسی روز انشورنس کمپنی کے اگریمنٹ فارم پر ماں کے دستخط ہوئے۔ کمپنی کے ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کیا اور اُسے صحت مند قرار دیا۔ ضروری خانہ پُری ہوئی۔ نیاز نے پالیسی کی پہلی قسط ادا کی اور اُس کی اہلیہ کی زندگی کا ۵۰ ہزار کا بیمہ ہو گیا۔

نوشا کی ماں سوچ رہی تھی کہ عقد ثانی کر کے اُس نے غلطی نہیں کی۔ اس دفعہ بھی اُس کو چاہنے والا شوہر ملا تھا، جو اُس کی بہتری کا خواہاں تھا۔ ہر طرح کی ناز برداری کرتا تھا۔ اُس کی دونوں اولادیں اطمینان سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔

انو دودھ پی پی کر خوب موٹا ہو گیا تھا۔ اُس کے گال سُرخ پڑ گئے تھے۔ البتہ وہ سلطانہ کی طرف سے پریشان تھی۔ سلطانہ چُپ چُپ رہتی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ ماں اُس کے دُکھ کو جانتی تھی۔ لیکن اُس نے کبھی اُس کے زخموں کو کُریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اُس کے ہاتھ پیلے کر دے اور وہ اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ مگر اس بات کو نیاز سے کہتے ہوئے جھجکتی تھی۔ حالانکہ نیاز کا رویہ اب سلطانہ کے ساتھ کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں تھا۔

گھر میں بہر حال سکون اور اطمینان تھا اور اُس کے لئے نوشا کی ماں نیاز کی ممنون تھی۔ وہ اب اس کا بے حد خیال رکھتی۔ سویرے ہی سویرے اُٹھ کر اُس کے لئے غسل خانے میں نہانے کا انتظام کرتی۔ اُجلا تولیہ منجن اور صابن سنبھال

کر رکھتی۔ جوتوں پر پالش کرتی۔ ٹرنک سے پہننے کے کپڑے نکالتی۔ ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتی۔ کسی کپڑے میں مرمت کی ضرورت ہوتی تو اُس کو بیٹھ کر سیتی۔ جتنی دیر میں نیاز غسل خانے سے نہا کر نکلتا، وہ ناشتہ تیار کر دیتی۔ کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ نیاز کے دوکان جانے سے قبل ناشتہ نہ تیار ہو گیا ہو۔ وہ گھر سے نواب بن کر نکلتا تھا۔ دوست احباب مذاق میں اُس کو چھیڑتے۔

"ابے نیاز تُو چھیلا بن گیا ہے۔"

"سالے پر جوانی چڑھ رہی ہے۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ اب اُس کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ چال ڈھال میں نرالی سج دھج پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ سب کچھ بیوی کی بدولت تھا، جس سے اُسے اُنسیت بھی تھی اور نفرت بھی، اور یہ دونوں جذبے بیک وقت کام کر رہے تھے۔ کبھی وہ اُس کی محبت سے اِس قدر سرشار ہو جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ ساری زندگی اُسی کے ساتھ گزار دے۔ اس کو اس عورت کی ضرورت تھی، جس نے اُس کی زندگی کو سنوار دیا تھا۔ لیکن اس محبت میں پچاس ہزار روپے کا نقصان تھا۔ اور اتنی بڑی رقم وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پچاس ہزار کے لئے ہی اُس نے سب کچھ کیا تھا، اور اس کے بل بوتے پر آئندہ کے بڑے بڑے منصوبے تیار کئے تھے۔ اس کے علاوہ سلطانہ تھی۔ وہ جب بھی اُس کی بھرپور جوانی اور دل کش چہرے کو دیکھتا اس کے سینے میں الاؤ دہکنے لگتا۔

نیاز کا وقت اِسی کشمکش میں گزر رہا تھا۔ شادی کرنے سے پہلے اُس نے جو پروگرام بنایا تھا، اُس کے متعلق اب وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ اُسے خود علم نہیں تھا کہ آئندہ وہ کیا کرے گا۔ وہ روزانہ دکان پر تنہائی میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرتا۔ مگر جب گھر پہنچتا تو سارے ارادے مکڑی کے جال کی طرح تار تار ہو جاتے۔ عام طور پر وہ رات کے ۹ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔

جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر آتا، بیوی اُٹھ کر دروازے پر آجاتی۔ مسکرا کر کہتی۔
"آپ تو بڑی دیر لگا دیتے ہیں۔ سارا کھانا ٹھنڈا مٹی ہوگیا"
وہ نیاز کے ہاتھوں میں دبا ہوا سامان لیتی (وہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا) اُس کو کرسی پر بٹھا کر تولیے سے پیشانی اور گردن کا پسینہ پونچھتی۔ خود اپنے ہاتھ سے اُس کا جوتا اُتارتی اور پیروں کے نیچے چپل رکھ دیتی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے باہر چبوترے پر جاتا۔ وہاں لوٹے میں پانی ہوتا اور صابن دانی موجود ہوتی۔
بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانا گرم کرتی۔ نیاز کو میٹھی چیزوں سے رغبت تھی۔ وہ بلا ناغہ کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور تیار کرتی۔
دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سلطانہ اور اَنّو عام طور پر سر شام ہی کھانا کھا کر اپنے اپنے بستروں پر سونے کے لئے چلے جاتے تھے۔ نیاز مزا لے لے کر کھانا کھاتا اور سوچتا جاتا۔ ابے نیاز کباڑیے! اس عورت نے تو تیرے چار چاند لگا دیتے۔ بیٹا! ایسے عیش تو تم نے باپ کے زمانہ میں بھی نہیں کیئے۔

اُن ہی دنوں ایک حادثہ پیش آیا۔ کوئی گیارہ بجے دن کو نیاز کسی ضرورت سے دکان سے اُٹھ کر گھر آیا۔ اُس وقت سلطانہ اکیلی تھی۔ ماں کسی رشتے دار کے گھر گئی تھی۔ ویسے عام طور پر اب وہ کہیں آتی جاتی نہ تھی۔ اُس دن محض اتفاق تھا کہ وہ گھر پر سلطانہ کو تنہا چھوڑ گئی۔ نیاز نے پہلے تو بیوی کو تلاش کیا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو سلطانہ کے پاس گیا۔ وہ پلنگ پر گم صُم بیٹھی تھی۔
نیاز اُس کی پشت پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ پوچھا "سلطانہ تمہاری اماں کہاں ہیں؟"
وہ آہستہ سے بولی "خالہ دلبری کے یہاں گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی"

نیاز کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر سلطانہ کی پیٹھ پر پڑ گئی۔ اُس کا کرُتہ مسک گیا تھا اور اندر سے اُس کی گوری گوری جلد جھلک رہی تھی۔ نیاز بے قابو ہو گیا۔ ذرا دیر تک سانس روکے اُس کی نرم نرم جِلد کو دیکھتا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"تم چُپ چُپ کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ بولی۔ "سر میں درد ہے۔" یہ بات اُس نے ٹالنے کے لئے کہی تھی۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دُوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دئے۔ سلطانہ سر سے پَیر تک کانپ گئی۔ اُس نے اپنے بدن کو سمیٹا اور ایک طرف کھسک کر بولی۔

"آپ تکلیف نہ کریں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ "تم مجھ سے اِس قدر کترانے کیوں لگی ہو؟"

وہ اس کی بات کا جواب کیا دیتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز نے اِصرار کیا۔ "بولو، کیا بات ہے؟"

"کاہے کے لئے۔"

"یہی کہ تم مجھ سے دُور دُور رہتی ہو۔"

سلطانہ کو غصّہ تو بہت آیا۔ لیکن وہ صرف اس قدر کہہ سکی۔ "کیا مطلب؟"

"تم مجھ سے کچھ ناراض ہو۔"

"نہیں! آپ کو وہم ہو گیا ہے۔"

نیاز نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا اُس کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اور بے قابو ہو گیا۔ اُس نے جھک کر بے اختیار سلطانہ کے رخسار کو چوم

لیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پلنگ سے نیچے اُتر آئی۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔ نیاز نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُس نے نیاز کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ چیخ کر بولی:

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو اچھا نہ ہوگا۔"

وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔

لیکن نیاز نے معاملہ کو اُلٹا سمجھنے کی کوشش کی۔ اُس نے سوچا سلطانہ اِس لئے ناراض ہے کہ اُس کے بجائے اُس نے ماں سے شادی کیوں کی۔

وہ ذرا دیر تک چُپ چاپ دالان میں کھڑا رہا۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہُوا گھر سے باہر چلا گیا۔ دوکان پر جاکر اُس نے طے کیا کہ اگر اُس نے جلدی ہی کچھ نہ کیا، تو سلطانہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

رات کو وہ گھر واپس آیا تو دوپہر کے واقعے سے کسی قدر سہما ہُوا تھا۔ مگر جب بیوی کے رویّہ میں ذرا بھی فرق نہ پایا تو اس نے سوچا کہ سلطانہ نے ماں سے اُس کی اس حرکت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اِس بات سے اُس کے اِس مغالطہ کو اور بھی تقویت پہنچی کہ سلطانہ کے دل میں ابھی تک اُس کے لئے گنجائش تھی۔ اُس نے رات ہی طے کیا کہ وہ کل صبح ڈاکٹر موٹو سے ملے گا۔

لیکن دوسرے دن وہ ڈاکٹر موٹو سے نہ مل سکا۔ گھر سے نکلتے ہی سردار سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ سانولے رنگ کا بڑا تیز طرار قسم کا آدمی تھا۔ پسنی کے راستے سامان اسمگل کر کے لاتا تھا۔

سردار ملتے ہی بولا "کچھ سودا ودا کرتے ہو؟"

نیاز کا ایک بار پہلے بھی اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ مگر وہ سودا ایک دلال کی معرفت ہُوا تھا۔ اس لئے وہ ذرا ہچکچایا۔

سردار نے فوراً کہا۔ "لے لو نہیں تو بعد میں پچھتاؤ گے۔ اچھی رقم بن جائے گی۔"

نیاز نے دریافت کیا۔ "مال کس قسم کا ہے؟"

"سگریٹ ہیں۔"

سگریٹ کا سودا اُس نے پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ کہنے لگا۔ "بھئی سگریٹ کا کام تو میں کرتا نہیں۔"

سردار ہنس کر کہنے لگا۔ "تم کاروبار میں ابھی کچھ دن مجھ سے ٹریننگ لو۔ تم کو بازار کا پتہ بھی ہے۔ آج کل شہر میں سگریٹ مِل کہاں رہے ہیں؟" نیاز نے سوچا اگر سگریٹ کی شہر میں قلت ہے تب تو اچھی رقم نکل آئے گی۔ کہنے لگا۔ "اچھا چلو مال دکھاؤ۔"

سردار نے وہیں سے تانگہ کیا۔ اُس میں سوار ہو کر دونوں ایک ہوٹل پہنچے۔ سردار وہیں ٹھہرا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر مال دکھایا۔ سگریٹ کے پیکٹ پانچ ٹرنکوں میں بھرے تھے۔

دو ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ نیاز اُسے گھر لے آیا۔ بیوی سے رقم لی اور سردار کو دو سو روپے بیعانہ بھی دے دیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ مال رات کو لے کر خود اُس کی دکان پر آئے گا اور بقیہ رقم لے جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد نیاز کے لئے اب دو ضروری کام رہ گئے تھے۔ سب سے پہلے وہ علاقے کے تھانے پہنچا۔ ہیڈ کانسٹیبل محمد خاں کو تلاش کیا۔ وہ اُس کا پُرانا واقف کار تھا۔ وہ انچارج تھانے سے کبھی نہیں ملا۔ ہمیشہ محمد خاں کے توسط سے بات کرتا تھا۔ انچارج کوئی ہو، اس کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔

محمد خاں کو اُس نے سو روپے دئے اور مطمئن ہو کر تھانے سے باہر آ گیا۔ بازار جا کر اُس نے سگریٹ فروشوں سے معاملہ کی بات چیت کی۔ واقعی سگریٹ کی

سخت قلّت تھی۔ مال کے اچھے دام لگے۔ کچھ دکاندار اس قدر ضرورت مند تھے کہ اُنہوں نے بیعانہ بھی دے دیا۔

دس بجے کے قریب سردار ایک تانگہ میں سگریٹوں سے بھرے ہوئے ٹرنک لے کر آ گیا۔ نیاز نے مال سنبھالا۔ پوری رقم ادا کی اور سردار کو ایک چائے پلا کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر سے پہلے پہلے تمام ٹرنک خالی ہو گئے۔ سگریٹ کے پیکیٹ دکانوں پر پہنچ گئے۔ اس سودے میں اُس کو ہزار روپے سے زائد مل گئے۔ نیاز بہت خوش تھا کہ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا سودا مل گیا۔ زیادہ بھاگ دوڑ بھی کرنا نہیں پڑی۔ دکان میں مال رکھ کر خطرہ بھی مول لینا نہیں پڑا۔ اس خوشی میں اُس نے ڈاکٹر موٹو کے پاس جانے کا پروگرام بھی ملتوی کر دیا۔

اُس روز وہ سرِ شام ہی دکان بند کر کے گھر پہنچ گیا۔ بیوی اور اتو کو ساتھ لے کر سنیما چلا گیا۔ سلطانہ گھر پر تنہا رہ گئی۔ اُس نے بے قرار ہو کر سوچا۔ اس وقت سلمان آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔

بڑی سُہانی رات تھی۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ شیشم کے پتّے آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ وہ کئی بار دالان سے نکل کر صحن میں آئی۔ کھُلے آسمان کے نیچے اُس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ ہوا میں رچی ہوئی مہک محسوس کی اور گلی میں اُبھرنے والی راہگیروں کی چاپ پر کان لگا دئے کہ شاید ان میں سلمان بھی شامل ہو۔

(۴)

سلمان نے جھاڑن سے تختۂ سیاہ صاف کیا۔ اور کلاس کی جانب مُڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کھجور کی چٹائیوں پر ۳۶ افراد بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے

تیز دھوپ سے سنولائے ہوئے تھے۔ جسم پر بوسیدہ لباس تھے، جن سے پسینہ کی بُو اٹھ رہی تھی۔ یہ اُس کے شاگرد تھے۔

سلمان نے سب پر ایک نظر ڈالی اور اونچی آواز سے بولا۔ "آج آپ لوگوں کا امتحان ہوگا۔"

کسی نے دبی زبان سے کہا۔ "امتحان؟"

سلمان کہنے لگا۔ "جی ہاں! میں بورڈ پر جملے لکھوں گا اور ہر ایک سے باری باری پڑھواؤں گا۔ جس سے میں کہوں گا، وُہی پڑھے گا۔ کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔"

اس کے بعد سلمان تختۂ سیاہ پر لکھتا چلا گیا اور باری باری سب سے پڑھواتا گیا۔ بعض شاگردوں نے ہر جملہ فرفر پڑھ دیا۔ بعض کو کسی قدر دقت پیش آئی۔ مگر ہر شخص نے جملوں کو پڑھ ڈالا۔ اُس کو بیحد خوشی ہوئی۔ ابھی پُورا کورس ختم ہونے میں بارہ سبق باقی تھے۔ مگر اس عرصہ میں وہ اچھا خاصا پڑھ لینے کے قابل ہوگئے تھے۔ ان میں ذوق و شوق بھی بہت تھا۔ اِس امتحان میں بھی ہر شخص بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اُن کی یہ دلچسپی دیکھ کر اُس نے بلیک بورڈ پر زیادہ مشکل جملے لکھے۔ کچھ نے روانی کے ساتھ اُن کو پڑھا۔ کچھ اٹک کر رہ گئے۔ یہ سلسلہ بھی کچھ دیر چلتا رہا۔ آخر وہ نثر ختم کر کے نظم پر آگیا۔

عین اُس وقت علی احمد بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اکثر اپنے گروپ کے اسکاؤٹ لارکوں کی سرگرمیوں کا معائنہ کرنے آتا تھا۔ ان میں جو خامی دیکھتا، اُس پر اُن کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتا اور اُس کو دُور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت سلمان بورڈ کی طرف منہ کیے لکھنے میں مصروف تھا۔ علی احمد چُپ چاپ ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ وہ ہمیشہ اِسی طرح خاموشی سے آتا تھا۔

سلمان جب تختۂ سیاہ کے سامنے سے ہٹا تو سب نے دیکھا، اُس پر یہ شعر درج تھا۔

چمکنے سے بجلی کے تھا وہ سماں
ہوا میں اُڑیں جیسے چنگاریاں

اُس نے جس شاگرد کی جانب اشارہ کیا، اُس نے اُٹھ کر فوراً اس شعر کو پڑھ دیا۔ اُس نے ایسے ہی کئی اور سادا اور عام فہم اشعار بورڈ پر لکھ کر پڑھوائے اشعار لکھتے لکھتے اچانک اُسے سلطانہ کی یاد آگئی۔ اور اُس کی یاد کے ساتھ ہی وہ خوابوں میں بھٹکتا دُور نکل گیا۔ اب وہ ایسے اشعار لکھنے لگا جن کو پڑھتے ہوئے لوگ اٹکنے لگے۔ ایک بار تو خاصی گڑبڑ ہو گئی۔ اس نے بلیک بورڈ پر لکھا۔

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں ؟

سلمان نے جس شاگرد سے پڑھنے کے لئے کہا تھا اُس نے پہلا مصرعہ تو روانی سے پڑھ دیا۔ دوسرے مصرعہ نے اُس کو خاصا پریشان کیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر چگی داڑھی تھی۔ اور دیکھنے میں مریل سا نظر آتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے سلمان سے پوچھا۔

" ماسٹر جی! لالہ تو سمجھ میں آگیا، وہی جو آپ نے پہلے دن پڑھایا تھا۔ پر یہ شہناز کون ہے ؟"

پیچھے سے کسی من چلے نے کہا۔" ابے وُہی بُوٹا کی بہن شہناز، اور یہ کون ؟"

فوراً ہی ایک اور آواز آئی "یہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔ ابے یہ تو صاف صاف کلکتہ والی شہناز ہے۔"

کسی بوڑھے نے جل کر اُسے ڈانٹا "کیا بات کر رہا ہے۔ کلکتہ والی تو گوہر جان تھی۔ یہ کوئی اور ہوگی۔"

یہ تبصرہ سُن کر سلمان پریشان ہو لیا۔ علی احمد نے بھی بے چینی سے پہلو بدلا۔ سلمان نے نظم کے اس بند کو فوراً جھاڑن سے مٹا دیا۔ اور یہ نسبتاً آسان شعر لکھا۔

بیت گئی، جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخرِ شب

ابھی اُس نے کسی کی طرف پڑھنے کا اشارہ بھی نہ کیا تھا کہ ایک نوجوان نے اُٹھ کر بڑی سادگی سے کہا "ماسٹر جی! 'آخری شب' کی 'ی' چھوٹ گئی ہے۔" اُس نے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس طرح گردن اونچی کر کے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ابے ہم تو ماسٹر جی کی غلطیاں پکڑ لیتے ہیں۔ سلمان اِس وار سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک بوڑھے نے اُٹھ کر پوچھا۔

"ماسٹر جی! یہ ہجر کی شب کیا ہووے ہے؟"

اُسی وقت کسی نوجوان نے پیچھے سے ڈانٹا "چاچا، بیٹھ جا۔ یہ باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

دوسرا اس سے بھی دو قدم آگیا "ابے یہ عاشقی معشوقی کی باتیں ہیں۔" اُس نے سینے پہ ہاتھ رکھا اور زوردار نعرہ لگایا۔

ہائے مدھو بالا، پلا دے شربتِ وصل کا پیالا

اس بات پر خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے اُٹھ کر احتجاج کیا کہ جس نوجوان نے مدھو بالا والی بات کہی تھی، اُسے سزا کے طور پہ فوراً کلاس

سے نکال دیا جائے۔ مگر وہ نکلنے پر کسی طور آمادہ نہ تھا۔ اُس کی دلیل یہ تھی۔ کہ اُس نے تو صرف شعر پڑھا تھا، گالی نہیں بکی تھی۔ کچھ اُس کے حمایتی بھی پیدا ہو گئے۔ اِس طرح دو ٹولیاں بن گئیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف شور مچانے لگیں۔ سلمان گھبرا گیا۔ فوراً ہی علی احمد بڑھ کر سامنے آ گیا۔ اس نے سب کو سمجھا بجھا کر کلاس کو قابو میں کیا۔ اور دیر تک تختۂ سیاہ پر عام فہم اور دلچسپ جملے لکھ لکھ کر پوچھتا رہا۔

اُس رات سلمان اور علی احمد تعلیم بالغاں کے مرکز سے دیر میں لوٹے۔ راستہ میں علی احمد نے سلمان کو سمجھایا کہ جن لوگوں کو وہ پڑھاتا ہے وہ بہت پس ماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ فلک پیما کا کام فی الحال یہ ہے کہ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کی ذہنی نشو و نما مطالعہ سے ہو گی، جو بعد کا مرحلہ ہے۔

سلمان چُپ رہا۔ علی احمد نے مسکرا کر کہا "تمہارے رومانٹک موڈ نے کلاس کو رومانٹک بنا دیا تھا۔"

سلمان پہلے ہی شرمندہ تھا، اس جملہ پر اور شرمندہ ہو گیا۔ اپنی مدافعت میں اُس سے کچھ نہ کہا گیا۔ خاموشی سے علی احمد کے طنز کو جھیل گیا۔

چند روز بعد فلک پیما کا ماہانہ اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر زیدی نے ہر گروپ کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔ اس کے تجزیہ سے یہ اندازہ ہوا کہ علی احمد کا گروپ سب سے زیادہ کامیاب اور مؤثر ثابت ہو رہا تھا۔ دار المطالعے قائم کرنے والے گروپ کا کام افسوس ناک حد تک سُست اور غیر مؤثر تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ فی الحال ایک دار المطالعہ قائم کیا گیا تھا۔ وہ ایسی بستی میں تھا، جہاں کی بیشتر آبادی بالکل اَن پڑھ تھی۔ دار المطالعہ ہر وقت خالی رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آتا تو صرف رسالوں اور اخباروں کی تصاویر

دیکھ کر چلا جاتا۔ لہذا اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ دار المطالعہ گروپ ختم کر دیا جائے اور اُسے تعلیم بالغاں گروپ میں مدغم کر دیا جائے۔

تعلیم بالغاں کے ساتھ ساتھ، تقریروں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ صفدر بشیر اپنے گروپ کے دو اسکاؤٹ لارکوں کے ہمراہ روزانہ کسی پس ماندہ بستی میں جاتا اور اچھا شہری بننے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی اہمیت پر زور دیتا۔ توہم پرستی اور فرسودہ رسم و رواج سے پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتا۔ انہیں چھوڑنے اور ان کے خلاف مؤثر طور پر جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا۔ عام فہم انداز میں اُن کی ذہنی تربیت کرتا۔

ہر شام وہ کسی چوراہے یا گلی کے نکڑ پر کھڑا ہو جاتا۔ اپنی تقریر شروع کرتا۔ اُس کی تقریر سُننے کے لئے لوگ اکٹھا ہوتے۔ دلچسپی اور توجہ سے اُس کی باتیں سنتے اور اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جاتے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد صفدر بشیر یہ محسوس کرنے لگا کہ ان جلسوں کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی حیثیت مجمع گیر عطائی معالج یا دوا فروش کی مانند تھی، جو اپنی چکنی چپڑی اور پرلطف باتوں سے لوگوں کو اکٹھا کر کے اُن کی جیبوں سے رقم نکلوانے کا گُر جانتا ہے۔

صفدر بشیر اپنی کوششوں کے بارے میں اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔ وہ عوام میں جس تبدیلی کو دیکھنے کا خواہاں تھا، وہ کہیں نظر نہ آتی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر زیدی نے اپنی رپورٹ میں اس کے گروپ کی کوششوں کو سراہا تھا۔ اور یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ تحریک تعلیم بالغاں کو کامیاب بنانے میں صفدر بشیر اور اُس کے گروپ کے دوسرے اسکاؤٹ لارکوں کی تقریروں نے بڑی حد تک زمین ہموار کی تھی۔

ان ہی دنوں شہر کے پس ماندہ اور نشیبی علاقوں میں ٹائیفائڈ کی وبا

پھوٹ پڑی۔ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں طلبا کی تعداد تیزی سے گھٹنے لگی۔ ہر طرف بیماری کا زور تھا۔ صورتِ حال خاصی تشویش ناک تھی۔ صفدر بشیر نے فوراً فلک پیما کا ہنگامی اجلاس بُلایا۔ اور اس میں یہ تجویز پیش کی کہ اس کے گروپ کو بھی توڑ دیا جائے۔ ڈاکٹر زیدی کی سربراہی میں ایک نیا گروپ تشکیل دیا جائے جو ٹائیفائڈ کے مریضوں کو طبّی امداد مہیّا کرے۔ اس تجویز کو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔ فلک پیما کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے ابتدائی اخراجات کے لیئے منظور کیئے گئے ڈاکٹر زیدی کی مدد کے لیئے چار اسکائی لارک دیئے گئے۔

سلمان نے بھی اس سلسلہ میں ایک تجویز پیش کی۔ اور وہ یہ تھی کہ تعلیمِ بالغاں کا کام چونکہ رات کو ہوتا تھا، لہٰذا اُس گروپ میں کام کرنے والوں کو دن میں اپنے وقت کا کچھ حصّہ طبّی امداد کے لیئے دینا چاہیئے۔ تجویز معقول تھی اور ہنگامی حالات میں نہایت مناسب تھی۔ چنانچہ اُسے بھی منظور کر لیا گیا۔ صفدر بشیر نے سلمان کے اِس جذبہ کی دل کھول کر داد دی۔

جلد ہی فلک پیما کی جانب سے ٹائیفائڈ کے مریضوں کے لیئے ایک متأثرہ بستی میں طبّی امداد کا مرکز کھول دیا گیا۔ بڑے جوش و خروش اور لگن سے طبّی امداد کا کام شروع ہوُا۔ اسکائی لارک سویرے ہی سویرے ہیڈ کوارٹر سے نکلتے اور رات گئے لوٹتے۔ وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ اُن کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے۔ بیماری کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے طریقے بتاتے۔ گندگی سے پرہیز اور صفائی پر زور دیتے۔ وہ ہر کام ڈاکٹر زیدی کی ہدایت پر کرتے۔

ڈاکٹر زیدی ان دنوں اس قدر مصروف رہتا کہ اسے سر اُٹھانے کی مُہلت نہ ملتی۔ اکثر رات کو طبّی مرکز میں کُرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ ذرا آنکھ

لگتی، اطلاع ملتی کہ فلاں مریض کی حالت نازک ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچتا۔

کچھ ہی عرصہ بعد یہ اندازہ ہوگیا کہ ایک ڈاکٹر سے کام نہیں چلے گا۔ ڈاکٹر زیدی کی کوششوں سے دو ڈاکٹروں کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی گئیں۔ دونوں نیک دل اور خداترس تھے۔ ان میں خدمتِ خلق کی لگن بھی تھی۔ اب فلک پیمانے دو طبّی مراکز اور کھول دئے تھے۔ ہر مرکز کا انچارج ایک ڈاکٹر تھا۔ ان کیمپوں کے اخراجات کے لئے مزید پانچ ہزار کی رقم منظور کی گئی۔ شہر کے سرکاری اور خیراتی اسپتالوں کا انتظام انتہائی ناقص تھا۔ اور ان سے بھی زیادہ خراب رویہ بیشتر پرائیویٹ ڈاکٹروں کا تھا۔ لہٰذا مریض فلک پیما کے طبّی امداد کے مرکزوں میں علاج کرانے کو ترجیح دیتے۔ ہر وقت وہاں مریضوں کا ہجوم رہتا۔

ٹائیفائڈ کی وبا رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ مگر اس سلسلہ میں فلک پیمانے جو کام کیا، اس نے اسکاؤٹ لارکوں کو پس ماندہ بستیوں میں بہت مقبول بنا دیا۔

آئندہ اجلاس میں، جب ہر گروپ کے کام کا جائزہ لیا گیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ اب چونکہ ٹائیفائڈ کی وبا ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا طبّی امداد کا گروپ توڑ دیا جائے۔ لیکن بعض اسکاؤٹ لارکوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس گروپ کو برقرار رکھا جائے اور کسی بستی میں جگہ حاصل کر کے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کیا جائے۔ اس منصوبے میں چونکہ اخراجات زیادہ تھے۔ اس لئے متفقہ طور پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کئی گھنٹے تک بحث جاری رہی۔ آخر رائے شماری ہوئی اور اکثریت اس بات کے حق میں نکلی کہ اسپتال ضرور قائم کیا جائے۔

اسپتال کے لئے سب سے پہلے ایک قطعہ اراضی حاصل کرنا ضروری

تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی، جس نے بستیوں میں گھوم پھر کر ایک ایسی جگہ منتخب کی، جو سڑک کے کنارے تھی۔ دوسرے ہی دن فلک پیما کا ایک وفد محکمۂ آبادکاری کے افسران سے ملا۔ اس کے بعد حکام سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ آخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد زمین کا الاٹ منٹ مل گیا۔ مگر اس پلاٹ کے ساتھ مشکل یہ تھی، کہ اس پر چند خاندان ناجائز طور پر قابض تھے اور ایک مدّت سے وہاں آباد تھے۔ وہ اس جگہ کو چھوڑنے پر کسی طور آمادہ نہ تھے۔ اُن کی بے دخلی کا حکمنامہ جاری کیا گیا تو لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ خاصی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ فوراً فلک پیما کا ہنگامی اجلاس بُلایا گیا، جس میں یہ طے کیا گیا کہ سلمان اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائے۔ اُس لئے کہ اس علاقے میں تعلیمِ بالغاں کا جو مرکز قائم تھا، اس کا انچارج سلمان ہی تھا۔

دوسرے ہی دن سلمان نے اپنے شاگردوں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ ماسٹر صاحب کی بات کس طرح خالی جا سکتی تھی۔ دوبارہ اس مسئلہ کی جانب توجہ دلانے کی نوبت نہ آئی۔ پُوری بستی اُن لوگوں کے سر ہو گئی۔ کہ پلاٹ خالی کرو۔ منّت سماجت بھی کی اور دھمکی بھی دی کہ پلاٹ خالی نہ ہوا تو اُن کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

وہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے۔ بستی کے ہزاروں آدمیوں سے دشمنی مول نہیں لے سکتے تھے۔ آخر اُنھوں نے جگہ خالی کر دی۔ بستی والوں نے دوسری جگہ اُن کے مکانات تعمیر کرنے کے لئے چندہ جمع کیا۔ پھر سب نے خود ہی مل جُل کر پہلے ہی کی طرح جھگیاں اور نیم پختہ مکانات تعمیر کر لئے۔ یہ سارا کام آناً فاناً ہوا۔ نہ کوئی ہنگامہ ہوا۔ نہ کوئی کھلبلی مچی۔ سب کام اطمینان اور سکون سے ہو گیا۔

اسکائی لارکوں نے ایک روز آکر دیکھا تو پلاٹ خالی تھا۔ لوگوں نے ملبہ تک صاف کر دیا تھا۔ چٹیل زمین سرما کی ہلکی بسنتی دھوپ میں اُجلی اُجلی نظر آ رہی تھی۔ جگہ کا مسئلہ حل ہو گیا تو اسپتال کی تعمیر کا کام زیرِ بحث آیا۔ فنڈ میں صرف چھ ہزار روپے رہ گئے تھے۔ صفدر بشیر نے مزید دس ہزار روپے دئے۔ مگر یہ رقم بھی اسپتال کے لئے کم تھی۔

اسکائی لارکوں نے ایک اجلاس میں مالی مشکلات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ اسپتال کی تعمیر کا کام خود کریں گے۔ اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ علاقے کے عوام سے اسپتال کی تعمیر کے لئے چندہ لینے کی کوشش کی جائے۔ لیکن کئی اسکائی لارکوں نے تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اختلافِ رائے کے باعث اس تجویز پر اجلاس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اسے آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔ البتہ اسکائی لارکوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ علاقے کے رہنے والوں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ اگر چندے کی مہم شروع کی جائے تو اس کی کامیابی کے کس قدر امکانات ہیں۔

اسپتال کی تعمیر کا منصوبہ ابھی زیرِ غور ہی تھا کہ ایک روز صفدر بشیر کی کوٹھی پر ایک جھلکتی ہوئی کیڈلک آکر رکی۔ ایک اُدھیڑ عمر آدمی کار کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اُس کا جسم کسی قدر بھاری بھر کم تھا۔ سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر سُرخی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ تھا۔ اپنی آن بان اور وضع قطع سے وہ خاصا معزز لگتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اور صفدر بشیر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ صفدر بشیر اس وقت کوٹھی میں موجود تھا۔ ڈرائنگ رُوم میں دونوں کی مُلاقات ہوئی۔ اجنبی نے

صفدر بشیر سے اپنا تعارف کرایا۔ اُس کا نام خان بہادر فرزند علی تھا۔ اُس کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین اور املاک تھی۔ جاگیر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اُس نے شہر میں کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ خاندانی رئیس تھا۔ اُس کا باپ بھی خان بہادر تھا۔ تاجِ برطانیہ کی گراں قدر خدمات انجام دینے اور تمام تر وفاداری کے باوجود سر کا خطاب حاصل کرنے کا ارمان دل میں لیئے دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

خان بہادر فرزند علی نے اِس مُلاقات کا مقصد یہ بتایا کہ وہ فلک پیما کی مالی امداد کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی کچھ تجاویز بھی تھیں۔ مسئلہ چونکہ اہم تھا، لہذا سینئر اسکائی لارکوں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ صفدر بشیر نے علی احمد، فہیم اللہ اور ڈاکٹر زیدی کو بھی ڈرائنگ روم میں بُلا لیا۔ خان بہادر نے اُن کے سامنے امداد کی پیشکش کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اُسے اپنی تجاویز تمام ارکان کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہ بات فلک پیما کی روایت کے خلاف تھی۔ مگر صفدر بشیر کی سفارش پر خان بہادر کی درخواست منظور کر لی گئی۔

اُس وقت تمام اسکائی لارک اِتفاق سے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے، لہذا اسی وقت فلک پیما کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تمام اسکائی لارک کانفرنس روم میں جمع ہو گئے۔ خان بہادر بھی صفدر بشیر کے ہمراہ کمرے میں پہنچ گیا۔ اجلاس کی صدارت کے لیئے علی احمد کا نام تجویز کیا گیا جسے دو اسکائی لارکوں کی تائید سے منظور کر لیا گیا۔ علی احمد صدر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا تو صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر خان بہادر فرزند علی کا تمام اسکائی لارکوں سے تعارف کرایا اور اُس کی مالی پیشکش

کا ذکر کرتے ہوئے کہا خان بہادر اس سلسلہ میں اجلاس کے سامنے کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔

جب صفدر بشیر اپنی بات کہہ کر بیٹھ گیا تو خان بہادر نے کھڑے ہو کر صدر سے اجازت لی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کیا۔ چشمہ کو آنکھوں پر درست کیا۔ اس تیاری پر اُس نے تقریباً ایک منٹ صرف کیا۔ اُس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ اُس کی آواز بھاری تھی اور لہجہ میں نرمی تھی۔ بات کرتے وقت وہ بار بار اپنی گردن کو ایک خاص انداز سے خم دیتا تھا۔

اُس نے سب سے پہلے "فلک پیما" کے فلاحی کاموں کی تعریف کی۔ اسکاؤٹ لڑکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اُس وقت بڑے سرپرستانہ انداز میں بول رہا تھا۔ بار بار مسکراتا، سگار پر ہلکے ہلکے کش لگاتا اور سامنے بیٹھے ہوئے اسکاؤٹ لڑکوں کو ایسی نظروں سے دیکھتا، جیسے وہ کالج کے طالب علم ہیں، جن کا تجربہ محدود اور مشاہدہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے اُس کی باتوں پر کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نہ صرف سن و سال میں ان سے بڑا تھا، بلکہ خاصا باوقار بھی نظر آتا تھا۔

خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لئے رُکا۔ اُس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ ایک چیک نکالا اور اُس کو اسکاؤٹ لڑکوں کے رُوبرُو پیش کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے سُنا ہے کہ آپ کی جماعت ایک اسپتال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ میری جانب سے اس کے لئے یہ ایک حقیر پیش کش ہے۔ یہ ۲۰ ہزار کا چیک ہے۔"

خان بہادر نے بیس ہزار پر خاص طور پر زور دیا اور اسکاؤٹ لڑکوں کو اِس طرح گردن اُونچی کر کے دیکھا کہ وہ چٹان کی طرح پُرشکوہ نظر آنے

لگا۔

اُس نے ۲۰ ہزار کا چیک صدر کو دیا۔ لمحہ بھر تک خاموش کھڑا رہا۔ اب اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی۔ اُس نے سگار پہ لمبا کش لگایا۔ اور اسکاؤٹ لڑکوں سے خطاب کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ ضرور اسپتال تعمیر کر لیں گے۔ آپ میں وہ جذبہ و عمل پایا جاتا ہے، جس سے زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دئے جا سکتے ہیں۔"

اچانک اُس نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ اور گردن کو اپنے خاص انداز میں خم دیا۔ "مگر آپ اسپتال کو چلائیں گے کس طرح؟ میرا مطلب اس کے اخراجات سے ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ حکومت کی امداد یا ذاتی فنڈ۔ اور یہ دونوں ہی صورتیں فی الحال ممکن نہیں۔" خان بہادر فرزند علی نے سگار کے دو چار کش لگائے۔ سامنے بیٹھے ہوئے اسکاؤٹ لڑکوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کی تنظیم نے اس مسئلہ پر کیا سوچا ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں میری ایک تجویز ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ اسے پسند کریں گے۔ بات بنیادی طور پر یہ ہے کہ اسپتال کے اخراجات کے لئے ایک مستقل آمدنی کا وسیلہ ہونا ضروری ہے۔ کیوں نہ آپ ایسا کریں کہ اسپتال کے نام پر دوائیں امپورٹ کرنے کا لائسنس حاصل کر لیں۔ اور یہ لائسنس تو بہر حال آپ کو حاصل کرنا ہی پڑے گا۔ مگر اس میں اتنا اور کرنا پڑے گا کہ لائسنس اسپتال کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ کم از کم دوگنا ہونا چاہیئے۔ دواؤں کا جو فاضل کوٹا بچے، اس کو بازار میں بہت اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔"

اُس نے بلیک مارکیٹ میں دوائیں فروخت کرنے کی بات کہنے سے حتی الوسع احتراز کیا۔ صرف مسکرا کر اسکائی لارکوں کو دیکھا۔ امپورٹ لائسنس اور دواؤں کے لئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ البتہ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دواؤں کی فروخت سے جو منافع ہوگا۔ اُس میں ۵۰ فی صدی اُس پارٹی کو دینا پڑے گا، جو آپ کے لئے امپورٹ لائسنس مہیا کرے گی اور دوائیں فروخت کرنے کی بھی ذمہ دار ہوگی۔ اس لئے کہ یہ کام آپ لوگوں کے بس کا نہیں۔"

اُس کی یہ بات سن کر اسکائی لارکوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ مگر کسی اسکائی لارک نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔ خان بہادر نے اس بدلی ہوئی فضا کو محسوس کیا اور بڑے مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔

"ممکن ہے کہ آپ لوگ میری اس تجویز پر چونکیں کہ یہ شخص کیا بک رہا ہے۔ ہمیں بلیک مارکیٹنگ کی ترغیب دے رہا ہے۔" اس دفعہ وہ کھل کر ہنسا۔ "ہے تو بھئی یہ بلیک مارکیٹنگ، مگر صاحب کبھی کبھی یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ سر سید مرحوم کو اپنے مشن کے لئے طوائفوں سے بھی چندہ ملا تھا۔ مولویوں نے بڑا شور مچایا کہ یہ حرام کی کمائی ہے۔ اس کا استعمال قطعی غیر شرعی ہے۔ سر سیّد اگر اُن کی باتوں سے مرعوب ہو جاتے تو جناب آج یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نظر نہ آتی۔ جس نے سچ پوچھئے تو مسلمانوں میں سیاسی بصیرت اور بیداری کا جذبہ پیدا کیا۔"

اُس نے اسکائی لارکوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ نیک کام کے لئے کبھی کبھی بُرائی کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

خان بہادر نے ذرا دیر کے لئے خاموشی اختیار کی۔ سگار سے تھوڑا سا شغل کیا اور فاتحانہ انداز سے سر اونچا کر کے تمام اسکائی لارڈوں کے ردِ عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسکائی لارڈوں میں کشیدگی کا احساس زائل ہو رہا تھا۔ اُن کے چہرے سوچتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خان بہادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور لہجہ میں شفقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ کچھ کام کروں۔ دوڑ دھوپ کرنا، اب میرے بس کی بات نہیں۔ عمر پچپن سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ مگر کام کرنے کا حوصلہ ضرور ہے۔ آپ لوگ تو مجھے مشیر بنا لیں۔ پھر دیکھئے میں کیسے اس تنظیم کو چلاتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ یاد رکھئے۔ ہر کام کے لئے روپیہ بہت بڑی قوت ہے۔ تنظیم بنا لینا آسان ہے۔ مگر اس کا چلانا بہت مشکل ہے۔ بغیر فنڈ کے کوئی جماعت یا تنظیم نہیں چلتی۔ بہرحال میں نے آپ کے سامنے ایک مخلصانہ تجویز پیش کی ہے۔ اب جو جی چاہے آپ لوگ فیصلہ کریں، آپ کو اختیار ہے۔ وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

"بس مجھے یہی کہنا تھا۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی۔"

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ سگار پر کش لگاتا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر کئی اسکائی لارڈوں نے صدر سے تقریر کرنے کی اجازت چاہی۔ مگر اُس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ خان بہادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کے قیمتی مشوروں کے لئے بے حد ممنون ہیں۔ اب ہمیں

اِس بات کا موقعہ دیجئے کہ ہم اس کے تمام پہلوؤں پہ غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

خان بہادر نے کہا۔" آپ اپنے فیصلے سے مجھے کب تک مطلع کر سکیں گے؟"

" مجھے یقین ہے کہ اسی اجلاس میں کچھ نہ کچھ ضرور طے ہو جائے گا۔"

وہ بولا۔" اگر آپ مجھے بھی بحث میں حصّہ لینے کا موقع دیں تو مجھے اپنا نکتۂ نظر سمجھانے میں سہولت ہو گی۔"

علی احمد نے کہا۔" مجھے افسوس ہے کہ مَیں ایسی اجازت نہ دے سکوں گا یہ بے ضابطہ بات ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنی بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ اب اس سے زیادہ وضاحت کی اور کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔"

خان بہادر فرزند علی نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ رات کے نو بجے آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ صفدر بشیر نے تمام اسکائی لارکوں کی جانب سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی کے گیٹ تک اُس کو چھوڑنے گیا۔

اُس کے جانے کے بعد اجلاس کی کارروائی از سرِ نو شروع کی گئی۔ صدر نے خان بہادر کی تجاویز پر اسکائی لارکوں کو اظہارِ رائے کی دعوت دی۔ وہ بہت دیر سے بولنے کے لئے بے چین تھے۔ ایک بار ہی کئی اسکائی لارکوں نے بولنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح جلسہ میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو خان بہادر کے ہم خیال تھے اور وہ بھی تھے جو اُس کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ جلسہ کا رنگ بگڑتا جا رہا تھا۔ علی احمد نے بڑی مشکل سے صورتِ حال کو قابو میں کیا۔ اور بحث کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک اسکائی اگر تجویز کی حمایت میں بولتا ہے تو دوسرے کو مخالفت میں بولنے کا موقعہ دیا جاتا۔ پھر بھی بار بار مداخلت کی جاتی۔

اِن تقریروں سے جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ اسکائی لارکوں کی اکثریت خان بہادر کی ہم خیال تھی۔ ان میں سلمان پیش پیش تھا۔ وہ اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے لہجہ میں کھُردرا پن تھا۔ وہ معمول سے زیادہ اُونچی آواز سے بول رہا تھا۔ اُس نے اپنی تقریر میں نہ صرف اِس بات پر زور دیا کہ خان بہادر کی تجویز کو مان لیا جائے، بلکہ جذبات کی رَو میں اور بھی بہت کچھ کہہ گیا۔ تقریر کرتے کرتے ایک بار اُس نے آواز اُونچی کر کے کہا۔

"آپ کو دواؤں کی چور بازاری پر اعتراض ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ہمیں بنکوں کو لُوٹنا پڑے، سرمایہ داروں کی تجوریاں توڑنا پڑیں، جاگیرداروں کے محلوں پر ڈاکہ ڈالنا پڑے تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم کو روپیہ چاہیئے ہے۔ عوام کی بہبُودی کے لئے، اُن کی بھلائی کے لئے۔ ہم اس کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمارا نصب العین بلند، اور ہمارا مقصد عظیم ہے۔ ہمیں چھُوٹی اخلاقی روایات کو نظر انداز کر کے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم کس طرح جلد سے جلد اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔ ہمیں وقت کی اہمیّت کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔"

وہ دیر تک اِسی انداز میں بولتا رہا۔ اُس نے تقریر ختم کی تو اُس کے ہم خیال اسکائی لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔

فلک پیما کا یہ اجلاس سہ پہر کو شروع ہوا تھا اور شام تک جاری رہا۔ اسکائی لارکوں نے اس روز سہ پہر کی چائے بھی کانفرنس روم ہی میں پی اور اجلاس کی کارروائی جاری رکھی۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ جب شام کا دُھندلکا کوٹھی کے در و دیوار پر پھیل گیا اور کانفرنس رُوم کی دیوارگیریوں سے نارنجی روشنی پھُوٹنے لگی تو علی احمد بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ آنکھوں میں سکُون تھا۔ اُس نے جذبات سے عاری، نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنی تقریر

شروع کی۔

"اسکائی لارک ساتھیو! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اسکائی لارک کی حیثیت سے یہ میری اپنی رائے ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکائی لارکوں نے خان بہادر فرزند علی کی تجویز کے بنیادی مقصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی خان بہادر کاروباری قسم کے آدمی ہیں۔ روپے سے روپیہ پیدا کرنا اُن کا مقصدِ حیات رہے۔"

سلمان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بھی خان بہادر کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہے۔ ہم اُن کو فرشتہ نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے۔۔۔۔"

علی احمد نے سلمان کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "میں اسکائی لارک سلمان احمد سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنی بات کہنے کا موقع دیں۔" سلمان نے اُس کو مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ علی احمد نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خان بہادر کا مقصدِ حیات زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنا ہے۔ یعنی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ خواہش ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس کا مطلب ہے دوسروں کے گھروں سے روشنی چھین کر اپنے ایوانوں میں چراغاں کرنا۔ غریبوں کے پسینے سے جھلکتی ہوئی کاروں کے لئے پیٹرول مہیا کرنا۔ لاکھوں انسانوں کے لئے برہنگی اور اپنے لئے اطلس و کمخواب۔" علی احمد کا لہجہ بتدریج تیکھا ہوتا گیا۔ اُس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہوگئی۔ "یہ محنت کا استحصال ہے، ڈاکہ زنی ہے۔"

اسکائی لارکوں میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ سحر زدہ انسانوں کی طرح خاموش بیٹھے علی احمد کو دیکھتے رہے جو اب اُونچی آواز سے بول رہا تھا۔

"خان بہادر سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہماری راہیں ایکدوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ فلک پیما کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہو گی اور خان بہادر کے مشوروں پر یوں ہی عمل ہوتا رہا تو پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اسپتال میں دواؤں کے بجائے، رنگین پانی کی بوتلیں نظر آئیں گی۔ دوائیں چور بازار میں پہنچ جایا کریں گی اور بیماریوں میں مبتلا، بے سہارا اور محتاج انسان سسک سسک کر دم توڑتے رہیں گے۔" علی احمد نے ہاتھ اُٹھا کر انگشتِ شہادت سے بلندی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں اس تجویز کے پسِ پردہ فلک پیما کی تباہی دیکھ رہا ہوں ــــ اسکائی لارکوں کا عبرت ناک انجام۔" اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود تھا۔

"کیا ضروری ہے کہ فلک پیما ایک بہت شاندار اسپتال تعمیر کرے، جس کے کثیر اخراجات کے لئے نہ صرف بلیک مارکیٹنگ بلکہ بعض اسکائی لارکوں کے مطابق ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تک کی جائے۔" اس کا اشارہ براہِ راست سلمان کی جانب تھا۔

"جنابِ من! یہ رابن ہڈ کے شاہ رچرڈ کا عہد نہیں ہے جب چند امیروں کو لوٹ کر چند غریبوں کی مدد کی جاتی تھی۔ یہ علم و آگہی کا دَور ہے، سائنس اور جمہوریت کا دَور ہے۔ آج انسان کو اپنے مسائل کا بخوبی شعور ہے۔ وہ اس کے لئے جدّو جہد کر رہا ہے۔ جو لوگ ان مسائل کا حل نہیں جانتے، وہ انارکی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان جذباتی ہو کر اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ یہ گمراہ کُن رجحان ہے۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔"

علی احمد نے تمام اسکائی لارکوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور اپنے لہجہ

میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔" جہاں تک خان بہادر کا تعلق ہے۔ میں ان کے ساتھ اس حد تک تعاون کرنے کا مشورہ دوں گا کہ وہ اسپتال کی تعمیر کے لئے جو چندہ دے رہے ہیں، اس کو قبول کر لیا جائے اور ان کی تجویز کو مسترد کر دیا جائے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کی تجویز منظور نہ کی گئی تو وہ فلک پیما کو چندہ دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ یہی اُن کے خلوص اور ہمدردی کی آزمائش ہوگی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں نے اپنی رائے کا پوری دیانت داری سے اظہار کر دیا۔ فیصلہ آپ سب مل کر کریں گے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ علی احمد کی تقریر نے جلسہ کی فضا بدل دی چنانچہ رائے شماری کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ تمام اسکاؤٹ لارکوں نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ جلسہ ختم ہوا تو اسکاؤٹ لارکوں کے چہروں پر اطمینان اور سکون تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

رات کے نو بجے خان بہادر کی کار فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر پر ایک بار پھر نمودار ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ صفدر، بشیر، علی احمد اور فہیم اللہ اس کا پہلے ہی انتظار کر رہے تھے۔ خان بہادر نے کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی گفتگو کی۔ پھر حرفِ مطلب پر آ گیا۔

"کہئے کیا فیصلہ ہوا آپ کے اجلاس میں؟"

صفدر بشیر نے جواب دیا۔" خان بہادر صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی تجویز پر عمل نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اگر آپ اسپتال کی تعمیر کے لئے ہماری مالی امداد کرنا چاہیں تو ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے۔"

خان بہادر کا چہرہ فق ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔" ایسی صورت میں مجھے غور کرنا کرنا پڑے گا کہ میں کیا کروں؟"

علی احمد نے خاموشی کے ساتھ بیس ہزار کا چیک نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا" یہ چیک حاضر ہے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں، فیصلہ کریں۔"

خان بہادر جلدی سے بولا" دیکھئے بُرا ماننے کی بات نہیں۔ روپیہ بڑی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ مجھ کو یہ حق تو دیں گے کہ اگر میں کسی مقصد کے لئے چندہ دوں تو یہ بھی دیکھوں کہ میری رقم صحیح کام پر صرف ہو رہی ہے یا نہیں۔ پھر آپ یہ بھی غور کریں کہ بیس ہزار روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

علی احمد نے بڑی سنجیدگی سے کہا" یہ حق آپ سے کون چھین سکتا ہے۔ اگر آپ فلک پیما کے پروگرام سے متفق نہیں ہیں تو پھر کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ ہنس کر بولا" اوہو ہو! آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ آپ کے پروگرام سے تو مجھ کو سو فی صد اتفاق ہے۔ لیکن جس طرح آپ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں، اُس سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ بھئی آپ لوگوں نے میری تجویز پر معلوم ہوتا ہے، جذباتی انداز سے غور کیا ہے۔ ورنہ اُس کو منظور نہ کرنا بڑی عجیب سی بات لگتی ہے۔"

صفدر بشیر نے کچھ کہنا چاہا، مگر اس سے قبل فہیم اللہ بول پڑا" خان بہادر صاحب! آپ کی تجویز کے ہر پہلو پر اجلاس میں غور کیا گیا اور جو فیصلہ ہو چکا ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

خان بہادر کہنے لگا" صاحب! بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

فہیم اللہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے خان بہادر کو گھور کر دیکھا،

اور کسی قدر روکھے پن سے بولا "معاف کیجئے گا، آپ کی سمجھ میں یہ بات آ بھی نہیں سکتی۔ ہمارے آپ کے سوچنے کے طریقے میں بنیادی فرق ہے۔"

خان بہادر کی پیشانی پر بل آ گیا۔ اُس نے فہیم اللہ کی بات کو پسند نہیں کیا۔ ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے چیک اُٹھا کر اطمینان سے بریف کیس میں رکھا، اور شگفتہ مزاجی کے اظہار کے طور پر زبردستی مسکرا کر بولا۔

"بھئی آپ لوگ ماشاء اللہ نوجوان ہیں۔ تازہ خون ہے۔ اب یہ آپ کی مرضی، میری بات مانیں یا نہ مانیں۔"

وہ زیادہ دیر نہ ٹھیرا۔ چند ہی منٹ بعد اُٹھ کر چلا گیا۔

(۵)

نیاز ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ ہوا یہ کہ ملٹری ڈپو سے ڈسپوزل کا کچھ سامان نکلا، جس کے نیلام میں وہ بھی گیا۔ اس میں اُونی کمبلوں کی ایک بڑی لاٹ بھی، جس کی بولی خلافِ توقع اُونچی گئی۔ نیاز گھر سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس کو یہ لاٹ خریدنی ہے۔ وہ بولی بڑھاتا چلا گیا۔ ۱۸ ہزار میں پوری لاٹ اُس کے نام چھوٹ گئی۔ وہ خوشی خوشی سارا مال ٹرکوں میں بھر کر دکان پر لایا۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا، کمبلوں کے اچھے دام مل جائیں گے۔

لیکن جب اُس نے بنڈلوں کو کھولا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سارے کمبل بوسیدہ اور گلے ہوئے تھے۔ ذرا سا دباؤ پڑتا تو کاغذ کی طرح مسک جاتے۔ ڈپو کے جس شیڈ کے اندر کمبل رکھے تھے، وہاں ڈھلوان تھا۔ برسات کا سارا پانی شیڈ کے اندر گھس گیا۔ کمبل عرصہ تک اس میں پڑے پڑے گل گئے تھے۔ منافع تو

ایک طرف رہا، رقم نکلنے کے لالے پڑ گئے۔ دو ایک دلّالوں کو اُس نے مال دکھایا، وہ بازار میں نمونہ لے کر گئے۔ اور چُپ چاپ دکان پر لا کر ڈال گئے۔ کوڑی کوڑیوں کے مول بھی کمبلوں کو لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ نیاز کی راتوں کی نیند اُڑ گئی۔

وہ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ چند ہی روز میں اُس کا چہرہ مُرجھا گیا۔ پیشانی پر سیاہ لکیریں اُبھر آئیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز رات گئے وہ گھر پہنچا تو خلافِ معمول بیوی کو دالان میں نہ پاکر اُس کو تعجب ہُوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ سہ پہر سے اُس کی طبیعت گڑ بڑ ہے۔ وہ اُس وقت کمرے میں لیٹی تھی۔ نیاز نے جاکر دیکھا، تیز بخار تھا۔ حرارت سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ بیوی کے سرہانے کھڑے کھڑے نیاز نے سوچا کہ اب اُس اسکیم کے پُورا ہونے کا وقت آگیا ہے جس پر وہ عرصہ دراز سے غور کر رہا تھا۔

بظاہر اُس نے بیوی سے بڑی محبّت کی باتیں کیں۔ اور تسلّی دے کر، ڈاکٹر موٹو کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر مطب بند کر کے جانے ہی والا تھا۔ اُس وقت کوئی مریض موجُود نہ تھا۔ کمپاؤنڈر بھی جا چکا تھا۔ دونوں نے تنہائی میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کیں۔

معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اب نیاز کو معاہدہ کے مطابق ایک ہزار روپیہ پیشگی ادا کرنا تھا، جس کا مہیّا کرنا فی الحال نیاز کے لئے مشکل تھا۔ اُن دنوں اُس کا سارا سرمایہ کمبلوں کے علاوہ دو ایک اور سَودوں میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر سے کچھ مہلت چاہی، تو اُس نے بڑے رُوکھے پن سے کہا۔

"نہیں بھئی پیشگی رقم پہلے ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہی کچھ ہو گا۔"

اِس انکار پر نیاز سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو اپنی مالی پریشانیاں بتائیں، منت سماجت کی تو وہ ذرا نرم پڑا، اور بڑی مشکل سے مہینہ بھر کی مہلت دی۔ مگر ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر رقم وقت پر نہ ملی تو وہ انجکشن لگانا بند کر دے گا۔

نیاز اسی وقت ڈاکٹر موٹو کو لے کر گھر آیا۔ اُس نے مریضہ کی نبض دیکھی، ٹمپریچر لیا۔ تشویش کی قطعی کوئی بات نہ تھی۔ موسمی بخار تھا۔ وہ دو ایک روز میں علاج معالجہ کے بغیر بھی اچھی ہو جاتی۔ مگر ڈاکٹر نے ایک عجیب و غریب بیماری کا نام لے کر مرض کو بے حد خطرناک بتایا۔ اُس کی تشخیص کے مطابق مریضہ کا جگر بالکل خراب ہو چکا تھا، اور آنتوں میں زخم پڑ گئے تھے۔ اُس نے مریضہ کے سامنے ہی نیاز کو مشورہ دیا کہ علاج باقاعدگی کے ساتھ ہونا چاہیئے، ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ علاج کے لئے اُس نے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ پہلا انجکشن اُس نے اسی وقت لگایا اور مریضہ کو ہدایت کی کہ وہ پانی کم پیئے۔ غذا میں نمک کا استعمال زیادہ کرے اور جسمانی مشقت سے پرہیز کرے۔

دو تین روز میں سلطانہ کی ماں کا بخار اُتر گیا۔ طبیعت سنبھلنے لگی۔ ڈاکٹر موٹو ہر چوتھے روز آکر، خود اپنے ہاتھ سے انجکشن لگاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مریضہ کی طبیعت کچھ عرصہ تک ٹھیک رہی۔ لیکن اچانک بگڑنے لگی۔ ڈاکٹر نے کچھ پیٹنٹ دوائیں تجویز کیں، جن سے کسی قدر افاقہ ہو گیا۔

مگر وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے سخت مشقت کی عادی تھی۔ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود، گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتی۔ لیکن ذرا سا جسمانی کام کرنے کے بعد اُس کی سانس پھُول جاتی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتی۔ دیر تک طبیعت قابو میں نہ آتی۔

ایک روز اُس نے دبی زبان سے اپنی حالت کا نیاز سے تذکرہ کیا تو وہ بگڑ کر بولا۔

"تم کو تو وہم ہو گیا ہے۔"

"آپ کو کیا پتہ میری کیا حالت ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ ڈاکٹر کیسا علاج کر رہا ہے۔ طبیعت سنبھلنے کی بجائے دن بدن گرتی ہی جا رہی ہے۔"

نیاز نے فوراً کہا۔ "تم ہمیشہ کی شکّی ہو۔ ہر وقت اُلٹی سیدھی باتیں سوچا کرتی ہو، مجھے تو کہیں سے تمہاری حالت بگڑتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ پہلے سے اب صحت اچھی ہے۔ یوں وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

وہ زِچ ہو کر بولی۔ "میں کیسے بتاؤں کہ میری کیا حالت ہے؟"

نیاز غصّہ سے آنکھیں نکال کر چیخا۔ "تو پھر خیراتی ہسپتال چلی جاؤ۔ تم کو تو وہیں سے آرام ملے گا۔"

لمحہ بھر کے لئے اُس نے توقف کیا، پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دیکھو آج کل میں یوں ہی ایک چکّر میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم خواہ مخواہ مجھ کو پریشان نہ کرو۔ ورنہ کہیں اپنا منہ کالا کر کے چلا جاؤں گا۔ پھر بیٹھی جس سے چاہے علاج کراتی رہنا۔" اِس دھمکی کو سُن کر وہ ایک دم سنّاٹے میں آ گئی۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

نیاز تھوڑی دیر بیٹھا غصّہ سے بڑبڑاتا رہا۔ پھر اُٹھ کر گھر سے باہر جانے لگا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ بار بار اُنگلیوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔ اُس کو جاتے دیکھ کر بیوی نے کہا۔

"اِتنی رات گئے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

وہ جھلّا کر بولا۔ "جہنّم میں۔"

وہ اُٹھ کر اُس کی جانب بڑھی۔ "آپ کو میری قسم جو گھر سے باہر گئے۔"

نیاز کے قدم دروازے تک پہنچتے پہنچتے سُست پڑ گئے۔ وہ اُس کے قریب پہنچی اور اُس کا بازو پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھُلا کر بستر پر لیٹ گیا۔ بیوی سرہانے بیٹھی دیر تک اُس کا سر دباتی رہی۔

اِس واقعہ کے بعد، اُس نے نیاز سے اپنی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا۔ انجکشن لگتے رہے اور اُس کا جسم چھپکلی کی طرح پیلا پڑتا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا، جیسے دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔ اُس کا دم باؤلا جاتا اور اختلاجی کیفیت طاری ہو جاتی۔

علاج کرتے ہوئے چوتھا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ نیاز کو ڈاکٹر کی رقم کی فکر تھی۔ وہ ایک ہزار روپیہ دے تو سکتا تھا، مگر اتنی رقم نکل جاتی تو اُس کی دکان ٹھپ ہو جاتی۔ ان دنوں وہ دو، ڈھائی ہزار روپے کے لوٹ پھیر سے کاروبار چلا رہا تھا۔ نیاز کی پریشانی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر سوچتا کہ ڈاکٹر نے اگر انجکشن لگانا بند کر دئیے تو بہت بُرا ہو گا۔ انشورنس کی پہلی ششماہی قسط جو اُس نے کئی ہزار روپے کی صورت میں ادا کی تھی، ڈوب جائے گی۔ بغیر انجکشنوں کے بیمہ کی پالیسی جاری رکھنا فضول تھا۔

وہ اسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ ایک شام خان بہادر فرزند علی کا ایک کارندہ نیاز کے پاس آیا۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ خان بہادر کو کسی دلال کے ذریعہ معلوم ہوُا تھا کہ نیاز کے پاس خاصی بڑی تعداد میں کمبل موجود ہیں۔ خان بہادر کمبلوں کی خریداری میں دلچسپی رکھتا تھا۔

اسی رات وہ خان بہادر فرزند علی سے خود ملا۔ وہ بڑے تپاک سے مِلا۔ اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اُس نے نیاز کو گرم گرم چائے پلائی۔ پاس

رکھی ہوئی فائل کھول کر ایک ٹائپ کیا ہُوا کاغذ نکالا اور نیاز کو دکھا کر بولا۔

"میرے پاس پانچ ہزار کمبلوں کی سپلائی کا یہ سرکاری آرڈر ہے۔ اگر معاملہ پٹ جائے تو آپ کا سارا اسٹاک نکلوا دوں گا۔"

نیاز نے فوراً کہا۔ "تو پھر اس میں سوچنا کیا ہے۔ کچھ ایسا بھاؤ لگا دیجئے کہ مجھے بھی کچھ بچ جائے۔ میں سارا مال دینے کو تیار ہوں۔"

خان بہادر بولا۔ "دیکھئے میں کمبل خود نہیں خریدوں گا۔ آپ کا مال میرے توسط سے جائے گا۔ ریٹ طے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنے ٹینڈر میں دس روپے فی کمبل کا ریٹ دیا تھا۔ گورنمنٹ نے وہ ریٹ منظور کر کے سپلائی کا آرڈر دے دیا ہے۔"

نیاز کی سمجھ میں خان بہادر کی پوری بات نہ آئی۔ کہنے لگا: "حکومت تو آپ کو دس روپے فی کمبل کے حساب سے پے منٹ کرے گی۔ مگر آپ مجھے کیا دیں گے؟"

خان بہادر کو اپنی بات کی مزید وضاحت کرنا پڑی۔ "دیکھئے اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ سے کمیشن لوں۔ مگر میں کمیشن پر سودا کرنا نہیں چاہتا۔ میری شرائط یہ ہوں گی کہ اس سپلائی سے جو منافع ہوگا، اس کے تین حصہ دار ہوں گے۔ میرا اور آپ کا ۴۰، ۴۰ فی صد کا برابر کا حصہ ہوگا۔ ۲۰ فی صد کا حصہ دار وہ سرکاری افسر ہوگا جس کے ذریعہ یہ ٹینڈر منظور ہُوا ہے، اور جس سے آئندہ سپلائی میں بھی مدد ملے گی۔ اب جیسا آپ مناسب سمجھیں وہ طے کر لیں۔"

نیاز نے سوچا سودا تو بہت اچھا ہے۔ کئی ہزار روپے سیدھے سیدھے بچتے تھے۔ اُس کے لئے تو کمبلوں کا نکالنا ہی ایک مصیبت تھی۔ کہاں اتنا بڑا منافع۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی کو قابو میں کیا۔ کہنے لگا۔ "مجھے

آپ کی یہ شرط منظور ہے۔ اور کوئی شرط ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔"
خان بہادر ہنس کر بولا "یہی بنیادی شرط ہے۔ اور کوئی چھوٹی موٹی قانونی شرط ہوئی، وہ ہم معاہدہ کرتے وقت طے کر لیں گے۔"

نیاز کو بڑی مسرت تھی کہ اتنا اچھا سودا، اس قدر آسانی سے طے ہو گیا۔ دونوں نے سپلائی کے متعلق کچھ کاروباری باتیں کیں، اور یہ طے کیا کہ وکیل کی معرفت جلد ہی معاہدہ کر لیا جائے۔ نیاز گھر واپس آگیا۔ اُس روز وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت جو دُھندلا سا یہ چھایا رہتا تھا، دُور ہو گیا تھا۔

تیسرے روز معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ سرکاری افسر کے حصّہ کا اِس میں تذکرہ نہ تھا۔ اس کو اخراجات کی ایک فاضل مد میں ڈال دیا گیا۔ نیاز نے معاہدے کی نقل لے کر جیب میں رکھی تو کچھ ایسا محسوس ہُوا جیسے اُس کی جیبیں نوٹوں کی گڈیوں سے بھر گئی ہیں۔ اس وقت خان بہادر اُس کو شریف اور نیک آدمی معلوم ہُوا۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ خان بہادر چاہتا تو اُس سے بہت سستے داموں میں کمبل خرید کر اچھی رقم پیدا کر سکتا تھا۔

اس سپلائی کی نوعیت یہ تھی کہ شدید بارشوں کے باعث پنجاب اور سندھ میں زبردست طغیانی آگئی تھی۔ سیلاب سے بستیاں اُجڑ گئیں، لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ ہر طرف وبائی امراض پھیل گئے۔ لوگ دھڑا دھڑ بیمار پڑ رہے تھے۔ حکومت نے اُن کی امداد کے لئے جگہ جگہ ریلیف کیمپ کھول دئے تھے۔ سیلاب زدگان کے لئے جن اشیاء کے فراہم کرنے کی ضرورت تھی، ان میں کمبل بھی شامل تھے۔ اس کی سپلائی کے لئے ٹینڈر جاری کئے گئے۔ ریلیف کمیٹی کا جو افسر ٹینڈر منظور کر رہا تھا، اُس سے خان بہادر کے مراسم نکل آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں بات کچھ اس ڈھب سے چلی کہ اُسی وقت معاملہ پٹ گیا۔

خان بہادر اور نیاز، دونوں معاہدہ ہو جانے کے بعد اپنی اپنی جگہ بہت مطمئن تھے۔ لیکن جب منظوری کے لئے نمونہ کا کمبل بھیجا گیا تو کچھ عرصہ کے لئے وہ پریشانی میں ضرور پڑ گئے۔ اس لئے کہ اگر نمونہ مسترد ہو جاتا تو اُن کا سارا پروگرام ریت کے محل کی طرح بیٹھ جاتا۔ لیکن نمونہ کی نامنظوری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، جو افسر اُسے منظور کر رہا تھا، اُس کا سپلائی میں بیس فی صد کا منافع تھا۔ چنانچہ فوراً ہی نمونہ کی منظوری آگئی اور مال سپلائی ہونا شروع ہو گیا۔

گلے ہوئے بوسیدہ کمبل، نیاز کی دکان سے نکل نکل کر ریلیف کیمپوں میں پہنچنے لگے اور وہاں سے سیلاب کے ستائے ہوئے پریشان حال لوگوں میں تقسیم کر دئے جاتے۔ ہفتہ بھر کے اندر سپلائی کا کام ختم ہو گیا۔ ۱۵ روز بعد خان بہادر نے اپنے رسُوخ سے بل منظور کرا لیا۔ کمبلوں کا سارا حساب وصول ہو گیا۔ اصل رقم اور خرچ نکال کر ۲۵ ہزار کا منافع ہوا۔ دس دس ہزار روپے خان بہادر اور نیاز نے لے لئے اور ۵ ہزار روپے معاہدے کی رُو سے ریلیف کمیٹی کے متعلقہ افسر کو پہنچا دئے گئے جس نے ٹینڈر کے ساتھ نمونہ بھی منظور کیا تھا۔

جس روز نیاز کو ساری رقم ملی، اُس روز وہ بے حد خوش تھا۔ اُس نے بازار سے مٹھائی اور پھُولوں کے گجروں کے علاوہ، بیوی کے لئے بھی کئی سو کا سامان خریدا اور مسرت سے جھُومتا ہوا گھر کی جانب چل دیا۔ گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ بیوی بستر پر آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ قریب ہی سلطانہ پریشان بیٹھی تھی۔

نیاز نے نزدیک جا کر دیکھا۔ بیوی دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچے بے سُدھ پڑی تھی۔ اُس کا رنگ لیمپ کی روشنی میں گہرا زرد نظر آ رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے چمک رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات تھے۔ چہرے کی کھال کا تناؤ کم پڑ گیا تھا۔ اُس وقت وہ خاصی سن دراز

نظر آرہی تھی۔ نیاز نے اپنی مالی پریشانیوں کے باعث اب تک اُس کی حالت پر زیادہ توجہ ہی نہ دی تھی۔ اب جو اُسے غور سے دیکھا تو اُس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ اس کو گھناؤنی اور بدصورت معلوم ہوئی۔ اُس نے نفرت کے ساتھ سوچا اب تو اِس عورت کو مر ہی جانا چاہیئے۔ یہ مُرجھایا ہوا مریل جسم اُس کے لئے بالکل بے کار تھا۔

اُس نے قریب بیٹھی ہوئی سُلطانہ کو دیکھا۔ اُس کے گداز جسم کا ایک ایک خم پھڑک رہا تھا۔ دُھندلی روشنی میں اُس کے چہرے پر ایک خاص دل کشی تھی۔ بے خیالی کے عالم میں ایک بار سلطانہ نے نظریں اُٹھا کر نیاز کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کنول کی طرح کھِل گئیں۔ وہ اس سے نظریں نہ ہلا سکا۔ گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ پوچھنے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

وہ بولی "اچھی خاصی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔"

نیاز نے کہا "شام کو نہائی ہوں گی؟"

سلطانہ نے فوراً اُس کی بات کی تردید کی "نہیں تو۔ اکثر اُن کو ایسا ہی دَورہ پڑتا ہے۔ کہتی ہیں سینے میں تکلیف ہوتی ہے۔"

اِس کے بعد نیازنے مزید گفتگو نہیں کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل کر سیدھا ڈاکٹر موٹو کے پاس پہنچا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ تاخیر کے لئے معذرت کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! سال بھر کے بجائے پہلے ہی معاملہ صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔"

وہ کہنے لگا "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا، مگر تم راضی نہ ہوئے۔ یوں بھی دیر کرنے میں خطرہ ہے۔"

نیاز اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا "اچھا ڈاکٹر صاحب! جیسی

آپ کی مرضی۔ میں اب اس معاملہ میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

اُس روز ڈاکٹر نے مریضہ کی حالت کے بارے میں اُس کو بہت سی باتیں بتائیں۔ اور کچھ ضروری ہدایات بھی دیں، جن پر عمل کرنے کے لئے وہ بار بار تاکید کرتا رہا۔

فصل ششم

(۱)

سرما کی ایک کُہر آلود رات تھی۔ دس بج چکے تھے۔ کانفرنس روم میں تمام اسکائی لارک موجود تھے۔ فلک پیما کا ماہانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زیدی نے انجمن کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے اسپتال کی تعمیر کے منصوبے پر بحث شروع ہوئی، جس کو بعض ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

اسپتال کی تعمیر کے لئے جو گروپ بنایا گیا، اس میں سب ہی اسکائی لارک شریک تھے۔ اس گروپ کا سربراہ محمد علیم تھا۔ وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کچھ عرصہ کام کر چکا تھا۔ تعمیر کے کاموں کا اُس کو عملی تجربہ تھا۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ سب سے پہلے محمد علیم پلاٹ کا سروے کرے گا اور جب یہ کام ختم ہو جائے تو کسی کنسٹرکشن کمپنی سے تعمیری ضروریات کا سامان کرایہ پر لے لیا جائے اور اسکائی لارک خود اسپتال کی بنیاد کھودنا شروع کر دیں۔

دوسرے دن محمد علیم دو اسکائی لارکوں کے ساتھ سویرے ہی سویرے پلاٹ کا سروے کرنے گیا۔ مگر یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ پلاٹ کے گرد قد آدم اونچی دیواری

تھی۔ ایک حصے پر ٹین کا سائبان پڑا تھا۔ مشرقی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس پہ ایک بورڈ لگا تھا۔ بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"نورانی مسجد"

محمد علیم نے سوچا شاید وہ کسی دوسری جگہ آگیا ہے۔ مگر جب اُس نے دونوں اسکاؤٹ لارکوں کے ہمراہ گھوم پھر کر معائنہ کیا تو اُس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ کسی نے اسپتال کی زمین پر راتوں رات مسجد بنا دی تھی۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ دونوں اسکاؤٹ لارک بھی چکّر میں پڑ گئے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ مسجد کس نے بنوائی؟ کیوں بنوائی؟ اب اُفق سرحدوں پر سنہری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دن کی آمد آمد تھی۔ بسنتی دھوپ آہستہ آہستہ بلندیوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ بستی میں ملی جلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان تینوں کو چار دیواری کے قریب حیرت کے عالم میں کھڑے دیکھ کر کچھ آدمی اِدھر بھی آ گئے۔ مسجد کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گئے۔

ایک بوڑھا کہنے لگا۔" دس بجے جب میں دکان سے لوٹا تو میدان صاف پڑا تھا۔ رات بھر میں نہ جانے کس نے مسجد کھڑی کر دی۔ اللہ میاں نے فرشتے بھیجے ہوں گے۔ اور تو اپنی سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔"

فوراً ہی اُس کے برابر کھڑا ہوا دوسرا شخص بولا۔" یار نبی جان تو بھی کمال کرتا ہے۔ لو بھئی آج تک تو ہم نے سُنا نہیں کہ فرشتے آ کر مسجد بنا گئے۔ یہ تو کچھ اور چکّر معلوم ہوتا ہے۔"

وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں برابر والی گلی سے ایک آدمی تہبند دُرست کرتا ہوا نکلا اور اُن لوگوں سے کہنے لگا۔" اب کیا دیکھ رہے ہو۔ رات کو دیکھتے یہاں کیا ہو رہا تھا۔" اُس نے سڑک کی جانب ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔" وہاں تین چار ٹرک کھڑے تھے۔ اُن میں سے سامان نکال نکال

کر دبا دب دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں"۔

"یہ کے بجے رات کی بات ہے جی؟"

"میں کارخانے سے واپس آرہا تھا۔ تین بج رہا ہوگا۔ اماں خدا جھوٹ نہ بلوائے پچاسیوں آدمی جُٹا ہُوا تھا"۔

"تو یار تُو نے اُن لوگوں سے پُوچھا تو ہوتا"۔

"میں تھکا ہارا آرہا تھا۔ میں نے کہا نہ جانے بھئی یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"اذان تو فجر کی میں نے بھی سُنی تھی اور امامی نے تو نمازیوں کو بھی مسجد سے نکلتے دیکھا تھا۔ مگر وہ کہتا تھا کہ اپنے محلّہ کا تو اس میں کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے کون لوگ تھے؟"

"یارو! اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے"۔

"ہاں جی! یہ سب اُس کی قدرت کے کرشمے ہیں"۔

وہ سب اِسی طرح باتیں کرتے رہے۔ علیم کے لئے اب وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ دونوں اسکائی لارکوں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر واپس آیا اور صفدر بشیر کو فوراً اِس واقعہ کی رپورٹ دی۔ اسکائی لارکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کسی کو بھی محمد علیم کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ صفدر بشیر نے گیراج سے اسٹیشن ویگن نکالی، اور علی احمد کے ہمراہ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

واپس آکر اُس نے فلک پیما کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اسکائی لارکوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ محمد علیم کی اطلاع کی اُس نے تصدیق کی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس سلسلہ میں کیا کارروائی کی جائے۔ نوجوان اسکائی لارکوں میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ اُن کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ صفدر بشیر اور علی احمد پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے اپنے معائنے میں جو کچھ دیکھا تھا، اُس کی وہ ایک ایک تفصیل بتا چکے تھے۔

مگران باتوں سے اسکاؤٹ لڑکوں کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے کہ یہ مسجد بنی کیسے ۔۔۔؟ اور کس نے بنوائی ہے؟ اجلاس میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اسی دوران کوٹھی کے ایک مُلازم نے صفدر بشیر کو اطلاع دی کہ ٹیلیفون آیا ہے۔ صفدر بشیر نے جاکر ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے خان بہادر کی آواز اُبھری ۔" میں خان بہادر فرزند علی بول رہا ہوں"۔

صفدر بشیر نے پوچھا" مزاج تو اچھا ہے۔ کہئے اس وقت ٹیلیفون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ؟"

وہ کہنے لگا ۔" بھئی ایک بہت نازک مسئلہ سامنے آگیا ہے"۔

صفدر بشیر نے دریافت کیا ۔" کیا مسئلہ آگیا ؟"

خان بہادر کی آواز آئی ۔" میں نے سُنا ہے کہ جس زمین پر آپ اسپتال بنانا چاہتے تھے، اُس پر محلّہ کے لوگوں نے مسجد تعمیر کر لی ہے"۔

" محلّہ کے لوگ تو قطعی لاعلمی ظاہر کر رہے ہیں۔ میں خود وہاں گیا تھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے"۔

خان بہادر کے ہنسنے کی آواز ریسیور میں سنائی دی"۔ بھئی غلط اطلاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا ایک وفد صبح سے میرے پاس بیٹھا ہے"۔

صفدر بشیر گھبرا کر بولا ۔" آپ کے پاس وفد آیا ہے ؟"

" جی ہاں! میں نے عرض کیا ناکہ وہ تو صبح سے یہاں موجود ہے"۔

" تو پھر ایسا کیجئے کہ آپ ان لوگوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ اس وقت فلک پیما کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ہم اِسی مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی موجودگی میں مسئلہ کو سلجھانے میں آسانی ہو جائے گی"۔

" میرا کہا مانیئے تو اب اِس خیال کو ترک ہی کر دیجئے۔ اِس لئے کہ بات بہت

آگے بڑھ چکی ہے۔ شہر کے تین عالموں سے مسجد کی تعمیر کے شرعی ہونے کا فتویٰ لیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ میں ابھی وفد کے ہمراہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر آرہا ہوں۔ تاکہ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مشورہ دیا تھا کہ نقصِ امن کا خطرہ ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے پولیس کا پہرہ لگانے کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔"

اِس دھمکی پر صفدر بشیر کو سخت غصہ آیا۔ مگر اُس نے ضبط سے کام لیا اور شکوہ کرنے کے انداز میں کہنے لگا۔" مگر یہ ساری کارروائی کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔"

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔" بھئی وہ ہوا کہ اُنھوں نے مجھ کو غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔"

" بہر حال اس وقت تک جو کچھ ہو چکا، وہ ہو گیا۔ میں درخواست کروں گا کہ آئندہ اِس مسئلہ میں آپ دلچسپی نہ لیں تو مناسب ہو گا۔"

خان بہادر برہم ہو کر بولا۔" کیا کہا آپ نے یعنی میں اس مسئلے میں دلچسپی نہ لوں۔ بات ذرا سوچ کر کہا کیجئے۔ واہ صاحب واہ! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ یہ بھی خوب کہی۔ اجی آپ سے تو صرف صاحب سلامت ہی ہے۔ اگر میرا حقیقی بھائی بھی مجھ سے یہ بات کہتا تو بخدا میں اس کا منہ نوچ لیتا۔ جناب یہ دینی معاملہ ہے۔ میں تو اس کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

ابھی وہ اپنے جذبۂ ایمانی کے اظہار میں نہ جانے اور کیا کیا لن ترانی کرتا۔ لیکن صفدر بشیر نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔" معاف کیجئے آپ میری بات کا مطلب قطعی غلط سمجھے۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا جو آپ نے سمجھا۔"

" بہر حال آپ کا کچھ بھی مطلب ہو، ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ آپ لوگ تو اب اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں۔"

خان بہادر نے اپنا لہجہ کچھ نرم کیا۔" یہ میرا برادرانہ مشورہ ہے۔ پھر آپ لوگ بھی تو

مسلمان ہیں۔ کچھ اپنے ایمان ہی کا پاس کیجیے۔ اسپتال تو حکومت بھی بنوا دیتی ہے مسجدیں تو وہی بنواتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کی حرارت اور اسلام کا سچا جذبہ ہوتا ہے۔"

صفدر بشیر نے کسی جھنجلاہٹ اور ناراضگی کا اظہار کئے بغیر جواب دیا "ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی رائے پر عمل کریں۔ آپ کے ان بیش بہا مشوروں کا بہت شکریہ۔ اچھا خدا حافظ۔" اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

کانفرنس روم میں واپس پہنچ کر اُس نے صدر سے اجازت لی۔ اور اسکائی لارکوں کو بتایا کہ جو کچھ ہوا ہے اِس کے پیچھے خان بہادر کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ٹیلیفون کی گفتگو سے اُس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ پھر اُس نے خان بہادر کی دھمکی سے بھی سب کو آگاہ کر دیا۔ اُس کی ذاتی رائے اس سلسلہ میں یہ تھی کہ فلک پیما کو خان بہادر کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اُس کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

کئی جوشیلے اسکائی لارکوں نے اُس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اُن میں سلمان بھی تھا۔ اُس نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا "اگر رات بھر میں چار دیواری کھڑی کی جاسکتی ہے تو ایک ہی رات میں اس کو مسمار کر کے برابر بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔"

فہیم اللہ نے جو اسکائی لارکوں میں بڑا معاملہ فہم سمجھا جاتا تھا اور مزاج کے اعتبار سے بھی غیر جذباتی قسم کا نوجوان تھا، فوراً کھڑے ہو کر سلمان سے کہا۔

"استغفر اللہ، آپ مسجد شہید کریں گے؟"

فہیم اللہ کی اِس بات پر سلمان کے آگ ہی تو لگ گئی۔ جھلّا کر بولا "آپ اِس گھروندے کو مسجد کہہ رہے ہیں۔ کل چند شر پسند فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو کر نماز پڑھنا شروع کر دیں اور دروازے پر مسجد کے نام کا کتبہ لگا دیں، تو

کیا آپ اُن کے دعوے کو تسلیم کر کے اس کوٹھی سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اسکائی لارک فہیم اللہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قانون بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر کسی کی نجی ملکیت پر اس طرح قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔"

فہیم اللہ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔" لیکن اس طرح لوگوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

اُسی وقت ایک اور اسکائی لارک نے کہا:" اس کے علاوہ نقضِ امن کے پیشِ نظر پولیس کا پہرہ بھی شاید لگ گیا ہے۔"

سلمان اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔" اگر یہ تجویز پسند نہیں تو ہم اس چار دیواری کے سامنے بھوک ہڑتال کریں گے۔" اس کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"یہ تجویز بالکل ٹھیک ہے۔"

"بھوک ہڑتال بڑا مؤثر حربہ رہے گا۔"

فہیم اللہ اُن کا جوش و خروش دیکھ خاموش ہو گیا۔ لیکن اُس کی حمایت میں علی احمد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔

" دیکھئے یہ بہت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں جذباتی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ اگر ہم نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم اُٹھایا تو اُس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے۔ میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں میرے خیال میں یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے۔ یہ ہماری خود داری کو چیلنج ہے۔" ملحہ بھر رک کر وہ بولا۔" اس سلسلہ میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے حکومت کا تعاون حاصل کریں۔ ہمارا ایک وفد شہر کے اعلیٰ حکام سے ملے۔ اُن کو صورتِ حال سے آگاہ کرے

مناسب کارروائی کا مطالبہ کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی اندازہ لگانا چاہیئے کہ بستی کے لوگوں کا اس سلسلہ میں کیا ردِ عمل ہے۔ اُن کی ہمدردی اور تعاون حاصل کئے بغیر ہماری راہ میں ہزاروں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

علی احمد کا سلجھا ہوا اندازِ بیان، اُس کی شخصیت کا دبدبہ اور صورتِ حال کا تجزیہ، ان سب باتوں نے مِل کر اسکاؤٹ لارکوں کو خاصا متاثر کیا۔ اُن کے چہروں پر مشتعل جذبات کے بجائے سنجیدگی چھانے لگی۔ کمرے میں ذرا دیر کے لیئے خاموشی چھا گئی۔ ہر اسکاؤٹ لارک علی احمد کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ آخر جب اُنہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو سب علی احمد سے متفق تھے۔

اِس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ سلمان کو ہدایت کی گئی کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ بستی کے لوگوں کا ردِ عمل کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں۔

سلمان حسب معمول رات کے آٹھ بجے بستی میں گیا۔ تعلیم بالغاں کے مرکز میں کلاس کو سبق پڑھایا۔ اور جب پڑھائی سے فراغت ہو گئی تو اُس نے سب کو روک کر کہا۔

"مجھے آپ لوگوں سے آج کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری انجمن اس علاقے میں ایک اسپتال تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیئے ہم نے زمین بھی حاصل کر لی تھی۔ آپ سب نے مِل کر اُس کو خالی کرانے میں ہماری مدد بھی کی تھی۔ مگر اس پر کچھ لوگوں نے راتوں رات ایک گھروندا بنا کر مسجد کا نام دے دیا۔ یہ سب کچھ اِس لیئے کیا گیا کہ اسپتال نہ بنے۔ ورنہ مسجد ہی بنانا تھی تو وہ کسی اور جگہ بھی بنائی جا سکتی تھی۔ اسپتال کی زمین پر اِس طرح ناجائز قبضہ کرنے کا مقصد، آپ ہی بتائیے اور کیا ہو سکتا ہے؟"

اُس نے سب پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور اُن سے سوال کیا "اب میں آپ لوگوں سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق آپ سب سے ہے۔ یہ اسپتال آپ ہی لوگوں کے لئے تعمیر کیا جا رہا ہے۔"

فوراً ہی کئی آوازیں اُبھریں۔

"یہ ضرور کسی نے بدمعاشی کی ہے۔"

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اس میں بستی والوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ تو باہر کے لوگوں کا کیا کرایا ہے۔"

"یہ چودھویں صدی ہے۔ ہمارے حضورؐ نے کہا تھا کہ چودھویں صدی میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ اب تو اللہ کے نام پر لُوٹ مار ہونے لگی ہے۔ یہ لُوٹ مار نہیں تو اور کیا ہے۔ بغیر پوچھے گچھے چوروں کی طرح مسجد بنا ڈالی۔ سالوں نے خدا کے گھر کو بھی مذاق بنا ڈالا۔"

"نہیں جی اس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہاں جی یہ تو بہت خراب حرکت ہے۔"

ان باتوں سے سلمان کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک ان سے اسی موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔

اسکول سے باہر آکر اُس نے دیکھا کہ بستی کے چوراہے پر کئی گیس بتیاں روشن تھیں۔ ان کی تیز روشنی میں بہت سے لوگ فرش پر بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھے تھے۔ جلسہ غالباً ذرا ہی دیر قبل شروع ہوا تھا۔ وہ اُسی طرف چل دیا۔

قریب جا کر دیکھا کہ ایک لمبی داڑھی والا مولوی تقریر کر رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی کرسی پر خان بہادر شیروانی پہنے، جناح کیپ لگائے، بڑی شان

کے ساتھ اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ جلسہ کی صدارت کر رہا تھا۔

سلمان کے ساتھ اُس کے شاگرد بھی تھے۔ پانچ چھ سو افراد کا اجتماع تھا۔ مولوی اُن سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو صاحب میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ بہت بڑی بات ہے۔ جی ہاں بہت بڑی بات ہے۔ ایک زندگی تو کیا اگر ایک ہزار زندگیاں بھی نصیب ہوں تو خانۂ خدا کی حفاظت کے لئے قربان ہو سکتی ہیں۔ وہ کانپور والی مسجد کا واقعہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ کانپور کے غیور مسلمان سر سے کفن باندھ کر نکل آئے۔ جامِ شہادت نوش کرنے والوں کا یہ عالم تھا کہ ایک گرتا تھا، دس بڑھتے تھے۔ اللہ اللہ کیا مسلمان تھے۔ اور یہ مسجد شہید گنج کا واقعہ تو کل کی بات ہے۔ جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی، وہ یوں سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے کہ گولی چلانے والوں کے ہاتھوں میں رعشہ آجاتا۔ کیا شان تھی اُن مومنوں کی۔ دستِ قاتل بھی ہیبت سے لرزتا تھا۔ آج بھی کچھ لوگ آپ کے ایمان کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کے جذبۂ ایمانی کی آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس مسجد کو شہید کرنا چاہتے ہیں۔ خانۂ خدا کو نعوذ باللہ ڈھانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس مسجد کو شہید ہو جانے دیں گے؟ کیا آپ کا ایمان اس کو گوارا کر لے گا؟"

یہ کہہ کر وہ رُک گیا اور حاضرینِ جلسہ کی جانب دیکھنے لگا۔ اچانک بہت سے ملی جُلی آوازوں کا شور اُبھرا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔"

سلمان نے گھبرا کر دیکھا، شور مچانے والوں میں اُس کے شاگرد بھی شامل تھے۔ وہ اُس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے غضب ناک ہو

رہے تھے۔ گردن کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ مولوی پھر تقریر کرنے لگا۔

" برادرانِ اسلام! آپ کو خان بہادر فرزند علی صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے جن کوششوں سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔" اُس نے برابر بیٹھے ہوئے خان بہادر کی طرف، اشارہ کیا۔ خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سر کو ذرا سا جھکا لیا۔

" باری تعالیٰ نے ان کو دولت اور عزت کے ساتھ ساتھ ایک ایمان بھرا دل بھی دیا ہے۔ اب ان ملعونوں کو دیکھیئے جو ان پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کر رہے ہیں۔ اس مسجد کے شہید کرنے کے درپے ہیں۔ آپ ان کو بتا دیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت ابھی باقی ہے۔ جان و مال کیا، ہم راہِ خدا میں سر بھی کٹا سکتے ہیں۔ سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرا سکتے ہیں۔" حاضرین نے جوش میں آ کر نعرۂ تکبیر لگایا۔

" اللہ اکبر"۔

" اللہ اکبر"۔

ساری بستی نعروں کے شور سے گونج اُٹھی۔ سلمان نے غور کیا کہ اُس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے دہکنے لگے تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ وفورِ جذبات سے مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اُس نے بدحواس ہو کر سوچا کہیں جوش کے عالم میں اُس کے شاگرد ہی اُس کی مرمت نہ شروع کر دیں، اُس نے خیریت اسی میں دیکھی کہ چُپ چاپ جلسہ سے اُٹھ کر چلا جائے۔

وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت اداس تھا۔ اُس نے صفدر بشیر کو تمام باتوں کی رپورٹ دی اور تھکا ہوا سا بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ یہ رات اُس نے بڑی بےچینی اور دُکھ میں بسر کی۔ رہ رہ کر اُس کو خیال آتا کہ جن لوگوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے اشتراکی لارک، اپنی ہر مسرت کو تج کر، جفاکشی کی زندگی بسر کر رہے تھے، وہ

ایک کرانے کے مولوی کی باتوں میں آکر کس بے رحمی کے ساتھ اسکاٹی لارکوں کے خلاف اپنی نفرت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ عجیب تماشا تھا۔ ناانصافی اسکاٹی لارکوں کے ساتھ ہوئی تھی اور وہی ملعون ٹھیرائے جا رہے تھے۔ اور خان بہادر کو، جس کی سازش سے یہ سب کچھ ہوا تھا، خراج عقیدت پیش کیا جا رہا تھا۔ بستی کے لوگوں پر اُسے سخت غصہ آیا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ گندے کیڑے گندگی ہی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا، نیکی کر کے دریا میں ڈالنا ہے۔

جب وہ سوچتے سوچتے اس انتہا تک پہنچا تو اُس کو فلک پیما سر بسر مسخرا پن اور اسکاٹی لارک احمق معلوم ہونے لگے۔

نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں اُٹھ کر کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔ اِس وقت وہ تنہا تھا۔ اُس کے ساتھ جو دوسرا اسکاٹی لارک مقیم تھا، وہ اپنے کسی بیمار رشتہ دار کی عیادت کے لئے گیا تھا اور اب تک لوٹا نہ تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اور باہر گلابی جاڑوں کی شفاف چاندنی پھیلی تھی۔ وہ دریچے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا نرم اور پُرسکون تھی۔ اس میں آغاز بہار کے پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک تھی۔ چاند ایک سہ منزلہ عمارت کی منڈیر کے پیچھے سے اُبھر رہا تھا۔ شبنم سے بھیگے ہوئے درختوں پر اُس کی گہری زرد شعاعیں جھلملا رہی تھیں۔ رات مسکرا رہی تھی، اور سلمان کا دل افسردہ تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے خواب ناک نظروں سے جاگتی ہوئی رات کے حسن کو دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں اُسے سلطانہ یاد آگئی۔ وہ سیاہ آنکھوں والی دوشیزہ، جو اُس کے کندھے پر سر ٹکا کر رو پڑی تھی، جس کو فلک پیما کی طوفانی سرگرمیوں میں وہ فراموش کر چکا تھا۔ اُس نے سوچا نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔

کیا کہتی ہوگی۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے، کیسی ہے؟ وہ دیر تک سلطانہ کے متعلق سوچتا رہا۔

دوسرے روز، دوپہر سے کچھ پہلے وہ نیاز کی دکان کی جانب گیا۔ دکان پر قفل لگا تھا۔ اُس نے قریب کے چائے خانہ میں ایک پیالی گرم چائے پی۔ اور ریستوراں سے نکل کر اُس گلی میں داخل ہو گیا، جو نوشا کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اُس روز وہ گلی اُسے کچھ اجنبی سی معلوم ہوئی۔ گلی سے گزرتے ہوئے اُسے ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نوشا کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ وہی نیچی چار دیواری، وہی کھپریل کی چھت اور کبڑوں کی طرح جھکا شیشم کا پیڑ۔ ہر چیز اپنی جگہ ویسی ہی تھی۔

نوشا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اُس کے سامنے سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کے لئے وہ ٹھٹکا۔ مگر فوراً ہی اُس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ آگے چلا گیا۔ گلی میں بہت دُور تک جانے کے بعد وہ کچھ سوچ کر واپس آ گیا۔ ایک بار پھر وہ نوشا کے دروازے پر تھا۔ اس بار بھی وہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے گزر گیا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ اُس کا دل ہر بار زور سے دھڑکتا۔ طرح طرح کے وہم سے پیدا ہوتے۔

جب وہ تھکا ہوا سا گلی سے نکل کر سڑک کی جانب مڑ رہا تھا تو اچانک نیاز سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سلمان نے چاہا کہ اُس کی نظر بچا کر چپکے سے گزر جائے۔ مگر نیاز نے اُسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا "اوہو! سلمان صاحب ہیں۔ بھئی آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ کہاں رہے اتنے دنوں؟"

سلمان سوکھا سا منہ بنا کر بولا "کچھ دنوں کے لئے گھر چلا گیا تھا۔"

"جبھی میں نے کہا کہ یکایک کہاں غائب ہو گئے۔ سب خیریت تو ہے؟ کہیں کام کاج بھی لگا؟"

"فی الحال تو تعلیم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔"

وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں بولا۔" چلو یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی ادھر بہت سے چکّروں میں گھر ا رہا۔ کچھ تو کاروبار کا بکھیڑا تھا۔ پھر بیوی کی روز روز کی بیماری نے الگ جان عذاب میں کر دی ہے۔ اور ہاں یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ میں نے شادی کر لی ہے۔"

سلمان نے مسکرا کر کہا۔" مُبارک ہو۔"

وہ بیزاری سے بولا۔" ارے بھئی کہاں کی مُبارک باد۔ کبھی فرصت سے ملاقات ہو گی تو بتاؤں گا کہ کن چکروں میں پڑا ہوں۔ آج تو میں ۲ بجے دن کی گاڑی سے کوئٹہ جا رہا ہوں۔"

سلمان نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہُوا۔ اُس نے فوراً پوچھا۔" کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟"

وہ بولا۔" جلد ہی آجاؤں گا، زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر رُکوں گا۔"

سلمان نے کہا۔" تو پھر میں واپسی پر آپ سے ملوں گا۔"

وہ کہنے لگا۔" ضرور ملنا۔ تم سے تو ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

نیاز گلی میں مُڑ گیا اور سلمان سڑک پر چلتے ہوئے سوچنے لگا کہ نیاز اس سے ملنے کے لئے اتنا اشتیاق کیوں ظاہر کر رہا تھا۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ ساتھ ہی سلطانہ کی ماں کی بیماری کی خبر سُن کر اُسے تشویش پیدا ہو گئی۔ اُس نے اُسی وقت طے کیا کہ نوشا کے گھر ضرور جانا چاہیئے۔

وہ ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ کر، سلطانہ سے ملنے کا پروگرام بناتا رہا۔ رات کو بستی کے اسکول گیا۔ مگر اُس روز اُس نے سبق نہیں پڑھایا۔ اپنے شاگردوں کو سامنے دیکھ کر اُس نے سوچا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو کل رات جلسہ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے اور اسکانی لارکوں کو گالیاں دینے والے مولوی کے اشاروں پر ناچ

رہے تھے۔ یہ سب کمینے اور ذلیل ہیں۔ اُلّو کے پٹھے ہیں۔ میں ان کے لئے کیوں اپنا سر کھپاؤں۔

اُس نے سر درد کا بہانہ کیا اور ذرا ہی دیر بعد اسکول سے باہر چلا گیا۔ مگر ہیڈ کوارٹر کے بجائے وہ سیدھا نوشا کے گھر کی جانب چل دیا۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا۔ گلی کی چہل پہل اُجڑنے لگی تھی۔ جانے کو تو وہ نوشا کے گھر پہ پہنچ گیا۔ مگر نیاز کے خوف سے دروازے پہ دستک دینے کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی اثناء میں سامنے سے ایک راہ گیر آتا ہؤا نظر آیا۔ اُس نے سلمان کو اندھیرے میں اس طرح کھڑا دیکھ کر مشتبہ نظروں سے گھورا۔ آگے جا کر بھی اُس نے مُڑ مُڑ کر دیکھا۔ سلمان گھبرا گیا۔ اُس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر دروازے کو کھٹکھٹایا۔

اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے دوبارہ دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد سلطانہ کی آواز اُبھری "کون ہے ؟" وہ کہیں دُور سے بول رہی تھی۔ سلمان شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ اُس نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ سلطانہ بیزاری سے بولی۔

"ارے بھئی کون ہے۔ بولتے کیوں نہیں ؟"

ساتھ ہی صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا۔ چاپ نزدیک آتی گئی۔ سلمان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

دروازے کے بالکل قریب سے سلطانہ کی آواز آئی "کون ہے ؟"

اب خاموش رہنا ناممکن تھا، سلمان نے آہستہ سے کہا "میں ہوں سلمان"۔

سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ دروازے کے اُس پار چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ، دو منٹ، چار منٹ،

خاصی دیر ہو گئی، نہ کوئی آواز ابھری، نہ دروازہ کھلا، سلمان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا وہ ایک پھر دروازہ کھٹکھٹائے، خاموش کھڑا انتظار کرتا رہے یا واپس چلا جائے۔ عین اس وقت جب وہ نااُمید ہو چکا تھا۔ آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھُلنے کی آہٹ ہوئی۔ دروازے کا ایک پٹ چرچراتا ہُوا تھوڑا سا کھل گیا۔

سلمان نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو اور کھول دیا اور دہلیز پر ایک قدم رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ سلطانہ دروازے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ سلمان نے محبت سے اُس کی ٹھوڑی کو چھُو لیا۔

وہ پیچھے ہٹ کر سرگوشی کے انداز میں بولی "اماں جاگ رہی ہیں، میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ آپ آتے ہیں"

سلمان نے جلدی سے صحن کی جانب دیکھا۔ اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہُوا۔ کہ باورچی خانے کی دیوار سے ملحق ایک اور کمرہ بن گیا تھا۔ اس میں روشنی ہو رہی تھی۔

سلطانہ نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"اماں اس کمرے میں ہیں۔ وہیں چلے جائیے"

سلمان نے پوچھا "نیاز کوئٹہ چلا گیا؟"

"ہاں! مگر آپ کو کس نے بتایا؟"

"وہ مجھ کو آج دوپہر ملا تھا"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی "اچھا!"

زیادہ بات چیت کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سلمان فوراً نئے کمرے کی جانب چلا گیا۔ کمرے میں جا کر اُس نے دیکھا۔ سامنے پلنگ پر سلطانہ کی ماں لیٹی تھی۔ لیمپ کی دھُندلی روشنی میں اُس کا چہرہ مٹیالا نظر آرہا تھا۔

اُس کا جسم بہت لاغر ہو گیا تھا۔ وہ نحیف آواز سے بولی۔
"بہت دن بعد آئے۔ کیسے رہے؟"
وہ کمرے میں رکھی ہوئی کرُسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے جواب دیا۔
"میں تو اچھا رہا، مگر آپ نے اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے۔"
وہ بولی "پتہ نہیں کیا بیماری ہے۔ بس بیٹھے بٹھائے اچانک دورہ پڑتا ہے۔"
سلمان نے پوچھا "علاج کس ڈاکٹر کا ہو رہا ہے؟"
وہ بولی "ڈاکٹر تو سُنا ہے کہ بہت اچھا ہے، مگر میری حالت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ خدا معلوم اب تک کتنے انجکشن لگ چکے ہیں۔ آئے دن نہ معلوم کون کون سی دوائیاں آتی ہیں، مگر میرا حال جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔"
سلمان نے ایک بار غور سے اُسے دیکھا، واقعی اُس کی صحت بہت گر چکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ بار بار ہانپنے لگتی۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کی حالت دیکھ کر صاف معلوم ہوتا کہ وہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا تھی۔ سلمان نے سوچا کہ وہ ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لے کر آئے گا، اور اُس سے معلوم کرے گا کہ آخر بیماری کیا ہے۔ اُس کی یہ حالت کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ یہی سوچ کر اُس نے کہا۔
"میرے ایک دوست ہیں، وہ بڑے ہوشیار ڈاکٹر ہیں۔ میں کسی روز اُن کو لے کر آؤں گا۔"
وہ بولی "کوئی یہ تو بتا دے کہ آخر مرض کیا ہے۔ یہاں تو اب تک یہی پتہ نہیں۔ اُن سے کہتی ہوں کسی اور ڈاکٹر کو دکھاؤ تو ناراض ہوتے ہیں۔ وہ اس ڈاکٹر کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرا اُس پر یقین ہی نہیں رہا۔ جب

اعتقاد نہ ہو تو علاج کیا فائدہ کرے گا۔" پھر وہ ایسی باتیں کرنے لگی جن سے نا اُمیدی جھلکتی تھی۔ سلمان نے تسلّی دی کہ وہ پریشان نہ ہو۔

سلطانہ نے یا تو ساری باتیں بتا دی تھیں یا پھر ماں نے جان بُوجھ کر اُس رات کے بارے میں تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا، جب وہ وعدہ کرنے کے باوجُود واپس نہیں آیا تھا۔ وہ اس وقت صرف اپنی بیماری کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا، کہ وہ زندگی سے مایوس ہو چکی تھی سلمان نے حتی الوسع اُس کو دلاسا دینے کی کوشش کی اور چلتے وقت وعدہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زیدی کے ہمراہ بہت جلد آئے گا۔

کمرے سے نکل کر وہ صحن میں آیا۔ دیکھا، دالان کے کھمبے سے لگا کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔ یہ سلطانہ تھی۔ وہ اُس کو دیکھ کر بھی اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی۔ سلمان کو اُس طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ صحن سے گزرتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا اور وہاں رُک کر سلطانہ کا انتظار کرنے لگا۔ سلطانہ دالان سے باہر نکلی۔ اُس نے آنگن عبوُر کیا اور سلمان کے قریب پہنچ گئی۔ لمحہ بھر تک دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر سلمان نے سُلطانہ کے نرم نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے جذباتی انداز میں بھینچ لیا۔ آہستہ سے بولا۔

"میں پھر آؤں گا۔"

اُس نے دبی زبان سے کہا۔ "دیکھئے آیئے گا ضرور۔"

سلمان نے جواب دینے کے بجائے اقرار میں گردن ہلا دی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

(۲)

فلک پیما کا ایک وفد علی احمد کی سرکردگی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے

ملا۔ وہ حال ہی میں تبدیل ہو کر اس شہر میں آیا تھا۔ وہ لمبے قد کا نوجوان افسر تھا۔ اُس وقت سرمئی رنگ کا سوٹ پہنے، ہونٹوں میں پائپ دبائے، بڑے وقار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وفد کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ بات چیت شروع ہوئی۔ علی احمد نے مسجد کا قضیہ اُس کے سامنے پیش کیا۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اُس کی باتوں کو پُوری توجہ سے سُنا۔ پائپ پر کش لگایا۔ ذرا دیر سوچتا رہا۔ پھر وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔" اچھا ہُوا کہ آپ لوگ بھی آ گئے۔ کل خان بہادر فرزند علی بھی ایک وفد کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔ دونوں فریقین کے بیانات میں نے سُن لئے ہیں۔ میں عنقریب اِس کی تحقیقات کرنے والا ہوں۔"

علی احمد نے دریافت کیا۔" کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مسجد کے نام پر تعمیر خان بہادر صاحب کے ایما پر ہوئی ہے ؟"

اُس نے جواب دیا۔" اُن کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد بستی ہی کے لوگوں نے بنائی ہے۔ وہ صرف اپنے مذہبی فریضہ کے تحت اِس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

علی احمد نے فوراً کہا۔" میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اِس تعمیر سے بستی کے لوگوں کا کوئی تعلق نہیں۔"

" میرا خیال ہے کہ آپ کی اطلاع درست نہیں ہے۔ بستی ہی کے لوگوں کا وفد میرے پاس آیا تھا۔ اُن کے اس علاقہ میں مکانات ہیں اور وہ ایک مدّت سے وہاں آباد ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ سلمان نے جو اسکائی لارکوں کے وفد میں شریک تھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

" خان بہادر نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ بستی کے لوگوں کو تو

اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔ یہ صرف خان بہادر کی سازش ہے۔ وہ اس طرح اسپتال کی زمین پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اُن کے خلاف فوری کارروائی کرنی چاہیئے۔ ورنہ مجبوراً ہم کو جوابی اقدام کرنا پڑے گا۔ یہ تو سراسر دھاندلی ہے۔ مذہب کے نام پر ڈاکہ زنی ہے۔"

سلمان بالکل اس انداز سے بول رہا تھا، گویا وہ اسکائی لارکوں کے جلسہ میں تقریر کر رہا ہو۔ وہ یہ بالکل بھول گیا کہ وہ شہر کے ایک اعلیٰ حاکم کے رُو برُو بات کر رہا تھا، جو سی۔ ایس۔ پی آفیسر تھا، اور اپنے اُن پیش رَو آئی۔ سی۔ ایس افسروں کی روایات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا، جو نہتے عوام پر گولیاں چلا کر اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط کرتے تھے۔ اور کلب میں وہسکی کا جام چڑھا کر بڑے فخریہ لہجے میں کہتے تھے ــــ "آج پانچ کتے مارے گئے۔"

سلمان کی باتیں سُن کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی گردن کو خم دیا، اور پائپ پر کئی لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں منہ سے اُگل دیا۔ اُس نے وفد کے ارکان کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "دیکھئے آپ لوگوں نے کوئی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی، تو میں سب کو اُٹھا کر بند کر دوں گا۔ اس قسم کی دھمکیاں آپ لوگ وزیروں کو دیا کریں۔ اِس لئے کہ اُن کو آپ کے ووٹوں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

سلمان اُس کی اس دھمکی پر بہت بھنّایا۔ اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا مگر علی احمد نے اُس کو بولنے کا موقعہ نہ دیا۔ اُس نے نوجوان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے کہا "ہماری جانب سے دھمکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تو آپ کے پاس اپنی فریاد لے کر آئے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں اِس قسم کی مجرمانہ حرکتوں کی سرکوبی کی جائے۔ ورنہ اس سے نہ صرف عوام میں اسلام کے خلاف

نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا، بلکہ مفسدوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔"

وہ بولا۔" آپ مسئلہ کو جس قدر معمولی سمجھ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ مسئلہ بے حد نازک ہے۔ آپ کو علم نہیں کہ لوگوں کے مذہبی جذبات کس قدر جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی تو آپ بھی اُلٹا حکام ہی کو بُرا بھلا کہیں گے۔"

اب وہ اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خشونت چھا گئی تھی۔ بات کرنے کے انداز سے یہ حقیقت صاف جھلکتی تھی کہ اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ محض اُلّو کے پٹھے تھے۔ نہ اُن کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا اور نہ قانون کا کوئی احترام تھا۔ اُس نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

" بہر حال میں آج ہی اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے حکم جاری کر دوں گا۔ یوں میں نے احتیاطاً مسجد کے دروازے پر پولیس کا پہرہ لگوا دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو پولیس فورس میں اور اضافہ کر دیا جائے گا۔" یہ سیدھے سادے الفاظ میں وفد کو تنبیہ دی گئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا، اور ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر کسی سے بات کرنے کی غرض سے ڈائل گھمانا شروع کر دیا۔

وفد کے ارکان جب باہر نکلے تو دل برداشتہ تھے۔ اُن کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس بہت سی توقعات لے کر گئے تھے اور اب اِن توقعات کے جنازے کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہیڈ کوارٹر کی جانب جا رہے تھے۔

وفد کے ارکان میں جو اسکائی لارک، سب سے زیادہ مضمحل نظر آ رہا تھا، وہ سلمان تھا۔ وہ اس طرح تھکا ماندہ چل رہا تھا، جیسے اُس کی پشت پر منوں بوجھ لدا ہو۔ ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد بھی اُس کا یہی موڈ رہا۔ علی احمد اپنی رپورٹ لکھنے چلا گیا۔ سلمان کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے

زیادہ علی احمد پر تاؤ آرہا تھا، جس نے بڑے دعوے کے ساتھ یقین دلایا تھا کہ حکومت اس معاملہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔

سلمان سہ پہر تک لیٹا رہا، اور بڑی اُوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔ اس وقت وہ چڑچڑا اور جذباتی ہو رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ کوٹھی کے باہر اسکول سے لوٹنے والے بچوں کا ملا جلا شور اُبھر رہا تھا۔ اُس کو یہ شور و غل بہت بُرا معلوم ہوا۔ اُس نے کھڑکی کے قریب جاکر، سڑک پر گزرنے والے بچوں کو گھور کر دیکھا اور غصہ سے کھڑکی کے دونوں پٹ زور سے بند کر دئے۔

شام کو سلمان نے ڈاکٹر زیدی کو اپنے ہمراہ لیا۔ نوشا کے گھر پہنچا۔ ابھی تک سلطانہ کی ماں کی طبیعت سنبھلی نہیں تھی۔ دو روز قبل اس کو جو دورہ پڑا تھا، اس سے نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ نڈھال پڑی تھی، اور رُک رُک کر گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ ڈاکٹر زیدی نے بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کیا۔ بیماری کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

نوشا کی ماں نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب کوئی گھبرانے کی تو بات نہیں ہے؟"

ڈاکٹر زیدی نے تسلی دیتے ہوئے کہا "جی نہیں، آپ انشاء اللہ جلد اچھی ہو جائیں گی۔"

وہ بولی۔ "مگر میری حالت تو دن بدن گرتی جا رہی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بچوں گی نہیں۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اُس کو تشفی دی۔ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا۔ جس سے مریضہ کو خاصی ڈھارس بندھی۔ اُس نے ایک کاغذ پر چند دوائیں لکھ کر دیں۔ اُن کے استعمال کے متعلق ضروری ہدایات دیں اور تاکید کرتے ہوئے بولا۔

"جس قدر جلد ہو سکے یہ دوائیں استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔"

وہ دبی زبان سے بولی۔ "مگر اس کے لئے مجھے اپنے ڈاکٹر صاحب سے بھی تو پوچھنا پڑے گا۔"

ڈاکٹر زیدی اس کی بات سُن کر خاموش ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سنجیدہ پڑ گیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے کچھ سوچنے لگا، نوشا کی ماں نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر خیرات محمد کا علاج فوراً بند کر دیں، ورنہ آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

نوشا کی ماں اور سلمان دونوں حیرت زدہ ہو کر ڈاکٹر زیدی کو دیکھنے لگے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ لیمپ کی لو ہوا کے تیز جھونکے سے بھڑکی۔ دیواروں پہ پھیلی ہوئی پرچھائیاں جھومنے لگیں۔ کمرے کی فضا آسیب زدہ نظر آنے لگی۔ مریضہ کا چہرہ گہرا زرد پڑ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں حلقوں کے اندر بے حس پڑی تھیں ــــ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ وہ کسی لاش کی طرح بے جان نظر آ رہی تھی۔

آخر اس ہیبت ناک سناٹے میں ڈاکٹر زیدی کی آواز اُبھری۔ "مسٹر سلمان اب ہمیں چلنا چاہیئے۔" سلمان کھڑا ہو گیا۔ نوشا کی ماں نے سلمان سے کہا۔

"تم واپس آؤ گے؟"

سلمان کے پاس اب وقت بہت کم تھا۔ اُسے تعلیمِ بالغاں کے مرکز جانا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔ اس وقت تو میں واپس نہیں آؤں گا۔ مجھ کو ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "کل تو آؤ گے؟"

سلمان نے فوراً کہا۔ "جی ہاں، کل دوپہر کو آؤں گا۔"

وہ اصرار کرنے لگی۔ "دیکھو آنا ضرور۔"

"نہیں، نہیں، میں ضرور آؤں گا۔"

دونوں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گئے۔ آگے آگے ڈاکٹر زیدی تھا۔ سلمان اُس کے پیچھے چل رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہی اُس نے چاروں طرف تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ سلطانہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ نے بڑی معصومیت سے اپنا داہنا ہاتھ اُٹھا کر ماتھے پر رکھ لیا۔ سلمان مسکرا دیا۔

دونوں گھر سے نکل کر باہر گلی میں آ گئے۔ ڈاکٹر زیدی کچھ دُور تک اندھیری گلی میں خاموش چلتا رہا۔ اچانک اُس کی بھاری آواز اُبھری۔ وہ سلمان سے کہہ رہا تھا۔

"مجھ کو تعجب ہے کہ مریضہ اب تک زندہ کیوں ہے۔ اس کو تو بہت پہلے ہی مر جانا چاہیئے تھا۔"

سلمان نے پوچھا۔ "مگر یہ بیماری کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے اُس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس سے ایک بڑا بے تکا سوال کیا۔ "تم یہ بتا سکتے ہو کہ شوہر کے ساتھ مریضہ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ ابھی چند ہی ماہ ہوئے اُن کی شادی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر زیدی نے پلٹ کر اُس کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "تو یہ اُن کی دوسری شادی ہے۔ اُن کے شوہر کی عمر کیا ہوگی؟" سلمان نے بتایا۔ "دیکھنے میں تو وہ خاصا جوان معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کی عمر چالیس سے کم ہی ہوگی۔"

"مریضہ کی کچھ جائداد بھی ہے ؟"

"نہیں" سلمان نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر ذرا دیر سوچتا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "تب تو مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی" وہ زیرِ لب مسکرایا۔

"یہ ڈاکٹر خیرات محمد اس قدر بدنام ہے کہ اس کا نام سُنتے ہی خواہ مخواہ شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل وہ مریضہ کی بیماری کی تشخیص نہیں کر سکا اور اُلٹے سیدھے انجکشن دینا شروع کر دئے۔ ان عطائی ڈاکٹروں کے علاج میں ہمیشہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔"

سلمان اُس کی بات سُن کر بولا "معلوم ہوتا ہے۔ پہلے آپ کوئی خطرناک بات سوچ رہے تھے۔"

ڈاکٹر زیدی بولا "تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے کچھ ایسی ہی بات سوچی تھی۔ بات یہ ہے کہ میں آٹھ سال تک پولیس اسپتال میں سرجن رہا ہوں۔ مجرموں سے میرا بہت عرصہ تک واسطہ رہا ہے۔"

سلمان نے اصرار کر کے پوچھا "مگر یہ تو بتائیے، آخر یہ مرض ہے کیا ؟"

"مریضہ کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ دل کو خون سپلائی کرنے والی رگیں سکڑتی جارہی ہیں اور یہ تبدیلی اچانک رونما ہوئی ہے۔"

سلمان خوفزدہ ہو کر سوچنے لگا، یہ تو بہت خطرناک بیماری ہے۔

ڈاکٹر زیدی اُسے پولیس اسپتال کے تجربات بتانے لگا۔ اس نے سلمان کو ایک بوڑھے کرنل کا واقعہ سُنایا، جس کے جسم میں انجکشن کے ذریعہ پاگل کتے کا خون داخل کیا گیا تھا، چنانچہ وہ دیوانہ ہو گیا۔ ایک روز دیوانگی کے عالم میں اس نے ریوالور چلا کر خودکشی کر لی۔ اس واقعہ کی تفصیلات بڑی ہیبت ناک تھیں۔ سلمان بار بار حیرت زدہ نظروں سے ڈاکٹر زیدی کو دیکھتا، جس کا سر گنجا تھا اور

آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہیڈ کوارٹر میں زیادہ دیر ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی سلمان فوراً تعلیم بالغاں کے مرکز کی جانب چل دیا۔

اُس روز بھی وہ جلد ہی پڑھا کر واپس آگیا۔ اُن دنوں وہ اپنے کام میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ فلک ہُما کی سرگرمیوں کی جانب سے اس نے بے نیازی برتنا شروع کر دی تھی۔ اب وہ سلطانہ اور اس کے گھر کے متعلق زیادہ سوچا کرتا۔

کئی روز بعد وہ پھر نوشا کے گھر گیا۔ اُس نے سڑک عبُور کی اور جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوا جو نوشا کے گھر کی جانب جاتی تھی، نیاز سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً لوٹا۔ اب نوشا کے گھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ اسکائی لارکوں کا ایک وفد وزیرِ داخلہ سے ملنے کراچی گیا تھا۔ اُس کے بعد وہ اکثر ایسی اطلاعات سُنتا رہا۔ حکام اور وزراء سے مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ اس عرصہ میں مسجد کی تعمیر کا کام زور شور سے جاری رہا۔ پُرانی چار دیواری گرا کر نئی دیواریں کھڑی کی گئیں۔ اُونچے اُونچے ستون تعمیر کئے گئے۔ اُن پر محرابیں بنائی گئیں۔ کام اس قدر تیز رفتار سے ہو رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے مسجد کی عمارت اُبھر کر سامنے آگئی۔ اور حکام یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کارروائی کی جائے۔

آخر وہ دن بھی آگیا کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد اس انداز سے بنائی گئی تھی کہ سڑک کی جانب جو حصّہ تھا، اُس میں دس دکانیں نکالی گئیں۔ مسجد کی دیکھ بھال کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کا تاحیات صدر خان بہادر فرزند علی تھا۔ پانچ ٹرسٹیوں میں خان بہادر کے دو بھتیجے تھے۔ اور ایک داماد بھی شامل

تھا۔ خان بہادر فرزند علی نے اس ٹرسٹ کو باقاعدہ رجسٹرڈ کروالیا تھا۔

دکانیں، چونکہ بازار کے بیچوں بیچ تھیں، لہٰذا مسجد کی تعمیر سے پہلے ہی تگڑی پگڑی پر اٹھ گئیں۔ جب تک مسجد کی تعمیر ہوتی رہی، خان بہادر ہر روز اپنی جھلکتی ہوئی سبز رنگ کی کار میں وہاں آتا۔ ٹھیکیدار سے گفتگو کرتا۔ ضروری ہدایات دیتا اور جب اپنی کار کی جانب واپس جاتا تو ٹھیکیدار دوڑ کر کار کا دروازہ کھولتا ــــ خان بہادر اندر بیٹھ کر سر کے خفیف اشارے سے کاریگروں اور ٹھیکیدار کے سلام کا جواب دیتا۔ کار خراماں خراماں آگے بڑھ جاتی۔

اسکائی لارکوں میں پہلے پہل تو بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا، مگر جوں جوں مسجد مکمل ہوتی گئی، ان کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اُن میں جھنجھلاہٹ اور شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اکثر اپنے فرائض سے لاپرواہی برتتے اور چائے خانوں میں بیٹھے گھنٹوں فضول باتیں کرتے رہتے۔

اس زمانے میں فلک پیما کے تین اجلاس ایسے ہوئے، جن میں کورم بھی پورا نہ ہو سکا۔ صدر کو بغیر کسی کارروائی کے مجبوراً اجلاس ملتوی کرنے پڑتے۔ یہ بڑا نازک اور حوصلہ شکن دور تھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ جلد ہی فلک پیما کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اِس مرحلہ پر علی احمد نے جرأت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اُس نے ایک اسٹڈی سرکل قائم کیا، جس میں وہ زندگی کے بنیادی مسائل پر بحث کرتا۔ اُن کا حل بتاتا۔ اسکائی لارکوں کے کام کی اہمیت اور ان کے نصب العین کی عظمت پر روشنی ڈالتا۔ ہر رات ۱۰ بجے، جب تمام اسکائی لارک اپنے اپنے مرکزوں سے واپس آتے، تو کانفرنس روم میں، اسٹڈی سرکل کی کلاس شروع ہوتی۔ ان میں زیادہ تر علی احمد لیکچر دیتا تھا۔ صفدر بشیر اور فہیم اللہ بھی مختلف موضوعات پر بولتے۔ پھر ان پر مباحثہ شروع ہوتا۔ ہر اسکائی لارک اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اظہارِ خیال کرتا۔

اپنی ذہنی تربیت کرتا اور معلومات میں اضافہ کرتا۔

ابتدا میں اسکائی لارک، اسٹیڈی سرکل میں بے دلی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مباحثہ میں حصہ لینے سے کتراتے۔ خاموش بیٹھے سگریٹ کے کش لگایا کرتے۔ مگر یہ بے تعلقی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ ان میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہونے لگا۔ اب وہ چائے خانوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے لائبریری میں نظر آتے۔ علی احمد جن کتابوں کو تجویز کرتا، ان کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھتے۔ اُن سے نوٹ لیتے اور رات کو اسٹیڈی سرکل میں شریک ہوتے تو بڑھ چڑھ کر بولتے۔

سلمان کا لہجہ فلک پیما کے جلسوں میں ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے رویہ میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر بات کرتا اور اپنی بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا۔ اکثر رات گئے تک جاگتا رہتا۔ اس کی گردن میز پہ جھکی ہوتی۔ سامنے کوئی کتاب ہوتی اور ٹیبل لیمپ کے شیڈ سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں، اُس کے چہرے کے نقوش بڑے ٹھوس نظر آتے۔

اسٹیڈی سرکل قائم ہونے کے چند ہی ہفتوں بعد فضا بدلنے لگی۔ اسکائی لارکوں میں پائی جانے والی شکست خوردگی اور بے حسی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔ علی احمد کے لیکچروں نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اب پھر وہ فلک پیما کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ مگر علی احمد ہنوز مطمئن نہیں تھا۔ اُس نے اسکائی لارکوں کی بنیادی کمزوری کا سراغ نکال لیا تھا۔ چنانچہ جب فلک پیما کا ماہانہ اجلاس ہوا تو علی احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اسکائی لارکوں کا ہیڈکوارٹر صفدر بشیر کی کوٹھی سے منتقل کر کے کسی بستی میں بنایا جائے۔

علی احمد نے جس وقت یہ تجویز پیش کی تو اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ ہر اسکائی لارک دم بخود رہ گیا۔ یہ جاڑوں کی رات تھی۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی

تھیں۔ اسکائی لارک گرم کمرے کے اندر بیٹھے تھے۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوارگیریوں سے گہری نارنجی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہیٹر پر سماوار رکھا تھا، جس سے قہوے کی مہکتی بھاپ نکل رہی تھی۔ کمرے کے اس رومانٹک ماحول میں اسکائی لارک گرم لباسوں میں ملبوس، سگرٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان کو علی احمد کی تجویز بڑی عجیب سی معلوم ہوئی۔ کئی اسکائی لارکوں نے اس تجویز کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

علی احمد نے اُن کے اعتراضات کو خاموشی سے سُنا۔ جب تجویز کی مخالفت میں بولنے والا ہر اسکائی لارک اپنی بات کہہ چکا، تو اُس نے کھڑے ہو کر بڑے نرم اور سنجیدہ لہجے میں اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ اعتراضات کا جواب دیا۔ اُس نے اسکائی لارکوں کو سمجھایا کہ اُن میں مایوسی اور شکست خوردگی کا جو احساس پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسکائی لارکوں کو اسپتال کی زمین کے سلسلہ میں ناکامی ہوئی۔ ایسی ناکامیوں سے تو آئندہ بھی سابقہ پڑے گا۔ اور وہ ہر بار نئے عزم اور تازہ حوصلے کے ساتھ جد و جہد کریں گے۔ اِس احساسِ شکست خوردگی کی اصل وجہ کوٹھی کا رہن سہن تھا۔ جب تک اسکائی لارک عوام کے ساتھ مِل جُل کر نہیں رہیں گے، نہ وہ ان کے مسائل کو سمجھ سکیں گے، نہ اُن کی نفسیات کو اور نہ ہی اپنے کام کی اہمیت کو۔

علی احمد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اُس نے اپنے لہجہ میں زورِ خطابت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

" انجینئر بننے کے لئے مشین کے کل پُرزوں سے، اور ڈاکٹر بننے کے لئے انسانی جسم کی ساخت اور ہر عضو کی بناوٹ سے پوری طرح آگاہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جب ایک انجینئر بگڑی ہوئی مشین کو درست کرتا ہے۔ جب ایک ڈاکٹر مریض کو موت کے منہ سے بچاتا ہے تو اُس کی خوشی میں ایک مقدس جذبہ کارفرما

ہوتا ہے۔ اسکائی لارکوں کا کام اور بھی زیادہ اہم ہے۔ وہ غریب عوام کے دُکھ درد اور اُن کی پسماندگی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو بہتر انسان بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کو زندگی کا قرینہ سکھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک عظیم جدوجہد ہے۔ ان کی کامیابی ایک رُوح پرور جذبہ ہے۔ اُن کی مسرت فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ آپ ان پیٹ بھرے پیشہ ور سیاستدانوں کی مثال اپنے سامنے نہ رکھیں جو زندگی کو دُور بین سے دیکھتے ہیں۔ اپنے خدمت گاروں، ڈرائیوروں اور خانساماؤں کی بات چیت سے عوام کے مسائل کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاندار ڈرائینگ روموں میں بیٹھ کر سیاست بگھارتے ہیں۔ جلسوں میں جاکر زندہ باد کے نعرے لگواتے ہیں۔ وہ لیڈر بننا چاہتے ہیں، شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اقتدار اور دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسکائی لارکوں کی راہ اُن سے قطعی مختلف ہے۔"

علی احمد لمحہ بھر کے لئے رُکا۔ پھر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیڈری تو دولت سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دولت کمانے کے نسخے تلاش کرنے کے لئے بازار سے 'دولت کماؤ اور لکھ پتی بن جاؤ' کتاب خریدنے کی بھی ضرورت نہیں۔ خان بہادر فرزند سے رجوع کیجئے، وہ دولت پیدا کرنے کا اچھا خاصا چلتا پھرتا نسخہ ہے۔"

اس بات پر ایک قہقہہ بلند ہُوا۔ اور کانفرنس روم دیر تک اس سے گونجتا رہا۔

سلمان نے بلند آواز سے کہا۔ "وہ تو کفن کھسوٹ ہے۔"

علی احمد نے کہا۔ "شائی لاک بھی بُرا خطاب نہیں۔"

صفدر بشیر مسکرا کر بولا۔ "کیا خان بہادری کو آپ چھوٹا خطاب سمجھتے ہیں؟"

علی احمد خاموش کھڑا زیرِ لب مسکراتا رہا۔ جب خاموشی ہوگئی تو اس نے پھر اپنی تقریر شروع کی۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسکائی لارک پیشہ ور لیڈر بننے کے بجائے اُس کسان کی زندگی میں اپنی زندگی کا عکس تلاش کریں، جو مٹی سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ زمین کیسی ہے۔ جو بنجر زمین کو زرخیز اور چٹیل میدانوں کو لہلہاتی فصلوں میں بدل دیتا ہے جو زمین کا سینہ چیر کر خوشۂ گندم پیدا کرتا ہے۔"

علی احمد دیر تک تقریر کرتا رہا۔ اپنے موقف کی تائید میں اُس نے ٹھوس دلائل پیش کیے۔ آخر اس کی تجویز کو منظور کر لیا گیا۔ اُس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صفدر بشیر کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی گئی۔

صفدر بشیر نے دوڑ دھوپ کر کے ہفتہ بھر کے اندر گمٹی کی مضافاتی بستی میں سستی قیمت پر زمین بھی حاصل کر لی۔ یہ بہت بڑی بستی تھی اور ایک بنجر پہاڑی کے دامن میں آباد تھی۔ یہاں زیادہ تر فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی آبادی تھی۔ ان کے علاوہ گوالوں کے کچھ خاندان تھے۔ گمٹی میں تعلیمِ بالغاں کا مرکز قائم تھا اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ جب شہر میں ٹائی فائڈ کی وبا پھیلی تھی تو اسکائی لارکوں نے اپنا پہلا طبی مرکز یہیں بنایا تھا۔

نیا ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے منصوبے پر برابر کام ہوتا رہا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب تمام اسکائی لارک سویرے سویرے ہی اپنے پلاٹ پر پہنچ گئے۔ وہ خاکی نیکریں اور ملیشیا کی سرمئی قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے چُونے سے عمارت کی بنیاد کے نشان زمین پر ڈالے، کدالیں اُٹھائیں اور بنیاد کھودنی شروع کر دی۔

بستی کے لوگوں کے لئے جلد ہی وہ تماشہ بن گئے۔ دیکھتے، دیکھتے ان کے چاروں طرف ہجوم لگ گیا۔ اس ہجوم میں بچے تھے، جوان تھے اور بوڑھے

بھی تھے۔ عورتیں دروازوں سے جھانک جھانک کر ان کو حیرت سے دیکھتیں۔

چند ہی روز میں اُنہوں نے عمارت کی بنیاد کھود ڈالی اور دیواریں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔ وہ بڑی تن دہی اور لگن کے ساتھ کام کرتے۔ کوئی اینٹیں ڈھو ڈھو کر لا رہا ہے۔ کوئی گارا بنا رہا ہے۔ کوئی پاڑھ پر چڑھا ہے اور زور زور سے آوازیں دے رہا ہے۔ کوئی دیوار چُن رہا ہے۔ اس عالم میں واقعی وہ عجیب سے لگتے۔ اُن کے بال بکھرے ہوتے۔ چہروں پر خاک جمی ہوتی۔ آوازیں بے ترتیبی ہوتی۔ خاص طور پر دوپہر کے وقت جب وہ پسینے میں ڈوبے ہوئے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ــــ تھرماس سے پانی نکال کر پیتے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سگریٹیں سُلگا کر لمبے لمبے کش لگاتے۔ اس وقت وہ بڑی بے تکلفی کے عالم میں ہوتے۔ بات بات پر قہقہے لگاتے، ایک دوسرے کے کام پر تبصرہ کرتے۔ زیادہ تھک جاتے تو کسی دیوار کے سائے میں لیٹ کر آنکھیں بند کئے خاموش پڑے رہتے۔

جب اُنہوں نے عمارت کی تعمیر شروع کی تھی، اُس وقت اُن کو اپنا کام بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ گردنیں جھکا کر چلتے اور شرمائے شرمائے سے رہتے۔ مگر اب وہ جھجک جاتی رہی تھی۔ وہ سینہ تان کر مشقت کرتے اور لاابالی پن سے ایک دوسرے کو چھیڑتے۔ کام میں اب ان کو ایک خاص مسرت محسوس ہوتی، ایسی مسرت جس کی لذت سے وہ اب تک ناآشنا تھے۔

اسکاؤٹ لڑکوں نے اس قدر محنت اور جاں فشانی سے تعمیر کا کام کیا کہ دیکھتے دیکھتے ایک عمارت زمین کے سینے سے اُبھر کر سامنے آگئی۔ اُس پر ٹین کی چھتیں تھیں۔ آٹھ بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک میں فلک پیما کا دفتر قائم کیا گیا۔ اور اس کمرے کو، جو سب سے زیادہ کشادہ تھا، لائبریری اور جلسوں

کے لئے وقف کر دیا گیا۔ چار کمرے اسکاؤٹ لارکوں کی رہائش کے لئے تھے، دو کمروں میں ڈاکٹر زیدی نے ایک معمولی سی ڈسپنسری کھول دی۔

ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے مکمل ہوتے ہی، تمام اسکاؤٹ لارک اس میں منتقل ہو گئے۔ یہ زندگی بڑی سادہ تھی۔ وہ سویرے اُٹھ کر بستر درست کرتے۔ کمرے صاف کرتے۔ چائے بناتے۔ کپڑے دھوتے۔ غرض کہ اپنا ہر کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ فلک پیما کے کام کے علاوہ، اُن کا بیشتر وقت لائبریری میں گزرتا۔ علی احمد اور صفدر بشیر روزانہ اسٹیڈی سرکل میں اُن کی کلاس لیتے، مہینہ میں ایکدن اُنہوں نے چھٹی کا رکھا تھا۔ اس روز وہ شہر سے کہیں دُور نکل جاتے اور کسی پُر فضا مقام پر پک نک مناتے۔

بستی میں رہائش اختیار کرنے سے اسکاؤٹ لارکوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کو اس علاقے میں آتے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ہر اسکاؤٹ لارک اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا کہ اُن کے چاروں طرف غلاظت ہی غلاظت تھی۔ گندے پانی کی نکاسی کے لئے گمٹی میں نالیوں کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ گھروں کے پاس گڑھے کھُدے ہوئے تھے جن میں گندہ پانی جمع ہو کر سڑا کرتا۔ گلی کوچوں میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا رہتا۔ رات ہوتی تو بستی پر گھرا اندھیرا چھا جاتا۔ روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ راہ گیر رات کے وقت راستوں پر ٹھوکریں کھاتے، کیچڑ پر پھسل کر گر پڑتے۔ قدم قدم پر گندے پانی کے گڑھوں میں گرنے کا خطرہ رہتا۔

ہر چند کہ یہ علاقہ میونسپلٹی کی حدود میں تھا مگر اُس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ فلک پیما کے ایک اجلاس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یہ طے کیا گیا کہ اسکاؤٹ لارکوں کا ایک وفد ڈاکٹر زیدی کی رہنمائی میں میونسپلٹی کے متعلقہ افسروں سے ملے اور اُن کو صورتِ حال سے آگاہ کرے۔

چند روز بعد فلک پیما کا وفد میونسپلٹی کے چیئرمین سے ملا۔ اُس نے اُن کے مطالبات سُن کر بتایا کہ شہر کی مضافاتی بستیوں کے لیے میونسپلٹی نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ بورڈ کے آئندہ اجلاس میں وہ اس منصوبے کو منظور کرانے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے وفد کو یقین دلایا کہ منصوبے کی منظوری ملتے ہی مضافاتی بستیوں کا ترقیاتی کام تیزی سے شروع کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر زیدی نے واپس آکر اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

ہفتہ بھر بعد میونسپل بورڈ کا اجلاس ہوا مگر مضافاتی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اجلاس میں ہنگامہ برپا ہوگیا صورت حال اس قدر نازک ہو گئی کہ سیکریٹری کو ٹیلیفون کرکے پولیس کی امداد حاصل کرنا پڑی۔ چیئرمین کو اجلاس برخاست کرکے میز کے نیچے رُوپوش ہونا پڑا۔

اِس ہنگامہ کی ابتدا اعتراضات سے شروع ہوئی۔ پھر گالی گلوچ ہونے لگی۔ جس نے بڑھ کر ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر لی۔ جُوتے ہوا میں پرندوں کی طرح اُڑنے لگے۔ گریبان چاک اور بال پریشان ہوئے — ہر ممبر قیس عامری کے میک اَپ میں اسٹیج کا ایکٹر نظر آنے لگا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ چند دکانوں کے الاٹمنٹ کا تصفیہ تھا، جو وائس چیئرمین نے اپنے بھائی کے نام الاٹ کرا دی تھیں۔ اس بات پر ایک دوسرے کی عقدہ کشائیاں ہونے لگیں۔ کسی ممبر پر ٹھیکیداروں سے رشوت لینے کا الزام تھا۔ کسی نے گرلز اسکول کی اُستانیوں کی عصمتیں خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے اپنے سُسرالی عزیزوں کو ملازمتیں دلوا کر پورے پورے محکموں کو اپنی سسرال بنا دیا تھا۔ غرض کہ اس حمام میں سب ننگے تھے۔

فلک پیما نے کچھ عرصہ تو چیئرمین کے وعدوں پر اعتماد کرکے انتظار کیا۔ مگر

جب اسکاؤٹ لارکوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مضافاتی بستیوں کے ترقیاتی منصوبے کو تیار ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے ہیں اور آج تک بورڈ کے کسی اجلاس میں اس کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تو فلک ہما کا ایک خاص اجلاس بلایا گیا۔ اس میں اتفاقِ رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ اِس کام کو اسکاؤٹ لارک خود ہی انجام دیں گے۔ چنانچہ ہفتہ صفائی منانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔

صفائی کا ہفتہ بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ اسکاؤٹ لارکوں نے بستی کے بہت سے نوجوانوں کو رضا کاروں کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ مختلف اسکاؤٹ لارکوں کی سرکردگی میں، کئی گروپ بنا کر کام شروع کر دیا گیا۔

ہفتہ بھر کے اندر بستی کا حُلیہ تبدیل ہو گیا۔ بستی بھر میں نالیاں کھود کر بڑے نالے سے ملا دی گئیں۔ گڑھے پاٹ دیئے گئے۔ گلیاں صاف کر کے جگہ جگہ کوڑا رکھنے کے لئے ٹین کے ڈرم رکھ دیئے گئے۔ چار لالٹینیں خرید کر بستی کے مختلف نکڑوں پر لگا دی گئیں، جن کو ہر شام روشن کرنے اور کیروسین آئل سپلائی کرنے کا بندوبست ایک اسکاؤٹ لارک کے سپرد کیا گیا (یہ ڈیوٹی ہر مہینہ بدلتی رہتی) بستی کے قریب جو خالی میدان تھا، اُسے صاف کر کے بچوں کے کھیل کود کے لئے ایک معمولی سے پارک کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جن مکانوں کی دیواریں اور چھتیں شکستہ تھیں، اُن کی سب نے مل کر مرمت کی۔ ہفتہ بھر تک ہر شام حفظانِ صحت کے موضوع پر تقریریں کی گئیں۔

ہفتہ صفائی توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ بستی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا، جیسے الف لیلائی داستانوں کے کسی جن نے راتوں رات پرانی بستی کی غلاظت کھُرچ کر ایک نئی بستی بنا دی تھی۔ اب گلیاں صاف ستھری نظر آتیں۔ رات کو لالٹینوں کی روشنی در و دیوار پہ جھلکتی۔ اسکاؤٹ لارک اپنی اس کامیابی

پر بے حد مسرور رہتے۔ اُن میں کام کرنے کا جذبہ اور تیز ہو گیا تھا۔

(۳)

نیاز جس کام سے کوئٹہ گیا تھا، وہ کام بنا نہیں۔ لہذا وہ جلدی ہی واپس آ گیا۔ ان دنوں اُس کا مزاج چڑچڑا رہتا۔ بات بات پر گالیاں بکتا۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوتی تو باؤلے کتّے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ گھر میں رہتا تو بستر پر گھنٹوں خاموش پڑا رہتا یا پھر دالان میں ٹہلتا رہتا۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ گردن جھکی ہوتی اور دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوتے۔

کوئٹہ سے واپسی کے بعد ہی اُس میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔ حالانکہ جب وہ کوئٹہ جا رہا تھا تو بڑا ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ خلاف معمول وہ اس دفعہ خالی ہاتھ گھر آیا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ سوغاتوں سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئٹہ میں اُس کے ساتھ کوئی سنگین واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک آدھ بار بیوی نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تو اُس نے بڑے روکھے پن سے اُسے جھڑک دیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ رات کا وقت تھا۔ نیاز کچھ ہی دیر قبل دکان سے گھر واپس آیا تھا۔ وہ بستر پر چپ چاپ لیٹا ہُوا چھت کو تک رہا تھا۔ پاس ہی تخت پر بیوی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ اُس روز اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی ہوئی تھی۔ دوپہر کو اُس نے غسل بھی کیا تھا اور اس وقت خوب بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ جسم سے عطر کی تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ وہ پہلو بدلتی تو ریشمی لباس کی سرسراہٹیں اُبھرتیں۔ لیمپ کچھ اس رُخ سے رکھا تھا کہ پوری روشنی اُس کے چہرے پر نہیں پڑ رہی تھی۔ روشنی اور سایوں کے اس امتزاج میں اُس کے رخساروں کی زردی دُھندلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں کے نشانات مٹ گئے تھے۔

کمرے کے اندر انگیٹھی سُلگ رہی تھی۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی دیواروں پر پھیلی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ باہر دسمبر کی سرد راتوں کا مہیب سناٹا چھایا تھا۔ شیشم کے پتے رُک رُک کر کھڑکھڑاتے، اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی۔

بیوی نے اُونی شال کو سینے کے نیچے ڈھلکا کر اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نیاز کا بازو جھنجوڑ کر بولی "کیا سوچ رہے ہو؟"

نیاز نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ بیوی ایک خاص ادا کے ساتھ مسکرائی۔ مگر نیاز اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر بیزاری سے بولا "دیکھو اِس وقت مجھ کو پریشان نہ کرو۔ میری طبیعت خراب ہے۔"

بیوی کے دل پر گہرا چرکا لگا۔ مگر وہ جھیل گئی۔ اِس دفعہ اُس نے اپنا نصف جسم اس کے سینے پر جھکا دیا اور بڑے پیار سے بولی "ناراض ہو مجھ سے؟"

وہ جھنجھلا کر بولا "اُف بھئی حد ہو گئی۔ خدا کے لئے تم مجھ کو اسی طرح پڑا رہنے دو۔"

یہ دوسرا چرکہ تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولی "آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ لاؤ میں تمہارا سر دبا دُوں۔" اُس کے لہجے سے خوشامد جھلک رہی تھی۔ نیاز ذرا بھی نہ پسیجا۔ اُس کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

"جاؤ تم اپنے بستر پر لیٹو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

اُس نے منہ پھیر کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ وہ جل بھُن کر رہ گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ کمرے کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے۔ حبس سے اُس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ اُس نے گہری سانس بھری۔ اور بڑے دُکھ کے ساتھ سوچنے لگی۔ کیا واقعی اب اس میں کوئی دلکشی نہ رہی۔ بیماری نے دیمک کی چاٹ کر اُسے کھوکھلا کر دیا ہے اور اِس کھوکھلے جسم سے نیاز کو ذرا بھی دلچسپی نہ رہی۔ یا پھر وہ واقعی

پریشان تھا۔ وہ بڑی معاملہ فہم عورت تھی۔ ایک شوہر کے ساتھ زندگی کے بارہ سال گزار کر خاصی تجربہ کار ہو گئی تھی۔ پہلا شوہر زندگی بھر اُس کا مرید رہا۔ وُہ اُس کو نت نئے حربوں سے اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر کئے رہی۔ اس کا جی چاہا کر وہ نیاز کو آزما کر دیکھے۔ یہ بڑا خطرناک اقدام تھا۔ لیکن اُس وقت وہ ہر خطرہ مول لینے پر آمادہ تھی۔ اُس نے سلطانہ کو آواز دی۔

"سلطانہ، اے سلطانہ!"

سلطانہ اپنے کمرے سے بولی "جی اماں!" وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔

ماں نے کہا "ذرا یہاں آؤ!"

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دالان میں چاپ سنائی دی۔ سلطانہ آرہی تھی۔

کمرے کے باہر سے اُس کی آواز آئی "اماں!"

"ماں نے کہا "دروازہ کھلا ہے۔ چلی آؤ"

سلطانہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ وہ اس وقت سردی سے تھرتھرا رہی تھی۔ ماں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ پوچھا۔

"کیا ابو سو گیا؟"

"وہ تو سرِ شام ہی سو گیا تھا"

ماں بولی "میرا دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا تم سے کچھ باتیں کروں۔ شاید دل بہل جائے۔"

سلطانہ نے گردن گھما کر نیاز کی جانب دیکھا جو خاموش پڑا تھا۔ ماں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ چند ہی لمحوں بعد نیاز کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ اُٹھا کر اپنی کمر کھجانے لگا۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہیں۔

انگیٹھی میں ابھی تک انگارے دہک رہے تھے۔ گہری سُرخ روشنی میں سلطانہ کے چہرے کی دلکشی نکھر گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شبنم کے قطرے جھلک رہے تھے۔ تر و تازہ رُخساروں پر برسات کی سُہانی شاموں کی شفق پھیل گئی تھی۔

نیاز نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں مَلتے ہوئے بیوی سے پوچھنے لگا۔ "ارے یہ سلطانہ کب آئی ؟"

وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔

بیوی نے جواب دیا۔ "ذرا ہی دیر پہلے آئی ہے۔"

"اس سردی میں اس کو باہر نکلنے کی کیا سُوجھی ؟"

سلطانہ سر جھکا کر پان لگانے لگی۔ وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اُس نے جب بھی نیاز کی جانب دیکھا، اُسے نیاز کی آنکھوں میں شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی سی تیز چمک نظر آتی۔ وہ نامعلوم خوف سے تھرّا کر رہ جاتی۔

بیوی نے نیاز سے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے ؟"

کہنے لگا۔ "کل ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ آج کل طبیعت کچھ گڑبڑ ہی رہتی ہے۔"

"میں تم سے خود یہی کہنے والی تھی۔ کل یاد کر کے ڈاکٹر کے پاس چلے جانا۔"

"فرصت مل گئی تو ضرور جاؤں گا۔"

وہ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "فرصت تو تم کو کبھی نہیں ملے گی۔ تم نے اپنی جان کے ساتھ جھگڑے ہی اتنے لگا رکھے ہیں۔ مگر کچھ اپنا بھی تو خیال رکھو۔ واہ بھئی اچھی مصروفیت ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے تک کا وقت نہیں نکل سکتا۔"

نیاز اُس کی باتوں پر بے پرواہی سے ہنسنے لگا۔

دونوں کو باتوں میں مصرُوف دیکھ کر سلطانہ اُٹھ کر جانے لگی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ کہنے لگی۔ "ابھی کون سی زیادہ رات ہوئی ہے۔"

سلطانہ بولی۔ "نیند آرہی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "تیری آنکھوں میں تو چراغ جلتے ہی نیند آجاتی ہے۔ بیٹھ، چلی جانا۔"

دراصل وہ چاہتی تھی کہ سلطانہ ابھی نہ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ کے جاتے ہی نیاز کروٹ بدل کر منہ پھیر لے گا۔ نیاز کی یہ بیزاری اُس کے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس کی ذات میں نیاز کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اپنی دل کشی اور بچی کھچی جوانی تک کھو چکی ہے۔ وہ بوڑھی اور بدصورت ہو چکی ہے۔ یہ احساس اُس کے سینے میں نشتر بن کر چبھ گیا۔ یہ ایسا دُکھ تھا جس کو برداشت کرنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔

ماں کے مجبور کرنے پر سلطانہ کو بیٹھنا ہی پڑا۔

انگیٹھی میں انگارے دہکتے رہے۔ سلطانہ کے چہرے پر شفق پھوٹتی رہی۔ اُس کے حسن کا جادو جاگتا رہا۔ باہر ہوا سردی سے بلبلاتی رہی۔ کہر آلود رات چپ چاپ کھڑی تھی۔

اچانک کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر موٹو آیا تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں نے شال کو اچھی طرح اپنے جسم کے چاروں طرف لپیٹا۔ اور دیوار کی جانب منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ نیاز اُٹھ کر باہر گیا اور ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لایا۔ وہ اس وقت سیاہ اوورکوٹ پہنے تھا اور بڑا لحیم شحیم نظر آرہا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر نے کہا۔ "معاف کرنا نیاز! میں ایک کیس دیکھنے چلا گیا تھا۔ سیدھا وہیں سے آرہا ہوں۔"

نیاز کہنے لگا۔ "انجکشن کل بھی لگ سکتا تھا۔ آپ نے اس جاڑے پالے میں خواہ مخواہ تکلیف اُٹھائی۔"

ڈاکٹر مسکرا کر بولا "ارے بھئی ہمیں کہاں آرام نصیب۔ اپنا کام ہی ایسا ٹھہرا"
یہ کہہ کر وہ دیوار کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیاز سے کہنے لگا۔

"کمرہ تو خوب گرم ہے۔" اس وقت وہ بڑا بشاشں نظر آرہا تھا۔ بات یہ تھی کہ سہ پہر ہی کو نیاز نے اُسے ایک ہزار روپے کی دوسری قسط دی تھی۔

سلطانہ کی ماں خاموش بیٹھی ڈاکٹر کی باتیں سنتی رہی۔ ڈاکٹر نے ذرا ہی دیر بعد اپنے چرمی بیگ کے اندر سے سرنج نکالی اور انجکشن لگانے کے واسطے اُس میں دوا بھرنے لگا۔ نیاز خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر کی پشت اُس کی جانب تھی۔ سامنے دیوار پر ڈاکٹر کا سایہ بڑا ہیبت ناک نظر آرہا تھا۔

وہ دوا سے بھری ہوئی سرنج لے کر مریضہ کے پاس گیا۔ مسکرا کر پوچھا۔

"کہئے طبیعت اب کیسی ہے؟"

وہ بولی۔ "آج تو ذرا بہتر ہے"

ڈاکٹر تسلی دینے کے سے انداز میں بولا "اب آپ کی طبیعت انشا اللہ ٹھیک ہو جائے گی" اس نے سرنج والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ کہنے لگا۔

"ہاتھ ادھر کیجئے، میں انجکشن لگا دوں"

وہ دبی زبان سے بولی "ڈاکٹر صاحب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی"

پہلی بار اُس نے انجکشن لگوانے سے اِنکار کیا تھا۔ ڈاکٹر اور نیاز دونوں چونک پڑے۔ ڈاکٹر بے نیازی سے ہنس کر بولا "کیوں خیریت تو ہے۔ یہ آج آپ کو کیا سوجھی؟"

"نہ جانے کیوں انجکشن لگوانے سے میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے"

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا، جو دیوار کی جانب منہ موڑے بیٹھی تھی۔ وہ اُس سے کہنے لگا "آپ کو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ کہیں انجکشن سے طبیعت خراب ہوتی ہے" اُس نے ہلکا قہقہہ لگایا "لائیے ہاتھ اِدھر کیجئے۔

گھبرائیے نہیں۔ اب زیادہ انجکشن نہیں لگاؤں گا۔"

مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اُس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب اب میں انجکشن نہیں لگواؤں گی۔"

نیاز کو اُس کی باتوں پر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔ "خواہ مخواہ کی باتیں مت کرو، چلو انجکشن لگواؤ۔"

"میں نے کہہ دیا کہ اب میں کوئی علاج نہیں کرواؤں گی۔"

نیاز نے غصہ سے آنکھیں نکالیں۔ مگر ڈاکٹر نے اُس کو اشارہ سے منع کر دیا اور بڑی نرمی سے بولا۔ "دیکھئے انجکشن ناغہ ہو گیا تو یہ آپ کے مرض کے واسطے بہت بُرا ہو گا۔ میں تو اتنی رات گئے سردی میں آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں، اور آپ ہیں کہ انجکشن لگوانے سے انکار کر رہی ہیں۔ یہ تو ٹھیک بات نہیں۔" وہ ابھی تک غیر سنجیدہ تھا۔ مُسکرا مُسکرا کر بات کرتا تھا۔

مگر جب وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئی تو ڈاکٹر کے چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ اِس میں دبے دبے خوف کا احساس بھی شامل تھا۔ اب اصرار کرنا فضول تھا۔ اُس نے سرنج خالی کر کے چرمی بیگ کے اندر رکھی اور نیاز سے کہنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے اب یہ گھبرا گئی ہیں۔ بھئی ان کو کچھ روز کی چھٹی ملنی چاہیئے۔" اِس دفعہ اُس نے مریضہ کو مخاطب کیا۔

"لیجئے اب تو آپ خوش ہو جائیے۔"

وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ کمرے کے باہر چلا گیا۔ نیاز بھی اُس کے ہمراہ چلا گیا۔

دونوں خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی آہٹ سُنسان رات میں پُراسرار معلوم ہو رہی

تھی۔ گھر سے کچھ دُور آگے بڑھ کر ڈاکٹر نے نیاز کہا۔

"دیکھو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک خاص اسٹیج پر پہنچنے کے بعد مریض کا مزاج ایسا ہی ضدّی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔"

نیاز کہنے لگا۔ "مگر ڈاکٹر صاحب! یہ تو اُس نے بڑی خراب حرکت کی ہے۔"

ڈاکٹر بولا۔ "تم اس بات کا کچھ خیال نہ کرو۔ مریضہ کو کچھ وہم ہو گیا ہے۔ یہ عورتیں تو شکّی مزاج ہوتی ہی ہیں۔ اس شک کو تم ہی دُور کر سکتے ہو۔ دیکھو زبردستی نہ کرنا، ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"کہیں اُسے کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا؟"

ڈاکٹر کے دل میں بھی چور تھا، مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نیاز کی بات سُن کر اُس کے بدن میں خفیف سی لرزش ہوئی۔ آہستہ سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اُس کی آواز میں دبی دبی تھرتھراہٹ تھی۔

نیاز کہنے لگا۔ "پچھلے دنوں میں کوئٹہ گیا تھا۔ کہیں میری غیر موجودگی میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہ چلی گئی ہو۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

"یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ انجکشن لگوانے سے آج اُس نے پہلی بار انکار کیا ہے۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سوچتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ گلی میں چلتے رہے۔ کہر کے دُھندلکے میں لپٹے ہوئے وہ سنسان رات میں بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر سناٹے میں ڈاکٹر کی آواز اُبھری۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہئیے۔ جب تک کوئی

بہت ہی ہوشیار ڈاکٹر نہ ہو، اُسے شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ بہر حال تم اس بات کی نگہداشت رکھو کہ وہ اسپتال نہ جائے اور نہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرے۔ احتیاط کرنا ہر حال میں ضروری ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے گلی کے نکڑ پر پہنچ گئے۔ سامنے سڑک پر ڈاکٹر کی کار کھڑی تھی۔ دونوں اُس کے قریب پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے نیاز سے مصافحہ کیا اور کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ نیاز واپس گلی میں چلا گیا۔ وہ تھکے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بیوی کے انکار نے اُس کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ اس پریشانی میں خوف اور غصّہ کا امتزاج تھا۔

وہ جھنجلایا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مگر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ نیاز تھکا ہوا سا جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ذرا دیر تک وہ خاموش پڑا رہا۔ مگر اُس کو چین نہ آیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیوی سے کہنے لگا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

وہ آہستہ سے بولی۔ "کیا؟" اُس نے جان بوجھ کر تغافل برتا۔ اس بے نیازی پر نیاز کو اور تاؤ آیا۔ بگڑ کر بولا۔

"تمہارا سر۔"

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "تمہارا تو لڑنے کو دل چاہ رہا ہے۔ کئی روز سے تم پر بھوت سوار ہے۔"

اُس نے شال سنبھالی۔ تخت سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ نیاز اس وقت غصّہ میں بھرا بیٹھا تھا۔ لہٰذا وہ اُس سے اُلجھنا نہ چاہتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اب اسی میں خیریت ہے کہ وہ بستر پر جا کر لیٹ جائے۔

نیاز لمحہ بھر تو اُسے گھورتا رہا، پھر بگڑ کر بولا۔ "میں کہتا ہوں، تم نے آج

انجکشن کیوں نہیں لگوایا؟"

وہ بولی "انجکشن لگوانے سے مجھے ہول ہوتا ہے۔"

"اور میں جو اتنا پیسہ علاج پر برباد کر چکا ہوں"

"تو اب مت برباد کرو۔"

نیاز زچ ہو کر بولا "انجکشنوں کا پورا کورس تو تم کو لینا ہی پڑے گا۔ میں اس کی پیشگی رقم دے چکا ہوں۔"

وہ تنک کر بولی "واہ یہ بھی اچھی رہی۔ چاہے میں اُن کو لگوا کر مر ہی کیوں نہ جاؤں۔ مگر تمہاری رقم وصول ہو جائے۔"

"میں کہتا ہوں کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو" اس دفعہ نیاز کا لہجہ کسی قدر مدھم تھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز سے بولی "خدا کے لئے مجھ کو میرے حال پہ چھوڑ دو۔ میں کوئی علاج ولاج نہیں کروں گی۔ خدا کی ذات میں بڑی قوت ہے۔ زندگی ہے تو یوں ہی اچھی ہو جاؤں گی" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز گلو گیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

نیاز کو اُس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا "عجیب اُلّو کی پٹھی عورت سے سابقہ پڑا ہے۔"

نیاز نے پہلی بار اُس کو گالی دی تھی۔ اُس کے آگ ہی تو لگ گئی چیخ کر بولی "دیکھو زبان سنبھال کر بات کرو۔ مرنے والا مر گیا۔ وہ اپنی جگہ، میں اپنی جگہ، کبھی گالی دینا تو درکنار، مجھ سے تُو کر کے بھی بات نہیں کی" یہ سلطانہ کے باپ کا ذکر تھا، اور اُس کے ذکر سے نیاز ہمیشہ جھنجھلاتا تھا۔ اس وقت تو وہ یوں بھی جلا ہُوا تھا۔ کہنے لگا۔

"اُسی سالے بھڑوے نے تمہارا مزاج خراب کیا ہے۔"

"مرے ہوئے کو گالی دیتے تم کو شرم نہیں آتی۔"

نیاز زور سے چیخا۔" بس زبان بند کر۔ جتنا منع کرو اسی قدر حرامزادی سر پر چڑھے چلی جارہی ہے۔ تیری تو۔" اُس نے ایک گندی سی گالی دی اور لپک کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

" اچھا تو اب تم مجھ پر ہاتھ بھی اُٹھاؤ گے۔"

نیاز نے کئی گالیاں دیں۔ اور اُس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا، پھر دوسرا، تیسرا۔ اُس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی مار کھاتی رہی۔ نیاز نے اُس کی کمر پر کئی لاتیں ماریں۔

شور سُن کر سلطانہ ننگے پیر بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا، ماں زمین پر اوندھے منہ پڑی تھی اور نیاز اُس کے قریب کھڑا خچر کی مانند زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ سلطانہ نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ جلدی سے جاکر ماں کو فرش پر سے اُٹھایا۔ اُس کے بال خاک میں اَٹے ہوئے تھے۔ چہرہ مُردے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ نچلے ہونٹ سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ لیمپ کی میلی میلی زرد روشنی میں وہ بڑی ڈراؤنی نظر آرہی تھی۔

نیاز نے اُس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا کوٹ اُتار کر پہنا۔ گلے میں مفلر لپیٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے باہر چلا گیا۔ سلطانہ نے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا، مگر وہ اُس سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس نے آنگن میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ سُنی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

سلطانہ نے ماں کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رُک رُک کر سانس لے رہی تھی۔ جسم درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح

جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ سلطانہ نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر رونے لگی۔

ماں کئی منٹ تک بے ہوش پڑی رہی۔ سلطانہ اُس کے قریب بیٹھی آہستہ آہستہ روتی رہی۔ آخر ماں نے آنکھیں کھول کر اُس کو دیکھا۔ بڑی نحیف آواز سے بولی "سلطانہ!"

سلطانہ نے جلدی جلدی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ دریافت کیا "اب کیسی طبیعت ہے امّاں؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی گہری سانس بھری۔ پھر اُس نے بڑے دُکھ سے کہا "رو کیوں رہی ہے میری بچی! میری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا" سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی کے ساتھ اُس کے سینہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

(۴)

نیاز نے ساری رات دکان میں جاگ کر گزاری کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ اُس کے پاس اوڑھنے بچھانے کو کچھ نہیں تھا۔ دکان میں ایک پُرانا فوجی اوورکوٹ پڑا تھا، جس کو اُس نے ٹانگوں پر ڈال لیا، مگر جوں جوں رات ڈھلتی گئی، سردی شدّت اختیار کرتی گئی۔ اِس سردی سے اُس کا حُلیہ بیرنگ ہو گیا۔ وہ تمام رات جاگتا رہا۔ بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔

دوسرے دن بھی وہ گھر نہیں گیا۔

تیسرے روز شام کے وقت الّو دکان پر آیا۔ اُسے دیکھ کر نیاز نے دل میں دبی دبی مسرّت محسوس کی۔ اِن تین دنوں میں اُس کی جو اہمیت گھٹ گئی تھی اور جسے سوچ سوچ کر اُسے بیوی پر رہ رہ کے تاؤ آ رہا تھا، اب بحال ہو چکی تھی۔

اس نے بڑے رُوکھے پن سے پوچھا۔

"کیسے آیا یہاں ؟"

اَنّو خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "امّاں نے بُلایا ہے۔"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ اب حرامزادی کو پتہ چلا۔ ابھی کیا ہے۔ چند روز بعد سالی خود بھاگی ہوئی آئے گی۔ یہی سوچ کر اُس نے انّو کو گھُور کر دیکھا۔ ناراضگی سے بولا۔

"اپنی امّاں سے کہہ دینا کہ اُس گھر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔"

اَنّو نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف تھا اور چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ نیاز نے اُسے خاموش دیکھ کر زور سے ڈانٹا "ابے اب میرے سر پر کیوں کھڑا ہے۔ جا کے کہہ دینا اُس حرامزادی سے کہ میں اب کبھی اس گھر پر پیشاب بھی نہیں کروں گا۔" لمحہ بھر کے لیئے وہ رُکا اور بڑے بے ہنگم طریقے پر چلّایا۔

"ابے اب جا رہا ہے یہاں سے یا کچھ لے کے جائے گا۔"

وہ گالیاں دیتا ہوا انّو پر جھپٹا۔ اور وہ سہما ہوا چُپ چاپ دکان سے باہر چلا گیا۔

انّو کے جانے کے بعد نیاز گردن اُونچی کر کے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ اب بیوی خود منانے آئے گی۔ اسی خیال سے وہ دکان سے نکل کر کہیں گیا بھی نہیں۔ بے چینی سے بیٹھا بیوی کا انتظار کرتا رہا۔ رات دبے دبے قدموں آ کر کوچہ و بازار پر چھا گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔

جب پہر رات گزر گئی۔ اور راستوں پر سناٹا چھا گیا تو اس کا انتظار

شدید ہوگیا۔ مگر بیوی تو آئی نہیں۔ البتہ ڈاکٹر موٹو کا کمپاؤنڈر آگیا۔ ڈاکٹر نے اُس کو بُلوایا تھا۔ نیاز کی طبیعت پریشان تھی، لہذا اُس نے کمپاؤنڈر کو ٹالنا چاہا۔ مگر وہ گیا نہیں۔ کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے اُن کو اپنے ساتھ لانا۔ بڑا ارجنٹ کام ہے۔"

نیاز نے زیادہ حیل وحجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے اُس کے ہمراہ چلا گیا۔ ڈاکٹر اس وقت تنہا بیٹھا تھا۔ نیاز کے پہنچتے ہی اُٹھ کر کنسلٹیشن روم میں چلا گیا۔ نیاز کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ یہ مختصر سا کمرہ تھا۔ اُس کی چھت بھی نیچی تھی۔ اندر دُھندلا سا ایک بلب روشن تھا۔ پھیکی پھیکی روشنی میں دونوں بڑے پُراسرار نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر ذرا خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"میں کئی روز سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

نیاز نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ رضامند نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر کا چوڑا چکلا چہرہ لمحہ بھر کے لئے پریشان ہوگیا۔ "یہ تم نے بہت بری خبر سُنائی۔ بھئی کسی طرح اُس کو مناؤ۔"

"وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں۔ اِسی بات پر میرا اُس سے جھگڑا بھی ہوگیا۔ میں تو تین روز سے گھر بھی نہیں گیا۔"

ڈاکٹر اور پریشان ہوگیا۔ اُس نے کسی قدر ناراض ہوکر کہا۔ "میں نے تم کو منع بھی کیا تھا۔ پھر بھی تم باز نہ آئے۔ یہ تو تم نے بڑی غیر دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ اُس کو نہیں جانتے۔ وہ بڑی ضدّی عورت ہے۔"

"اِس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ تم کبھی نہ کسی طرح اُسے منانے کی کوشش

کرد۔ یہ بہت قیمتی وقت ہے۔ اس کو ضائع نہیں ہونا چاہیئے" ڈاکٹر نے نیاز کو نظر بھر کر دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "تم ابھی گھر جاؤ اور پری کوشیشہ میں اُتارنے کی کوشش کرو" اُس کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا "تم بھی کیسے مرد ہو، ایک عورت تمہارے قابو میں نہیں آتی"

نیاز روٹھے ہوئے بچے کی طرح مُنہ پھلا کر بولا "لیکن ڈاکٹر صاحب میں اب اُس کے پاس جاؤں گا نہیں"

ڈاکٹر نے بگڑ کر کہا "نہ جاؤ بھئی۔ میری ایک ہزار کی تیسری قسط دیدو۔ اور جا کر موج کرو"

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب بات یہ ہے۔۔۔"

ڈاکٹر نے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "بات وات سے کام نہیں چلے گا۔ انجکشن زبردستی نہیں لگایا جا سکتا۔ اِس کے لئے تو مریضہ کو رضامند کرنا ہی پڑے گا۔ اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو علاج بند کر دو۔ اور اگر کہیں تم اِس خیال میں ہو کہ اتنے ہی انجکشنوں سے اُس کا کام تمام ہو جائے گا تو یہ تمہارا مغالطہ ہے۔ اُس میں زبردست قوتِ مدافعت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک قبرستان میں ایک عدد قبر الاٹ کرا چکی ہوتی"

نیاز کے لئے اب انکار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً اُس کو کہنا پڑا "اچھی بات ہے۔ جیسا آپ کہہ رہے ہیں، وُہی کروں گا۔ مگر اب آپ یہ جھنجھٹ جلد ہی صاف کر دیجئے"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک اُبھر آئی۔ مُسکرا کر بولا "تم یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ جاڑا ختم ہونے سے پہلے، میں اس کو ٹھکانے لگا دوں گا"

اُس کی آنکھوں کی چمک اور خونخوار ہو گئی۔ جھکی ہوئی چھت والے اس

تنگ کمرے میں ڈاکٹر موٹو اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ ڈریکیولا کی مانند ڈراؤنا نظر آرہا تھا۔

نیاز ڈاکٹر کے مطب سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ مگر دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ نیاز چُپ چاپ بستر پر بیٹھ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ بیوی سے کس طرح بات چھیڑی جائے۔ وہ نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی۔ لیمپ کی پیلی پیلی روشنی میں اُس کے چہرے کا نصف حصّہ نظر آرہا تھا۔ جس کی زردی سے اُس کے رخساروں پر ایک روغنی چمک جھلک رہی تھی۔

نیاز کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی نے اُس کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اُس کی یہ حرکت نیاز کو بہت شاق گزری۔ وہ جھنجھلا کر اُٹھا اور اپنا ٹرنک کھول کر اُس میں سامان رکھنے لگا۔ اُس نے کھونٹیوں پر سے کپڑے اُتارے، پلنگ کے نیچے سے جُوتے اور چپلیں نکالیں۔ اُن کو پُرانے اخبار میں لپیٹا، الماریوں سے کاغذات اور ضرورت کی دوسری اشیاء نکالیں اور ہر چیز سنبھال سنبھال کر ٹرنک میں رکھنے لگا۔

وہ چُپ بیٹھی اُس کی ہر حرکت دیکھتی رہی۔ کئی بار اُس کا جی بھی چاہا کہ اُس سے ٹوک کے پُوچھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اُسے نیاز سے بات کرتے ہوئے جھجک معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے وہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ نیاز اس طرح اپنا سامان اُٹھا کر گھر سے نہ جائے۔

بات یہ تھی کہ بیماری نے اُس کو اپاہج کر کے ڈال دیا تھا۔ اب وہ گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھی۔ نیاز کے جانے کے بعد گھر کا دھندا کس طرح چلے گا، سارے اخراجات کس طرح پُورے ہوں گے۔ یہ احساس بڑا ڈراؤنا تھا۔

وہ اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اچانک نیاز نے اُس کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔" میرا دھوپ کا چشمہ کہاں ہے؟"

بیوی نے گردن گھما کر دیکھا۔ نیاز کھلے ٹرنک پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی پیٹھ بیوی کی جانب تھی۔

وہ بولی۔" یہ اس وقت دھوپ کے چشمے کی کونسی ضرورت پڑ گئی؟" اُس کے لہجے میں مصالحت کا انداز تھا۔ نیاز کو شاید بیوی سے اس رویہ کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے فوراً پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

" تمہیں معلوم ہو تو بتا دو۔"

وہ اُس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔" یہ اتنی رات گئے تم سارا سامان کیوں اُلٹ پُلٹ رہے ہو؟"

اِس دفعہ اُس نے بیوی کی جانب نہیں دیکھا۔ پژمردہ لہجے میں بولا۔" اب میں یہاں سے اپنا منہ کالا کرکے جا رہا ہوں۔ تم اپنی من مانی کرنا۔ کوئی تم کو ستانے والا نہیں ہوگا۔" صاف لفظوں میں اب وہ گلہ کرنے لگا تھا۔

وہ کہنے لگی۔" تھوڑے دن اور صبر کر لو۔ نہ میں اِس دُنیا میں رہوں گی۔ نہ تم کو اس طرح گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔"

اِس کے بعد شکوہ شکایت کا دفتر کُھل گیا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔" قسم اللہ کی، تم نے میرا سارا پروگرام ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ تمہیں کیا پتہ کہ میں کیا کیا سوچ رہا تھا۔"

" کبھی تم نے مجھ سے کچھ بتایا بھی۔ اِس قابل ہی نہیں سمجھتے۔"

" نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے تم اچھی ہو جاؤ تو کچھ بات کروں۔ اب بات آ ہی گئی ہے تو لو سُن لو۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطانہ کسی طرح

اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ میں سب سے پہلے اِس فرض سے ادا ہونا چاہتا ہوں۔"
وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ اُس کی بیوی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے سلطانہ کا بیاہ کر دے۔ اِس وقت وہ اُس کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ نیاز کا اندازہ غلط نہ نکلا۔ بیوی یہ بات سُنتے ہی چونک پڑی۔ پہلے اُس کے چہرے پر استعجاب ہویدا ہُوا، پھر کسی دبی ہوئی مسرت سے اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ جلدی سے بولی۔" تم نے کوئی لڑکا دیکھا ہے ؟"

وہ سوچنے لگی، کیا واقعی نیاز کو سلطانہ کے بیاہ کی اِس قدر فکر ہے، یا وہ محض اُس کو خوش کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہے ؟ نیاز کے متعلق اُس کے دل میں جو شبہات تھے، وہ رفتہ رفتہ مٹنے لگے تھے۔

نیاز نے کہا۔" لڑکا میں نے دیکھ لیا ہے۔ نہر کے محکمہ میں مُلازم ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ہے۔ لیکن اُوپر سے آمدنی اچھی ہو جاتی ہے۔ میٹرک تک انگریزی پڑھا ہے۔ اب پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ میرے پُرانے ملنے والے ہیں۔ ہزاروں روپے کا سامان مجھ سے لے چکے ہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے جھوٹ بولتا چلا گیا۔

اُس کی باتیں سُن کر بیوی کو کسی قدر پشیمانی ہوئی کہ وہ اب تک نیاز کی نیت پر کیوں شک کرتی رہی۔ ویسے وہ خاصی ہوشیار عورت تھی مگر تھی تو گھر کی بیٹھنے والی، سادگی میں مار کھا گئی۔

اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔" تم نے کبھی اِس بات کا اشارہ تک نہیں کیا۔"

" پہلے تم اچھی تو ہو جاؤ۔ میں کل ہی رشتہ طے کئے لیتا ہوں۔ تم میں انتظام کرنے کی ہمت ہے۔ روز تو تم کو دَورہ پڑتا ہے۔ اب میں بیٹھ کر جہیز تیار

کرنے سے رہا۔"

اِس کے بعد نیاز نے اِس سلسلہ کی اور بہت سی تفصیلات بتائیں۔ وہ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر ایک ایک تفصیل پوچھتی رہی۔ پھر تو باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ نیاز اُس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کے بالوں سے کھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر موٹو انجکشن لگانے آیا۔ باوجودیکہ نیاز گھر پر موجود نہیں تھا، مگر بیوی نے بغیر کسی مزاحمت کے ڈاکٹر کو انجکشن لگانے کی اجازت دے دی۔ وہ اب کسی طور نیاز کو ناراض ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ وہ اِن دنوں صرف سلطانہ کے بیاہ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی زردی مٹنے لگی تھی اور اُس پہ صحت مندی کے نشانات اُبھر رہے تھے۔ اب وہ ہر وقت بشّاش رہتی۔ بات بات پہ ہنس پڑتی۔ بڑی تندہی سے نیاز کی دیکھ بھال کرتی۔

لیکن دوسرا انجکشن لگنے کے چند ہی گھنٹے بعد پھر دورہ پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ دھوپ میں بیٹھی سلطانہ کے جہیز کا جوڑا کاٹ رہی تھی۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ شیشم کے درخت پہ ایک کوّا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ سلطانہ غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ پانی گرنے کی آواز رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ فضا میں سرگرمی اور ہلچل تھی۔

دفعتاً اس نے اپنے سینہ میں ہلچل محسوس کی۔ اُس کے پہلو میں زور کی ٹیس اُٹھی۔ اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ بے حال ہو کر فرش پر گر گئی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ غسل خانے سے باہر نکلی۔ اُس نے دیکھا، ماں زخمی پرندے کی طرح زمین پر لوٹ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی

کی پُتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ گھبرا کر اُس کے پاس گئی۔ جسم چھُو کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر سلطانہ بدحواس ہو گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اُسی وقت اَنّو آ گیا۔ سلطانہ نے فوراً اُسے ڈاکٹر موٹو کے پاس دَوڑایا۔ کہ اُسے بُلا لائے۔ وہ بے چینی سے ڈاکٹر کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا ہی دیر بعد انّو نے واپس آ کر بتایا کہ ڈاکٹر گھر پر موجود تھا، مگر آیا نہیں کہنے لگا میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ سلطانہ کو ڈاکٹر پر بہت غصّہ آیا۔ ماں کی طبیعت اُس وقت تک ذرا سنبھل چکی تھی۔ وہ اب آنکھیں بند کئے بے سُدھ پڑی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے آہستہ آہستہ کراہتی اور سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیتی۔

سہ پہر تک مریضہ کی حالت اِس قابل ہو گئی تھی کہ وہ آنگن سے اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ لیکن ابھی وہ اس قابل نہ ہوئی تھی کہ بات چیت کر سکے۔ کئی بار اُس نے بات کرنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر سینے کی ٹیسوں نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اِسی عالم میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ شام تک پڑی سوتی رہی۔

رات کو اُس کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی۔ اُس نے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ پیا، اور تکیے سے پیٹھ ٹکا کر اُونچی ہو کر بیٹھ گئی۔ سلطانہ اُس کا سر دبانے لگی۔ رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ سردیوں کی کہر آلود رات تھی۔ سرِ شام ہی سنّاٹا پڑ گیا تھا۔ نیاز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ سلطانہ دیر تک بیٹھی ماں کا سر دباتی رہی اور آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی رہی۔ بہت دیر بعد جب ماں کی آنکھ لگ گئی تو سلطانہ خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے نیاز گھر میں آیا۔ اس وقت وہ بہت تھکا ہوُا نظر آ رہا تھا۔ بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ نیاز نے نظر بھر کر اُس کو دیکھا۔

مگر جگانے کی کوشش نہ کی، چُپ چاپ کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر لیٹ گیا۔

(۵)

سلطانہ کی ماں کو اب ہر دوسرے، تیسرے دن دَورہ پڑنے لگا تھا۔ ڈاکٹر موٹو ان دَوروں کو رفع کرنے کی آڑ میں انجکشن پر انجکشن لگاتا رہا۔ وہ عام طور پر رات گئے آتا۔ اور آتے ہی مریضہ کا حال پوچھتا۔ اُس کو تسلی دیتا اور سرنج میں دوا بھر کر انجکشن لگاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا بیگ لٹکائے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتا۔ سنسان گلی میں اُس کے قدموں کی آواز دُور تک سنائی پڑتی۔

ایک روز سویرے ہی سویرے سلطانہ کی ماں کے سینے میں درد اُٹھا۔ وہ بے حال ہو کر فرش پر گر پڑی۔ دن بھر میں کئی بار اُس پر غشی کا دَورہ پڑا۔ اِن دنوں نیاز کسی کام کے سلسلہ میں کراچی گیا ہُوا تھا۔ سلطانہ نے ماں کی حالت بگڑتے دیکھی تو فوراً ڈاکٹر موٹو کو بلوایا۔ وہ آتو گیا مگر کوئی دوا نہیں دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ طبیعت خود بخود سنبھل جائے گی۔

شام کو سخت دَورہ پڑا۔ آنکھیں پھر گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ بتیسی بیٹھ گئی۔ سلطانہ نے اُس کا یہ حال دیکھا تو رو رو آنکھیں سُجا لیں۔ صبح سے اُس کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی تھی۔ دن بھر کا فاقہ اور یہ پہاڑ سا غم، اُس کا چہرہ کُملا گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے پاگلوں کی طرح گھر میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔

پھر اُسے خود ہی خیال آیا۔ جلدی سے اُٹھ کر وضو کیا۔ جزدان سے قرآن شریف نکالا۔ اور ماں کے سرہانے بیٹھ کر سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے لگی۔

کمرے کے اندر لیمپ روشن تھا۔ اُس کی زرد زرد روشنی میں ماں بستر پر آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی

تھی۔ قریب ہی کرسی پر انو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بار بار سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھتا جو دھندلی روشنی میں لاش کی طرح بے جان نظر آ رہی تھی۔

کمرے کے آسیب زدہ سکوت میں سلطانہ کی آواز آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔ کوئی بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیمپ بھڑک کر بجھ جائے گا۔ کمرے کے اندر قبر کی سی تاریکی چھا جائے گی۔ دروازہ آہستہ سے کھُلے گا اور موت کا فرشتہ آجائے گا۔

سلطانہ نے سورۂ یٰسین پڑھتے پڑھتے محسوس کیا کہ باہر آنگن میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ چاپ رُک رُک کر اُبھر رہی تھی۔ سلطانہ کی آواز بے ہنگم ہو گئی۔ اُس نے خوف زدہ نظروں سے دروازہ کی جانب دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا کوئی کواڑ سے لگا اندھیرے میں کھڑا تھا۔

اچانک اُس کی آواز گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ رُک گئی۔ کمرے کے اندر ہولناک خاموشی چھا گئی۔ انو ڈر کر سلطانہ کو گھورنے لگا، جو سہمی ہوئی پتھر کے مجسمہ کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔

اُسی وقت ماں نے کروٹ بدلی۔ پلنگ آہستہ سے چرچرایا۔ ساتھ ہی ماں کی نحیف آواز اُبھری۔

"سلطانہ!"

سلطانہ نے جلدی سے گردن گھُما کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے دیوار کو تک رہی تھی۔ سلطانہ فوراً تخت سے اُتر کر ماں کے پاس پہنچی۔ سرہانے بیٹھ کر اُس کا سر دبانے لگی۔ رات کے آٹھ بجے تک ماں کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ وہ اب آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ سلطانہ اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ماں کے چہرے سے مُردنی مٹ چکی تھی۔ اب وہ کسی قدر ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

ماں نے باتیں کرتے کرتے ایک بار سلطانہ کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور لمحہ بھر تک بغور اُس کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے گہری سانس بھری اور دتّو سے کہنے لگی۔

"بیٹا! ذرا جاکر آپا کنیز کو بُلا لا۔ کہنا امّاں نے بُلایا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔ اپنے ساتھ ہی اُن کو لے کر آنا۔"

اتّو سعادت مند بچے کی طرح اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ سوچنے لگی کہ یہ اس وقت امّاں نے خالہ کنیز کو کیوں بُلایا ہے۔ وہ ہمیشہ اُن کے نام سے چڑتی تھیں۔ اچانک ان پر اتنی مہربان کیوں ہو گئیں۔

تھوڑی دیر بعد اتّو ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کا جسم بھدّا تھا۔ داہنے گال پر سیاہ مسّا تھا، جو بھونرے کی طرح چہرے پر بیٹھا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ دہانہ چوڑا تھا اور کلّے میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سلطانہ کی ماں کو نظر بھر کر دیکھا، اور کہنے لگی۔

"اے اب کیسی طبیعت ہے؟"

سلطانہ کی ماں نے جواب دیا۔ "بس اچھی ہی ہے۔ زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔"

وہ جھٹ بولی۔ "اے ہے، کیا اُول فُول بک رہی ہو۔ نہ وقت دیکھتی ہو نہ گھڑی، جو منہ میں آیا بھڑ سے کہہ دیا۔ دشمنوں کے منہ میں خاک۔ تم کیوں زندگی کے دن کاٹنے لگیں۔ اللہ میاں تم کو اپنے بچّوں کے سہروں کی بہار دیکھنا نصیب کرے۔ اے بیماری ہی تو ہے۔ کون نہیں بیمار پڑتا۔ اچھی ہو جاؤ گی۔ دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔" وہ روانی سے بولتی چلی گئی۔

سلطانہ نے سوچا۔ یہ تو بڑی باتونی عورت ہے، گھنٹوں پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ پان چباتی جائے گی اور ہاتھ مٹکا مٹکا کر بولتی رہے گی۔ اُسے بھوک

بھی شدّت سے لگ رہی تھی ۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماں تکیہ سے کمر ٹکائے ۔ آپا کنیز سے باتیں کرتی رہی ۔

سلطانہ کی ماں نے باتوں باتوں میں اُس سے پوچھا " آپا! حشمت آج کل کیا کر رہا ہے ؟"

وہ جھٹ سے بولی :" وہیں بجلی گھر میں ہے ۔ اب تو بڑا اچھا کاریگر ہو گیا ہے ۔ تین روپے روز ملنے لگے ہیں ۔ اِس کے علاوہ پرائیویٹ کام سے کبھی دو، کبھی ڈھائی کما لاتا ہے ۔ ماشاء اللہ اس وقت وہ سب بھائیوں سے زیادہ مزے میں ہے ۔"

سلطانہ کی ماں ذرا دیر خاموش بیٹھی دیوار کو تکتی رہی، پھر بغیر اُس کی جانب دیکھے ہوئے پوچھا :" کہیں اُس کا رشتہ بھی لگایا ۔ ایک زمانہ میں تم گھر گھر لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں ۔"

" کل ہی ایک جگہ سے بات آئی تھی ۔ مگر لڑکی مجھے پسند نہیں آئی ۔ ہاتھی کی سونڈ کی سی ناک تھی اُس کی ۔"

سلطانہ کی ماں نے کہا :" اے لڑکی تھی یا ہتنی ۔" دونوں کو ہنسی آگئی ذرا دیر تک کمرے کے اندر خاموشی چھائی رہی ۔ پھر سلطانہ کی ماں کی آواز اُبھری :" آپا میری سلطانہ کو حشمت کے لئے لوگی ؟"

اُدھیڑ عمر کی آپا کنیز نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُس کو اس طرح دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو ۔ مُسکرا کر بولی :" میں نے تو ہمیشہ تم سے کہا کہ گھر کا لڑکا ہے ۔ دیکھا بھالا ہے ۔ کوئی عیب نہیں ۔ کسی فعل میں نہیں ۔ ایک ذرا رنگ سانولا ہے تو مرد کا کیا روپ رنگ دیکھنا ۔ کماؤ پوت ہونا چاہیئے ۔ بیوی کو اچھی طرح رکھے ۔ حشمت کو تم جانتی ہی ہو، نگوڑا لڑکا کاہے کو ہے ، لڑکیوں سے گیا گزرا ہے ۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھ لے ۔" وہ اپنے

منجھلے بیٹے کی خوبیاں گنواتی رہی۔ اور سلطانہ کی ماں چپ چاپ بیٹھی اُس کی باتیں سُنتی رہی۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو سُلطانہ کی ماں نے کہا "دیکھو آپا! میں اب زندگی سے نا اُمید ہو چکی ہوں۔ نہ جانے کس وقت آنکھ بند ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں سلطانہ میری زندگی ہی میں اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ ورنہ قبر میں میری روح بلکتی رہے گی۔" یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

"اے کیسی باتیں کر رہی ہو۔ جلد ہی اچھی ہو جاؤ گی۔"

"نہیں آپا! اب میں بچوں گی نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"تم کہو تو میں کل ہی لڑکے کو لے آؤں۔ نکاح پڑھوا لو، رخصتی چاہے بعد میں کر دینا۔"

سلطانہ کی ماں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جس قدر جلد وہ سلطانہ کے فرض سے فارغ ہو جائے، وہی اچھا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا وہ نیاز کی واپسی کا انتظار کرے یا اُس کے آنے سے پہلے ہی نکاح کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نیاز اس رشتے کو نامنظور کر دے۔ جب سے اس نے چند پیسے کما لئے تھے، وہ اپنے خاندانی ہونے کا جھنڈا گاڑنے لگا تھا۔

اِدھر حشمت کا باپ ضلع کچہری میں چپراسی تھا۔ وہ نچلے طبقے کا آدمی تھا۔ اور ویسا ہی اُس کا رہن سہن تھا۔ یہی باتیں سوچ کر اُس نے حشمت کی ماں سے کہا۔

"کل کونسی تاریخ ہے؟"

"چاند کی ۱۳ تاریخ ہے۔"

"نہیں بھئی یہ ۲۳، ۱۳، ۲۳ ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ عشار کی نماز کے بعد، تم حشمت کے ساتھ قاضی کو لے کر آجاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

دونوں اس سلسلہ میں باتیں کرنے لگیں۔ سلطانہ کی ماں کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ آہستہ بول رہی تھی۔ اور آپا کنیز کی بات بات پر باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ وہ بڑی خوش نظر آرہی تھی۔ اُس کے گال کا سیاہ مسّا بار بار روشنی میں آجاتا تو بھونرے کے پَر لرزتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اسی اثنار میں اللّٰو حشمت کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

حشمت نے سلطانہ کی ماں کو سلام کیا اور دیوار کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت گہرے نیلے رنگ کی پتلون اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ گردن میں اُونی گلوبند لپٹا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں ماں کی طرح چھوٹی چھوٹی تھیں۔ جسم مضبوط تھا۔

سلطانہ کی ماں نے گردن موڑ کر حشمت کی طرف دیکھا اور بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا۔ سلطانہ اِس کالے کلوٹے کے قابل تو نہ تھی۔ اِس کو تو کسی محل میں بیاہ کر جانا چاہیئے تھا۔ وہ تو شہزادی ہے۔ اُس نے گہری سانس بھر کر دل میں کہا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی اچھا بَر مل جائے۔ مگر اللہ کی مرضی یہی تھی۔ سلطانہ کی قسمت ہی میں یہ کالا کلوٹا لکھا تھا۔

حشمت کے آنے کے بعد سلطانہ کی ماں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ حشمت گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت ماں کو بُلانے آیا تھا۔ اس گھر میں اُس کا آنا جانا بہت کم تھا۔ آپا کنیز سلطانہ کی ماں کی سگی رشتہ دار نہیں تھی، بہت دُور کا ننھیالی رشتہ تھا۔ ویسے آپس میں میل جول بھی کم تھا۔ سلطانہ کے لئے وہ کئی بار اشاروں

میں کہہ چکی تھی۔ دوسروں کے ذریعہ بھی پیغام بھجوایا، مگر ہر بار سلطانہ کی ماں انکار کر چکی تھی۔

آپا کنیز کچھ دیر بعد حشمت کے ساتھ اُٹھ کر چلی گئی۔ اُن کے جانے کے بعد ماں کمرے میں اکیلی لیٹی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ سلطانہ کا رشتہ تو اُس نے حشمت کے ساتھ طے کر دیا۔ مگر اُس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آپا کنیز مزاج کی بڑی تیز ہے۔ بڑی بہو سے آئے دن اُس کی ٹھنی رہتی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی یہی سب کچھ سوچ رہی تھی کہ اسی اثناء میں سلطانہ کمرے میں آگئی۔ وہ اُس کے لئے گرم دودھ کا پیالہ لے کر آئی تھی۔ اُس نے ماں کو دودھ پلایا اور بستر پر اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر سلطانہ نے پُوچھا۔

"امّاں! اب کیسی طبیعت ہے؟"

وہ بڑے دُکھ بھرے لہجے میں بولی: "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں بچوں گی نہیں۔"

"خدا کے لئے امّاں ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ ہمارا بیٹھا ہی کون ہے۔ لے دے کے ایک تمہارا دم ہے۔" سلطانہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"ہاں بیٹی! یہی سوچ رہی تھی کہ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ انو پھر بیٹا ذات ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ تیرا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے۔" ماں نے ایک دلدوز آہ بھری اور سر اُوپر اُٹھا کر بولی۔

"یا اللہ! ان لاوارثوں کا تُو ہی نگہبان ہے۔"

سلطانہ نے جلدی سے کہا: "ایسی باتیں نہ کرو، امّاں میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔" اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی: "رو نہیں بیٹی!" اور

اُس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ سلطانہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سسکیاں بھر کر روتی رہی۔ ماں کہنے لگی: "تُو رونے بیٹھ گئی۔ مجھے تو تجھ سے ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

اُس نے گہری سانس بھری: "میں تیری ماں بھی ہوں، باپ بھی اور سہیلی بھی۔ میرے علاوہ تیرا اور کون بیٹھا ہے۔ بہت سی باتیں جو مجھے تجھ سے نہیں کہنا چاہئیں، وہ بھی کہنا پڑتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے بعد تُو اس گھر میں اکیلی رہ جائے۔ کوئی اتنا بھی نہیں کہ تمہارے سر پہ ہاتھ رکھ دے۔ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہوں اندھیرا ہی اندھیر نظر آتا ہے۔ کوئی بھی تو اپنا نہیں۔"

سلطانہ خاموش بیٹھی اُس کی باتیں سُنتی رہی۔ کمرے کے اندر ماں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔ وہ کہہ رہی تھی: "آپا کنیز نے آج پھر حشمت کا پیغام دیا تھا۔ وہ بجلی گھر میں مستری ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ دو سو روپے ہر مہینہ کما لیتا ہے۔ مجھے تو اُس میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ سیدھا اور سعادت مند لگتا ہے۔"

سلطانہ نے گھبرا کر سوچا۔ ہائے اللہ، یہ امّاں کیسی باتیں کر رہی ہے۔ وہ تو ایک نمبر چھٹا ہُوا بدمعاش ہے۔ پچھلی گرمیوں ہی کی تو بات ہے، وہ اُس کے گھر میلاد شریف میں گئی تھی۔ سلام پڑھنے کے بعد اُس کا گلا خشک پڑ گیا تھا۔ وہ پانی پینے کے لئے گھڑونچی کی طرف گئی۔ وہ کالا کالا بھوُت کی طرح دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ کمبخت اندھیرے میں نظر بھی تو نہیں آتا۔ اِس زور سے پکڑ کر دبوچا کہ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ منہ سے بُو کیسی آ رہی تھی۔ حرامزادے نے سارا تھوک گالوں پہ چپڑ دیا۔ سلطانہ کو سخت کراہیت محسوس ہوئی۔

ماں کہتی رہی: "میں نے تو رشتہ منظور کر لیا ہے۔ وہ تو کل ہی قاضی

کو لانا چاہتی تھیں۔ میں نے پرسوں عشاء کے بعد کا وقت رکھا ہے۔"
سلطانہ کے سینے پر جیسے کسی نے زور سے پتھر دے مارا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔
اُس نے وحشت زدہ نظروں سے ماں کو دیکھا، جو تکیہ سے سر ٹکائے رُک رُک کر بول رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مُردنی چھائی تھی۔ آنکھیں بُجھتے چراغوں کی طرح دھندلی نظر آرہی تھیں۔ بات کرتے کرتے وہ رُک کر ہانپنے لگتی۔
ماں بیٹی کی نظریں ایک بار ملیں اور ماں نے محسُوس کیا کہ بیٹی کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔ اُس کے غم کو وہ جانتی تھی۔ اور جب اس کی شدّت کو محسُوس کیا تو بیٹی کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا۔ سلطانہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ زخمی گائے کی طرح اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ماں کو تکنے لگی۔

ماں نے اچانک پوچھا "سلمان بہت دنوں سے نہیں آیا؟"
سلطانہ اب خاموش نہ رہ سکی۔ اُس نے دبی زبان سے کہا۔ "انّو کہتا تھا وہ آجکل بہت مصروف ہیں۔"
ماں کہنے لگی "نہیں بیٹی! وہ بڑے گھر کا لڑکا ہے۔ ہم غریبوں کی اُس کو کیا پرواہ، کہیں روزگار سے لگ گیا ہوگا۔ کھاتا، کماتا، عیش کرتا ہوگا۔ ہمارا اس سے کیا میل جول، ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ ہی میں لگتا ہے۔"
سلطانہ سر جھکا کر بولی "آپ اُن کو بُلا کر بات تو کیجئے۔"
"اب بات کرنے کا وقت ہی کہاں رہ گیا ہے۔"
"اِس وقت تو وہ مل جائیں گے۔ انّو کو بھیج کر بُلا لیجئے۔"
ماں کہنے لگی "انّو اتنی رات گئے کیسے جائے گا۔ بچّہ ہے، اُس کو ڈر لگے گا۔"

سلطانہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "میں اُس کے ساتھ چلی جاؤں؟"

ماں نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوُا کہ وہ سلطانہ کی ماں نہیں سہیلی ہے۔ کوئی بیٹی اپنی ماں سے ایسی بات نہیں کہہ سکتی اور جب بیٹی نے منہ پھوڑ کر اُس سے سب کچھ کہہ ہی دیا تو اُسے اب کیا کرنا چاہیئے۔ وہ اُسے ایک نامحرم کے پاس جانے کی اجازت دے دے۔ یہ تو بڑی بے حیائی کی بات ہے۔ اُس نے گھبرا کر سوچا۔ میرے اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ ان پریشانیوں نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔

نہیں، اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن میری بچّی تو رو رو کر بُرا حال کر لے گی۔ زندگی بھر مجھے کوسنے دے گی۔ کہے گی اپنا دل چاہا تو خصم کر کے بیٹھ گئی۔ سوتیلا باپ لا کر سر پر بٹھا دیا۔ اُس نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اپنی بیٹی کے سامنے گناہ کار ہے۔

سلطانہ نے ماں کو خاموش دیکھ کر کہا: "امّاں تم ناراض تو نہیں ہو گئیں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

ماں نے بے اختیار اُس کو سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میری بچّی!" اُس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگی۔ سلطانہ اُس کے دل کی دھڑکن صاف سُن رہی تھی۔ اس کا سینہ بار بار غبارے کی طرح تن کر سمٹ جاتا۔

ماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولی: "جاؤ انّو کو جگا کر اپنے ساتھ لے لو۔ مگر دیکھو، جلدی آجانا۔ اکیلے میں میرا دل بڑا گھبرائے گا۔ جب تک تم آؤ گی نہیں، مَیں جاگتی رہوں گی۔"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا: "اچھا!"

اُس کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ وہ پلنگ سے اُتر کر نیچے آگئی۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو ماں نے ایک بار پھر ٹوک کر کہا۔

"دیکھو، جلدی آجانا۔"

سلطانہ نے فوراً کہا۔ "نہیں، امّاں میں جلدی آ جاؤں گی۔"

ماں نے دیکھا، سلطانہ کے چہرے پر سُرخی آ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں مسرت سے ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ اُس کو بڑا سکون محسوس ہُوا۔ اُس نے جسم کو ڈھیلا کر دیا اور کروٹ بدل لی۔

سلطانہ نے انّو کو بیدار کیا، اور اُس کو اپنے ہمراہ لے کر باہر گلی میں آ گئی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا تھا۔ راستوں پر اِکا دُکا راہ گیر نظر آ رہے تھے۔ جب وہ فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر پہنچے تو دس بج چکے تھے۔ سلمان اس وقت لائبریری میں بیٹھا مطالعہ میں غرق تھا۔

اچانک باہر انّو کی آواز سنائی دی۔ وہ اُس کا نام لے کر پُکار رہا تھا۔ سلمان باہر آیا۔ انّو کے ساتھ سلطانہ کو اتنی رات گئے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"ارے تم؟"

سلطانہ نے آہستہ سے کہا۔ "آپ تو اب آتے ہی نہیں، میں نے کہا، چلو میں ہی چلی چلوں۔"

وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "میں آجکل بیحد مصروف ہوں۔ ذرا بھی مہلت نہیں ملتی۔ امّاں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب تو اُن کو روز دَورہ پڑنے لگا ہے۔"

سلمان نے سوچا اس طرح بات کرنا مناسب نہیں۔ اُس نے سلطانہ سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اندر گیا۔ ڈاکٹر زیدی سے ڈسپنسری کی کنجی لی اور باہر آ کر سلطانہ اور انّو کے ساتھ ڈسپنسری پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ اندر جا کر موم بتی روشن کی۔

انّو کی موجودگی میں سلطانہ اُس سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

سلمان نے اُس کی پریشانی کو جلد ہی بھانپ لیا۔ اُس نے الماری سے ایک اور موم بتی نکالی اور سلطانہ کے ہمراہ پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ اس میں ایک لمبی میز تھی۔ سلمان نے سلطانہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور موم بتی روشن کر کے میز پر رکھ دی۔ روشنی ہوتے ہی کمرے کی سفید سفید دیواریں جھلکنے لگیں۔

سلطانہ سیاہ بُرقع پہنے ہوئے تھی۔ اُس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ موم بتی کی پوری روشنی میں اُس کی دل کشی نکھر گئی تھی۔ لانبی لانبی پلکوں کے سائے میں اُس کی آنکھیں، گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی جھیلوں کی طرح شفاف نظر آرہی تھیں۔

سلمان لمحہ بھر تک اُس کے خوبصُورت چہرے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ اتنی رات گئے تم کیسے یہاں آئیں؟"

وہ آہستہ سے بولی "میں اس وقت یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اُس نے نگاہیں اُٹھا کر سلمان کی جانب نہیں دیکھا۔ اسی طرح گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

سلمان تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ کسی ایسی بات کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ در اصل اب تک اُس نے سلطانہ کے متعلق سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ اُس کی بات کا کیا جواب دے۔ اس کو خاموش دیکھ کر سلطانہ کا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے رُک رُک کر کہا۔

"اب شاید مجھ کو اس طرح گھر سے نکلنے کی اجازت نہ ملے۔"

"کیوں؟" سلمان نے پوچھا۔

سلطانہ نے جھجکتے ہوئے کہا "اماں میری شادی کر رہی ہیں۔"

سلمان کو اُس کی بات پر یقین نہ آیا۔ "کب؟"

"پرسوں رات کو۔"

اُسے پھر بھی یقین نہ آیا۔" ارے اتنی جلدی!" پھر وہ زیرِ لب مسکرایا۔" یہ ویسی ہی شادی تو نہیں ہے جیسی ایک بار پہلے ہو رہی تھی۔"

سلطانہ نے گھور کر اُسے دیکھا۔ سلمان کی بات اُس کو پسند نہ آئی۔ اُس نے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔

"وہ اور بات تھی۔ آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں۔"

لمحہ بھر وہ خاموش رہی۔ پھر بجھے ہوئے لہجہ میں بتایا۔" اماں کی طبیعت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ بار بار کہتی ہیں کہ میں اب بچوں گی نہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے میرا بیاہ کر دیں۔ وہ اپنی زندگی سے بڑی ناامید ہو چکی ہیں۔ آپ نے اِدھر اُن کو دیکھا نہیں۔ اُن کی حالت دیکھ کر تو کلیجہ پھٹتا ہے۔"

سلطانہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے اور گردن جھکالی۔ موم بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس کا چہرہ اُداس نظر آ رہا تھا۔

سلمان نے خاموش نظروں سے سلطانہ کے غمگین چہرے کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ یہ بھولی بھالی معصوم لڑکی، جو سرما کی اس سنسان رات کو اُس سے ملنے آئی ہے، اُس کو پسند ہے۔ وہ اُس سے محبت بھی کرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اس کے لئے "فلک پیما" کو چھوڑ سکتا ہے۔ اس جماعت کو جس میں شامل ہونے کے بعد اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دے گا۔ یہ زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی لگن تھی، جس میں اُس کے ارمان، اُس کی خوشی اور اُس کے غم پھیل کر لاکھوں انسانوں میں بٹ گئے تھے۔

یہ ایک اسکائی لارک کی زندگی تھی، جس کا نصب العین خدمتِ خلق تھا۔ عوام کی بھلائی اور بہتری کے لئے سرگرم عمل رہنا۔

اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سلطانہ سے شادی کرنے کے بعد وہ اسکائی لارک نہیں رہ سکے گا۔ اُسے فلک پیما کو چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ایک بیوی کا شوہر بن جائے گا۔ پھر اُسے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ملازمت کرنی پڑے گی۔ چند سال بعد وہ باپ بن جائے گا۔ اُس کے اخراجات بڑھ جائیں گے۔ اُس کو اور زیادہ کمانا پڑے گا۔ ایک بچہ، دوسرا بچہ، کئی بچے۔ آمدنی، زیادہ آمدنی۔ یہ سلسلہ ساری زندگی چلتا رہے گا۔ صبح سے شام تک ایک ہی فکر، ایک ہی چکر۔ دنیا میں کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور اسی چکر میں ساری عمر پھنسے رہتے ہیں۔ اور ایک روز، ایک بیوی کو، چند بچوں کو، چند بچوں کے بچوں کو، روتا بلکتا چھوڑ کر اس دُنیا سے سدھار جاتے ہیں۔

زندگی کائنات کی طرح وسیع ہے۔ ہر لمحہ، ہر گھڑی ارتقا پذیر ہے۔ وہ اس قدر محدود نہیں ہو سکتی۔ تو کیا وہ اس لڑکی کو، جس کے لئے کبھی وہ رویا بھی تھا۔ پاگلوں کی طرح پریشان رہا تھا، کسی دوسرے کو سونپ دے؟ کیا مضائقہ ہے۔ زائد سے زائد یہی تو ہوگا کہ وہ اُس کی زندگی کی ایک المناک یاد بن جائے گی۔ اور ایسی یادیں اُسی وقت حملہ آور ہوتی ہیں، جب زندگی میں جدّوجہد نہیں رہتی۔ جب آدمی تھک جاتا ہے۔ لیکن اُس کے سامنے تو بہت بڑا پروگرام ہے۔ اتنا بڑا پروگرام کہ اگر اُس کو ایسی کئی زندگیاں ملیں تو بھی اُس کا مشن ختم نہیں ہوگا۔

دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر اس گہری خاموشی میں سلطانہ کی آواز اُبھری۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے یہاں آکر آپ کو پریشان کر دیا۔"

سلمان کا سلسلۂ خیالات منقطع ہو گیا۔ اُس نے چونک کر کہا۔

"نہیں تو۔"

وہ اُس کی بات پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

سلمان نے پوچھا۔" جس کے ساتھ اماں نے تمہارا رشتہ طے کیا ہے وہ کیا کرتا ہے ؟"

" بجلی گھر میں مستری ہے۔"

" تمہارا رشتہ دار ہے ؟"

" ہاں !" سلطانہ نے مختصر جواب دیا۔

" اماں کو پسند ہے ؟"

" کہتی تو وہ یہی ہیں۔"

سلطانہ بغیر غور کئے سلمان کے ہر سوال کا جواب دیتی چلی گئی۔ سلمان نے ذرا دیر تک سوچا۔ پھر اُس نے کہا۔" میرا خیال ہے کہ تم اُس سے شادی کر لو۔"

سلطانہ کو ایسا محسوس ہوُا، گویا کمرے میں جلتی ہوئی موم بتّی کی لَو بھڑک کر بجھ گئی ہے۔ اُس کے چاروں طرف تاریکی کا جال پھیل گیا ہے، اور اُس گھُپ اندھیرے میں وہ آہستہ آہستہ ڈوبتی جارہی ہے، اُترتی جارہی ہے۔ اُس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ وہ پتھر کے مجسّمے کی طرح دم بخود نظر آرہی تھی۔

سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔" یہ ہم دونوں ہی کے لئے بہتر ہے۔"

سلطانہ نے بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا۔ مَیں یہاں کیوں آئی مجھے یہاں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کم سے کم یہ بات تو نہ سُنتی، جس نے اُس کے کلیجہ کو چیر ڈالا۔ یا اللہ! یہ کیسی تکلیف ہے۔ یہ کیسا دُکھ ہے۔ میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں۔ اُس نے محسُوس کیا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے، کہیں وہ لڑکھڑا کر گر نہ پڑے۔ گھبرا کر وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور اُکھڑی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔

"اچھا اب میں چلوں گی۔"

سلمان نے اُس کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ "دیکھو سلطانہ بات یہ ہے۔" لیکن سلطانہ نے اُس کی کوئی بات نہ سُنی۔ آہستہ سے کہا۔

"بات تو اب ختم ہو چکی۔"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے سلمان کو تکنے لگی۔ اُس نے گہری سانس بھری۔ اور قریب جاکر سلمان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لے لیا۔ پھر وہ اُس پر جھک گئی۔ اُس کی پیشانی کو چوما اور علیحدہ ہو گئی۔ نہ وہ روئی، نہ اُس نے زبان سے ایک لفظ نکالا۔ چُپ چاپ دوسرے کمرے میں آ گئی۔

اکو بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر چونک پڑا۔ سلطانہ نے اُس کو ساتھ لیا اور ڈسپنسری کے باہر جانے لگی۔ سلمان اُس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

"چلو میں تم کو گھر تک چھوڑ آؤں۔ رات بہت گزر چکی ہے۔"

سلطانہ نے اُس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ "نہیں، میں اس سرد رات میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔" اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سلطانہ باہر آ گئی۔ دونوں بہن بھائی سنسان رات میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بستی پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی، سنّاٹا تھا۔ رات اور بھیگ چکی تھی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کے جسم سردی سے کانپ رہے تھے۔

سنسان سڑکوں کو طے کر کے دونوں محلّے کی گلی میں داخل ہوئے۔ اچانک کتّوں کے زور زور سے رونے کی آواز اُبھری۔ رات کے آسیب زدہ سنّاٹے

میں، اُن کی آوازیں بڑی ہیبت ناک معلوم ہورہی تھیں۔ دونوں سہم کر رہ گئے۔ سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

گھر پہنچ کر سلطانہ نے دیکھا، دروازہ کھُلا تھا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خوف زدہ سی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ ماں کے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ سیدھی وہیں پہنچی۔ ماں تکیہ کے سہارے خاموش پڑی تھی۔ اُس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور ایک ہاتھ پلنگ کے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ لپک کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ اُس نے ماں کے ہاتھ کو اُٹھایا تو اُس کا دل دَھک سے رہ گیا۔ اس نے بدحواس ہوکر کہا۔

"امّاں، امّاں!"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑی رہی۔

سلطانہ نے گھبرا کر ماں کے جسم کو ہلایا اور چیخ کر بولی "امّاں، امّاں! میری امّاں! منہ سے تو بولو" ماں اب کیا بولتی، وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ سلطانہ چیختی رہ گئی۔ اُس کو آواز دیتی رہ گئی۔ اس نے پہنچنے میں دیر کر دی۔

فصل ہفتم

(۱)

اسکاتی لارکوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

شہر کی مختلف بستیوں میں تعلیم بالغاں کے لیئے فلک پیما کے پانچ مرکز قائم تھے۔ دو دار المطالعے تھے۔ ڈسپنسری صرف ایک تھی مگر صبح سے شام تک اس پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کئی کئی میل سے مریض وہاں آتے تھے۔ ڈاکٹر زیدی کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر راتوں کو لوگ گہری نیند سے بیدار کر کے اُسے اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مگر اُس کی پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھتا، اور کبھی کبھی تو کپڑے تبدیل کئے بغیر مریض کو دیکھنے چلا جاتا۔ اِس حُلیہ میں وہ ڈاکٹر کی بجائے کان میلیا لگتا تھا۔ اُسے ڈاکٹر تسلیم کرتے میں اکثر مریضوں کو مشکل سے یقین آتا۔

اِن اداروں کے علاوہ فلک پیما نے دستکاری اور گھریلو صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک انڈسٹریل ہوم بھی کھولا تھا۔ اُس کے دو شعبے تھے۔ ایک میں مرد دستکار اور کاریگر کام کرتے اور دوسرا زنانہ حصّہ تھا۔

اِس میں بیوہ اور لاوارث عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی، اور اُن سے گھریلو مصنوعات بھی تیار کرائی جاتیں۔

انڈسٹریل ہوم کا بنا ہُوا مال بازار میں فروخت کیا جاتا۔ فلک پیما کا پروگرام تھا کہ شہر کے کسی بازار میں انڈسٹریل ہوم کی جانب سے ایک شو روم کھول دیا جائے، جہاں مصنوعات کی نمائش ہو سکے اور اُن کو فروخت بھی کیا جائے۔ اِس طرح دوکان داروں کو جو کمیشن دیا جاتا تھا، وہ بچ جاتا۔ مگر یہ تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔

ہُوا یہ کہ ایک روز کوئی دو بجے شب کو ایک شخص ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا۔ ڈاکٹر آدھ گھنٹہ پہلے ہی کسی مریض کو دیکھ کر آیا تھا، اور تھکا ہارا بے خبر سو رہا تھا۔ اُسے مجبوراً اُٹھنا پڑا۔ آنکھیں مَلتا ہُوا وہ ڈسپنسری میں گیا ایمرجنسی دواؤں کا بیگ اُٹھایا اور اُس شخص کے ساتھ ہولیا۔ اُس آدمی کا چہرہ پچھلی رات کے چاند کی طرح زرد تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہُوا تھا اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے ڈاکٹر نے اندازہ لگایا کہ کسی عورت کا کیس تھا۔ مریضہ اس شخص کی بیوی تھی اور اُس کی حالت بہت نازک تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے جا کر دیکھا۔ مریضہ ایک سیلے ہوئے تنگ و تاریک کمرے میں بوسیدہ چٹائی پر بے سُدھ پڑی تھی۔ کمرے کے اندر چراغ جل رہا تھا۔ جس کی روشنی میں وہ لاش کی طرح بے جان نظر آ رہی تھی۔ اُس کے بال دُور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہا تھا۔

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا۔ اُس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ پہلا خیال اُس کے ذہن میں یہی آیا۔ اُس نے مریضہ کا معائنہ کیا تو اُس کا خیال درست نکلا۔ اُس نے مریضہ کے شوہر سے

پُوچھا۔
"تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"
"جھگڑا وگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔" اُس شخص کی بات میں ذرا بھی جھجک اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔
ڈاکٹر نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔" پھر اُس نے زہر کھانے کی کیوں کوشش کی ہے؟"
اُس کا زرد چہرہ، حیرت و خوف کے ملے جلے تاثر سے سیاہ پڑ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو گھبراہٹ میں جلدی جلدی گردش دے کر کہا۔" زہر؟" لمحہ بھر کے لئے اُس نے کچھ سوچا، نہیں ڈاکٹر صاحب! وہ زہر تو کھا ہی نہیں سکتی۔" یہ بات اُس نے بڑے یقین کے ساتھ کہی تھی۔
"تو پھر آج اُس نے کیا کھایا ہے؟"
ڈاکٹر کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جھجکنے لگا۔ اُس کی اس حرکت سے زیدی کو ایک بار پھر شبہ ہوا کہ یہ ضرور خودکشی کا کیس ہے۔ اس آدمی کو اس کا ضرور علم ہے۔ اور وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے کسی قدر تیکھے لہجہ میں کہا۔
"بتاتے کیوں نہیں کہ اُس نے کیا کھایا ہے؟"
اس شخص کا چہرہ مُردے کی طرح خاکستری نظر آنے لگا۔ وہ ڈاکٹر سے نظریں نہ ملا سکا۔ ملزموں کی طرح گردن جُھکا کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اُس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور حلق سے اِس طرح نکل رہی تھی، جیسے وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اُس نے جو بات بتائی، اُسے سُن کر ڈاکٹر زیدی لرز کر رہ گیا۔
وہ شخص دو ماہ سے بے روزگار تھا۔ پہلے وہ کسی فیکٹری میں کام کرتا

تھا۔ عام تخفیف اور چھانٹی کے زمانہ میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اب تک نہ تو اُسے کوئی ملازمت ملی تھی اور نہ اتنا سرمایہ تھا جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیتا۔ پرسوں صبح سے دونوں میاں بیوی مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی شیر خوار بچّے کی جانب سے تھی۔ جس نے دودھ کے لئے ماں کی چھاتیوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر دیا تھا۔ آج شام وہ کہیں سے قرض اُدھار کا بندوبست کرنے گیا۔ واپس آکر دیکھا، بیوی بار بار رقصے کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے بتایا کہ جب بچّے نے بہت زیادہ پریشان کیا اور اس کا بلکنا اُس سے دیکھا نہ گیا تو وہ کوڑا دان کے ڈرم میں سے کھانے کی اشیاء ڈھونڈ کر لائی تھی، اور اُن کو اُس نے کھایا بھی تھا۔ اُس کے بعد اُس کی یہ حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اُس شخص کو دیکھا، جو ملزموں کی طرح گردن جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ سانپ کے پیٹ کی طرح مٹیالا نظر آ رہا تھا۔ دیوار کے قریب اُس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ اُس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر گندے کپڑے میں ایک بچّہ لپٹا ہوا لاش کی مانند پڑا تھا۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بار بار بھڑکتا۔ پُراسرار سائے دیواروں پر سرسراتے ہوئے معلوم ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اچانک خوفناک چیخیں بلند ہونے والی ہیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا دی۔ اُس کی جیب میں اُس وقت ۵ روپے تھے، وہ بھی اُسے دے دیئے اور واپس ہیڈ کوارٹر آ گیا۔ بستر پر لیٹا دیر تک مریضہ اور اُس کے شوہر کے متعلق غور کرتا رہا۔ مہینہ کے آخر میں جب اُس نے فلک پیما کے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس واقعہ پر خاص طور پر

زور دیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر زیدی نے یہ تجویز پیش کی کہ چھوٹے پیمانے پر ایک امدادی بنک قائم کیا جائے جس سے آسان قسطوں پر اور منافع کی بہت معمولی شرح پر ضرورت مندوں کو قرضے دیئے جائیں، تاکہ وہ کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔ اس تجویز کو اسکائی لارکوں نے پسند کیا اور یہ طے کیا گیا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جو بنک کے لئے ایک منصوبہ تیار کرے۔

ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ صفدر بشیر نے اس مقصد کے لئے فلک پیما کو مزید ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ امدادی بنک قائم ہو گیا۔

فلک پیما کا کام جس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا، اسکائی لارکوں کی مصروفیت بھی اُسی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر اسکائی لارک کو کئی کئی شعبوں میں کام کرنا پڑتا۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز زیر بحث آئی کہ اسکائی لارکوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ بہت سے نوجوان اس کے لئے آمادہ تھے۔ وہ باشعور اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسکائی لارکوں کی تعداد بڑھا کر ۱۵ تک کر دی جائے۔ اس سے زیادہ تعداد بڑھانے کی گنجائش نہیں تھی۔

صفدر بشیر اب تک پچاس ہزار روپیہ فلک پیما کے فنڈ کے لئے دے چکا تھا۔ انجمن اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ چندہ کے ذریعہ فنڈ مہیا کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کے لئے ہنوز کسی مہم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ فلک پیما کو اپنے منصوبوں کے لئے روپے کی ضرورت تھی، جو روز بروز شدید ہوتی جا رہی تھی۔

اُنہی دنوں جب فلک پیما کی مجلس عاملہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر رہی تھی۔ ایک رات خان بہادر کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسکائی لارکوں کو اُس کی آمد پر سخت حیرت ہوئی۔ صفدر بشیر اور علی احمد نے لائبریری

میں خان بہادر سے مُلاقات کی۔

یہ مارچ کی ایک خوشگوار رات تھی۔ اس وقت نو بج چکے تھے۔ خان بہادر ہلکے پھلکے لباس میں تھا۔ حسب معمول اُس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خوش مزاج بننے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اُس کے انداز میں تصنّع پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک خاص برانڈ کی سگریٹیں لایا تھا، جو بازار میں نایاب تھیں۔ اُس نے دونوں اسکاٹی لارکوں کو اصرار کر کے اپنی سگریٹ پلائی اور لائیٹر نکال کر اُن کو سُلگایا بھی۔ یہ لائیٹر خالص سونے کا بنا ہُوا تھا اور اس پر ایک قیمتی پکھراج جڑا ہوا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں جھلملاتا تو کمرے میں ستارے جگمگانے لگتے۔ خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائیٹر سے کیا۔

مگر علی احمد کو ان باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر، وہ اپنی سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا، کہ خان بہادر سے جلد ہی چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ صفدر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اُس کی باتوں سے اُکتایا ہُوا تھا۔ آخر اُس نے خان بہادر کی بات کاٹ کر کہا۔

"معاف کیجئے گا خان بہادر صاحب! ٹھیک ساڑھے نو بجے ہماری ایک میٹنگ ہے۔"

خان بہادر جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اُس نے ایک ہی جملے سے اندازہ لگا لیا کہ دونوں زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ بے تکلّفی سے مسکرا کر بولا۔

"بھئی! میں تو کفّارا ادا کرنے آیا تھا۔"

صفدر بشیر نے حیرت سے پوچھا۔ "یعنی؟"

خان بہادر نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنا بریف کیس کھولا۔ چیک بُک نکالی اور بیس ہزار کا چیک کاٹ کر صفدر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اسکائی لارک غور سے چیک کو دیکھنے لگے۔ خان بہادر بڑی مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ آج میں نے سوچا، اس کو واپس کر آؤں۔"

علی احمد نے سوچا کہ خان بہادر اس وقت ضرور کوئی نیا چکر چلانے آیا تھا۔ اُس نے مشکوک نظروں سے خان بہادر کو دیکھا، جو بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کے انداز سے خوشامد صاف جھلک رہی تھی۔ علی احمد نے دریافت کیا۔

"اس کے ساتھ جو شرائط ہوں، وہ بھی ساتھ ہاتھ بتا دیجئے تاکہ ہم جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔"

خان بہادر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "بھئی آپ لوگ تو میری طرف سے بڑے بدظن معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے مسجد کا مسئلہ خالص دینی تھا اور ایک سچّے مؤمن کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا۔" علی احمد نے اُس کو آگے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا ٹوک کر کہا۔

"بہتر یہ ہوگا کہ اس وقت ہم اُس مسئلہ پر بات نہ کریں۔"

خان بہادر کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ "چلئے اس کے متعلق گفت گو نہیں ہوگی۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ لوگ میرے متعلق کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔" وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ مگر دونوں اسکائی لارک اِس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے۔ اور اس قضیہ پر اس وقت قطعی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس دفعہ صفدر بشیر بیچ میں بول پڑا۔ "اِس بات کو تو فی الحال آپ

چھوڑ ہی دیں۔"

"اچھا اس کے بارے میں میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔"

علی احمد نے کہا۔"آپ نے اپنی شرائط نہیں بتائیں۔" وہ چاہتا تھا کہ خان بہادر کھل کر بات کریں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے اور اس بیس ہزار روپے کی پیشکش سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

"بھئی میری کوئی شرط ورط نہیں۔" خان بہادر نے کہا۔"جیسا کہ میں پہلی ملاقات میں کہہ چکا ہوں کہ جو آپ کی پارٹی کا پروگرام ہے، وہی میں چاہتا ہوں۔ خدا کا خوف ابھی دل میں باقی ہے۔ اس لئے دل میں خدمتِ خلق کا بھی جذبہ ہے۔ تھوڑی بہت جو زندگی رہ گئی ہے، چاہتا ہوں کہ اس کو عوام کی خدمت میں گزار دوں۔"

علی احمد نے کہا۔"بڑا نیک جذبہ ہے۔" اس کے ہونٹوں پر زہرخند تھا۔

خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔"بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے۔" اس کے لہجہ میں عجز تھا۔

صفدر بشیر نے فوراً پوچھا۔"کس قسم کا تعاون؟"

"بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد، یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ میں اس حلقے سے اُمیدوار ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا، آپ ہی لوگوں جیسے بعض کرم فرماؤں کا اصرار تھا کہ میں انتخابات میں ضرور حصّہ لوں۔ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔" خان بہادر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔"سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مگر آپ کی تنظیم کے تعاون کے بغیر یہ پروگرام اُدھورا ہے۔"

صفدر بشیر نے مسکرا کر کہا۔" ہمارے تعاون کے بغیر بھی آپ الیکشن لڑ سکتے ہیں۔"

" آپ لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔ آپ کی تنظیم نے اس علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیئے جو کچھ کیا ہے اور جس قدر آپ لوگوں کی یہاں عزّت ہے، اس کو کون نہیں جانتا۔ بلکہ اگر میری بات کو آپ خوشامد نہ تصوّر کریں تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ان بستیوں کے لوگ تو آپ سب کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہیں۔ اور وہ بے جا بھی نہیں۔ آپ کے کارنامے اسی جذبہ کے مستحق ہیں۔"

علی احمد نے کہا۔" دیکھئے خان بہادر صاحب! فلک پیما کا فی الحال کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ اس لیئے اگر آپ ہم کو ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں تو بہتر ہے۔"

اُس نے فوراً کہا۔" میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ہمدردی مجھے مل جائے، یہی بہت ہے۔" اُس نے چیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" فی الحال آپ میرا یہ نذرانہ قبول کرلیں، آئندہ بھی جو کچھ ہوسکا، خدمت کرتا رہوں گا۔"

علی احمد نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔" یہ تو آپ ایک طرح کی فلک پیما کو رشوت دے رہے ہیں۔"

" نہیں صاحب! یہ رشوت کیسے ہوسکتی ہے؟"

صفدر بشیر نے کہا۔" چلئے رشوت نہ سہی، فلک پیما کے تعاون کی قیمت تو بہرحال آپ لگا ہی رہے ہیں۔"

علی احمد نے صفدر بشیر کی تائید کی۔" اور اگر یہ تعاون کی قیمت ہی ہے تو معاف کیجئے گا خان بہادر صاحب! آپ نے بہت کم قیمت لگائی۔ میں اس

بات پر احتجاج کروں گا۔"

خان بہادر دونوں کی باتوں سے کسی قدر بدحواس ہوگیا۔ گھبرا کر بولا۔

"آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو پورے خلوص کے ساتھ آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں۔"

دونوں اُس کے خلوص کو ایک بار آزما چکے تھے۔ وہ تجربہ اُن کے لئے کافی تھا۔ لہذا اُن کو خان بہادر کی باتوں پر ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ علی احمد کہنے لگا۔

"دیکھئے خان بہادر صاحب! آپ کاروباری آدمی ہیں۔ اِس بات سے تو آپ اِنکار نہیں کر سکتے۔ آپ کوشش بھی کریں۔ تب بھی آپ کسی مسئلہ کو کاروباری انداز سے دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔"

صفدر بشیر نے کہا۔" اور آپ تو بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔ یہ صلاحیت خدا کسی کو کم ہی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک کامیاب تاجر بننا چاہوں تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اِس کے لئے ایک مخصوص ٹمپرامنٹ کی ضرورت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے۔" وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا۔

خان بہادر بڑا سٹ پٹایا، مگر وہ اتنی جلد ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"اگر آپ حضرات نے تعاون کیا اور خدا کا فضل شامل رہا تو میں میونسپلٹی کا ممبر منتخب ہو جاؤں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں عوام کی کس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ خدمت کرتا ہوں۔"

"آپ کے خلوص کا تو ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔" صفدر بشیر نے طنز کیا۔ علی احمد نے بھی اُس کو معاف نہ کیا۔ فوراً ہی وار کیا۔" اور آپ کی نیت پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔ آپ ایسے مردِ مومن کی نیت پر تو شبہ کرتے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

خان بہادر پُرانا گھاگ تھا، فوراً بھانپ گیا کہ بات بننے کی بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔ اُس نے جھٹ پینترا بدلا۔ چہرہ کو باوقار بنا کر بولا۔

"دیکھئے یہ بات تو آپ لوگ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی جماعت یا تنظیم کا کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ آپ انتخابات میں کسی نہ کسی اُمیدوار کی مدد تو ضرور ہی کریں گے۔ اگر وہ امیدوار آپ مجھ کو ہی مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کو فائدہ ہی پہنچے گا۔"

علی احمد نے کہا "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فلک پیما کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ بیس ہزار کی رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ میں اس پر پہلے ہی احتجاج کر چکا ہوں۔"

خان بہادر نے جواب دیا "بیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اس سے آپ ایک بہتر دفتر تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہ عمارت تو آپ کی تنظیم کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ یہاں بجلی تک تو ہے نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ بہرحال آپ کی بات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چلیئے ۲۵ ہزار روپے کا چیک کاٹے دیتا ہوں۔"

علی احمد بولا "نہیں خان بہادر صاحب! یہ تو بہت کم قیمت آپ نے لگائی ہے۔ کچھ اور بڑھائیے بولی۔"

خان بہادر نے اس کے طنز پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اب وہ قطعی کاروباری موڈ میں آگیا تھا۔ کہنے لگا "جناب ۲۵ ہزار روپے میں آپ دو اچھے خاصے اسکول قائم کر سکتے ہیں۔ جن کو قاعدے سے چلایا جائے تو ۵ ہزار روپیہ ہر ماہ آسانی کے ساتھ کمایا جا سکتا ہے۔ اس رقم سے سال بھر بعد آپ دو نئے اسکول کھولنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

صفدر بشیر نے کہا: "خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورہ کا بہت بہت شکریہ۔ فلک پیما کے اس وقت پانچ تعلیمی مرکز قائم ہیں۔ فی الحال مزید مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ان سے بھی زیادہ اہم تجاویز ہیں۔ جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔"

خان بہادر نے رقم اور بڑھا دی۔ کہنے لگا: "میں آپ کی جماعت کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ۴۰ ہزار تک دے سکتا ہوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ مانئے تو سب سے پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیئے۔ گمٹی میں گوالوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو زیادہ دوڑ دھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔

"اس ڈیری فارم کے ذریعہ بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔ خسارہ کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا: "میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہئے کیسی لاجواب اسکیم ہے۔" اُس نے داد طلب نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

علی احمد نے فوراً جواب دیا: "آپ کی سُوجھ بُوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات سے قائل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو بڑا زرخیز دماغ عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لئے ہم ضرور آپ کو زحمت دینگے۔

مگر خان بہادر صاحب یہ ۴۰ ہزار کی رقم بھی کم ہے۔"

اِس کے بعد خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھا دئیے۔ دونوں اسکائی لارکوں نے اِس رقم کو بھی قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔ تھوڑی دیر حیل و حجت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا کہنے لگا۔

"یہ میرا آخری آفر ہے۔ اِس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لیئے یہ بنیادی شرط ہوگی کہ آپ کے تمام ممبر الیکشن میں میرے رضاکاروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان کو اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ آفر قبول کر لینا چاہیئے۔ ۵۰ ہزار کی رقم بہت ہوتی ہے۔ اگر آپ اسپتال ہی تعمیر کریں، تو اس رقم سے ایک شاندار عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ یہ جو آپ نے اسپتال بنا رکھا ہے، معاف کیجئے گا یہ تو اچھا خاصا مذاق معلوم ہوتا ہے۔ کہیں سے بھی تو اسپتال نہیں لگتا۔"

علی احمد نے ایک لمحہ بھی اس کی پیش کش پر غور کرنے کے لیئے ضائع نہ کیا۔ فوراً بولا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم صرف پچاس ہزار کی رقم پر آپ کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔"

خان بہادر کے لیئے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بگڑ کر بولا۔ "صرف پچاس ہزار!" وہ سخت بھنایا ہوا تھا۔ بمشکل اُس کی زبان سے نکلا۔ "آخر آپ لوگ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

دونوں اسکائی لارکوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی چھائی تھی، وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ کمرے میں سکوت تھا۔ خان بہادر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ چہرے کی وہ شگفتگی مٹ گئی تھی، جس سے وہ ہنس مکھ اور بشاش نظر آتا تھا۔ رخساروں کی دبیز کھال لٹکنے لگی تھی۔ وہ بہت

بوڑھا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کم از کم دو لاکھ تو آپ کو دینا ہی چاہیئے۔"

"دو لاکھ!" خان بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ جھنجلا کر کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں میونسپلٹی کی ممبری کے بجائے سونے کی کان کھودنے جا رہا ہوں۔"

علی احمد اُس کی جھنجلاہٹ سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "خان بہادر صاحب! ہمارا تو یہی خیال ہے۔"

وہ بہت چکرایا۔ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

صفدر بشیر نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہمیں تو خان بہادر صاحب یہ سیدھی سادی بزنس معلوم ہوتی ہے۔"

خان بہادر نے بلند آواز سے کہا۔ "بھئی وہ کیسے؟" ابھی تک وہ حیرت زدہ تھا۔

علی احمد نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ تو بہت صاف سی بات ہے۔ دیکھئے نا، جب آپ میونسپل بورڈ کے ممبر بن جائیں گے تو آپ آسانی سے اپنے بھتیجے اور بھانجوں کے نام سے ٹھیکے لے سکتے ہیں۔ اگر ہر سال دو تین ٹھیکے بھی مل گئے تو دس پانچ لاکھ کما لینا کوئی مشکل نہیں۔ پھر آپ تو پانچ سال ممبری کریں گے۔ بیس پچیس لاکھ بھی آپ کے لیسے تجربہ کار شخص نے نہ پیدا کئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ رشوتوں سے جو رقم ملے گی۔ وہ علیحدہ رہی۔ کوشش کی جائے تو کمائی کی اور بھی بہت سی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔"

علی احمد بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ خان بہادر کا چہرہ سُرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو چبا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

علی احمد نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "کسی فیکٹری پر دس بارہ لاکھ روپیہ صرف کرنے سے تو یہ کہیں اچھا پروجیکٹ ہے کہ میونسپلٹی کی ممبری حاصل کی جائے۔ بلکہ خدا توفیق دے تو چیئرمین بننے کی بھی جوڑ توڑ کرنی چاہیئے۔ پھر تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

خان بہادر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کی بات کاٹ کر بولا: "کیا آپ مجھے اتنا ذلیل اور کمینہ سمجھتے ہیں۔ میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

علی احمد نے تسلّی دیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا: "خان بہادر صاحب کاروبار میں اِس طرح جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا۔ پھر آپ تو ماشاء اللہ بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ! بزنس سے اور میونسپلٹی کے الیکشن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

صفدر بشیر کے لئے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ تیز مزاج کا نوجوان تھا۔ اُس نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا: "تو پھر یہ پچاس ہزار روپے کی رقم آپ فلک پیما کو کیوں پیش کر رہے ہیں؟ کیا آپ اسکائی لارکوں کو ضمیر فروش، خود غرض اور ایکسپلائٹر سمجھتے ہیں؟ آپ کا ابتدا ہی سے ہمارے ساتھ یہی رویّہ رہا ہے۔ مگر ہم نے کبھی آپ کی باتوں پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اِس لئے کہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ آپ کے نزدیک دولت، زندگی کی سب سے بڑی

قوت ہے اور ہم انسانی محنت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دولت، تبادلۂ جنس کا ایک ذریعہ ہے اور محنت سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اُس نے اِس محنت ہی کے ذریعہ ہیبت ناک دریاؤں کے رُخ بدل دئے۔ مہیب پہاڑوں کا غرور توڑ دیا۔ سمندر کو اپنا مطیع کر لیا اور اب چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔"

صفدر بشیر بڑی روانی سے بول رہا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح وہ خطیبانہ انداز میں جلسوں سے خطاب کرتا تھا۔

خان بہادر گھبرا کر کہنے لگا۔"آپ تو نہ معلوم کیسی باتیں کرنے لگے۔ میرا مطلب تو صرف اس قدر ہے۔۔۔۔"

صفدر بشیر نے بات کاٹ کر کہا۔"آپ کا مطلب ہم پر بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے ساتھ اِس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں دوٹوک بات کہہ دی۔

خان بہادر نے مزید بات چیت نہ کی۔ سگرٹ لائٹر روشن کیا، اور بیس ہزار کا چیک اُٹھا کر اُس کے سامنے کر دیا۔ چیک جلنے لگا۔ بڑا سا شعلہ روشن ہُوا۔ کمرے کی دیواریں جھلملائیں۔ چیک جل کر خاکستر بن گیا۔ جھلملاتی ہوئی دیواریں دُھندلی پڑ گئیں۔ خان بہادر نے اپنا خوب صورت بریف کیس اُٹھایا۔ دونوں سے رخصت ہُوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا باہر چلا گیا۔

جب اُس کی چاپ دُور ہو کر معدوم ہو گئی تو صفدر بشیر نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور تھکا ہُوا سا آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں سستانے کے سے انداز میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اُنھوں نے

خان بہادر سے جو گفتگو ہوئی تھی، اُس کی رپورٹ تیار کی اور لائبریری سے اُٹھ کر سونے کے لئے چلے گئے۔

علی احمد اور صفدر بشیر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے دوسرے ہی روز فلک پیما کا اجلاس ہوا۔ رپورٹ پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ تمام اسکاؤٹ لارکوں نے متفقہ طور پر ان دونوں کے اقدام کو سراہا اور خان بہادر کی سخت مذمت کی۔ اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فلک پیما کو میونسپلٹی کے انتخابات میں اِس حلقے سے اپنا اُمیدوار کھڑا کرنا چاہیئے۔ مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا۔ اجلاس دوسرے دن بھی جاری رہا۔ اور یہی تجویز زیرِ بحث رہی۔ اسکاؤٹ لارکوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ فلک پیما کو کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔

جو لوگ الیکشن لڑنے کے حق میں تھے، اُن کی دلیل یہ تھی کہ اگر انتخابات میں حصہ نہ لیا گیا تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپلٹی کے ممبر بنیں گے جو خدمتِ خلق کی آڑ میں ہر ناجائز طریقہ پر عمل کریں گے۔

دو روز کی طویل بحث کے بعد اسکاؤٹ لارک آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلک پیما صرف اسی وارڈ سے الیکشن کے لئے اپنا اُمیدوار کھڑا کرے۔ اس لئے کہ شہر کے دوسرے حصّوں میں اُن کے کام کی رفتار ہنوز سست تھی۔ اس کے علاوہ فنڈ کی کمی تھی۔ کام کرنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔

فلک پیما کے اُمیدوار کی نامزدگی کے لئے تین اسکاؤٹ لارکوں کے نام پیش کئے گئے۔ صفدر بشیر، علی احمد اور ڈاکٹر زیدی۔ لیکن رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی علی احمد نے اپنا نام واپس لے لیا۔ وہ الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں تھا، مگر خود اُمیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ ووٹنگ ہوئی اور ۶ کے مقابلہ میں ۱۰ کی اکثریت سے ڈاکٹر زیدی کو منتخب کر لیا گیا۔ اُس کو منتخب کرنے کی سب سے

بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس حلقے میں وہ بے حد ہردلعزیز تھا۔

نامزدگی کا اعلان ہونے کے بعد اسکائی لارکوں نے دیکھا کہ صفدر بشیر کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ اس وقت کسی قدر بے چین نظر آرہا تھا۔ بار بار سگریٹ پر لمبے لمبے کش لگا کر بہت سا دھواں فضا میں اُگل دیتا۔ مگر ڈاکٹر زیدی کی کامیابی پر سب سے پہلے اسی نے مبارکباد پیش کی۔

(۲)

اسکائی لارکوں نے اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، انتخابات کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اس مہم کا آغاز اُنہوں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا۔ روزانہ کسی نہ کسی بستی کے چوراہے پر ان کا جلسہ ہوتا۔ اسکائی لارکوں کی جوشیلی تقریروں نے ہر طرف دھوم مچا دی۔ لوگ اُن کی باتوں کو توجہ کے ساتھ سنتے اور جلسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے۔

پبلسٹی کا انچارج علی احمد تھا، وہ نت نئے پوسٹر بناتا، پمفلٹ لکھتا، ہینڈبل تیار کرتا۔ اسکائی لارکوں کو نئے نئے نعرے دیتا، پانچ پانچ منٹ کی چھوٹی چھوٹی تقریریں لکھ کر دیتا۔ یہ تقریریں اور نعرے، اسٹریٹ کارنر میٹنگ کے لئے ہوتیں۔ ہوتا یہ کہ اسکائی لارک، کسی بھی گلی کے نکڑ پر یا سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے۔ پہلے وہ اُونچی آوازوں سے نعرے لگاتے۔ جب ہجوم ہو جاتا تو مختصر سی تقریر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ڈاکٹر زیدی اور خان بہادر فرزند علی کے علاوہ میونسپل بورڈ کے انتخابات میں اِس حلقے سے ایک اُمیدوار اور بھی تھا۔ اُس کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ پستہ قد کا چھچھورا سا آدمی تھا۔ نیلام کرنے والوں کی طرح ایک بات کو کئی کئی بار دُہراتا تھا اور بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا۔ پچھلے سال تک وہ محکمہ سول سپلائی میں

عہدے دار تھا، مگر رشوت لینے کے جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ سرکاری حلقوں میں ابھی تک اُس کا بڑا اثر تھا۔ ملازمت کے چھوٹ جانے کا اُس کو ذرا ملال نہ تھا۔ بنک میں اُس کا ۵ لاکھ روپیہ موجود تھا۔ شہر میں چار شاندار کوٹھیاں تھیں۔ کئی کارخانوں میں اُس کے حصّے تھے اور پلاسٹک کی ایک فیکٹری کا مینیجنگ ڈائرکٹر تھا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر خان بہادر کے مقابلہ میں اُس کا پراپیگنڈا ہلکا تھا۔

خان بہادر اپنی انتخابی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اُس کے کارکُن جھلکتی ہوئی کاروں پر آتے اور ووٹروں کو خریدنے کے لئے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔ جوں جوں انتخابات کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں، ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اِس مقصد کے لئے اُس نے ہر بستی میں ٹھیکیدار مقرر کر دئے تھے۔ جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔

کاغذاتِ نامزدگی منظور ہو چکے تھے اور ہر اُمیدوار نے انتخابی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ عبدالحمید کی طرف سے ووٹروں پر سرکاری حکام دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس حلقے کے جو بااثر لوگ تھے، اُن کو آئے دن تھانوں میں بلایا جاتا۔ اگر وہ عبدالحمید کی مخالفت کرتے تو پولیس کے افسران، اُن کے خلاف مقدمے بنانے کی دھمکی دیتے۔ غنڈوں کے ذریعہ اُن کو پریشان کرتے۔ جو لوگ سرکاری ملازم تھے، ان کو اپنے محکمہ کے افسروں کی جانب سے پرائیویٹ ہدایتیں دی گئی تھیں کہ وہ عبدالحمید کی ہر طرح سے مدد کریں۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کا ریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اُس کے تین انتخابی دفتر قائم تھے، جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیگیں

چڑھتیں۔ بڑی فیاضی کے ساتھ مرغن کھانے کھلائے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے، اور سیدھے سادے لوگوں کو چکمہ دینے کا گُر جانتے تھے، خان بہادر نے اُنہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ اُن کی یومیہ اُجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کا ریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو دوکانوں کے الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

خان بہادر خود بھی حلقے کا دورہ کرتا۔ اُس کی شاندار کار نمودار ہوتی تو اُس کے اہالی موالی بڑی مستعدی کے ساتھ لپک کر کار کا دروازہ کھولتے، زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ خان بہادر ہونٹوں میں موٹا سا سگار دبائے، ونسٹن چرچل بنا بڑے ٹھسے کے ساتھ کار سے نیچے اُترتا۔ اُس کے آگے پیچھے تنخواہ دار کارکن ہوتے۔ اُن کے ہجوم میں گھرا ہوا وہ بستی کے گلی کوچوں کا ایک چکر لگاتا۔ لوگوں سے ملتے وقت ضرورت سے زیادہ انکساری کا مظاہرہ کرتا۔

اسکائی لارکوں کا طریقۂ کار بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ موٹا جھوٹا لباس پہنتے۔ ہاتھوں میں تھیلے ہوتے، جن میں پوسٹروں، ہینڈ بلوں اور پمفلٹوں کے علاوہ گڑ اور چنے بھی ہوتے۔ ہر محلّے کے لئے علیحدہ گروپ تھا۔ وہ صبح تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوتے اور چائے کی ایک ایک گرم پیالی پی کر چاق و چوبند ہو جاتے۔ سویرے سویرے ہی ہر گروپ کی میٹنگ ہوتی۔ ہر روز کے کام کا پروگرام مرتب کیا جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے نکل جاتے۔ وہ میلوں پیدل چلتے۔ بستی کے لوگوں کے ساتھ فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ اُن کے ساتھ حقے پر کش لگاتے بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ اُن کے دُکھ درد سُنتے۔ اُن کے جو چھوٹے موٹے کام ہوتے، اُن کو انجام دینے کی کوشش کرتے۔ بھوک لگتی تو کسی

درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے تھیلوں سے چنے اور گُڑ نکالکر کھاتے۔ ڈٹ کر پانی پیتے اور تازہ دم ہوکر آگے چل دیتے۔

فلک پیما کی سرگرمیاں طوفان کی طرح بڑھتی جارہی تھیں۔ اُس کی انتخابی مہم نے ہر طرف ہل چل برپا کردی تھی۔ اُس کے پاس یوں تو کُل ۱۵ کارکن تھے مگر وہ بلا کے کام کرنے والے لوگ تھے۔ ایک ایک اسکاؤٹ لارک کئی کئی محاذوں پہ کام کر رہا تھا۔ ہر کام خوش اسلُوبی سے چل رہا تھا۔ کہیں بھی گڑ بڑ نہ ہوتی۔ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں روزانہ کلاسیں ہوتیں۔ انڈسٹریل ہوم میں گھریلو مصنوعات کی پیداوار بڑھ گئی تھی۔ اُس کے تیار کئے ہوئے سامان کی بازار میں مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔

امدادی بنک کا کام اطمینان بخش تھا۔ حسابات باقاعدگی کے ساتھ رکھے جاتے۔ بنک کے بارے میں کسی قسم کی شکایت اب تک نہیں ملی تھی۔ بستی کے بہت سے لوگ اس کے قرضوں کے ذریعے بے روزگاری سے نجات پا چکے تھے۔

فلک پیما کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں میں سلمان پیش پیش تھا۔ ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ وہ ان دنوں دیوانہ وار کام کر رہا تھا مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے چند گھنٹے اُسے رات کو سونے کے لئے ملتے۔ ہفتوں شیو تک کرنے کا ہوش نہ رہتا۔ وہ روزانہ سویرے سویرے ہی اپنے گروپ کی میٹنگ کرتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے ہی اپنے کام پر نکل جاتا۔ بستیوں میں تقریریں کرتا پوسٹر لگاتا۔ لوگوں میں ہینڈ بل بانٹتا، اُن سے تبادلۂ خیال کرتا اور رات کو باقاعدگی کے ساتھ تعلیم بالغاں کے مرکز میں کلاس لیتا۔ اِس عرصہ میں ایک روز بھی وہ غیر حاضر نہیں رہا۔

رات گئے ہیڈ کوارٹر لوٹتا تو دن بھر کے کام کی پوری رپورٹ پیش کرتا۔

ان دنوں فلک پیما کے روزانہ اجلاس ہوتے۔ سلمان ہر اجلاس میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتا۔ بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

ان مصروفیات کے علاوہ فلک پیما کی جانب سے اس کو یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ صفدر بشیر کے ساتھ مزدوروں کی یونین میں کام کرے۔ یہ ٹریڈ یونین کچھ ہی دنوں پہلے قائم ہوئی تھی اور اُس کے قیام میں فلک پیما کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے قیام کی صورت یہ ہوئی کہ مزدور آئے دن ہیڈ کواٹر پر اپنی کوئی نہ کوئی شکایت لے کر آتے اور اسکائی لارکوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اُس وقت تک ان کی کوئی باقاعدہ یونین نہ تھی۔ ایک آدھ بار ایسی کوشش بھی کی گئی، مگر مالکان نے طرح طرح کے ہتھ کنڈوں سے اُسے ختم کرا دیا۔ لہذا فلک پیما کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مزدوروں کی باقاعدہ یونین بنا کر اس کو رجسٹرڈ کرایا جائے۔ اس کے تمام عہدے دار مزدور ہی تھے، اور اُن کی دیکھ بھال کے لئے فلک پیما نے صفدر بشیر کو مقرر کیا تھا۔ مگر جب یونین کا کام بڑھنے لگا تو سلمان کی ڈیوٹی بھی یونین میں لگا دی گئی۔ اس نئے کام میں بھی سلمان پوری سرگرمی کے ساتھ حصّہ لے رہا تھا۔

لیکن سلمان جس قدر سرگرم اسکائی لارک بنتا جارہا تھا، صفدر بشیر اسی قدر ڈھیلا ڈھالا ہو گیا تھا۔ اس کے انداز میں بے نیازی آگئی تھی۔ اُس کی یہ بے نیازی اسکائی لارک اُس وقت سے محسوس کر رہے تھے، جب سے ڈاکٹر زیدی کو اس کے مقابلہ میں میونسپل بورڈ کے انتخابات کے لئے فلک پیما کا اُمیدوار نامزد کیا گیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر لائبریری میں نظر آتا اور ہر وقت مطالعہ میں غرق رہتا۔ اُس کا چہرہ اُن دنوں بے حد سنجیدہ نظر آتا۔ وہ بات چیت بھی کم کرتا۔ اکثر اپنے سینٹر سے غیر حاضر رہتا، جس سے کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی اور ہیڈ کواٹر میں اُس کے خلاف شکایات آتیں۔ آخر فلک پیما کے ایک اجلاس میں صفدر بشیر

کی بڑھتی ہوئی بے عملی کا محاسبہ کیا گیا۔ اُس کے خلاف چارج شیٹ پیش کی گئی اور یہ وضاحت طلب کی گئی کہ کیوں نہ اُس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔

صفدر بشیر، فلک پیما کا نہ صرف صدر تھا بلکہ وہ اس کا بانی اور روحِ رواں بھی تھا۔ یہی وہ بنیادی اسباب تھے جن کے پیشِ نظر جنرل سیکرٹری علی احمد نے دوسرے اسکائی لارکوں کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ مشورہ دیا کہ فی الحال صفدر بشیر کو وارننگ دے دی جائے۔

علی احمد کی تجویز منظور کر لی گئی۔ صفدر بشیر کو وارننگ دی گئی کہ آئندہ وہ اپنے فرائض کی جانب سے غفلت نہیں برتے گا۔ صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور یقین دلایا کہ وہ ایک اسکائی لارک کی حیثیت سے اپنا کام پوری ذمہ داری کے ساتھ کرے گا۔

اِس یقین دہانی کے بعد کچھ عرصہ تک صفدر بشیر نہایت سرگرمی سے کام کرتا رہا، مگر اُس کی بے نیازی رفتہ رفتہ پھر سر اُبھارنے لگی۔ اسکائی لارک اُس کے اِس رویّہ کو محسوس کر ہی رہے تھے کہ اسی دوران میں صفدر بشیر نے ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی، جس سے اسکائی لارکوں میں اُس کے خلاف بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔

صفدر بشیر کی اِس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نوعیت یہ تھی کہ ایک روز اسکائی لارکوں نے گمٹی میں ایک بڑے جلسۂ عام کا انتظام کیا۔ اس جلسہ کے لئے وہ کئی روز سے پبلسٹی کر رہے تھے۔ پوسٹر لگائے گئے اور ہینڈ بِل تقسیم کئے گئے۔ اسٹریٹ کارنر میٹنگوں کے ذریعہ مسلسل اعلان کیا گیا۔ جلسہ گاہ میں بہت بڑا اجتماع تھا۔ لوگ دُور دُور سے چل کر جلسہ میں آئے تھے۔ اسکائی لارک اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں

تھے۔

جلسہ کا خاص مقرر صفدر بشیر تھا۔ وہ اپنے خطیبانہ انداز کے باعث علاقے میں بے حد مقبول تھا۔ وہ جوش میں آکر بولتا تو حاضرین کا تنفّس تیز ہو جاتا۔ گردن کی رگیں تن جاتیں، آنکھوں میں سُرخی دوڑ جاتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے۔ اُس کی تقریر میں یہ سحر تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں کبھی گڑبڑ مچ جاتی اور وہ ڈائس پر آجاتا تو چشمِ زدن میں جلسہ قابو میں آجاتا۔ اُس کی تقریر کی تکنیک یہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز کا حجم بڑھاتا جاتا۔ اسی رفتار سے اُس میں روانی پیدا ہوتی جاتی تھی، اور جب ٹمپو خوب بڑھ جاتا تو اُس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔ اُس کا لہجہ الہامی معلوم ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ صرف ایک چیز زندہ ہے۔ ایک آواز اور صرف ایک آواز۔ اور وہ آواز صفدر بشیر کی ہوتی۔ حاضرین جذبات سے بے قابو ہو کر نہایت جوشیلے نعرے لگاتے۔ بار بار تالیاں بجاتے۔ لیکن ایسی جذبات انگیز تقریریں وہ کسی بڑے اجتماع میں کرتا تھا۔ اور اُس روز ایسا ہی ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔

جلسہ کا آغاز ڈاکٹر زیدی کی تقریر سے ہُوا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا، اور بات کو سمجھا کر کہنے کا عادی تھا۔ وہ مدّھم لہجہ میں سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ جلسے میں بددلی سی پائی جاتی تھی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سٹیج نشین کی جانب صفدر بشیر کو دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ اس کی تلاش میں تھی، اور صفدر بشیر اُس وقت ایک بار میں بیٹھا وہسکی پی رہا تھا۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور اسکاٹ لارکوں سے چھپ کر کبھی کبھی شراب پیتا تھا۔ اُسے یہ عادت لندن کے دورانِ قیام میں پڑی تھی۔ جب بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتا تو شراب پیتا، اور اُس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح

اُس نے ذہنی سکون حاصل کرنے کا ایک بہانہ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اسی عالم میں جلسہ کے اندر آگیا۔ اُس وقت وہ نشہ میں دھت تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈائس پر پہنچا، جلسہ میں زندگی کی لہر دَوڑ گئی۔ بکھرا ہوا مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ لوگ صفدر بشیر کی تقریر کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ ایک ہیرو کی طرح اُٹھ کر مائیک کے سامنے آیا۔ حاضرین نے اُس کی آمد کا پُرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ صفدر بشیر نے اپنی تقریر شروع کی۔

"دوستو! ساتھیو! جی چاہتا ہے آج آپ سے کھُل کر باتیں کروں۔" وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔

"اِس اجتماع کو دیکھ کر مجھے ایسا محسُوس ہوتا ہے۔ گویا یہاں بہت سے کچھوے اکٹھا ہو گئے ہیں۔"

حاضرین نے چونک کر بے چینی سے پہلو بدلے۔ صفدر بشیر کہتا رہا —

"جی ہاں کچھوے، ایسے کچھوے، جنہوں نے اپنے پیر سمیٹ کر پیٹ کے اندر کر لئے ہیں اور گردن نکالے یوں دیکھ رہے ہیں، جیسے میں کوئی مداری ہوں، اور ابھی کوئی شعبدہ دکھاؤں گا۔"

اُس نے ہچکی لی۔ ذرا سا ڈگمگایا اور حاضرین کو گھُورنے لگا۔ جلسہ میں سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ اُبھر رہی تھی۔ کچھ لوگ ہونقوں کی طرح صفدر بشیر کا منہ تک رہے تھے۔

صفدر بشیر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کچھوؤں کی چال چلنے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ سائنس کی ترقی کا عہد ہے۔ آج ایک شخص ریڈیو سے تقریر کرتا ہے اور تمام دُنیا کے لوگ اُس کو سُن سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے۔ حرکت کرتے ہوئے۔ ہر انداز

ہیں۔ ہر عالم میں۔ جناب ترقی کی اس دوڑ میں آپ کہاں ہیں؟ افسوس تو یہی ہے کہ آپ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ گمراہی جرم ہے۔ آپ پھوسے نہ سہی، حضرت عیسیٰ کی بھیڑیں ہیں، جس کا جی چاہتا ہے، ہانک کرلے جاتا ہے۔ جدھر منہ اُٹھ گیا، اسی طرف نکل گئے۔"

جلسہ میں اب گڑبڑ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو اُس کا اندازِ تخاطب سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ ہرگز پھوسے اور بھیڑیں بننے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ وہ ہاتھ اونچے کر کے اس طرح ہلا رہے تھے، گویا اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے؟"

دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "ابے گھاس کھا گیا ہے؟"

کچھ نوجوان باقاعدہ مرغ کی بولی بولنے لگے۔

"ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔"

اب مختلف سمتوں سے صفدر بشیر پر آوازے کسے جارہے تھے۔ وہ ذرا سنبھلا، پریشان ہو کر بولا۔ "دیکھئے میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ بول رہا ہوں۔"

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس کے بعد قہقہوں کی آواز دیر تک جلسے میں گونجتی رہی۔

جلسہ درہم برہم ہو رہا تھا۔ لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ علی احمد قریب ہی بیٹھا تھا، اُس نے صفدر بشیر کا دامن پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ تمام اسکاٹی لاڈک جلسہ کا یہ عالم دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔ صفدر بشیر تقریر کرنے پر بضد تھا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بُری طرح نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اب اُس

نے اول فول بکنا شروع کر دیا تھا اور یہ تمام آوازیں لاوڈ اسپیکر سے نکل نکل کر گونج رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ علی احمد نے گھبرا کر ایمپلی فائر بند کر دیا۔ لاوڈ اسپیکر خاموش ہوگیا۔ اسکائی لارکوں نے بڑی مشکل سے صفدر بشیر کو بٹھایا۔

اب علی احمد جلسہ کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے فوراً سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ مائیک پر پہنچ گیا۔ بیٹری کا سوئچ کھول دیا گیا۔ جلسہ گاہ میں لگے ہوئے لاوڈ اسپیکر پہ سلمان کی آواز اُبھرنے لگی۔ وہ حاضرین سے معذرت کر رہا تھا۔ سلمان نے ان کو بتایا کہ صفدر بشیر ایک عرصہ سے بیمار ہیں۔ دن بھر اُن کو تیز بخار رہا۔ چونکہ حاضرین کو اُن کی تقریر سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ لہذا اُن کو بخار کی حالت میں یہاں لایا گیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ سرسامی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

سلمان نے یہ سب کچھ اس انداز میں کہا کہ بات بن گئی۔ ورنہ اس روز صفدر بشیر نے اسکائی لارکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اس افسوس ناک حادثہ نے اسکائی لارکوں کو صفدر بشیر کی جانب سے سخت برگشتہ کر دیا تھا۔ وہ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرنے والے تھے۔

اُنہی دنوں صفدر بشیر نے اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کا ایک اور ثبوت دیا۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ جوبلی ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے چار مزدوروں کو برطرف کر دیا۔ یونین نے انتظامیہ کی یک طرفہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا، اور یہ دھمکی دی کہ چاروں مزدوروں کو ہفتہ بھر کے اندر کارخانے میں واپس نہ لیا گیا تو ہڑتال کر دی جائے گی۔

مالکان نے یونین کے نوٹس کو مسترد کر دیا اور برطرف شدہ مزدوروں

کی ملازمت بحال کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی روز مزدور یونین کا جلسہ ہوا۔ اس میں صفدر بشیر اور سلمان دونوں شریک ہوئے۔ جلسہ میں ہڑتال کا نوٹس دینے کی قرارداد پیش کی گئی۔ سلمان نے قرارداد کی پوری پوری تائید کی۔ مگر صفدر بشیر ہڑتال کا مخالف تھا۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ مزدوروں کی تنظیم ابھی مضبوط نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا قدم نہ اُٹھایا جائے۔ لیکن مزدوروں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اُنہوں نے صفدر بشیر کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور ہڑتال کی قرار داد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

ہڑتال کے دوسرے دن مزدوروں نے کارخانے کے سامنے مظاہرہ کیا۔ اور اُن مزدوروں کی روکنے کی کوشش کی جو ڈیوٹی پر جانا چاہتے تھے۔ کارخانے کے جنرل منیجر نے فوراً پولیس بُلوائی۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ ہوا، نہ گڑبڑ۔ مظاہرین پُرامن تھے۔ ہڑتال بہت کامیاب جا رہی تھی۔ منتظمین کو یہ پُرامن مظاہرہ خطرناک معلوم ہوا۔ چنانچہ اُنہوں نے سہ پہر کو اپنے کچھ غنڈے بھیج کر بلوہ کرا دیا۔ پولیس نے نقصِ امن کے پیشِ نظر ہڑتالی مزدوروں پر تین بار لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج آٹھ مزدور زخمی ہو گئے۔ مظاہرین کو منتشر ہونا پڑا۔ اُسی روز کارخانے کے گرد نواح کے علاقہ میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔

اِس تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے رات کو یونین کا ہنگامی جلسہ طلب کیا گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ یونین کے دفتر پر پولیس چھاپہ مارنے والی تھی اور کچھ گرفتاریوں کی افواہ بھی گرم تھی۔ صفدر بشیر نے اُس روز شام ہی سے طبیعت خراب ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ دراصل وہ جلسہ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یوں بھی اُسے یونین کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، بلکہ فلک پیما کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اُس نے ایک بار زور بھی دیا تھا کہ اسکائی لارکوں کو مزدور تحریک میں حصّہ لینا نہیں چاہیئے۔ اُنہیں اپنی سرگرمیاں صرف

سماجی بہبود کے کاموں تک محدود رکھنا چاہئیں۔ وہ فلک پیما کو صرف ایک فلاحی تنظیم کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

سرِ شام ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی چلا گیا اور یونین کے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ جلسہ سے غیر حاضری کے لیئے اُس نے بیماری کا عذر پیش کیا۔ مگر اسکائی لارکوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ خان بہادر فرزند علی کے ساتھ اُس شب بادہ و ساغر کا لطف اُٹھا رہا تھا۔

صفدر بشیر کے اس غیر ذمہ دارانہ رویّہ نے اسکائی لارکوں کو مشتعل کر دیا۔ اُن کے مطالبہ پر فلک پیما کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ صفدر بشیر جلسہ میں موجود تھا۔ وہ ایک ملزم کی طرح خاموش بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ نہ اُس نے کسی سے بات کی نہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کے مجسمہ کی طرح چُپ چاپ بیٹھا رہا۔

جلسہ کی صدارت فہیم اللہ کر رہا تھا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو سلمان نے صفدر بشیر کے خلاف چارج شیٹ پیش کی۔ بہت سے الزامات کے علاوہ اس کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ تھا کہ وہ خان بہادر فرزند علی سے سازباز کر کے فلک پیما کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ صفدر بشیر نے یہ سنگین الزام سُنا تو غصّہ سے اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ وہ فلک پیما کا صدر تھا۔ اس کا بانی تھا۔ اور اُس کو باقاعدہ تحریک کی شکل دینے میں، اُس نے ساٹھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ سخت جد و جہد کی تھی، اور عیش و آرام کی زندگی ترک کر رُوکھی، پھیکی بے مزہ زندگی اختیار کی تھی۔ فلک پیما کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کر کے اُس کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی تھی۔ یہ بات کبھی اُس کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ اُس کو فلک پیما سے صرف اِس قدر شکایت تھی کہ ڈاکٹر زیدی کے بجائے میونسپلٹی کے انتخابات میں اُس کو فلک پیما کا اُمیدوار کیوں نامزد

نہیں کیا گیا۔ وہ خود کو ڈاکٹر زیدی سے زیادہ بہتر اور مستحق اُمیدوار سمجھتا تھا۔

اسکائی لارکوں نے یہ فیصلہ کر کے اُس کے ساتھ بے انصافی کی تھی۔ جہاں تک خان بہادر کے ساتھ ساز باز کرنے کا سوال تھا، صفدر بشیر کو خود خان بہادر سے شدید نفرت تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ اُس شب وہ یونین کے جلسے میں شریک ہونے کے لئے نکلا تو راستے میں خان بہادر مل گیا۔ اور اصرار کر کے اپنی کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں خان بہادر نے الیکشن کے متعلق اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر اُس نے خان بہادر کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

چارج شیٹ پیش کرنے کے بعد سلمان نے یہ مطالبہ کیا کہ صفدر بشیر کو صدر کے عہدے سے فوری طور پر معطل کر دیا جائے اور اس کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کر کے سخت کارروائی کی جائے۔ صدر نے صفدر بشیر کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیا۔ مگر وہ غصّہ سے اس قدر بے قابو ہو رہا تھا کہ اُس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور احتجاجاً اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔

صفدر بشیر کے چلے جانے کے بعد بھی اجلاس کی کارروائی جاری رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد صفدر بشیر کا ڈرائیور آیا۔ وہ جنرل سیکرٹری علی احمد کے نام ایک خط لایا تھا۔ یہ صفدر بشیر کا استعفیٰ تھا۔ اُس نے فلک پیما سے علیٰحدگی اختیار کرنے کی درخواست کی تھی۔

علی احمد کو یہ علم نہیں تھا کہ جذبات کی رَو میں وہ اِتنی دُور نکل جائے گا۔ اُس نے استعفیٰ پڑھ کر سنایا اور اسکائی لارکوں سے اپیل کی کہ فی الحال اِس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ فلک پیما کے آیندہ اجلاس میں اس پر غور کیا جائے۔ اِس تجویز کو مان لیا گیا، اور صفدر بشیر کے استعفیٰ پر اُس روز کوئی بحث

نہ ہوئی۔

(۲۳)

مئی کی شروع تاریخیں تھیں۔ میونسپلٹی کے انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ تمام دن لو چلتی۔ آسمان پر گہرا زرد غبار چھایا رہتا۔ درختوں کے پتے جھلس گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں جسم موم بتی کی طرح پگھلتے تھے۔ پہر دن گزرتے ہی شہر میں سناٹا پڑ جاتا۔ دوپہر تک کوچہ و بازار سنسان ہو جاتے۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی۔ علی احمد کمرے میں بیٹھا ایک نیا انتخابی پوسٹر تیار کر رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر سلمان داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتما رہا تھا۔ بالوں پر گرد کے ذرات بکھرے تھے۔ بدن پسینہ سے شرابور تھا۔ علی احمد نے گردن موڑ کر اُس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

"کیا خبر لائے ہو اسکاٹ لارک سلمان؟"

سلمان نے ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا" ابھی ابھی ایک بڑی شاندار خبر ملی ہے۔"

"شاندار خبر ہے، تو ضرور سناؤ۔"

"ایک حریف تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔"

علی احمد چونک پڑا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "کیا؟"

"عبدالحمید تو اَن اپوزڈ ہو گیا۔" سلمان اس وقت بڑی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔" آج اُس نے کاغذات نامزدگی بھی واپس لے لئے۔"

لمحہ بھر کے لئے اُس نے توقف کیا: "کہئے ہے نا زور دار خبر۔ اب تو صرف خان بہادر ہی میدان میں رہ گیا ہے اور وہ بھی کیا۔" یہ کہہ کر سلمان نے قہقہہ لگایا۔ مگر اس اطلاع پر علی احمد نے کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اس کو اس طرح خاموش دیکھ کر سلمان کو کسی قدر تعجب ہوا۔ پوچھنے لگا: "آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

علی احمد نے آہستہ سے کہا: "بھئی یہ تو کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔"

سلمان حیرت سے چونک پڑا: "کیوں؟"

"میرے اندازے کے مطابق، اس کو دو ہفتے پہلے ہی انتخابات سے دست برداری کا اعلان کر دینا چاہیئے تھا۔ مجھے خود حیرت تھی کہ عبدالحمید ابھی کیوں ڈٹا ہوا ہے؟"

سلمان اُس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ پوچھنے لگا: "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟"

علی احمد اُس کو سمجھانے لگا: "تم نے غالباً یہ غور نہیں کیا کہ عبدالحمید کے بیٹھ جانے سے فائدہ کس کو پہنچے گا۔ اگر عبدالحمید الیکشن لڑتا تو خان بہادر کے ووٹ تقسیم ہو جاتے۔ اُس کے زیادہ تر ووٹر متوسط طبقے سے ہیں۔ یہ ایسا طبقہ ہے جو کسی وقت بھی جذباتی نعروں سے گمراہ ہو کر ہمارا مخالف بن سکتا ہے اس کے طبقاتی کردار کا یہی تقاضہ ہے۔ یہ ناقابلِ اعتماد طبقہ ہے۔"

وہ لمحہ بھر کے لئے رُکا اور سلمان سے پوچھنے لگا۔

"یہ تو بتاؤ صفدر بشیر کس عالم میں ہے؟"

سلمان نے مختصر سا جواب دیا: "مجھے ان کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں۔ صرف اتنا سُنا ہے کہ اب وہ کثرت سے شراب پینے لگے ہیں اور اُن کا

مزاج بہت چڑچڑا ہوگیا ہے۔"

علی احمد کا چہرہ افسردہ ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس خبر سے اُسے بہت صدمہ پہنچا۔ اُس نے افسردہ لہجے میں کہا: وہ اپنی جذباتیت کا شکار ہوگیا۔ ہائے بے چارہ صفدر بشیر!" وہ ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے سلمان سے کہا۔

"عبدالحمید کی کنارہ کشی کسی صورت میں ہمارے لئے مفید نہیں۔ اُس کے سارے ووٹ خان بہادر کے حق میں جائیں گے۔ فلک پیما کی جڑیں کہیں مضبوط ہیں تو وہ علاقے کے غریب اور پسماندہ لوگ ہیں۔ کارخانوں کے مزدور ہیں، جو ہمارے پکے ووٹ ہیں۔ ہمیں یونین میں اپنا کام تیز کر دینا چاہیئے۔ یوں بھی اب ہمیں اپنی انتخابی مہم زیادہ تیز کرنا پڑے گی۔"

سلمان نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ علی احمد نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ سلمان کو دی، دوسری اپنے ہونٹوں میں دبائی اور اس کو سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر لُو کے جھکڑ غراتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب کے اصطبل میں بندھا ہوا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ سنسان دوپہر میں اس کی آواز کسی پاگل کی چیخوں کی طرح خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز اُبھری، وہ کہہ رہا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے خان بہادر نے عبدالحمید کو تگڑی رقم دی ہے، ورنہ وہ آسانی سے بیٹھنے والا اُمیدوار نہیں تھا۔ بہرحال خان بہادر کی قوت اب کسی قدر مضبوط ہوگئی ہے۔" وہ سلمان کی اطلاع پر تبصرہ کرتا رہا۔ چند منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اِس کے بعد گفتگو ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔

سلمان کو ابھی کہیں جگہ جانا تھا۔ اُس نے اپنا تھیلہ اُٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ علی احمد پوسٹر تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کمرے میں ایک بار سکوت ہو گیا۔ باہر لو کے جھکڑوں کی سرسراہٹیں اُبھرتی رہیں۔ کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ آہستہ آہستہ بجتا رہا۔

علی احمد کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ دوسرے ہی دن عبدالحمید کی جانب سے جاری کئے جانے والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ ان پوسٹروں میں عبدالحمید نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خان بہادر کے حق میں انتخابات سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے ووٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خان بہادر کی پوری حمایت کریں۔

اس اعلان کا فوری ردِّ عمل یہ ہوا کہ خان بہادر کے حامیوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ چند ہی روز بعد اُنھوں نے ایک جلسۂ عام کا بندوبست کیا۔ یہ انتخابی مہم کے سلسلہ میں خان بہادر کی جانب سے پہلا جلسہ تھا۔ اِس سے قبل وہ عام جلسہ کراتے ہوئے ڈرتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے اور رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے۔ اُس کے کارکنوں کے حوصلے اور پست ہو جاتے۔

جلسہ کو کامیاب بنانے کے واسطے بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں کی گئیں۔ ہر طرف قدِ آدم پوسٹر لگائے گئے۔ خان بہادر کی دو جیپیں رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جلسہ کا اعلان کرتی رہتیں۔

ان تیاریوں کو دیکھ کر اسکاؤٹ لارکوں میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ فلک سیما کے ایک اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان بہادر کے جلسہ کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ چند جوشیلے اسکاؤٹ لارک اِس حد تک کمربستہ تھے کہ جلسہ گاہ کے اندر گھس کر بجلی کا تار کاٹ دیں گے۔ ہڑبونگ مچا کر جلسہ کو درہم برہم

کر دیں گے۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی سخت مذمت کی۔ اُس نے کہا کہ اسکالئ لارک اپنے مخالفین کو قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ نہیں دیں گے تو وہ اپنی صفوں کو حریف کے خلاف کبھی مستحکم نہ بنا سکیں گے۔ اُن کو اپنی کمزوریوں کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ اس کے نزدیک یہ بزدلی کی نشانی تھی۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکالئ لارکوں کی مخالفت پہ اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔

خان بہادر نے اس جلسہ پر خوب روپیہ صرف کیا تھا۔ پنڈال کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چپّہ چپّہ پر رنگ برنگے برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شہ نشین کئی گز اونچی بنائی گئی تھی۔ اُس کے چاروں طرف زرتار پردوں کی محرابیں تھیں۔ بیچ میں فانوس لٹک رہے تھے۔ دبیز قالینوں کا فرش تھا، جس پر صدر کے لئے ایک اونچی کرسی رکھی تھی۔ اُس پر سُرخ مخمل کا غلاف تھا۔ ہوا چلتی تو محرابوں کے زرتار پردے لہراتے۔ ہر طرف ستاروں کی افشاں بکھر جاتی۔ شہ نشین دُور سے کسی بارہ دری کی طرح پُر شکوہ نظر آتی۔

جلسہ کا انتظام رفعت علی دستگیر کے سپرد تھا۔ وہ پستہ قد کا آدمی تھا۔ چہرہ پر چگی داڑھی۔ لمبی کاکلیں اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھایا ہوا عصا۔ اس حلیہ میں وہ اُن صوفیوں کی طرح نظر آتا تھا جن کو محفل سماع کی زینت کے لئے خاص طور پر بلایا جاتا ہے جو قوالوں کو پیسہ کوڑی تو کبھی نہیں دیتے، مگر عالم وجد میں وہ کرتب دکھاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن دستگیر کا تصوف اور کشف و کرامات سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ وضع قطع اُس نے محض اپنی شخصیت کو باوقار بنانے کے لئے اختیار کی تھی۔

دستگیر جلسوں کو کامیاب بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ویسے پیشے کے اعتبار سے وہ درزی تھا۔ شہر میں اُس کی دکان بھی تھی۔ مگر الیکشن کے دنوں میں وہ انتخابات لڑانے اور انتخابی جلسے کرانے کا کام بھی کرتا تھا اور ہمیشہ ٹھیکے پر

کام کرتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کی باقاعدہ ٹولی تھی، جن میں نعرہ لگانے والے، نعرہ اُٹھانے والے، تالیاں بجانے والے بھی تھے، اور ایسے مضبوط غنڈے بھی تھے کہ اگر کسی نے ذرا بھی جلسہ میں گڑبڑ کی تو فوراً اُس کی گردن دبوچ لیتے۔ مگر اب اس کی ٹکڑی منتشر ہوگئی تھی۔ البتہ پرانی ساکھ باقی تھی۔

جلسہ شروع ہونے کا جو وقت مقرر تھا، رفعت علی دنگیر اس سے گھنٹہ بھر پہلے ہی جلسہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے پنڈال کا گھوم پھر کر باقاعدہ معائنہ کیا۔ اُس کے ہمراہ ۲۵ افراد کی ٹیم تھی۔ دنگیر نے ہر ایک کو مختلف مقامات پر تعینات کیا۔ نعرہ لگانے والوں کو ہدایتیں دیں کہ پہلے کون ابتدا کرے گا، اور اس کے بعد کس طرح سب مل کر نعرہ لگائیں گے۔ تالیاں پیٹنے والے کس موقعہ پر تالیاں بجائیں گے۔ جب تک وہ سگنل نہیں دے گا، نہ کوئی نعرہ لگے گا، نہ تالیاں بجیں گی۔

وہ ایک روز قبل باقاعدہ ریہرسل بھی کرا چکا تھا۔ مگر بیشتر اناڑی تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے وہ اُنہیں بار بار ہدایتیں دے رہا تھا اور ڈانٹتا بھی جا رہا تھا۔ "دیکھو بے! کسی نے اُلٹی سیدھی حرکت کی تو دھیلا نہیں دوں گا۔" اُن کے ریٹ کچھ اِس طرح مقرر تھے۔

نعرہ لگانے والے فی کس پانچ روپے۔

نعرہ اُٹھانے والے فی کس دو روپے۔

تالیاں بجانے والے فی کس ایک روپیہ۔

اِس کے علاوہ دنگیر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جو بہت زور دار اور جوشیلے نعرے لگائے گا اُس کو انعام بھی ملے گا۔

اِن تیاریوں سے فارغ ہونے کے بعد دنگیر نے غنڈوں کی ڈیوٹیاں مقرر کیں۔ اُن کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر، وہ خان بہادر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہی سے لوگ جلسہ گاہ میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ خان بہادر کی آمد سے پہلے ہی پنڈال کھچا کھچ بھر گیا۔ پندرہ ہزار سے زیادہ کا اجتماع تھا۔ حاضرین میں بڑی تعداد خان بہادر اور اُس کے حامی کارخانہ داروں کی فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تھی، جنہیں بسوں میں بھر بھر کر جلسہ گاہ تک لایا گیا تھا۔ اُنہیں جلسے میں شرکت کرنے کے لئے باقاعدہ اوور ٹائم دیا گیا تھا۔

آٹھ بجنے سے کچھ دیر قبل خان بہادر کی کار جلسہ گاہ پر آکر رُکی۔ اُس کے کارکن، چیلوں کی طرح کار کی جانب جھپٹے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ خان بہادر بڑے وقار کے ساتھ باہر آیا۔ کارکنوں اور عقیدت مندوں نے بڑھ بڑھ کر اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ دگلگیر نے فوراً نعرہ لگانے والوں کو اشارہ کیا۔ فضا خان بہادر زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔

خان بہادر، کارکنوں اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں مسکراتا، ہاتھ ہلاتا، آگے بڑھا۔ خلقت اُس پر اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ شہ نشین تک پہنچنے میں پورے دس منٹ لگے۔

شہ نشین پر پہنچ کر، خان بہادر نے جلسہ پر نظر ڈالی۔ اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اجتماع اُس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ مسرت سے اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ روشنیوں سے جگمگاتے پنڈال میں، ہار پھولوں سے لدا، وہ دولھا کی طرح سجا، سجایا، مہمانِ خصوصی بنا ایک اونچی کرسی پر رونق افروز تھا۔ ہر نگاہ اُس کی جانب اُٹھتی تھی۔ ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس حقیقت کا خان بہادر کو شدت کے ساتھ احساس بھی تھا۔

خان بہادر کے ساتھ نیاز بھی جلسہ میں آیا تھا۔ اُس نے یہ آن بان اور دبدبہ دیکھا تو خان بہادر کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اُس کے سامنے دور تک انسانی چہرے ہی چہرے نظر آرہے تھے۔ اور یہ سب خان بہادر کے

حامی اور مددگار تھے۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ واقعی خان بہادر بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ بار بار خان بہادر کی جانب دیکھتا، جو اونچی کرسی پر کسی فرماں روا کی مانند فروکش تھا۔ اُس کی گردن فخر سے اُوپر اُٹھی تھی۔ چہرے پر وقار اور گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

جلسہ کی کارروائی کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہُوا۔ ایک مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اُس نے خان بہادر کی شان میں خوب خوب قصیدہ خوانی کی۔ اُس کے بعد کئی دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ ہر تقریر کا لُبِ لباب یہ تھا کہ خان بہادر، عوام کا مخلص رہنما، ایک سچا اور صالح مسلمان تھا۔ اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ اُن کے ووٹوں کا صحیح حقدار تھا۔

قریب قریب ہر مقرر نے "نورانی مسجد" کی تعمیر کو خان بہادر کی گراں قدر خدمت اور ایمان افروز کارنامہ قرار دیا۔ اُنھوں نے خان بہادر کو عوام کا نمائندہ ثابت کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے وہ، وہ جوہر دکھلائے کہ خان بہادر کے پیسے وصول ہو گئے۔

اِن تقریروں کے دوران، رفعت علی دلگیر اور اُس کی ٹیم نے اسقدر جوش و خروش سے نعرے لگائے کہ جلسہ میں زبردست گرمی پیدا ہو گئی۔ لیکن جوں جوں خان بہادر کے تقریر کرنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا، اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے آج تک کسی جلسۂ عام سے خطاب نہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے یہ سوچ کر چلا تھا کہ اپنی تقریر سے دھوم مچا دے گا۔ یہ تقریر اُس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے لکھوائی تھی اور کئی روز تک بند کمرے میں ٹہل ٹہل کر اُسے رٹا تھا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر چہرے پر مختلف انداز سے تاثرات پیدا کرنے کی باقاعدہ مشق بھی کی تھی، ایک

بار کنبے کے تمام افراد اور گھر کے نوکروں کو اکٹھا کر کے اُن کے رُوبرو تقریر کا ریہرسل بھی کیا تھا۔ مگر اب اتنا بڑا مجمع دیکھ کر کسی قدر وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اُس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔

آخر خان بہادر بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کرنے سے پیشتر اُس نے پورا گلاس پانی کا پیا۔ سگار پر کئی لمبے لمبے کش لگائے۔ مگر وہ تقریر جو رٹ کر آیا تھا، اُس کے ذہن سے نکلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے کر اُس کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک طرف سے نعرہ بلند ہوا۔

"نعرۂ تکبیر!"

اور اس کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے آوازیں آئیں۔

"اَللہُ اکبر"

"خان بہادر زندہ باد"

"خان بہادر زندہ باد"

ان نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ خان بہادر کی یادداشت بالکل جواب دے گئی۔ بدحواس ہو کر اُس نے سگار کے دو تین اور لمبے لمبے کش لگائے۔ اس کے پَیر آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ تنفّس تیز ہو گیا تھا اور سارا خون سمٹ کر اُس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اُس نے اِسی عالم میں تقریر شروع کر دی

"برادرانِ اسلام! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لُوں گا۔ مجھے آپ سے صرف چند ضروری باتیں کہنا ہیں۔"

یہ دو جملے اُس نے بڑی مشکل سے ادا کئے۔ اُس کی آواز قدرے بھرّائی ہوئی تھی۔ مگر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں آپ کا ایک

خادم ہوں، آپ کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کو اپنی تقریر کا کچھ حصّہ یاد آگیا۔ اُس نے فوراً کہا۔" لیکن یہ بات تو ہر اُمیدوار آپ سے کہتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں آپ کی خدمت کا جذبہ ہے، ہر ایک آپ کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ تو پھر آپ میری بات پر یقین کیوں کرنے لگے۔ آپ کہیں گے کہ خان بہادر ووٹ لینے کے لئے یہ سب ڈھونگ رچا رہا ہے۔ وہ پہلے درجے کا عیار اور مطلبی ہے۔"

خان بہادر اپنی تقریر کو ٹوسٹ دے کر حرفِ مطلب پر آنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے عین اُس وقت رفعت علی دلگیرؔ کے سر میں کھجلی ہوئی۔ اس نے سر کھجانے کے لئے اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ ایک تالی بجانے والے کی نظر اُس پر پڑگئی۔ وہ سمجھا دلگیر سگنل دے رہا ہے۔ اُس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور زور زور سے تالی بجانے لگا۔ اُس کے دوسرے ساتھی بھی تالی بجانے لگے۔

تالیوں کا شور سُن کر مشرقی کونے پر کھڑے ہوئے نعرہ لگانے والے نے اپنی مستعدی کا ثبوت دیا۔ اُس نے فوراً گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

" سچ کا بول بالا "

جلسے سے مِلی جُلی آوازیں اُبھریں۔

" جھُوٹے کا منہ کالا "

" دھاندلی بازی "

" نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی "

" ووٹوں کی دلّالی "

" نہیں چلے گی، نہیں چلے گی "

حاضرینِ جلسہ بھی ان نعروں میں شریک ہوگئے۔ اُن کی آوازوں کے

شور سے جلسہ گاہ گونجنے لگی۔ یہ نعرے دراصل اسکاٹی للاکوں کے تھے اور خان بہادر کے کارکنوں نے انہی کے خلاف استعمال کرنے کے لئے دگیر کے آدمیوں کو رٹائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ خان بہادر جب اسکاٹی للاکوں کی مذمت کرے تو وہ یہ نعرے لگانا شروع کر دیں۔

خان بہادر نے یہ نعرے سُنے تو گھبرا کر سوچا کہ جلسے میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس کی مخالفت میں نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ تقریر کا وہ حصّہ جو اُس کو یاد آیا تھا، بالکل ذہن سے نکل گیا۔ دوسری طرف دگیر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ خان بہادر کی نظروں سے بچتا پھر رہا تھا۔ غصہ سے بڑبڑا رہا تھا۔

"سالوں نے میری ناک کٹوا دی۔ کسی حرام کے تخم کو ایک پیسہ نہیں دونگا۔ یارو! غضب ہو گیا۔"

غصّہ سے اُس کی چگّی داڑھی بکرے کی دُم کی طرح ہل رہی تھی۔ نتھنوں سے سانس، شوں، شوں، کر کے نکل رہی تھی۔ اس وقت وہ اچھا خاصا ناٹک کا مسخرا نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر غضب ناک ہو کر کہنے لگا: "بعض لوگ جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُن کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔"

دگیر نے دیکھا موقعہ غنیمت ہے۔ اُس نے فوراً سگنل دیا اور جلسہ "نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر" کے نعروں سے گونجنے لگا۔

دگیر کو سُرخ رُو ہونے کا موقع مِلا تھا۔ اب وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا، جہاں سے خان بہادر اس کو دیکھ سکتا تھا۔ ان نعروں نے واقعی اثر کیا۔ خان بہادر جوش میں آ کر کہنے لگا: "میں اپنے متعلق خود اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتا مگر میری خدمات کو آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ احمد نگر کی نورانی مسجد کس

نے بنوائی ؟"

شامت اعمال کسی دل جلے کی زبان سے نکل گیا: "مسجد کی دوکانوں کی دو لاکھ پگڑی کس نے لی ؟"

دلگیر کے گرگے چیلوں کی طرح اُس شخص پر جھپٹے اور لاتوں اور گھونسوں سے مارتے ہوئے جلسے کے باہر لے جانے لگے۔ اس رویّہ پر حاضرین نے احتجاج کیا۔ جلسہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے غنڈوں کی گرفت سے اس شخص کو چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ پھر تو اس قدر ہنگامہ برپا ہوا، ایسا غل غپاڑہ ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اُٹھا، اسی طرف بھاگا۔ خان بہادر نے یہ عالم دیکھا تو وہ بھی بدحواس ہو گیا۔ چپکے سے شہ نشین سے اُترا اور کارکنوں کے حلقے میں گھرا ہوا جلسہ سے باہر آگیا۔ کار منگوائی اور اُس میں بیٹھ کر سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

بھگدڑ پڑنے کے بعد آناً فاناً پنڈال خالی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں اُلّو بولنے لگا۔ اب صرف کارکن اور دلگیر شامیانے کے نیچے رہ گئے تھے۔ دلگیر سخت برہم نظر آرہا تھا۔ اُس کے گرگے سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ اُن کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جب اُس کو زیادہ تاؤ آتا تو اُن پر برسنے لگتا۔

"ابے تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں خان بہادر کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ یاد رکھنا کسی سالے کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میرا تو بیڑا غرق ہو ہی گیا۔ مگر تم کو بھی نہیں بخشوں گا۔ ابے تم کو کس کس طرح سمجھایا۔ مگر سب نے اپنا حرامی پن دکھایا۔ یارو ! ذرا تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ تُف ہے تم پر اتنے بڑے ڈھو جوان ہو کر تمہاری یہ حرکتیں۔"

وہ دیر تک اُن کو ڈانٹتا رہا اور بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

رفعت علی دستگیر شرم کے مارے خان بہادر کے پاس نہ گیا، اور پنڈال سے نکل کر سیدھا اپنے درزی خانے گیا۔ لیکن خان بہادر کو اُس سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ اُس نے جلسے کے درہم برہم ہو جانے کی ساری ذمہ داری اسکائی لارکوں پر عائد کی۔ وہ اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا، سارا غصہ اسکائی لارکوں پر اُتارتا رہا۔ کارکن بھی اُس کی تائید کر رہے تھے۔

رات گئے تک خان بہادر کی کوٹھی پر یہی چرچا رہا۔ آئندہ کے لئے نئے انتخابی ہتھکنڈے اور اسکیمیں سوچی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ جوابی کارروائی کے طور پر اسکائی لارکوں کے ہر جلسے کو ہنگامہ اور گڑبڑ کے ذریعے درہم برہم کرایا جائے۔

(۴)

چند ہی روز بعد اسکائی لارکوں نے بھی جلسۂ عام کیا۔ حاضرین کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ ان میں جوش و خروش بھی تھا۔ سلمان تقریر کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ انتخابی مہم کے سلسلہ میں تقریریں کرتے کرتے اب وہ منجھ گیا تھا۔ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کا اپنا اسٹائل بنتا جا رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب مقرر سمجھا جانے لگا تھا۔

سلمان نے دورانِ تقریر ایک بار اپنی آواز اُونچی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی پریشان حالی اور دُکھوں کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مجبور ہیں، بے سہارا ہیں، کمزور ہیں۔ آپ کی پریشانیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں، آپ اپنے حقوق اور اُن کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔" سلمان بڑی روانی کے ساتھ بول رہا تھا۔ اچانک جلسہ کے اندر سے کئی آوازیں

اُبھریں۔

"جھوٹ بولتا ہے۔"

"بہروپیا ہے۔"

"سب ووٹ مانگنے کا ڈھونگ ہے۔"

"ہم تقریر نہیں سُنیں گے۔"

"واپس جاؤ، واپس جاؤ۔"

اِس کے ساتھ ہی جلسہ میں شور ہونے لگا۔ اس میں چیخ چیخ کر بولنے والوں کی آوازوں کے ساتھ مُرغوں اور بلّیوں کی بولیاں بھی سُنائی پڑ رہی تھیں۔ سلمان کسی قدر گھبرا گیا۔ اس لئے کہ یہ اس کے ساتھ پہلا اتفاق تھا۔ اُس نے لوگوں سے خاموش رہنے کی درخواست کی تو شور مچانے والے اور بھی زیادہ اُونچی آواز سے چیخنے لگے۔ یہ آوازیں کچھ اس طرح آپس میں گھُل مِل گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔

جلسے میں پہلے تو کچھ سراسیمگی پھیلی، کچھ لوگ اُٹھ کر جانے لگے۔ کچھ پنجوں کے بَل اُونچے ہو ہو کر اُس طرف دیکھنے لگے جس طرف شور ہو رہا تھا۔ یہ پندرہ بیس افراد کا غول تھا، جس میں ہر شخص ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ مگر وہ اس طرح زیادہ دیر شور نہ مچا سکے۔ جلسہ کے اندر سے کچھ جوشیلے نوجوان نکلے اور ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ جھگڑا کرنے پر آمادہ ہو گئے اور یہی ان کے حق میں بُرا ہوا۔

اچانک اُن پر چاروں طرف سے مار پڑنے لگی۔ کچھ تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی صاف نکل گئے، مگر جن کو لوگوں نے پکڑ لیا تھا، اُن پر دھڑا دھڑ جُوتے پڑنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں اُن کی اچھی خاصی مرمّت ہو گئی۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے منّت سماجت کی۔ بڑی مشکل سے اُن کی گلوخلاصی ہوئی۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جلسہ پھر شروع ہو گیا اور رات گئے تک جاری رہا۔ سلمان نے اور بھی زیادہ جوش کے ساتھ تقریر کی اور یہ حقیقت ہے کہ اُس کی یہ تقریر بڑی ولولہ انگیز تھی۔ لوگ بار بار نعرے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کی آوازیں، رات کے سناٹے میں دُور تک سُنائی پڑ رہی تھیں۔

اسی رات فلک پیما کا اجلاس ہُوا، جس میں جلسہ کے اندر ہونے والی گڑبڑ پر غور کیا گیا۔ اِس لئے کہ یہ ابتدا تھی اور آئندہ کے واسطے اسکاؤٹ لڑکوں کو تنبیہ تھی۔ اجلاس میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اسکاؤٹ لڑکے اس واقعہ پر بہت برہم تھے اور اُونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔

کمرے کے اندر سگرٹوں کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے چاروں طرف سُرمئی غبار کا جال پھیل گیا تھا۔ اُس کی روشنی دھندلی پڑ گئی تھی اور اِس دھندلی روشنی میں اسکاؤٹ لڑکوں کے چہرے پرچھائیوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہی دھواں دھواں تھی۔

اچانک دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہُوا کھُلا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ صفدر بشیر کھڑا تھا۔ اُس کے بال پٹ سن کے ریشوں کی طرح خشک تھے۔ پیشانی پر گہری لکیریں تھیں، چہرے کا رنگ خاکستری پڑ گیا تھا۔ رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان اُس کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

صفدر بشیر لمحہ بھر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اُس کے قدموں کی آہٹ پختہ فرش پر کھٹ کھٹ اُبھرتی رہی۔ وہ علی احمد کی پشت پر آ کر چٹان کی طرح ایستادہ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں صفدر بشیر کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جنابِ صدر اور اسکائی لارک ساتھیو! میں اس بے جا مداخلت کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے اجلاس میں مجھے اِس طرح آنے کا کوئی حق نہیں۔ فلک پیما سے ایک جذباتی لگاؤ تھا، جو مجھے یہاں کھینچ لایا۔ شاید میں آخری بار اسکائی لارکوں کو، اُن کے ہیڈ کوارٹر کو اور اس کے در و دیوار کو دیکھ رہا ہوں۔"

صفدر بشیر ٹھہر، ٹھہر کر، آہستہ، آہستہ اس طرح بول رہا تھا، جیسے ہانپ رہا ہو۔ "میں اس شہر کو، بلکہ اِس ملک کو، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام جائداد فروخت کر دی ہے اور لندن میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

اس کا خوبصورت چہرہ، پت جھڑ کے پتوں کی طرح زرد پڑتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک دُھندلی پڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں فلک پیما کا ایک رُکن رہ چکا ہوں اور مجھے دُکھ ہے کہ جدوجہد کے اس سفر میں، میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکا۔ حالانکہ یہ میری زندگی کا آئیڈیل تھا۔ میں اب غبارِ کارواں ہوں۔ منزل سے بھٹکا ہوا، تھکا ہارا راہی ہوں۔ جس کا کوئی ہمراہی نہیں، جس کی کوئی منزل نہیں۔"

یہ کہتے کہتے، وہ اچانک خاموش ہوگیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ وہ بیماروں کی طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی تھی۔ ہر اسکائی لارک، اُداس، اُداس اور کھویا کھویا لگ رہا تھا۔ پھر علی احمد اُٹھ کھڑا ہوا۔ لمحہ بھر تک وہ صفدر بشیر کے چہرے کو تکتا رہا۔ اُس نے اپنے بازو پھیلائے اور بڑے جذباتی انداز میں صفدر بشیر کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

کچھ دیر تک دونوں اسی عالم میں کھڑے رہے۔ کمرے کی خاموشی میں دبی، دبی سسکیوں کی آواز اُبھری۔ صفدر بشیر رو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئی تھیں۔ سانس اُلجھی ہوئی تھی۔ علی احمد نے اُس کی پیٹھ آہستہ، آہستہ

بھینچ کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر جذباتی ہو۔ صفدر بشیر! ابھی تم بچے ہو۔"

صفدر بشیر اس کے شانے پر جھکا ہوا آنسو بہاتا رہا۔ ذرا دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ کہنے لگا۔

"اچھا! اب میں چلوں گا۔"

علی احمد نے پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"

"ہوٹل! کوٹھی تو میں نے پچھلے ہفتے فروخت کر دی۔"

علی احمد نے اس دفعہ پیار سے ڈانٹ کر کہا "کل ہوٹل سے اپنا سامان یہاں لے آنا۔"

"لیکن میں تو لندن جا رہا ہوں۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

کئی اسکاٹی لارکوں کی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

"صفدر بشیر لندن نہیں جا سکتے۔"

"صفدر بشیر یہیں رہیں گے۔"

صفدر بشیر مسکرانے لگا۔ اُس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اسکاٹی لارکوں نے کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا "صفدر بشیر، زندہ باد!" وہ اس وقت بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اُونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔ صفدر بشیر کی کمی کو اُنہوں نے اُس کی غیر حاضری میں شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اور آج اُسے پاکر اور اپنے درمیان دیکھ کر، وہ خوشی سے کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح اُچھل رہے تھے۔ سب نے صفدر بشیر کو گھیرے میں لے لیا اور اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ علی احمد اور صفدر بشیر چائے کی پیالیاں سنبھال کر لائبریری میں چلے گئے۔ وہ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ اسی اثناء میں ریاض آگیا۔ وہ فلک پیما کا رکن نہ تھا۔ کبھی کبھار آتا تھا، اور کئی کئی روز ہیڈکوارٹر میں ٹھہرا رہتا۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ علی احمد کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اسی رشتے سے فلک پیما کے ساتھ اُس کا رابطہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ قیام بھی علی احمد ہی کے ساتھ کرتا تھا۔

صفدر بشیر بھی اُسے جانتا تھا۔ مزدوروں کی یونین کے قیام میں ریاض نے بڑی مدد کی تھی۔ وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں صفدر بشیر کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ صفدر بشیر کی کنارہ کشی اور سلمان کی انتخابی مہم میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث ان دنوں یونین کی ذمہ داریاں ریاض ہی نے سنبھال رکھی تھیں۔

صفدر بشیر نے چائے پیتے ہوئے ریاض سے دریافت کیا۔

"یونین کی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟"

ریاض بتانے لگا۔ "ہڑتال کی ناکامی کے بعد، خاصی گڑبڑ رہی۔ مگر اب صورتِ حال پہلے سے بہتر ہوتی جارہی ہے۔"

صفدر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ "ریاض! تمہیں یقین ہے کہ صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔"

"کیوں؟ کیا تمہیں اس میں شبہ ہے؟"

صفدر بشیر بے تکلفی سے بولا۔ "بات یہ ہے ریاض! یہ یونین ودنین کی بات سچ پوچھو تو میرے حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔"

ریاض نے دریافت کیا۔ "صفدر! کبھی تم نے سنجیدگی سے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟"

"نہیں! مگر میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ فلک پیما کے ذریعہ میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں - ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ فلک پیما کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے علیحدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے - یہ بات میں علی احمد سے بھی کہہ چکا ہوں" صفدر بشیر نے علی احمد کو براہِ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا "علی احمد! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

علی احمد، جواب تک خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سُن رہا تھا مسکرا کر بولا "فلک پیما کے اجلاس میں اس مسئلہ پر بحث بھی ہو چکی ہے - بلکہ کئی اسکائی لارک اِس مسئلہ پر تمہارے ہم خیال بھی ہیں - مگر مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں - نہ پہلے تھا، نہ اب ہے"

اچانک ریاض نے صفدر بشیر سے عجب ٹیڑھا سوال کیا "صفدر بشیر! تم ایک لاکھ روپے سے کب تک جوا کھیلتے رہوگے؟"

صفدر بشیر بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا - حیرت زدہ ہو کر بولا "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا - کیا تم اس کی وضاحت کروگے؟"

ریاض بے تکلفی سے مسکرانے لگا "میرا مطلب ہے - تم اپنے سرمائے سے کب تک فلک پیما کی گاڑی کھینچتے رہوگے - ایک دن تمہارا اثاثہ ختم ہو جائے گا - پھر تم اپنی جائیداد بیچ دوگے - وہ بھی ختم ہو جائے گی - پھر کیا کروگے؟ پھر گاڑی کس طرح چلے گی؟ کبھی تم نے اپنی جدوجہد کو اس رُخ سے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے - ایک لاکھ یا چند لاکھ روپے سے اگر معاشرے میں تبدیلیاں آجائیں تو یہ بہت آسان نسخہ ہے"

وہ لمحہ بھر کے لیئے رُکا اور ہنس کر بولا "سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

صفدر بشیر نے مختصر سا جواب دیا "ہماری جدوجہد غربت اور پسماندگی

کے خلاف ہے۔"

"مگر تم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ غربت اور پس ماندگی کیوں ہے؟ معاشرے میں یہ اُونچ نیچ کیوں ہے؟ یہ امیر اور غریب میں فرق کیوں ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے اور جب تک تم اس بنیادی سوال کی تہہ تک نہیں پہنچو گے بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہو گے۔"

علی احمد نے مسکراتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔"کامریڈ! رات اب خاصی ہو چکی ہے۔ اور تم ایک ہی نشست میں اپنا انقلابی فلسفہ صفدر بشیر کو نہیں سمجھا سکتے۔" علی احمد گفتگو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر ریاض اس کے لئے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس مسئلہ پر صفدر بشیر سے میری پہلے بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ یہ غربت اور پس ماندگی دُور کرنا چاہتے ہیں اور اس جدوجہد میں محنت کشوں کی سیاسی قوت کو اہمیت بھی دینا نہیں چاہتے۔ حالانکہ ہر جدوجہد اور ہر تحریک، خواہ سیاسی ہو، سماجی ہو یا اقتصادی، بنیادی طور پر طبقاتی ہوتی ہے۔ یہ محنت کرنے والے اور محنت کا استحصال کرنے والے کے درمیان ایک مسلسل لڑائی ہے۔"

اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔"جب سے انسانی معاشرے میں نجی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور اس کے نتیجے میں طبقات وجود میں آئے۔ اُس وقت سے یہ لڑائی جاری ہے، اور اُس وقت جاری رہے گی جب تک طبقات ختم نہیں ہو جاتے۔ جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کی لُوٹ کھسوٹ ختم نہیں ہو جاتی۔ اِس لڑائی میں آپ کو کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ درمیان کا راستہ بند گلی کی مانند ہے۔"

علی احمد نے کہا: "ایسا نہیں ہے۔ کم از کم فلک پیما کے بارے میں تمہیں ایسی رائے نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس کا کردار تعمیری ہے۔ اِس کے ذریعے ہم عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُنہیں پڑھنا لکھنا سکھلاتے ہیں۔ طبّی امداد فراہم کرتے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم اور امدادی بنک کے ذریعہ روزگار مہیا کرتے ہیں۔ ہم عوام کے قریب جارہے ہیں۔ اُن سے دُور نہیں بھاگ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ ہمارا رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تمہاری اِس رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ ہمیں اپنی جدّوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کشوں پر انحصار کرنا چاہیئے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی صورت میں جب کہ ہمارا سابقہ خان بہادر فرزند علی ایسے لوگوں سے ہے، جو خدمت خلق کو دولت کمانے اور سماجی برتری حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔"

خان بہادر کے ذکر پر صفدر بشیر نے پوچھا: "میونسپلٹی کا الیکشن کیسا جا رہا ہے۔ میں نے سُنا ہے، خان بہادر کا حال بہت پتلا ہے۔"

علی احمد نے کہا: "تمہارا خیال درست ہے۔ ہمارے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ اُس نے جلسۂ عام کیا تھا، وہ بدنظمی کی نذر ہو کر ناکام ہو گیا۔ ہمارے جلسہ میں بھی اُس نے کرایہ کے غنڈوں سے گڑبڑ پیدا کرانے کی کوشش کی تھی، اس میں بھی اُسے ناکامی ہوئی۔ البتہ پیسہ وہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک انتخابات ہی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ پھر تینوں پر نیند کا غلبہ ہوا۔ ریاض حسبِ معمول علی احمد کے ساتھ ٹھیر گیا۔ صفدر بشیر واپس نہیں گیا۔ وہ بھی ایک اسکاؤٹ لارک کے ساتھ ٹھیر گیا۔ دوسرے اسکاؤٹ لارک پہلے ہی سو چکے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فلک پیما کے ہیڈکوارٹر میں سب گہری نیند سو چکے تھے۔ اچانک ہیڈکوارٹر کے صدر دروازے پر زور، زور سے دستک

دینے کی آوازیں اُبھریں۔ فہیم اللہ نے نیند سے آنکھیں ملتے ہوئے جاکر دروازہ کھولا تو بھونچکا رہ گیا۔ سامنے پولیس کا مسلّح دستہ موجود تھا۔ انسپکٹر نے فہیم اللہ کو بتایا کہ پولیس ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لینے آئی ہے۔ پولیس والے علی احمد کے کمرے میں گھس گئے۔ اُسے اور ریاض کو اُنھوں نے نیند سے بیدار کیا اور سیکورٹی ایکٹ کے تحت دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اُن پر تخریبی کارروائیاں کرنے اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام تھا۔

اُس وقت تک دوسرے اسکائی لارک بھی بیدار ہو چکے تھے اور علی احمد کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ صفدر بشیر نے وارنٹ گرفتاری دیکھنا چاہا تو انسپکٹر نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ تھانے میں ملزموں کو دکھایا جائے گا۔ علی احمد نے بھی وارنٹ دکھانے پر اصرار کیا۔ مگر انسپکٹر نے اُس کی ایک نہ سُنی اور اُسے اور ریاض کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ صفدر بشیر اور ڈاکٹر زیدی نے اُن کے ہمراہ چلنے کی بہت کوشش کی، مگر انسپکٹر کسی طرح رضامند نہ ہوا۔

پولیس کے جانے کے بعد اسکائی لارک دیر تک جاگتے رہے۔ علی احمد اور ریاض کی گرفتاری پر اُن میں شدید غم وغصّہ پھیل گیا تھا۔ صفدر بشیر تمام رات جاگتا رہا۔ صبح ہی صبح وہ ڈاکٹر زیدی کے ساتھ تھانے گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ علی احمد اور ریاض وہاں نہ تھے۔ تھانے والوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تمام دن وہ بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ حکامِ بالا سے ملتے رہے۔ مگر کہیں سے یہ سُراغ نہ ملا کہ دونوں کو گرفتار کر کے کہاں رکھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے شام کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ دونوں سنٹرل انٹلی جنس کی تحویل میں ہیں۔ اُن سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔ کسی کو اُن سے ملنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

اسکائی لارکوں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت مشتعل ہو گئے۔ ڈاکٹر زیدی نے سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طور پر اُن کے جذبات کو سرد کر دیا۔ لیکن علی احمد کی گرفتاری

کا فوری ردِ عمل یہ ہُوا کہ اسکائی لارکوں نے اپنی انتخابی مہم اور تیز کر دی۔ اُنہیں یقین تھا کہ دونوں کی گرفتاری کے پیچھے خان بہادر کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اِس لئے کہ انتخابی مہم کا نگران اعلیٰ علی احمد تھا اور دہ اس خوش اسلوبی سے اُسے چلا رہا تھا کہ دولت اور ہر طرح کے وسائل کے باوجود انتخابات کا پانسہ اسکائی لارکوں کے حق میں پلٹتا جا رہا تھا۔ ریاض، یونین کے ذریعہ مزدور ووٹروں کو اسکائی لارکوں کی حمایت میں منظم کر رہا تھا۔ مزدور نہ صرف اسکائی لارکوں کے حامی تھے بلکہ ان کی انتخابی سرگرمیوں میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ حصّہ لے رہے تھے۔ اس حلقے میں مزدور ووٹروں کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔ بلکہ انتخابات کی ہار جیت کا انحصار بڑی حد تک مزدوروں کے ہی ووٹوں پر تھا۔

اسکائی لارکوں نے علی احمد اور ریاض کی گرفتاری کے بعد اپنے غم و غصّہ کو خان بہادر کے خلاف انتخابی مہم میں ڈھال دیا۔ وہ اب صفدر بشیر کی قیادت میں دیوانہ وار کام کر رہے تھے۔ اُن کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے اِنتخابات کی فضا کو تیزی سے اسکائی لارکوں کے حق میں بدلنا شروع کر دیا تھا اب ہر طرف اسکائی لارکوں کے اُمیدوار ڈاکٹر زیدی ہی کا چرچا تھا۔

اِس صورتِ حال نے خان بہادر کو سخت پریشان کر دیا۔ اُس نے گھبرا کر ووٹوں کی خریداری کا بھاؤ بڑھا دیا۔ مگر یہ ہتھکنڈہ بھی کامیاب ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسکائی لارکوں نے اپنے زبردست انتخابی پروپیگنڈے سے اِنتخابات کو امیر اور غریب کی طبقاتی لڑائی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اُن کے انقلابی نعروں نے حلقے کے عوام میں ہلچل مچا دی تھی۔ اُن کا سیاسی شعور بیدار کر دیا تھا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ووٹروں کی بھاری اکثریت غریب اور پس ماندہ تھی۔ خان بہادر سے اُن کی نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسکائی لارکوں

کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے پر لوگوں نے غصہ سے خان بہادر کے کارکنوں پر کئی بار ہلّہ بول دیا۔ کارکن اس قدر خوفزدہ ہوگئے کہ اُنہوں نے گلی کوچوں میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ صرف بڑی بڑی سڑکوں پر منڈلاتے رہتے۔ اُن کی انتخابی سرگرمیاں محدود ہوکر رہ گئی تھیں۔

خان بہادر کو یہ اطلاعات برابر ملتی رہتیں۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ بات بات پر بھڑک اُٹھتا۔ زور زور سے چیختا۔ کارکنوں پر برستا۔ مسلسل سگرٹ نوشی کرتا۔ چائے کی پیالیوں پر پیالیاں خالی کرتا۔ نیند بھی اُسے کم آتی۔ چہرے پر ہر وقت پریشانی اور وحشت چھائی رہتی۔ وہ روز نت نئی اسکیمیں بناتا اور اپنی انتخابی مہم چلانے والوں کے ساتھ گھنٹوں ان کے بارے میں بات چیت کرتا۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایک رات دو یا ڈھائی بجے کا عمل ہوگا۔ گمٹی کی بستی پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ دن بھر لُو کے گرم جھکڑ چلتے رہے۔ مگر اب موسم کسی قدر خوشگوار تھا۔ شام کو بوندا باندی بھی ہوئی تھی اور اس وقت بھی آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہیڈ کوارٹر کے اندر اسکاؤٹ لڑکے بے خبر سو رہے تھے۔ اچانک رات کے سناٹے میں شور بلند ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ شور برابر بڑھتا گیا۔

صفدر بشیر کا کمرہ باہر کے رُخ پر تھا۔ شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر تک وہ ان آوازوں کو چُپ چاپ سُنتا رہا۔ پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر فہیم اللہ سو رہا تھا۔ صفدر بشیر نے اس کو آواز دی۔ شور سے اُس کی نیند بھی اُچاٹ ہوگئی تھی۔ وہ خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے کان لگا کر آوازوں کو سُنا۔ مگر سوائے شور کے کچھ اور نہ سُن سکے۔

شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ آوازیں عین ہیڈ کوارٹر کے سامنے بلند ہو رہی تھیں۔ اچانک سلمان دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہمراہ کئی اور اسکائی لارک بھی تھے۔ سلمان اُس وقت سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہونے والا ہے۔"

حملے کا لفظ سُن کر سب گھبرا گئے۔ سلمان کہنے لگا۔" میں باہر احاطہ میں سو رہا تھا۔ شور سُن کر آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر دیکھا تو ہیڈ کوارٹر سے کچھ فاصلہ پر بہت سے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ وہ اسکائی لارکوں کے خلاف اُونچی آواز سے اشتعال انگیز باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد سو سے اُوپر ہی ہو گی۔"

اِسی اثناء میں ڈاکٹر زیدی بھی کمرے میں آگیا۔ اُس نے بھی سلمان کی تائید کی۔ وہ کچی نیند سے اُٹھا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال خشک گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ کمرہ اسکائی لارکوں سے بھر گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ اُن کے بُشرے سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔

ذرا ہی دیر بعد دروازہ توڑنے کی آواز سُنائی دی۔ شور تیز ہو گیا۔ اب آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور چیخ چیخ کر اسکائی لارکوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر اس شور و غل میں شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکاریں اُبھرنے لگیں۔ ڈاکٹر زیدی نے بے قرار ہو کر کہا۔

"ڈسپنسری تباہ ہو گئی۔"

اسکائی لارک اور بھی زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑ اُبھرتی رہیں۔ شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پھر ہیڈ کوارٹر کے بڑے دروازے کو توڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس دفعہ

بالکل سامنے سے حملہ ہوا تھا۔ اسکاٹی لارک کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ یا پھر اندر رہ کر دروازے کی حفاظت کریں۔ مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اُن کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اُن کے ذہن ماؤف ہو چکے تھے۔ وہ سخت پریشان تھے۔

اچانک صفدر بشیر سب کے بیچ سے گزر کر دروازے کی جانب لپکا۔ قبل اس کے کہ اسکاٹی لارک یہ غور کریں کہ وہ کیا کرنے والا ہے، صفدر بشیر صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے دروازہ کھول دیا اور دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے حملہ آوروں کو مخاطب کرتے ہوئے بلند سے کہا۔

"بھائیو، پاگل مت بنو! اسکاٹی لارک تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تمہارے خادم ہیں۔ وہ تمہارے ہی لئے" عین اُس وقت اُس کی کنپٹی پر ایک بڑا سا پتھر آکر لگا۔ صفدر بشیر جملہ پورا نہ کر سکا۔ اُس کا سر چکرا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ خون کی ایک دھار کنپٹی سے نکل کر اس کے رخسار پر پھیل گئی۔ اُس نے چوٹ پر توجہ دیئے بغیر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

"بھائیو! اس دواخانے کو برباد نہ کرو۔ یہ ہزاروں نادار مریضوں کا سہارا ہے۔ تم....." فوراً ایک لاٹھی اُس کے سر پر پڑی۔ وہ شرابی کی طرح جھوم کر لڑکھڑا گیا۔ اُس نے دروازے کا ایک پٹ پکڑ لیا اور اس کا سہارا لے کر ہانپنے لگا۔ اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔

"لوگو! خدا کے لئے میری بات تو سنو۔ پاگل مت بنو۔"

مگر کسی نے اُس کی بات نہ سُنی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ اُنہوں نے اُس پر یلغار کر دی۔ چاروں طرف سے لاٹھیاں برسنے لگیں۔ صفدر بشیر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ اسی وقت کسی حملہ آور نے داہنی طرف

سے جھپٹ کر بلم سے حملہ کیا۔ بلم کا تیز چمکتا ہوا پھل اُس کے پہلو کو چیرتا ہوا جسم کے اندر اُترتا چلا گیا۔ صفدر بشیر بلبلا کر چیخا "ہائے" اور لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

سلمان اُس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور صفدر بشیر کو سنبھال لیا۔ وہ اُس کے بازوؤں پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھولنے لگا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ صفدر بشیر کو اُٹھا کر اندر لے جائے۔ مگر حملہ آوروں نے اتنا موقعہ ہی نہ دیا۔ اُنہوں نے اندھا دھند لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔

اب اسکاؤٹ لارکوں کے لئے ہیڈ کوارٹر کے اندر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کو بچانے کے لئے باہر نکل آئے۔ حملہ آوروں نے ان کو نرغے میں لے لیا۔ اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور تکلیف سے بلبلا کر چیخ رہے تھے۔ اُن کے جسموں سے خون پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے گہری دُھند پھیلتی جا رہی تھی

حملہ آور وحشیوں کی طرح حملے کر رہے تھے۔ وہ بلم اور لاٹھیوں سے اسکاؤٹ لارکوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور چہرے بھوتوں کی طرح خوف ناک نظر آ رہے تھے۔

بستی بھر میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر گھر میں جگار ہو گئی۔ لوگ مکانوں کی چھتوں اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جانب دیکھ رہے تھے، جہاں اسکاؤٹ لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مگر کوئی اُس طرف نہ گیا۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شور و غل سے دل دہلتا تھا۔

اندھیری رات میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ ہوا تیز تھی۔ دیکھتے دیکھتے شعلے بھڑک کر پھیلنے لگے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں آگ لگ گئی جس میں نادار

مریضوں کا دواخانہ تھا۔ ضرورت مندوں کا امدادی بنک تھا۔ لائبریری تھی۔ یہ اسکائی لارکوں کا زرین بسیرا بھی تھا، جو غریبی مٹانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، جو خان بہادر کے زرخرید غنڈوں کے نرغے میں گھرے ہوئے بلموں اور لاٹھیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اور زخموں سے نڈھال ہو ہو کر گر رہے تھے۔

ہیڈ کوارٹر جل رہا تھا۔ الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چتا کی مانند بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر ٹالسٹائی کی لاش تھی۔ یہ شیکسپئیر کا جنازہ تھا۔ یہ ارسطو اور رُوسو کا فلسفہ تھا۔ غالب اور اقبال کی شاعری تھی۔ مارکس اور لینن کا انقلابی ذہن تھا۔ سب آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقاء کے علمبرداروں کے ذہن و فکر شعلہ بداماں تھے۔ کتابیں جل رہی تھیں۔ کتابیں تباہ ہو رہی تھیں۔ ڈسپنسری شیشوں کا انبار بن چکی تھی۔ بوتلیں ٹوٹ چکی تھیں۔ دوائیں بکھر کر سرخ و سیاہ دھبے بن گئی تھیں۔ ڈسپنسری کے جلتے ہوئے در و دیوار چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے..

"خان بہادر فرزند علی! تمہارا بول بالا ہو۔ تم امیر بنو۔ وزیر بنو۔ حاکم بنو۔ میونسپلٹی کے ممبر بنو۔ تم نے اپنے حریف کو روند ڈالا۔ وہ دیکھو ڈاکٹر زیدی زخموں سے نڈھال پڑا سسک رہا ہے۔"

ہیڈ کوارٹر کی عمارت جلتی رہی۔ شعلے اژدہوں کی طرح سُرخ سُرخ زبانیں نکال کر لپکتے رہے۔ بھڑکتے رہے۔ آسمان کی بلندی پہ دُور، دُور تک سُرخ غبار پھیل گیا۔ دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ ہر چیز جل رہی تھی۔ ہر چیز تباہ ہو رہی تھی۔ اسکائی لارک زخموں سے بے حال تھے۔ حملہ آور کچھ دیر تک اسکائی لارکوں کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ پھر کسی جنگی مہم سے پلٹنے والے قدیم تاتاری حملہ آوروں

کی طرح شور مچاتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ وہاں کئی ٹرک کھڑے تھے۔ سب اُن پر سوار ہوگئے۔ انجن گڑگڑائے اور ٹرک تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

ہیڈ کوارٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔ صفدر بشیر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا۔ سلمان اُکھڑی اُکھڑی سانسیں بھر رہا تھا۔ نعیم اللہ، لاپتہ تھا۔ ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے پڑے تھے۔

پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔ لال لال انگاروں کی گہری سُرخ روشنی میں خاک سے لتھڑی ہوئی صفدر بشیر کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا چہرہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر شفق رنگ ہوگیا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جھلسی ہوئی دھواں، دھواں عمارت کو تک رہا تھا۔

○

فصل ہشتم

(۱)

پہرے دار نے آہنی پھاٹک کھولا۔ دونوں بورسٹل جیل سے باہر آ گئے۔

یہ گرمیوں کی ایک سانولی سلونی شام تھی۔ بحیرۂ عرب سے آنے والی تیز سمندری ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے بوندا باندی ہو چکی تھی۔ بھیگے ہوئے راستوں پر کہیں کہیں بارش اپنے نشان چھوڑ گئی تھی۔ دونوں جیل کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

نوشا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مگر آج اُس کے ہمراہ راجہ نہیں کوکر تھا۔ کئی مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ ایک ایسی ہی شام تھی۔ جیل کا بوڑھا ماسٹر، بیٹھ مونڈھے تختۂ سیاہ پر چاک سے پاکستان کا نقشہ بنا رہا تھا۔ دفعتاً ایک طرف سے بکرے کی طرح زور زور سے ممیانے کی آواز اُبھری۔ ماسٹر بدحواس ہو کر اس طرح اُچھلا کہ اُس کا پیر پھسل گیا اور وہ دھڑام سے کروٹ کے بل گر پڑا۔ زور کا قہقہہ پڑا۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ سب کے چہرے زرد پڑ

گئے۔ ماسٹر تیزی کے ساتھ اپنی اُنگلیاں رگڑ رہا تھا۔ یہ اِس بات کی علامت تھی کہ کسی کی شامت آنے والی ہے۔ وہ جب مارنے پر آتا تو پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا تھا۔ حسبِ معمول اُس نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے کلاس کو خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔ اس وقت وہ کچھ ایسا ہونق نظر آرہا تھا کہ راجہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ماسٹر نے اُس کو ہنستے ہوئے دیکھ لیا۔ اُس نے بید اُٹھایا اور چیل کی طرح راجہ پر جھپٹا۔ راجہ نے سہم کر گردن جھکالی۔ ماسٹر نے اندھا دُھند بید مارنا شروع کر دئے۔ چیخ کر بولا۔

"کیوں بے بکرا بننے کا تجھے بڑا شوق ہے۔ تجھے بکرا ہی بنا کے چھوڑوں گا۔" وہ سڑاک سڑاک بید مارتا چلا گیا اور ہر بار تال سُر کے ساتھ کہتا۔

"بکرے کی بولی بول۔ بکرے کی بولی بول۔" راجہ ذرا دیر تک تو مار کھاتا رہا۔ پھر تکلیف سے بلبلا کر چیخنے لگا۔

"میں نے بکرے کی آواز نہیں نکالی تھی۔"

ماسٹر نے پینترا بدل کے زنّاٹے کا ہاتھ گھمایا۔ "خبیث جھوٹ بولتا ہے۔"

راجہ کہنے لگا۔ "قسم اللہ کی، ماسٹر صاحب میں نے آواز نہیں نکالی تھی۔"

وہ پوچھنے لگا۔ "پھر کون تھا؟"

راجہ بات کہتے کہتے جھجک کر چُپ ہو گیا۔ اُسی وقت اُس کے بازو پر سڑاک سے بید پڑا۔ وہ گھبرا کے بول پڑا۔ "ماسٹر صاحب پوکر تھا۔"

پوکر کا نام تو محمد علی تھا مگر سب اس کو پوکر کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ کلاس میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ وہ حلق کے اندر سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ زور زور سے بغلیں بجاتا تھا۔ کتابیں غائب کر دیتا تھا۔ چٹکیاں بھرتا تھا۔ نہ خود پڑھتا تھا اور نہ کسی کو پڑھنے دیتا تھا۔ اِسی لئے روزانہ پٹتا تھا۔ مگر سب اُس سے

ڈرتے بہت تھے۔ بڑا شورہ پشت تھا۔

بوڑھے ماسٹر نے راجہ کو چھوڑ دیا، اور دانت کچکچاتا ہوا پوکر پہ جھپٹا۔ پوکر مار کھانے کے معاملہ میں تجربہ کار تھا۔ اُس نے ماسٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی گھٹنوں کے اندر سر چھپا لیا اور جھک کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر نے قریب پہنچتے ہی بید لگانے شروع کر دئے۔ پوکر چُپ چاپ پِٹتا رہا۔ اُس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔

جب کلاس ختم ہوئی اور ماسٹر کمرے سے باہر چلا گیا تو پوکر لپک کر راجہ کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ راجہ سہمی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ پوکر نے ایک گندی گالی دی اور چیخ کر بولا۔

"اب بتاؤ سالے خاں کیا کہتے ہو؟"

راجہ نے خوف زدہ ہو کر گردن جھکا لی۔ پوکر نے ڈانٹ کر کہا "سیدھا کھڑا ہو، تیری تو ——"

گالی دے کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور حلق سے آواز نکالی "ڈھیں" ساتھ ہی اُچھل کر راجہ کے سر پہ ٹکر ماری۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ پوکر حلق سے آوازیں نکالتا رہا "ڈھیں، ڈھیں، ڈھیں" راجہ چکرا کر گر پڑا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

خون ٹپک کر ہاتھ پر گرا تو راجہ کو تاؤ آ گیا۔ وہ اُٹھ کر اُس پہ کُتے کی طرح جھپٹا مگر پوکر نے ہاتھ گھما کر کنپٹی پہ ایسا مُکّہ مارا کہ وہ دُور جا کر گرا۔ سنبھل کر اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے ایک زور کی ہٹ لگائی۔ اُس کے جُوتے کی بھرپُور ٹُو راجہ کے گھٹنے پر بیٹھ گئی۔ بہت زور کی چوٹ آئی۔ راجہ تکلیف سے چیخ پڑا۔

اس کے بعد پوکر کی پیشی بھی ہوئی۔ سزا بھی ملی مگر راجہ کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ اچھا نہ ہُوا۔ کئی بار زخم دھو کر پٹی باندھی گئی۔ لیکن گھاؤ اچھا ہونے کی بجائے

اور پھیلتا گیا۔ راجہ لنگڑا لنگڑا کر چلتا، اور اکثر بیٹھا اپنا زخم کُریدا کرتا۔ پھر اُس زخم سے ذرا نیچے پنڈلی پر بھی ایک زخم اور ہو گیا۔ یہ زخم کسی چوٹ سے نہیں آیا تھا، خود بخود پیدا ہوا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے راجہ کے جسم پر جگہ جگہ سُرخ داغ پڑ گئے۔ جن کو وہ برابر کھجاتا رہتا۔

ایک بار ڈاکٹر معائنہ کے لئے جیل آیا۔ اُس نے راجہ کے داغوں کو دیکھا تو دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر علیحدہ کمرے میں لے جا کر اُس نے راجہ سے بہت سے سوالات کئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک اُس کا خوب معائنہ کیا۔

دوبارہ ڈاکٹر معائنہ کے لئے جیل آیا تو راجہ کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹنے لگی تھی۔ زخموں سے رطوبت بہا کرتی۔ راجہ کا چہرہ بھدّا ہو گیا تھا۔ کان پھول گئے تھے۔ اُنگلیوں کے ناخن جھڑ گئے تھے۔ اُس کو دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اب اُس نے چلنا پھرنا بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت نڈھال پڑا تھا۔ زخموں کو کھجایا کرتا۔

ڈاکٹر نے اس دفعہ دیکھا تو اُس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُس روز اس نے راجہ سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ چُپ چاپ اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اُسی دن، دوپہر سے کچھ دیر پہلے جیل کے آہنی پھاٹک پر ایک ایمبولینس کار آ کر ٹھہری۔ راجہ کو اُس میں بٹھا کر اسپتال بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد راجہ واپس نہ آیا۔

نوشا کو اب یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ راجہ اسپتال میں تھا یا اسپتال سے کہیں اور چلا گیا۔ لیکن وہ برابر راجہ کو یاد کرتا رہا اور آج جب وہ رہا ہو کر جیل سے نکلا تو اُس کو بار بار راجہ یاد آ رہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سوچ رہا تھا، نہ معلوم اب راجہ کہاں ہو گا۔ کس طرح ہو گا۔ وہ اس کو کہاں تلاش کرے۔ اُس سے کس طرح ملے۔

نورشا سنبھل سنبھل کے قدم اُٹھا رہا تھا۔ اُس کے آگے پوکر چل رہا تھا۔ اُس کے ساتھ پوکر کی دوستی راجہ کے جیل سے جانے کے بعد ہوئی اور اُس کی ابتدا بھی ایک حادثہ سے ہوئی تھی۔

پوکر گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ اُس کی عمر سولہ سال سے کچھ اُوپر تھی مگر دیکھنے میں زیادہ کم سن لگتا تھا۔ اُس کا قد ٹھنگنا اور رنگ سانولا تھا۔ اُس نے ایک رکشا ڈرائیور کو چاقو مار کر زخمی کیا تھا۔ اُس جرم میں اُس کو سزا ہوئی تھی۔ اور وہ بورسٹل جیل بھیج دیا گیا تھا۔ وہ بڑے فخر سے اپنا یہ کارنامہ سُنایا کرتا تھا۔ " سالے کی ایک ہی ہاتھ میں انتڑیاں نکال دی تھیں۔ نہ جانے کیسے بچ گیا، ورنہ میں نے تو اُس کا کام ہی تمام کر دیا تھا۔"

اِس بات سے قیدی لڑکوں پر اس کا بڑا رعب پڑا۔ چند ہی روز میں اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔

وہ بات بات پر گالی دیتا، اور ہر وقت لڑائی جھگڑا کرنے پر تُلا رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بلا وجہ لڑکوں کو چھیڑ کر مار پیٹ کرتا۔ ترنگ میں آکر آواز لگاتا — " ابے کوئی ہے مائی کا لال، ذرا ہو جائیں دو دو ہاتھ۔" وہ بار بار انگڑائیاں لے کر ایک ایک کو دیکھتا۔ جب وہ نیا نیا جیل میں آیا تو بعض جرائم پیشہ لڑکوں نے اُس کا چیلنج بھی قبول کیا۔ خوب خوب فری اسٹائل کشتی ہوتی۔ مکّہ بازی کے ہاتھ دکھائے جاتے۔

پوکر غضب کا پھرتیلا تھا۔ لڑتے وقت اُس کا جسم بجلی کی طرح تڑپتا معلوم ہوتا۔ کبھی داہنی طرف سے جھکائی دے کر نکلا، تو گردن پر بھرپور ہاتھ دیا۔ بائیں طرف سے گھُسا تو ایک ہی لات میں منہ کے بَل گرا دیا۔ جب تک حریف کے سامنے رہتا، اُس کا جسم بید کی مانند لچکتا رہتا۔ ایک مقام پر نہ ٹکتا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جگنو کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ مُرغ

کی طرح اُچھل اُچھل کر حملہ کرتا۔ عام طور پر اُس کی تکنیک یہ ہوتی کہ پہلے اپنے مقابل کو تھکا دیتا اور جب وہ ہانپنے لگتا تو مینڈھے کی طرح ایک قدم پیچھے ہٹتا، منہ سے "ڈھیں" کی آواز نکالتا اور زمین سے فٹ بھر اُچھل کر زناٹے کے ساتھ مکّہ مارتا۔ لڑنے والے کو للکارتا "لبے منہ کیا دیکھ رہا ہے، چل، چل" جب وہ حملہ کرتا تو پوکر اُس کا ہاتھ صاف بچا جاتا۔ مسکرا کر، بار بار کستا "ایک اور، ابے ایک اور!" وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کرتا اور اپنے حریف کو للکارتا بھی جاتا۔

کوئی دن ایسا نہ جاتا، جب اُس کی پیشی نہ ہوتی۔ ہر روز اُسے سزا ملتی۔ مگر جس طرح وہ مارنے کے معاملہ میں نڈر تھا، اسی طرح مار کھانے میں بھی ڈھیٹ تھا۔ سزا پاکر آتا تو بڑی بے حیائی سے ہنس کر کہتا "خواہ مخواہ سالے اپنا ہاتھ تھکاتے ہیں۔" پھر کسی لڑکے کو اشارہ کرتا "لے یار! ذرا کمر پر دو ایک مُکّیاں تو لگا دے۔ ادھر ایک آدھ ہاتھ گرم پڑ گیا تھا۔" وہ اسی طرح قیدی لڑکوں پر حکم چلاتا تھا۔ ذرا بھی کوئی حکم عدولی کرتا، اُس کی شامت آجاتی۔

اُس کا حکم نہ ماننے پر ایک بار نوشا کی بھی دُرگت بن چکی تھی۔ اُس روز کسی بات پر ناراض ہوکر پوکر نے ایک لڑکے کو مُرغا بنا دیا۔ نوشا کو حکم دیا کہ وہ اُس کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ نوشا اس کے لیئے آمادہ نہ ہوا۔ پوکر نے اُٹھ کر نوشا کے منہ پر ایک مکّہ جڑ دیا۔ وہ چکرا کے رہ گیا۔ اُسی وقت پوکر نے دوسرا وار کیا۔ سنبھلتے سنبھلتے تیسرا وار ہوا تو نوشا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ہاتھ پیر کپکپانے لگے۔

پوکر کے پُورے تین مُکّے سہہ جانا مذاق نہیں تھا۔ اچھے اچھے جی دار لڑکوں کے چھکے چھُوٹ جاتے تھے۔ نوشا تو ان دنوں نیا نیا جیل میں داخل ہوا تھا۔ اُس کے لیئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ چکرا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پوکر نے اُس لڑکے کی خطا معاف کر دی اور نوشا کو مُرغا بنا کر پیٹھ پر اُس لڑکے کو بٹھا دیا۔

نوشا نے اُسی دن توبہ کرلی تھی کہ اب وہ کبھی پوکر کے منہ نہیں لگے گا۔ وہ بلا چوں وچرا اُس کی ہر بات مان لیتا۔ البتہ راجہ نے اُس کی لیڈری کے سامنے جھکنے سے اِنکار کر دیا تھا۔ کئی بار اُس کا اور پوکر کا مچیٹا ہوُا اور ہر بار راجہ کی درگت بنی۔

پہلی بار دونوں کا جھگڑا کسی خاص بات پر نہیں ہوُا تھا۔ پوکر نے حسبِ معمول لڑکوں کو چیلنج دیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اُونچا کئے آواز لگا رہا تھا "ابے ہے کوئی مائی کا لال۔ ہاتھوں میں کھُجل ہو رہی ہے۔ ہو جائے کچھ رگڑم رگڑا۔" اُس وقت سارے لڑکے بیرک کے سامنے والے میدان میں اکٹھا تھے۔ اور درختوں میں پانی دے رہے تھے۔

جب کسی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ گالیاں دینے لگا۔ "ابے تم سب سالے نامرد ہو۔ ایک بھی مرد کا بچّہ نہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے سب کو اور بھی گندی گندی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ اس طرح اکثر اُن کو مشتعل کرتا تھا۔

راجہ بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوکر کو گھُور کر دیکھا۔ ٹوک کر کہا "ابے ذرا زبان سنبھال کے بات کر۔ ساری ہیکڑی ابھی نکال کے رکھ دوں گا۔"

پوکر اُس کو دیکھ کر مسکرایا "تو پھر آجا بے طرّم خاں کے سالے۔" اور اُس کے رُو برُو جا کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ نے چھُوٹتے ہی ایک زناٹے کا ہاتھ پوکر کے منہ پر رسید کیا۔ راجہ اُس وقت تھا بھی تگڑا اور وار بھی اُس نے جھنجھلا کر کیا تھا۔ پوکر اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ مکّہ اُس کے جبڑے پر بھرپُور بیٹھ گیا۔ اُس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر ایک ہاتھ سے خون صاف کیا۔ ہنس کر بولا "اچھا ہاتھ تھا۔ لونڈا کس بَل کا معلوم ہوتا ہے۔"

پھر وہ دونوں ہاتھ تول کر راجہ کے سامنے لہرانے لگا۔ "کم آن، کم آن!" وہ اسی طرح شروع میں اپنے حریف کو اُکساتا تھا۔ راجہ نے دانت بھینچ کر ایک اور وار کیا۔ پوکر صاف بچا گیا۔ اُس نے ایکٹروں کی طرح ایک مصنوعی قہقہہ لگایا۔ "ہے" اور راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "ایک اور میری جان۔ کم آن، کم آن۔" وہ اپنے بائیں کندھے بار بار اُچکار رہا تھا۔ ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔

"کم آن، کم آن۔"

راجہ نے پھر مُکّہ مارا۔ وہ بھی خالی گیا۔ جھنجلا کر اُس نے پے بہ پے وار کرنے شروع کر دئے۔ پوکر اُس کے سارے حملے خالی دیتا چلا گیا۔ ذرا دیر میں راجہ ہانپنے لگا۔ اُسی وقت پوکر نے اُچھل کر وار کیا۔ ہاتھ بھر پُور پڑا۔ راجہ نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پوکر نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دئے۔ پانچویں مکّے پر راجہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

اِس کے بعد بھی کئی بار پوکر سے راجہ کا جھگڑا ہوا۔ شروع شروع میں تو وہ اس سے ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لئے مقابلہ پر آجاتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ پوکر سے ڈرنے لگا تھا۔ اُس سے صرف اُسی وقت لڑتا تھا، جب بے حد جھنجلا جاتا تھا۔

پوکر اب قیدی لڑکوں کا سرغنہ بن چکا تھا۔ سب پر اُس کی حکومت چلتی تھی۔ کوئی بھی اُس کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہو کر مارتا بھی تو لڑکے چُپ چاپ اُس کی مار سہہ جاتے اور خوشامد الگ کرتے۔ اِس لئے کہ اُس کی ناراضگی بے حد خطرناک ہوتی تھی۔ قیدی لڑکوں پر پوکر کی حکومت اسی طرح چلتی رہی۔

ایک تپتی ہوئی سہ پہر کو پولیس کی لاری، جیل کے پھاٹک پر آکر رُکی۔ پہرے دار نے تالا کھولا اور تین مسلح کانسٹیبلوں کی حراست میں چھریرے جسم کا

ایک لڑکا جیل کے احاطہ میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی تھیں۔ وہ ٹخنوں سے اُونچی نیلی پتلون پہنے تھا۔ جسم پر چھوٹی چھوٹی آستینوں کی ریشمی قمیض تھی۔ جس پر اژدہوں اور چیتوں کے علاوہ عورتوں اور مردوں ایسی تصویریں چھپی تھیں، جو شہوت انگیز انداز میں بوس و کنار کرتے نظر آتے۔ اُس کی کمر کے گرد پیتل کے گھنگھروؤں سے جڑی ہوئی چمڑے کی بیلٹ تھی۔ آنکھوں پر چوڑے چوڑے حلقوں کا سبز چشمہ تھا۔ وہ ہالی وُوڈ کی مار دھاڑ سے بھرپُور فلموں کا کردار معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی وضع قطع بالکل امریکی کاؤ بوائز کی سی تھی۔

اُس کا نام تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ اُس نے اپنا تعارف ٹارزن کہہ کے کرایا تھا اور وہ اسی نام سے قیدیوں میں مشہور ہو گیا۔ سِن و سال کے اعتبار سے وہ نابالغ لگتا تھا مگر اُس پر زنا بالجبر کا مقدمہ چل رہا تھا۔ عدالت سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہُوا تھا، اور اس کی ضمانت بھی نہ ہو سکی تھی۔ اُس کا مشغلہ غنڈہ گردی اور سینما کے ٹکٹوں کی چور بازاری تھا۔ شہر میں اُس کے ساتھیوں کا باقاعدہ گروہ تھا، جو اکثر جیل میں مُلاقات کے دن اُس سے ملنے آتے، اور ہمیشہ اُس کے لئے کوئی نہ کوئی سوغات لے کر آتے۔

اِس کے علاوہ وہ پہرے داروں کے ذریعہ چوری چھُپے سگرٹیں منگواتا تھا۔ چھپ چھپ کر خود بھی پیتا تھا، دوسرے قیدی لڑکوں کو بھی پلاتا تھا۔

سگرٹوں کی بدولت ٹارزن جلد ہی جیل میں ہردلعزیز ہو گیا۔ اُس نے اپنی پسند کے قیدی لڑکوں کی ایک ٹولی بنالی تھی۔ جو ہر وقت اس کے دائیں بائیں پھرتے۔ ہر بات میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ اُس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ وہ سیٹی پر کوئی انگریزی دُھن الاپتا ہُوا، ٹھاٹھ سے جیل میں گھومتا پھرتا۔ ہاتھ پیروں میں کس بل تھا اور جھگڑا فساد کرنے کی مشق رہ چکی تھی۔ لہذا اُس کی دھاک اور بھی زیادہ تھی۔

پوکر کچھ دنوں تک خاموشی سے ٹارزن کی بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ٹارزن سے مراسم بڑھانا چاہے۔ مگر وہ اپنی ہوا میں تھا۔ اُس نے پوکو کو زیادہ لفٹ نہیں دی بلکہ ایک بار سگریٹ مانگنے پر اُس نے پوکر کو بُری طرح ڈانٹا بھی تھا۔ اِسی بات پر دونوں میں ٹھن گئی۔ پوکر اس وقت تو چپ ہو گیا، اس لئے کہ خطا اُس کی تھی۔

مگر دو ہی ایک دن کا غوطہ دے کر اُس نے ٹارزن کو چھیڑا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ ٹارزن کی عادت تھی کہ وہ بات بات پر انگریزی میں گالیاں بکتا تھا، جو امریکی فلمیں دیکھ دیکھ کر اُس نے ازبر کر لی تھیں۔

ایک روز ٹارزن ترنگ میں تھا۔ اُس نے ایک لڑکے کو یونہی تفریحاً "بلیڈی باسٹرڈ" کہہ دیا۔ وہ لڑکا تو کچھ نہیں بولا۔ البتہ پوکر اُس کی حمایت میں آ کر کہنے لگا۔ "دیکھو جی ٹارزن! تم اس طرح گالی گفتاری نہ کیا کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

ٹارزن نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بے نیازی سے بولا۔

"گٹ آؤٹ یو فکن۔"

پوکر نے تڑسے اُس کے جبڑے پر فوراً ایک مُکّہ جڑ دیا۔ چیخ کر بولا۔

"سالے میں منع کر رہا ہوں تُو وہی اپنا حرامی پن کر رہا ہے۔"

ٹارزن نے خونخوار نظروں سے گھور کر اُسے دیکھا اور دونوں ہاتھ تول کر فلمی مکّہ بازوں کی طرح پوکر کے سامنے آ کر جھومنے لگا۔ پھر اُس نے دائیں طرف جھک کر پوکر کے مُنہ پر ایک مکّہ لگایا۔ ہاتھ چھچھلتا پڑا۔ کوئی اور ہوتا تو پوکر صاف کاوا دے کر نکل جاتا۔ لیکن اس پہلے ہی وار سے پوکر کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا مدِّ مقابل اناڑی نہیں تھا، اچھی خاصی مکّہ بازی جانتا ہے۔ لہٰذا وہ بچ بچ کر حملہ کرنے لگا۔

دونوں بینڈھوں کی طرح جھوم جھوم کر لڑ رہے تھے۔ بڑے زوروں کا معرکہ تھا۔ سارے لڑکے دونوں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ برابر کی جوڑ تھی۔ دونوں پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ پوکر کمزور پڑ رہا تھا کئی بھرپور ہاتھ اُس کی کنپٹی اور رخساروں پر پڑ چکے تھے۔ اور ایک بار تو ٹارزن نے ایسا زنّاٹے کا مکّہ مارا کہ پوکر لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ لڑکوں نے زور زور سے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ ان میں زیادہ تر ٹارزن کے حمایتی تھے۔

ٹارزن برابر دباتا جا رہا تھا۔ پوکر چوٹ پر چوٹ کھا رہا تھا۔ اب اُس کے ہاتھ بھی اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ پوکر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اور پیچھے، اور پیچھے۔ وہ جیل کی چار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کی پشت بالکل دیوار سے لگ گئی۔ اُس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ راہِ فرار اختیار کرنے کا موقعہ تلاش کر رہا تھا۔ اُس کے رخسار جگہ جگہ سے سُوج کر نیلے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ خچّر کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ ٹارزن اب اُس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

پوکر نے ایک بار اپنی گردن جھکائی۔ حلق کے اندر سے "ڈھیں" کر کے بھیانک آواز نکالی اور مینڈھے کی طرح پنجوں کے بَل اُچھل کر ٹارزن کی ٹھوڑی پر زور کی ٹکّر ماری۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ چُندھیا کر رہ گیا۔ پوکر نے اُس کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دوسری ٹکّر، پھر تیسری، اُس نے تابڑ توڑ کئی ٹکریں ایسی ماریں کہ ٹارزن ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر جھومنے لگا۔

پوکر تیزی کے ساتھ اُس کی دائیں بغل سے نکلا اور گھوم کر ٹارزن کے رخسار کی پچھلی ہڈی پر ایک زوردار مُکہ جڑ دیا۔ وہ چکّر کھا کر رہ گیا۔ اب ٹارزن کی پشت پر دیوار تھی اور پوکر اس کے سامنے تھا۔ اُس کے بعد پوکر نے اُچھل اُچھل کر دو تین بھرپور مکّے مارے تو ٹارزن لڑکھڑا کر وہیں گر پڑا۔ اُس کی ٹانگیں فرش پر پھیلی ہوئی

تھیں۔ پیٹھ دیوار سے ٹکی تھی۔ وہ منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

اِس معرکہ کے بعد ٹارزن کی ہوا بگڑ گئی۔ اُس کو اپنی بے عزّتی کا شدید احساس تھا۔ وہ کئی روز تک اسی دُھن میں رہا کہ کس طرح پوکر کو نیچا دکھایا جائے تاکہ انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو۔

ایک دن موقعہ پاکر اُس نے پوکر کو گھیر لیا۔ اُس کے ہمراہ اس وقت کئی منتخب کیئے ہوئے قیدی لڑکے تھے۔ پروگرام کے مطابق پہلے ایک لڑکے کو بھیجا گیا۔ وہ پوکر کے برابر سے بغلیں بجاتا ہوا گزرا۔ غنڈوں کی اصطلاح میں اس کا مقصد پوکر کی بے عزّتی کرنا تھا۔

پوکر نے گھور کر اُس لڑکے کو دیکھا اور چیخ کر بولا "سالے چمگادڑ! تیری تو ایسی کی تیسی۔"

وہ گالیاں دیتا ہوا جھپٹا اور اُس کی گردن دبوچ لی۔ آناً فاناً ٹارزن اور اُس کے ساتھی پوکر پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اِس اچانک حملے کے لیئے قطعی تیار نہ تھا۔ سب نے مِل کر اُس کو گرا دیا۔ ٹارزن سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ اُس نے اُوپر سے اندھا دُھند پوکر کے منہ پر مکے مارنے شروع کر دیئے۔ پوکر نیچے دبا ہوا، بے بسی سے گالیاں بکتا رہا۔

نوشا اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ لپک کر وہاں پہنچ گیا۔ ذرا دیر تک وہ پوکر کو پٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا سُوجھی۔ ٹارزن سے کہنے لگا۔

"اتنے بہت سے مِل کر اکیلے کو مار رہے ہو، ابے یہ بھی کوئی مردانگی ہے۔" ٹارزن نے گھور کر اُسے دیکھا۔ چیخ کر گالی دی۔

"شٹ اپ یو بلیڈی۔"

نوشا نے بے پرواہی سے کہا "اکیلے اکیلے لڑلو"

اُس کی مُراد یہ تھی کہ ٹارزن اکیلا پوکر سے لڑے۔ مگر ٹارزن یہ سمجھا کہ وہ اُس کو چیلنج دے رہا ہے۔ اُس نے پوکر کو چھوڑ دیا۔ جھپٹ کر نوشا کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔

"آؤ سالے پہلے تم ہی آجاؤ"

نوشا لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔ آہستہ سے بولا "ابے میرے سر کیوں ہوئے جا رہا ہے؟"

ویسے نوشا ایسا کمزور بھی نہیں تھا۔ اب وہ خاصا لمبا چوڑا ہو گیا تھا۔ لمبے لمبے بے ڈول ہاتھ پاؤں، اُونچا قد اور موٹا تگڑا جسم۔ دیکھنے میں وہ خاصا مُسٹنڈا لگتا تھا۔ ٹارزن نے اُس کی بات کا کوئی جواب تو نہیں دیا۔ جھپٹ کر اُس کے منہ پر ایک زوردار مُکّہ جڑ دیا۔ نوشا بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹارزن نے ایک اور زنّاٹے کا ہاتھ دیا۔ نوشا مکّہ بازی کا عادی نہیں تھا۔ جھنجلا کر وہ ٹارزن پر جھپٹا۔ ایک مُکّہ اُس کی کنپٹی پر اور پڑا مگر وہ اُس سے لپٹ ہی گیا۔

دونوں گتھم گتھا ہو کر کچھ دیر تک زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر نوشا نے ٹنگڑی لگا کر ٹارزن کو دے مارا اور اُس کے سینہ پر گھٹنا رکھ کر دو تین کَس کَس کے رگڑے جو دئے تو وہ لگا غیں غیں کرنے۔

پوکر ابھی تک ٹارزن کے ساتھیوں کے نرغے میں گھرا ہوا لڑ رہا تھا۔ اُس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ وہ اکیلا سب کے وار روک رہا تھا۔ ٹارزن کا نوشا نے حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نوشا نے اُس کو تو وہیں چھوڑا اور لپک کر پوکر کے قریب پہنچا۔ اُس وقت وہ واقعی بڑے جوش میں تھا۔ سب کو چیلنج دے کر بولا "آجاؤ سالو! ایک ایک کی ایسی کی تیسی کر دوں گا"

یہ کہہ کر وہ اُن پر جھپٹا۔ جس کے اُس نے ہاتھ مارا، اُس کی سِٹّی گم ہوگئی۔ ذرا ہی دیر میں سب نکل بھاگے۔ پوکر نے بڑھ کر نوشا کو گلے لگا لیا۔ "ابے واہ میرے شیر۔ کیا بات ہے تیری۔ یار تُو تو چھُپا رستم نکلا۔ وہ دیر تک اُس کو بڑھاوا دیتا رہا۔

بس اُسی وقت سے اُن کی دوستی ہوگئی۔ پھر آپس میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ دونوں ہر وقت ایک ساتھ نظر آتے۔ جیل سے راجہ کے جانے کے بعد نوشا جو اکیلا پن محسوس کر رہا تھا، اس کمی کو پوکر نے پورا کر دیا تھا۔ اُس کے ساتھ رہنے میں ٹھاٹھ بھی بہت تھے۔ سب پر حکم چلتا تھا۔

ٹارزن زیادہ دنوں تک جیل میں نہیں رہا۔ ایک رات زبردست طوفان آیا۔ موسلا دھار بارش ہوئی۔ ہوا کے جھکّڑ اس طرح شور کرتے ہوئے چلے، جیسے بہت سے آدمی مِلی جُلی آوازوں کے ساتھ سِسکیاں بھر رہے ہوں۔ بجلی بار بار کڑکتی۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے بیرک کی چھت پر جلترنگ کی مانند بجتے۔ سویرے اُٹھ کر سب نے دیکھا، ٹارزن غائب تھا۔ تلاش ہوئی تو میدان میں کیچڑ پر بڑے بڑے قدموں کے نشان نظر آئے جو احاطہ کی دیوار تک گئے تھے۔ ٹارزن راتوں رات دیوار پھاند کر فرار ہوگیا تھا۔

اس کے بعد دو اور قیدی لڑکے جیل سے نکل بھاگے۔ ایک رات پوکر اور نوشا نے بھی فرار ہونے کی کوشش کی مگر پکڑے گئے۔ بڑی سخت سزا ملی۔ قیدِ تنہائی میں ڈال دیئے گئے اور کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

جیل میں نوشا نے اور تو کچھ نہیں سیکھا، البتہ پوکر کی صحبت میں رہ کر اُس کو لڑنے کی تکنیک معلوم ہوگئی تھی۔ اب وہ ایسے موقعوں کے تمام ہتکنڈے جان گیا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی بات پر لڑکوں سے جھگڑتا رہتا۔ اُس میں پہلے جو جھجک اور خوف تھا، وہ جاتا رہا۔

اب وہ بالکل نڈر ہو کر لڑتا تھا۔ اِس کے علاوہ پوکر بڑا اچھا جیب کترا تھا۔ اِس فن کے تمام گر اُس نے نوشا کو بتا دئے تھے۔

بورسٹل جیل میں بڑی تعداد ایسے لڑکوں کی تھی، جو جرائم پیشہ تھے۔ اِن میں افلاطون بھی تھا جو تالا توڑنے کا ماہر تھا اور اس فن کو بڑی فیاضی سے سب کو سکھاتا تھا۔ نوشا بھی کچھ عرصہ اُس کا شاگرد رہا اور کسی حد تک اس فن کو بھی سیکھ گیا۔ تجربہ کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ورنہ جس طرح پوکر جیب تراشی میں کئی بار اس کا امتحان لے چکا تھا، تالا توڑنے کے ہُنر کا مظاہرہ بھی ہو جاتا۔

پہلے وہ جیل میں بے حد اُداس رہتا تھا۔ اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رویا کرتا۔ گڑگڑا کے گھنٹوں دُعائیں مانگا کرتا۔ سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا۔ جیل کا ماسٹر جو سبق دیتا اُسے جی لگا کے پڑھتا۔ جب تک جیل میں راجہ رہا، اُس کا یہی رویہ رہا، مگر جیب پوکر سے اُس کے مراسم بڑھے تو وہ رفتہ رفتہ اُس کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جیل سے دونوں کی رہائی ایک ہی روز نہ ہوئی۔

(۲)

دونوں فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ شام نکھرتی جا رہی تھی۔ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ شہر کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔ وہ کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"ابے او پوکر! کدھر منہ اُٹھائے جا رہا ہے؟"

پوکر نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹین کی جھکی ہوئی چھت والے ایک چائے خانے کے سامنے استاد پیڈرو کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ باجو بھی تھا۔ پوکر رُک گیا۔ اُستاد پیڈرو اپنی اُجلی شلوار کھڑکھڑاتا ہوا اُس کی طرف لپکا۔ پیچھے پیچھے باجو

آرہا تھا۔ اُستاد نے دُور ہی سے اپنے بازو پھیلا دئے۔ پوکر کو بڑے جوش سے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اُوپر اُٹھا لیا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

"سالوں نے اب چھوڑا ہے۔ میں تو سمجھے کا یاں آیا بیٹھا ہوں حرام کے جنوں نے بیسیوں چکر لگوا ڈالے۔ ابھی ابھی تو ہو کر آ رہا ہوں۔"

اُستاد دیر تک بازوؤں میں بھینچے ہوئے، اُس کی پیٹھ شفقت سے تھپتھپاتا رہا۔ جب دونوں علیحدہ ہوئے تو باجوا نے رومال میں لپٹا ہوا پھولوں کا گجرا نکالا اور پوکر کے گلے میں ڈال دیا۔ گجرا پہننے کے بعد پوکر کو فوراً نوشا کا خیال آیا، جو اُس کے برابر خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے اُستاد سے نوشا کا تعارف کرایا۔

"اُستاد! یہ نوشا بھی اپنا یار ہے۔ میرے ساتھ ہی چھوٹ کر آیا ہے۔"

نوشا نے گردن کو ذرا سا خم دے کر بڑی سعادت مندی کے ساتھ اُستاد کو سلام کیا۔ اُس کے اس انداز پر اُستاد پیڈرو کا دل خوش ہو گیا۔ بزرگوں کی طرح اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "جیتے رہو۔" اس کے بعد وہ باجوا کو مخاطب کر کے بولا۔

"جا بے کوئی سواری تو پکڑ، میں جب تک لمڈوں کو چائے پلا دُوں۔"

باجوا سواری لینے چل دیا۔ اُستاد پیڈرو دونوں کے ہمراہ چائے خانہ میں پہنچا۔ سامنے پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھتے ہوئے چائے خانہ کے مالک سے بولا۔

"سیٹھ! دو فسٹ کلاس ڈبل چائے تو مارو۔ ذرا بالائی اچھی ڈلوانا، لمڈا دُبلا ہو کر آیا ہے۔" اُس نے محبت سے پوکر کے بازو کو دبایا۔ "اب کچھ کھانے کو بھی مل رہا تھا۔ تیری تو ہڈیاں نکل آئیں۔"

پوکر جیل کی تکلیفیں سُنانے لگا۔ اُستاد کُرید کُرید کر ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔

نوشا خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ دونوں نے چائے پی اور وہاں سے اُٹھ کر سڑک پر آ گئے۔ باجوا ٹیکسی لے آیا تھا اور ان کا انتظار کر رہا تھا۔ چاروں ٹیکسی کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی عثمان آباد کی طرف چل دی۔ جہاں اُستاد پیڈرو کا اڈّا تھا۔

بندر روڈ پر ہلکی نیلگوں روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ رات ہولے ہولے کراچی کی فلک بوس عمارتوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اُستاد بڑے ٹھاٹھ سے گردن اُونچی کئے بیٹھا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے مونچھیں بہت گھنی تھیں۔ آنکھوں میں بڑی پُراسرار چمک تھی۔ قد میانا تھا اور جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔

جب وہ اڈّے پر پہنچے تو پہر رات گزر چکی تھی۔ اڈّا ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر تھا۔ چاروں طرف کچی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ البتہ اڈّہ جس مکان میں تھا، اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ اُس میں چھ کمرے اور ایک طویل دالان تھا۔ صحن بڑا کشادہ تھا۔ مگر اس کا فرش کچا تھا۔ صحن کے ایک گوشہ میں نیم کا ایک کبڑا سا درخت تھا، جس پر کوّے بسیرا کرتے تھے اور چاندنی راتوں میں اُڑ اُڑ کر شور مچاتے تھے۔

جب ٹیکسی گلی کے نکڑ پر رُکی اور اُستاد پیڈرو کرایہ ادا کر چکا تو اُس نے مشکوک نظروں سے نوشا کو دیکھا اور پوکر کو علیحدہ لے جا کر پوچھا "کیوں جی! یہ نوشا کا کیا معاملہ ہے؟"

پوکر نے فوراً جواب دیا "اُستاد! وُہ تو اب اپنے ہی ساتھ رہے گا۔"

اُستاد کہنے لگا "ساتھ تو رکھ لوں گا پر وہ کچھ اپنے کینڈے کا بھی ہے؟"

"کیا پُوچھتے ہو اُستاد! بڑا جی دار لونڈا ہے۔ ویسے میں نے اُس کو

کاریگری کے دو چار ہاتھ سمجھا دئیے ہیں۔"

اُستاد پیڈرو نے اُس کو ڈانٹ دیا۔ "ابے تو کیا سمجھائے گا۔ ابھی تو تیرا ہاتھ خود نہیں صاف ہُوا۔ سالے چلے ہیں اُستادی کرنے۔"

پوکر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

اُستاد نے باجوا اور نوشا کو اشارہ سے قریب بُلایا اور اُن کے ہمراہ گلی کے اندر داخل ہُوا۔ اڈّے پر جا کر اُس نے دیکھا۔ بڑے کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ چکرم دیوار سے پیٹھ لگائے خاموش بیٹھا تھا۔ اُستاد پیڈرو کو دیکھ کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اُس نے پوچھا۔

"یہ لمڈے ابھی تک نہیں لوٹے؟"

وہ بولا۔ "قادر اور پنچھی آئے تھے۔ چائے پینے گئے ہیں۔"

اُستاد نے ایک لمبی 'ہوں' کی اور کمرے میں بچھی ہوئی دری پر تھکا ہُوا سا بیٹھ گیا۔ پوکر کو مخاطب کر کے بولا۔ "ابے تیرے چکرم نے تو آج اپنا پلیتھن کر دیا۔"

چکرم نے مسکرا کر پوکر کو دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چکرم کہنے لگا۔ "یار تیرے بغیر تاش کھیلنے کا لطف جاتا رہا۔ خدا قسم تجھے روز یاد کرتے تھے۔"

پوکر ہنس کر بولا۔ "تو پھر آج ہی جمے گی۔ یار بہت دن ہو گئے تاش کھیلے ہوئے۔ بڑی مشکل سے تاشوں کی ایک گڈّی ہاتھ لگی تھی۔ ایک دن سالوں نے دیکھ لیا۔ اسی وقت چھین کر لے گئے۔"

اس کے بعد وہ چکرم کو بورسٹل جیل کی باتیں سنانے لگا۔ نوشا چُپ بیٹھا رہا۔ پوکر نے اُسے چکرم سے مِلایا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ اُستاد پیڈرو اب بازو پر سر ٹکا کر چت لیٹا تھا۔ باجوا پھرتی سے اُس کی پنڈلیوں پر مکیاں لگا

رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ بڑے سدھے ہوئے تھے اور تیزی سے چل رہے تھے۔

- تھوڑی دیر بعد کمرے کے دروازے پر بیس، بائیس سال کے دو نوجوان نمودار ہوئے۔ ایک کا رنگ سیاہ تھا۔ بالوں میں خوب تیل چپڑا ہوا تھا۔ وہ پتلون اور بُش شرٹ پہنے تھا۔ دوسرا اُس سے مختلف تھا۔ اُس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ خوب گھیرے دار لٹھے کی شلوار پہنے تھا۔ دونوں بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔

اُستاد نے دونوں کو گھُور کر دیکھا۔ گرجدار آواز سے بولا ”ابے بڑی چہچہیں ہو رہی ہیں۔ بہت دن سے تمہاری کُندی نہیں ہوئی“

دونوں سہم کر رہ گئے۔ اُنھوں نے جلدی جلدی اُستاد کو سلام کیا۔ اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اُستاد کہنے لگا۔

”ابے ادھر منہ چھپا کر کیوں بیٹھ گئے۔ تم اب تک رہے کہاں ؟“

اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔

اِس دفعہ اُستاد نے ڈانٹ کر کہا۔ ”ابے منہ پھوٹ گئے تمہارے۔ بولتے کیوں نہیں ؟“

پھر اس نوجوان کو جس کا رنگ سیاہ تھا، مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تُو بتا بے کالے ؟“

وہ مری ہوئی آواز سے بولا ”اُستاد ذرا دیر ہو گئی“

اُستاد کو جلال آ گیا ”ابے یہ ذرا دیر گئی۔ دس بج رہا ہے اور تُو ذرا ہی دیر کہہ رہا ہے۔ تمہاری دونوں کی ڈیوٹی تو پاسپورٹ کے دفتر پر تھی۔ وہ تو چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ اب تو وہاں کتنے لوٹ رہے ہوں گے“

”ذرا کلفٹن چلے گئے تھے۔“ اِس دفعہ دوسرے نے جواب دیا۔

اُستاد کہنے لگا" تو یوں کہو سیریز ہو رہی تھی۔ ابے تم کو کیوں ہوا لگی ہے۔ سالو! کھال میں رہو کھال میں۔" وہ چکرم کی طرف پلٹا۔ ڈانٹ کر بولا۔" چل بے چکرم! بہت ہو چکی یاری۔ کام بھی کرے گا یا باتیں ہی ہوتی رہیں گی۔"

چکرم گھبرا کر اُٹھا۔ اُس نے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے چمڑ کے صندوق کو کھولا۔ ایک لمبا رجسٹر اور قلمدان نکالا اور لالٹین کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُستاد نے دونوں نوجوان لڑکوں سے کہا۔

" کلیلیں تو تم دونوں بہت بھر رہے تھے۔ اب دیکھوں تم کیا تیر مار کر آئے ہو؟"

کالئے نے پتلون کی جیب سے کئی نوٹ اور کچھ ریز گاری نکال کر چکرم کے سامنے ڈال دی۔ اُستاد پیڈرو نے پوچھا" کیوں بے چکرم کتنی رقم ہے۔ یہ تو سالے اپنی زبان سے بتائیں گے نہیں۔"

چکرم نے پوری رقم گن کر کہا: "۵۵ روپے ۹ آنے ہیں" اور رجسٹر میں رقم درج کرنے لگا۔

اُستاد پیڈرو نے کہا" بس! کل تو تم بڑے فروٹ گئے تھے۔ آج کیا ہوا؟"

" آج تو صرف ایک ہی موقعہ لگا۔ کل چار دفعہ کاریگری کی تھی۔"

اُستاد کہنے لگا" نہیں بے، اِتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ بس ایک دفعہ کاریگری دکھایا کرو۔ ورنہ دھر لئے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اُتنا رشوت میں الٹے کھا جائیں گے۔"

اُستاد پیڈرو کی ناراضگی رفع ہو چکی تھی۔ وہ انہیں بزرگوں کی طرح جیب تراشی کے فن پر نئے نئے نکتے سمجھانے لگا۔ دونوں سر جھکائے اس کی باتیں سنتے رہے۔ اسی اثنا میں تین نوعمر لڑکے کمرے میں داخل

ہوئے۔

"اُستاد سلام!"

"اُستاد سلام!"

"اُستاد سلام!"

تینوں اُس کو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹ بعد ایک لمبے قد کا نوجوان آیا۔ اُس نے بھی سلام کیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اُستاد خرّش پر لیٹ گیا۔ باجوا مُکیاں لگاتا رہا۔ اب جیب کتروں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ گیارہ بجے تک کمرے میں خاصی بھیڑ ہوگئی۔ وہ تعداد میں سولہ تھے۔ اِن میں کم سِن لڑکے تھے۔ کڑیل نوجوان تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو سن و سال کے لحاظ سے خرانٹ ہو گئے تھے۔ جو بھی جیب کترا آتا، پوکر کے ساتھ بڑے جوش کے ساتھ بغل گیر ہوتا اور جیل کا حال پوچھنے لگتا۔

کمرے میں مِلی جُلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ اُستاد پیڈرو کروٹ کے بل خاموش لیٹا تھا۔ آخر وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ سارے جیب کترے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چکرم نے لالٹین اور رجسٹر اُٹھایا اور اور اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔

اُستاد جیب کتروں سے کہنے لگا "چلو بے حساب دو۔"

ایک ایک جیب کترا باری باری آتا اور جیب سے نوٹ اور ریزگاری نکال کر اس کے سامنے ڈالتا جاتا۔ اُستاد پیڈرو اُونچی آواز سے جیب کترے کا نام لیتا اور خود رقم گنتا۔ چکرم فوراً رجسٹر میں اندراج کر لیتا۔

اُستاد پیڈرو کسی کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو جیب تراشنے کے فن پر لیکچر دیتا۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

جب سب جیب کترے اپنی اپنی آمدنی جمع کرا چکے تو اُستاد نے ساری رقم میں سے ایک تہائی حصّہ نکال کر چیکرم کو دے دیا۔ یہ اڈّے کا حصّہ تھا۔ بقیہ رقم میں سے اُستاد نے ہر ایک کی روزن داری بانٹ دی۔ جیب کتروں کے مختلف مدارج تھے جو سینیئر تھے ان میں ۵۰ فی صدی حصہ تقسیم کر دیا گیا، جو اُن سے کم درجے کے تھے اُن کو روپے میں ۵ آنے کا حصہ ملتا، اور جو بالکل جونیئر تھے، اُن کے حصّہ میں ۳ آنے کا حصہ آیا۔

استاد پیڈرو روزن داری تقسیم کر چکا تو اُس نے باجوا کی طرف اشارہ کر کے چیکرم سے کہا۔ "اِس کو بیس روپے دے دیجئو۔" پھر باجوا کی طرف متوجہ ہوا۔ "جا بے نیاز کے لئے سامان لے آ۔ مٹھائی تازی لائیو۔ اس سالے افضل کے ہاں نہ جائیو، پتہ نہیں سالا گھی میں کیا ملاوٹ کرتا ہے۔ اُس دن جو امرتیاں تولایا تھا، ایسا گلا پکڑا کہ اب تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔"

باجوا نے چیکرم سے بیس روپے لئے اور باہر چلا گیا۔ استاد بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اُٹھ کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی جیب کتروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے دے کر باتیں کر رہے تھے، ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ بے تکلفی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ سب کھسک کھسک کر نوکر کے گرد حلقہ بنا کر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اُس سے اُلٹے سیدھے سوالات پوچھ رہے تھے۔ نوشا گم صُم بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہر جیب کترا اس کو مشتبہ نظروں سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اُن کے اس انداز نے اُس کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔

اُستاد پیڈرو کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت صرف سفید تہبند باندھے ہوئے تھا۔ اور اپنے بھیگے ہوئے بدن کو تولیہ سے پونچھ رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غسل کر کے آیا تھا۔

جب بدن پونچھ چکا تو اُس نے چکرم کے آگے کنجی پھینک کر کہا "ٹرنک سے ایک دُھلا ہُوا جوڑا تو نکال لا۔" کنجی لے کر چکرم جانے لگا تو اُس نے ٹوک کر کہا۔

"اور ہاں میری ٹوپی اور مصلا بھی لائیو۔"

چکرم باہر چلا گیا۔ اُستاد پیڈرو نے اشارے سے نوشا کو قریب بُلایا۔ "میرے کنے آ ٹیو!" وہ سہما ہُوا اُس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اُستاد کہنے لگا۔ "ذرا اپنا داہنا ہاتھ تو دکھائیو۔"

نوشا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اُستاد اُس کا ہاتھ تھام کر اُنگلیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ نوشا کی اُنگلیاں نرم اور لانبی تھیں۔

اُستاد کہنے لگا "اُنگلیاں تو تیری ٹھیک ہیں۔ کچھ دن زور پنجہ کرانا پڑے گا۔ کھنچاؤ کم ہے۔"

وہ اُس کی اُنگلیاں دیکھتا رہا اور اپنی مخصوص اصطلاحات میں اُن پر تبصرہ بھی کرتا رہا۔ جب وہ اُنگلیاں دیکھ چکا تو نوشا اُٹھ کر جانے لگا۔ اُستاد نے ڈانٹ کر کہا "ابے ڈرا کیوں جا رہا ہے۔ یہ ڈھولکا ڈھو بدن دیکھو اور ابھی سے اس کی سِٹّی گم ہے۔" نوشا چپ چاپ اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔

اُستاد کچھ کہنے ہی جا رہا تھا، اتنے میں پنچھی بول پڑا "کل کھارا در والے استاد احمد جان ٹکر گئے تھے۔ آج کل اُن کے بڑے ٹھٹے ہیں۔ بڑے زوروں پہ جا رہے ہیں۔"

پیڈرو نے اُس کی بات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کے رہا تھا؟"

پنچھی کہنے لگا "بڑی ہوا باندھ رہے تھے۔ کہنے لگے کراچی میں تو سب

اُٹھائی گیرے ہیں۔ کاریگر ایک بھی نہیں۔ جس کو دیکھو وہی اُستاد بنا پھرتا ہے"۔
اُستاد پیڈرو کو تاؤ آگیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔
اُستاد تو وہی سالا شہر بھر میں رہ گیا ہے۔ خواہ مخواہ فلنٹی مارتا پھرتا ہے۔ بس کپڑا ماری کے دو چار اُلٹے سیدھے ہاتھ جانتا ہے۔ وہ تو ذرا ذرا سے لونڈے بھی کر لیتے ہیں۔ جس کو جیب کاٹنا کہتے ہیں، وہ فن تو اُس کے اُستاد کو بھی نہ آتا ہوگا۔ سالا اب تک تیسری اُنگلی اناڑیوں کی طرح چلاتا ہے۔ انگوٹھا چلانا تو اس کو آج تک نہیں آیا۔ وہ کیا، بمبئی کے سیکھے ہوئے جتنے کاریگر ہیں سب سالے اناڑی ہیں"۔

اُستاد پیڈرو بڑے جوش کے ساتھ بول رہا تھا۔ سارے جیب کترے دم بخود بیٹھے اُس کی باتیں سُن رہے تھے۔ اُستاد گردن کو بار بار خم دے کر کہتا رہا
"کام کرنے والے تو کلکتہ سے بڑھ کر رُوئے زمین پر نہ ہوں گے۔ یہاں کا ساحساب تھوڑی ہے کہ پھوکٹ میں ہنر سیکھ لو۔ اپنے اُستاد تھے شیخ نبی بخش، ستر سے اُوپر سن تھا۔ دکھائی بھی کم دیتا تھا۔ اُن کا باقاعدہ اسکول تھا۔ پورے سو روپے نذرانہ لیتے تھے۔ پھر کام سیکھنے میں اُن کے نوسو نخرے جھیلنا پڑتے تھے۔ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی۔ چھُٹتے ہی منہ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ کیا مجال کوئی چُوں کر جائے۔ کھڑے کھڑے نکال باہر کرتے۔ مگر اپنے کام کا ماہر تھا۔ دھاک اتنی تھی کہ پیشاب سے چراغ جلتا تھا۔ بڑے بڑے مانے ہوئے اُستاد آکر کان پکڑ گئے"۔

اُستاد پیڈرو کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ موج میں آکر بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اسی اثنا میں حکیم کپڑے لے کر آگیا۔ اُستاد پیڈرو نے اُٹھ کر وہیں کھڑے کھڑے کپڑے تبدیل کئے۔ دری پر مصلّا بچھایا اور اُس کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد باجوا سامان سے لدا پھندا کمرے میں داخل ہوا۔

اور سارا سامان اُستاد پیڈرو کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیا۔ چکرم نے اگر بتیاں سلگائیں۔ کمرے میں دُھویں کے ہلکے ہلکے مرغولے لہرانے لگے۔ فضا میں خوشبو پھیل گئی۔ اُستاد نے اپنی ترکی ٹوپی پہنی۔ شیرینی کو مصلّے پر رکھا اور آنکھیں بند کر کے نیاز دینے لگا۔

نیاز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے نوشا کو قریب بُلایا۔ اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اپنی ٹوپی اُتار کر اُس کے سر پر رکھ دی۔ شاگردی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ نوشا اب اُستاد پیڈرو کے حلقے میں باقاعدہ شامل ہو چکا تھا۔ اُستاد نے اپنے ہاتھ سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُس کے منہ میں رکھا، اور مٹھائی تمام جیب کتروں میں تقسیم کر دی گئی۔ نوشا اُٹھ کر ہر جیب کترے سے گلے مِل رہا تھا۔ وہ اڈّے کا سترھواں رُکن تھا۔

اس کے بعد پنچھی نے اُستاد پیڈرو کی فرمائش پر ایک فلمی گیت سُنایا۔ اُس کی آواز اچھی تھی۔ خوب لہک لہک کر گا رہا تھا۔ قادر گیت کے ساتھ ساتھ منہ سے طبلہ بجاتا۔ اچھا خاصا سماں بندھ گیا۔

آدھی رات تک یہ جشن رہا۔ پھر جیب کترے سونے کے لئے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اڈّے پر رہتے تھے۔ ایک کمرے میں کئی کئی کی رہائش تھی۔ پوکرا اور نوشا نے اپنے ٹھہرنے کا بند و بست ایک ہی کمرے میں کیا۔

ہفتہ بھر تک اُستاد پیڈرو، نوشا کو جیب تراشی کی تکنیک سکھاتا رہا۔ زور پنجہ کی مشق کرا کے اُس کی اُنگلیاں مضبوط اور پھرتیلی بنائی گئیں۔ آخر ایک روز چکرم کی نگرانی میں اُس کی ڈیوٹی مقرر کر دی گئی۔

چکرم بھرے بھرے جسم کا طرح دار نوجوان تھا۔ وہ اپنے کام میں بڑا چوکس اور پھرتیلا تھا۔ اُستاد پیڈرو اُس پر اس قدر مہربان تھا کہ بہت سے سینئر

جیب کتروں کی موجودگی میں، چکرم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس پر اس قدر اعتماد رکھتا تھا کہ جیب کتروں کا سارا حساب کتاب وہی لیتا اور ساری رقم بھی اُس کی تحویل میں رہتی۔ دل کا بھی اچھا تھا۔ نوشا کی ہر طرح دلجوئی کرتا۔ خوب خاطر مدارات کرتا۔ دن میں کئی بار چائے اور لسّی کا دَور چلتا۔ ٹھاٹھ سے سگریٹیں پی جاتیں۔

نوشا چند ہی روز میں چکرم سے مانوس ہو گیا۔ دونوں کی آپس میں خوب پٹنے لگی۔ ان دنوں چکرم کی ڈیوٹی شہر کے ایک گنجان علاقہ کے بس اسٹینڈ پر تھی۔ مہینہ کی شروع تاریخیں تھیں۔ پہلے ہی دن چکرم نے ایک تگڑا مُرغا ذبح کیا۔ (جیب کتروں کی اصطلاح میں اس سے مُراد جیب کاٹنا ہے) دو سو سے اُوپر کی رقم ہاتھ لگی۔

جس وقت چکرم نے جیب کاٹی۔ نوشا اُس کے برابر کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ آغا پلپلی بھی اُن کے ساتھ تھا۔ چکرم نے جس دیدہ دلیری کے ساتھ کارگیری کا ہاتھ دکھایا۔ نوشا دنگ رہ گیا۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اُس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اُسے تو اُس وقت علم ہُوا، جب چکرم نے چمڑے کا بٹوہ اس کے ہاتھ میں دے کر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ایسی تمام ہدایتیں اُستاد پیڈرو اس کو پہلے ہی دے چکا تھا اور باقاعدہ امتحان بھی لے چکا تھا۔

نوشا بٹوا سنبھال کر سیدھا اُسی چائے خانے میں پہنچا جہاں چکرم روزانہ بیٹھتا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد چکرم اور آغا پلپلی بھی مسکراتے ہوئے چائے خانے میں پہنچ گئے۔ سب کچھ اتنی پھُرتی اور آسانی کے ساتھ ہُوا کہ نوشا کے دل میں جیب تراشی کا جو خوف تھا، وہ پہلے ہی تجربہ میں بہت حد تک زائل ہو گیا۔

(۳)

نیاز کو بیوی کے انشورنس کا روپیہ ملا تو اُس کی گویا کایا پلٹ ہوگئی۔ پچاس ہزار کا چیک وصول کرنے کے چند ہی روز بعد اُس نے مضافات میں ایک مختصر سی کوٹھی لے لی۔ اور پُرانا مکان چھوڑ کر اس میں منتقل ہوگیا۔

یہ ویران علاقہ تھا۔ مشرق میں اُونچے نیچے بنجر ٹیلے تھے۔ قرب و جوار میں چند پُرانی وضع کے بنگلے تھے، جن میں کبھی فوجی افسروں کی رہائش تھی۔ مگر جب سے یہ بنگلے عام شہریوں کے تصرّف میں آئے تھے، اُس وقت سے نئی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ روز بروز نت نئی تبدیلیاں ہورہی تھیں۔ لیکن شام ہوتے ہی ہر طرف ہُو کا عالم ہوتا۔ راستوں پر آمد و رفت کم ہوجاتی۔ پہر رات گزرنے کے بعد ساری آبادی قبرستان کی طرح ہیبت ناک معلوم ہوتی۔ اندھیرا ہوتے ہی گیدڑ بولنا شروع کردیتے۔ رات کے سناٹے میں اُن کی تیز آوازیں بڑی وحشت ناک معلوم ہوتیں۔

کوٹھی میں چار کمرے تھے۔ نیاز نے نیلام میں خریدے ہوئے سیکنڈ ہینڈ فرنیچر سے تمام کمروں کو خاصا آراستہ کرلیا تھا۔ کوٹھی میں بڑا سا احاطہ تھا جس میں گھنے درخت تھے۔ عرصے سے باغیچے کی دیکھ بھال نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ نظر آتے۔ رات کے وقت شاخوں سے خشک پتّے جھڑ جھڑ کر گرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی دبے قدموں درختوں تلے چہل رہا ہے۔

کوٹھی میں آکر نیاز کو ہر طرح کی آسائش مل گئی تھی۔ مگر آمد و رفت کی بڑی تکلیف تھی۔ کاروبار اس کا شہر میں تھا۔ سویرے ہی سویرے وہ کوٹھی سے نکل جاتا۔ مگر بس کے انتظار میں کبھی کبھی تو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا۔

صرف چند بسیں اِس راستے پر چلتی تھیں۔ وہ بھی بہت پُرانی تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بس خراب ہو جاتی۔ اِس پریشانی کا حل اُس نے یہ نکالا کہ ساڑھے چھ ہزار میں ایک کار خرید لی۔ یہ سُرخ رنگ کی ٹوسیٹر سنگر تھی۔ پُرانا ماڈل تھا، مگر کنڈیشن اچھی تھی۔

کار خریدنے کے ساتھ ہی نیاز کے پر لگ گئے۔ اُس نے شلوار اور قمیص چھوڑ کر پتلون اور بُش شرٹ پہننا شروع کر دی۔ مونچھیں صفاچٹ کرا دیں اور ٹوسیٹر میں ٹھاٹھ سے بیٹھ کر اُڑا اُڑا پھرتا۔ کباڑ خانے کی دکان بھی اُس نے ختم کر دی۔ اور ایک روز اُس کی کوٹھی پر پلاسٹک کی بنی ہوئی ایک تختی بھی لگ گئی، جس پر انگریزی حروف میں لکھا تھا:

"شیخ محمد نیاز، گورنمنٹ کنٹریکٹر"

ویسے وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ جانتا تھا۔ مگر گورنمنٹ کنٹریکٹر ضرور ہو گیا تھا۔ اُس کو پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی نئی بیرکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ مل گیا تھا۔ کام بڑا نہیں تھا، مگر بی کلاس گورنمنٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے اُس کا نام ٹھیکے داروں کی فہرست میں رجسٹر ہو گیا۔ اِسی ٹھیکے کے بل بوتے پر اُس کو میونسپلٹی کے نئے مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ بھی مل گیا۔ اُس کا ٹینڈر سات لاکھ تھا۔ دوسرے کنٹریکٹروں کے ٹینڈر کم تھے۔ مگر خان بہادر فرزند علی اُن ہی دنوں نیا نیا میونسپلٹی کا چیئرمین بنا تھا۔ الیکشن پر اس کا بہت روپیہ صرف ہوا تھا، لہذا وہ ان دنوں زیادہ سے زیادہ کمائی کی فکر میں تھا۔ نیاز سے اس کے مراسم بھی تھے۔ اُس نے ۳۲ فیصد حصہ رکھ کر نیاز کا ٹینڈر منظور کرا دیا۔

نیاز کو تعمیرات کے کام کا پہلے سے تجربہ نہیں تھا، اور نہ ہی اُس کے پاس اتنے بڑے کنٹریکٹ کے لئے سرمایہ تھا۔ لہذا اُس نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے میں سارا کام دوسرے ٹھیکیداروں کو دے دیا۔ اب اس کام میں

اس کی دلچسپی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ ٹھیکے کے نام پر اُس نے سیمنٹ اور لوہے کا جو سرپلس کوٹا مقرر کرایا تھا، اُس کو بلیک مارکیٹ میں کسی طرح فروخت کیا جائے۔

خان بہادر فرزند علی سے اُس کے مراسم پہلے ہی اچھے تھے۔ اِس ٹھیکے کی وجہ سے دونوں کے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ نیاز کا زیادہ تر وقت خان بہادر ہی کے ساتھ گزرتا۔ خان بہادر ہی کے توسط سے شہر کے اعلیٰ حکام تک اُس کی رسائی ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک معزز شہری بنتا جا رہا تھا۔

تقریباً ہر شب خان بہادر کے یہاں اُس کی نشست ہوتی۔ اس محفل میں شراب کا دَور بھی چلتا۔ برج اور رمی ہوتی۔ خان بہادر کو رمی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ میونسپلٹی کا چیئرمین منتخب ہونے کے بعد اُس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ مگر رمی کے پروگرام میں فرق نہ آیا۔

رات ہوتے ہی کچھ سرکاری افسر اور شہر کے بعض بڑے تاجر اس کی کوٹھی پر اکٹھا ہوتے اور روزمرّہ کا مشغلہ شروع ہو جاتا۔ اس طرح خان بہادر کی کوٹھی پرائیویٹ قسم کا کلب بن گئی تھی، جس کا ایک رُکن نیاز بھی تھا۔ شروع شروع میں وہ پینے پلانے کے شغل سے کتراتا رہا۔ مگر کب تک بچتا۔ ایک دن سب نے اصرار کر کے زبردستی اس کو تھوڑی سی وہسکی پلا دی۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ اس کے بعد تو وہ لہک لہک کر پینے لگا۔

نیاز کی زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر ہو رہی تھی۔ سلطانہ اور انّو اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں آ گئے تھے۔ دونوں جاتے بھی کہاں۔ اُن کا بیٹھا بھی کون تھا جو سرپرستی کرتا۔ مگر نیاز کا رویّہ سلطانہ کے ساتھ بڑا نارمل تھا۔ سلطانہ کی ماں کو مرے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر اس تمام عرصہ میں نہ تو نیاز نے اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ کسی ایسی بات کا موقعہ دیا، جس سے

اُس کو دُکھ پہنچتا۔ وہ عام طور پر سویرے ہی سویرے کار لے کر کوٹھی سے نکل جاتا۔ اور رات گئے واپس آتا۔ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ رات کو واپسی کے بعد اس نے سلطانہ سے کوئی بات چیت کی ہو۔ وہ چُپ چاپ جا کر اپنے کمرے میں سو جاتا۔ رات کا کھانا وہ خان بہادر ہی کے ساتھ کھاتا تھا۔ شروع شروع میں سلطانہ نیاز کا کھانا اُس کے کمرے میں رکھوا دیتی۔ مگر جب نیاز نے خود ہی منع کر دیا تو اس نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔

نیاز کی صحت بھی اب اچھی ہوگئی تھی۔ کباڑ خانے کی دکان پر دن بھر بیٹھے رہنے سے اُس کے جسم میں جو بھدّا پن آگیا تھا، وہ دوڑ بھاگ سے کم ہو گیا تھا۔ اُس کی رنگت نکھر گئی تھی۔ شراب پینے سے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکتی رہتی۔ وہ جب نائیلون کی بش شرٹ اور پتلون پہن کر، گھر سے بن سنور کر نکلتا تو خاصا اسمارٹ لگتا۔ ایک بار تو سلطانہ نے بھی اُس کو دیکھ کر سوچا تھا کہ نیاز روز بروز خوب صورت ہوتا جا رہا ہے۔

گرمیوں کی ایک خوشگوار شام تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں گہری نارنجی روشنی پھیلی تھی۔ درختوں کے طویل سائے خوابوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سڑک پر اُونٹوں کا ایک کارواں گزر رہا تھا۔ اُن کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں شام کے سناٹے میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔ سلطانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی۔ گھنٹیوں کی آواز دُور ہوتی جا رہی تھی۔ آفتاب کی نارنجی شعاعیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

سامنے ایک درخت کے پاس نیاز کھڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں جانے کے لئے نکلا تھا۔ ڈرائیور کار میں پٹرول ڈلوانے گیا تھا۔ وہ اُس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالہ گوں روشنی میں وہ خاصا دیدہ زیب نظر آ رہا

تھا۔سلطانہ نے اُس کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ عین اُسی وقت نیاز نے اُس کی جانب نظریں اُٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہُوا۔ سلطانہ فوراً ہٹ گئی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ مگر اس واقعہ کے بعد نیاز کے رویّہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اتوار کو نیاز عموماً گھر پر رہتا۔ مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے کے اندر گزُرتا، یا پھر ملنے جُلنے والے آجاتے۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ سلطانہ سے اُس کی بات چیت بہت سرسری ہوتی تھی۔ کئی بار وہ اس کو اور انّو کو کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لئے شہر بھی لے گیا۔ اور ہمیشہ سامان سے لدا پھندا لوٹتا۔ اس سامان میں زیادہ تر سلطانہ کے بنڈل ہوتے۔

وہ اُس کے ساتھ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا تھا۔ بات کرتا تو عام طور پر اس کی نظریں جھکی ہوتیں۔ یہ گفتگو عام طور پر رسمی سی ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا جب وہ اُس سے کوئی ذاتی سوال کرتا۔ وہ بھی کچھ اس قسم کا ہوتا۔

"تمہارا دل تو یہاں نہیں گھبراتا؟"

"رات تمہاری کھانسی کی آواز آرہی تھی، جاکر ڈاکٹر کو دکھادو!"

"کسی بات کی تکلیف تو نہیں؟"

گھریلو اخراجات کے لئے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سویرے ہی سویرے انّو کو بُلاتا اور اس کے ذریعہ سلطانہ کو تین سو روپے بھجوا دیتا۔ بجلی کا بل، نوکروں کی تنخواہ اور دھوبی کا حساب وہ خود اپنے پاس سے ادا کرتا تھا۔ بڑے مزے میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ اس آسائش نے ماں کا غم دُھندلا کر دیا تھا۔ سلطانہ کا چہرہ تابناک ہوتا جارہا تھا۔ آنکھوں میں برسات کی شاموں کا حسن ہوتا۔

اور جسم پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح لچکتا۔ اُس کے حسن میں نرالی سج دھج آگئی تھی۔

لیکن سلطانہ کے ساتھ نیاز کا رویّہ جتنا نرم تھا، اُسی قدر وہ انّو کے ساتھ بے رخی سے پیش آتا۔ بات بات پر اُس کو ڈانٹتا۔ کبھی کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو گالیاں دینے سے بھی نہ چُوکتا۔ دو بار انّو کے منہ پر اُس نے تھپیڑ بھی مارے تھے اور ایک دفعہ تو وہ ایسا غضب ناک ہوگیا کہ پانی کا گلاس کھینچ مارا۔ مگر انّو بال بال بچ گیا۔ شیشے کا گلاس دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔

انّو ڈرا سہما رہتا تھا۔ نیاز کے رویّہ نے اُس کو اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت چپ چپ رہتا اور اس کمسنی میں بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ نظر آتا۔ نیاز گھر میں آتا تو انّو کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ اس کے سامنے نہ جائے۔ اگر نیاز کسی کام سے بُلاتا تو اُس کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ وہ سہما ہوا، سکڑا سکڑایا اُس کے پاس جاکر خاموش کھڑا ہو جاتا۔ وہ کسی کام کو کہتا تو بدحواسی میں کوئی نہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت ہو جاتی۔ نیاز پاگل کتے کی طرح دانت کچکچا کے اس کی جانب لپکتا اور اس پر گالیوں کو بوچھاڑ کر دیتا۔

انّو کے ساتھ نیاز کے اس ناروا رویّہ کو سلطانہ بار ہا شدّت کے ساتھ محسوس کر چکی تھی۔ مگر کبھی احتجاج کرنے کی اُس کو جرأت نہ ہوئی۔ ایک بار جب نیاز نے انّو کے منہ پر تھپیڑ مارا اور وہ روتا ہوا اُس کے پاس آیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ انّو کے رخسار پر اُنگلیوں کا نشان صاف نظر آرہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر کر بے چارگی سے رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی تو اپنی بے کسی پر خود اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ انّو کو سینہ سے لگا کر بے اختیار رو پڑی۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے بھائی صبر کرو۔ اللہ کے لئے اس طرح بلک بلک کر نہ رو۔

میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔"

اس کو سینے سے لگائے وہ دیر تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ اَنّو سے اس کو بچپن ہی سے بڑی محبت تھی۔ اور اب تو بھری دنیا میں وہ اُس کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک بھائی ایسا گیا کہ یہ بھی خبر نہ ملی کہ زندہ ہے کہ مر گیا۔

اَنّو کے ساتھ نیاز کا رویّہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس کا کام کاج کرنے کے لئے گھر میں ایک ملازم موجود تھا۔ مگر وہ اپنا سارا کام اَنّو ہی سے کراتا۔ اور ذرا سی غلطی پر گندی گندی گالیاں دیتا۔ اُس کے چہرے پر تھوک دیتا۔ بازو پکڑ کر پن چبھوتا۔ تکلیف سے بلبلا کر چیختا تو اُس کو بے رحمی سے مارتا۔

اَنّو نے بارہا سلطانہ سے فریاد کی۔ وہ اس کو دلاسا دے کر رہ جاتی۔ نیاز سے کچھ کہنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ اَنّو نے نیاز کے خلاف کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ اُس کی مار سہہ لیتا اور گھر کے کسی گوشہ میں جا کر چپکے چپکے روتا۔ نیاز سے تو اُس کو چڑ تھی ہی، اب وہ سلطانہ سے بھی بیزار رہنے لگا۔ اُس کو تنہائی سے رغبت ہوتی جا رہی تھی۔ جب دیکھو اکیلا بیٹھا ہے۔ اس وقت وہ بڑی اوٹ پٹانگ باتیں سوچا کرتا۔ اس کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ جسم کے ہر ہر جوڑ کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ اور اُن پر منڈھی ہوئی کھال چکنی چکنی معلوم ہوتی۔

اِس مریل سے لڑکے سے نیاز کو نہ معلوم کیوں اس قدر نفرت تھی کہ اس کو دیکھتے ہی وہ جھنجھلا جاتا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو جاتیں۔ ہونٹ کانپنے لگتے۔ اُس کو اذیت پہنچا کر اسے عجیب سی تسکین ملتی۔

اَنّو اس کے سامنے جاتا تو اس طرح گھگھیا کر بولتا کہ خارش زدہ کتے کی

طرح حقیر نظر آتا۔ اس نفرت کی بنیادی وجہ کسی حد تک خود سلطانہ تھی۔ اُس کو انّو سے بے تحاشہ پیار تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت اُس کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ وہ اس کو اپنے سامنے بٹھا کر ناشتہ کراتی، اصرار کر کے کھانا کھلاتی اور اپنے کمرے ہی میں اُس کو سُلاتی تھی۔ کبھی بیٹھی اُس کے کپڑوں میں بٹن ٹانک رہی ہے، اُس کی کتابیں قرینے سے لگا رہی ہے۔ اُس کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔ اُس کا بستر درست کر رہی ہے۔

وہ سویرے بہت تڑکے اُٹھ جاتی اور دیر تک انّو کو بیدار کرتی رہتی۔ وہ اُس وقت گہری نیند میں ہوتا۔ بار بار کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتا، مگر ناراض ہونے کے بجائے اُس کو چمکارتی رہتی۔ آخر جب اُٹھ کر بیٹھ جاتا تو اس کو غسلخانے لے جاتی۔ جب تک وہ نہاتا رہتا، باہر دروازے پر تولیا لئے کھڑی رہتی۔ وہ غسل خانے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا تو اس کا بھیگا ہُوا بدن پونچھتی اور خود کنگھا لے کر اُس کے بال بناتی۔ ذرا دیر بعد اُس کے لئے گرم گرم دودھ کا گلاس لے کر آتی اور زبردستی پورا گلاس پلاتی۔ جب اسکول جاتا تو کوٹھی کے دروازے پر کھڑی دُور تک اس کو دیکھا کرتی۔

سلطانہ نے اپنی ساری توجہ کا مرکز انّو کو بنا لیا تھا۔ نیاز کبھی کبھار اُس کے کمرے کے سامنے سے گزرتا تو یہی دیکھتا کہ وہ انّو کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہے۔ وہ اس قدر منہمک ہوتی کہ نیاز کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔

انّو کی تنہا پسندی نے سلطانہ کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اُس کو کبھی باغیچہ کے گھنے درختوں کے نیچے سے، کبھی باورچی خانے کی کوٹھڑی سے، کبھی چھت پر جانے والے زینے سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتی۔ مگر انّو اُس کی نظر سے بچتے ہی کہیں نہ کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ وہ گھبرائی گھبرائی اس کو

تلاش کرتی پھرتی۔ اُس کے پیار میں ماں کی مامتا کا جذبہ تھا۔ اُس کی دیکھ بھال میں سلطانہ کو ایک طرح کا سکون ملتا تھا۔

ایک روز ایسا ہُوا کہ سلطانہ کی طبیعت خراب تھی۔ معمولی موسمی بخار تھا۔ نیاز نے اصرار کر کے اُس کو بوڑھی خادمہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور خود کار کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شام کا وقت تھا۔ انّو باہر لان میں درختوں تلے حسبِ عادت تنہا بیٹھا تھا۔ جب اندھیرا خوب پھیل گیا تو وہ اُٹھ کر گھر کے اندر گیا، اسی وقت نیاز نے اُس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ انّو کا خون خشک ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ سہما ہُوا اس کے پاس پہنچا۔ نیاز اُس کو دیکھتے ہی غرّایا۔

"ابے کہاں مر گیا تھا۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

انّو نے حسبِ معمول اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ نیاز نے جل کر کہا۔ "سؤر کے بچے! منہ سے کیوں نہیں بولتا۔ اب تک کہاں آوارہ گردی کر رہا تھا۔"

انّو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "باہر درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔"

نیاز نے ایک بڑی ہوئی گالی دے کر کہا۔ "اب تُو جھوٹ بولنا بھی سیکھ گیا ہے۔ سمجھ لینا کھال اُدھیڑ کے رکھ دوں گا۔ اِس گھر میں رہنا ہے تو ٹھیک ٹھیک سے رہو۔ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ میں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔"

وہ دیر تک اُس پر برستا رہا۔ پھر ڈپٹ کر بولا۔ "ذرا الماری سے گلاس تو نکال، اور وہ جو کونے میں لمبی بوتل رکھی ہے، وہ بھی لیتا آ۔ میری طبیعت خراب ہے، ذرا سی دوا پیوں گا۔" انّو چپ چاپ الماری کی طرف چلا گیا۔

جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہوا بھری ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ نیاز کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت کچھ بھاری بھاری تھی۔ اُس نے سوچا اس وقت ایک آدھ پیگ وہسکی کا لگا لیا جائے تو طبیعت بشاش ہو جائے گی۔ اب وہ کبھی کبھار گھر پر بھی پی لیتا تھا۔ وہ شراب پینے کا مُوڈ بنا کر کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

انو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اُٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا "ابے کہاں مر گیا ؟" انو گھبرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھُوٹ گئی فرش پر گرتے ہی اُس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ وہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے میں اُس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لمحہ بھر تک تو خوں خوار نظروں سے اُس کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے انو کے بال پکڑ لئے۔ کئی بار زور زور سے اُس کو جھنجوڑا اور پھر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اُس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنی شروع کر دیں۔

انو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ درد سے بلبلا کر فرش پر دہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات ماری۔ وہ دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نیاز بھینسے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ انو ذرا دیر تک تو لاش کی مانند بے سُدھ پڑا رہا۔ پھر اُس نے اُٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے جانے نہ دیا۔ لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا دیا۔ انو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے قریب گیا اور گریبان پکڑ کر اس کو زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ پہلی بار انو نے جرأت پیدا کی اور جل کر اپنا پُورا

منہ نیاز کی کلائی پہ رکھ کر گوشت چبا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گھبرا کر بڑا گھناؤنا سا منہ بنایا۔ زور سے چلایا "مار دیا سالے نے" اور پھر انّو کو فرش پر گرا کر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انّو کے حلق سے بلیوں کے غرّانے کی سی آواز نکلی۔ اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔

نیاز نے گھبرا کر اُس کو چھوڑ دیا۔ انّو آنکھیں پھاڑے دیر تک اُس کو تکتا رہا۔ اُس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سُرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ پھر وہ درد سے کراہنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔

"تو ابھی میرے گھر سے نکل جا۔ ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔"

انّو نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ڈگمگا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینہ سے شرابور تھا۔ سانس اُلجھی ہوئی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

نیاز نے گالی دے کر کہا "ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور لے گا۔" وہ اُس کی جانب خوں خوار نظروں سے گھورتا ہوا لپکا۔ انّو جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بڑی بے بسی کے ساتھ ہاتھ جوڑ دئے۔ گھگھیا کر بولا۔

"اب نہیں، اب نہیں۔"

نیاز بولا "تو پھر نکل جا یہاں سے۔"

اُس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ زور سے دھاڑا "دیکھ اب لوٹ کے نہیں آنا۔ ورنہ میں تجھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

انّو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ لیکن وہ کوٹھی میں نہیں ٹھیرا۔ لان کو عبور کرتا ہوا پھاٹک سے نکلا اور سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(۴)

رات نے اپنے پر پھیلا دئے تھے۔ کوچہ و بازار پر تاریکی پھیل گئی تھی۔ انّو سنسان سڑک پر کئی گھنٹے تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ مسلسل سوچتا رہا کہ اس کو کہاں جانا چاہیئے۔ مگر وہ کہیں نہیں گیا اور ایک سنسان سڑک کے فٹ پاتھ پر تھک کر سو گیا۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے انّو کی آنکھ اچانک کھُل گئی۔ اُس کو ایسا محسُوس ہُوا کہ مینہ برس رہا ہے۔ اُسے اپنا بدن بھیگتا ہُوا معلوم ہُوا۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسی وقت اندھیرے میں کسی کی تیز آواز اُبھری۔

"مار دیا سالے نے۔ ابے تجھ کو یہیں مرنے کو جگہ رہ گئی تھی"؛

انّو نے دیکھا ایک شخص اُس کے سر پر کھڑا پیشاب کر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سہمی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ شخص اسی طرح اطمینان سے کھڑا پیشاب کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ فارغ ہُوا تو ازار بند باندھتا ہُوا قریب آکر پوچھنے لگا۔

"ابے یہاں کیوں سو رہا ہے۔ گھر میں جگہ نہیں ہے؟"

انّو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھا ٹکر ٹکر اُس کو دیکھتا رہا۔

اُس نے دوبارہ پوچھا۔ "یہیں رہتا ہے؟"

اِس دفعہ انّو نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "نہیں۔"

ذرا دیر تک وہ شخص خاموش کھڑا رہا۔ اندھیرے میں وہ سائے کی طرح دُھندلا نظر آ رہا تھا۔ انّو اُس کے حلیہ کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اُس کی آواز بھاری تھی۔ لب و لہجہ سے گھٹیا قسم کا آدمی لگتا تھا۔ چند لمحوں بعد اُس کی آواز اُبھری۔

"ابے تو یہاں کیوں پڑا ہے؟"

اتّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اچانک رات کی خاموشی میں گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز اُبھری۔ اتّو نے دیکھا، چند قدم کے فاصلے پر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ گھوڑا ہنہنا ہنہنا کر سڑک پر ٹاپیں مار رہا تھا۔ وہ آدمی گھوڑے کو چمکارنے لگا۔ "اور ذرا دم لے بادشاہ! میں ابھی آیا۔" پھر اُس نے پلٹ کر اتّو سے کہا۔

"ابے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر کیوں پڑا ہے۔ چل میرے ساتھ۔"

اتّو خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس دفعہ وہ آدمی جو تانگہ والا تھا، بے تکلفی سے بولا۔ "ابے اب کھڑا بھی ہو۔" اُس نے اتّو کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

اتّو اُس کے ساتھ تانگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چابک ہوا میں لہرائی۔ باگیں کھینچیں۔ گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ دُور تک سُرمئی سڑک پھیلی تھی، جس پر گھوڑے کے پیروں میں لگے ہوئے نعل ٹپا ٹپ بج رہے تھے۔ اتّو کچھ دیر بیٹھا ہچکولے کھاتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر سوتا رہا۔ جب آنکھ کھُلی تو اس نے دیکھا، تانگہ ایک تنگ بازار سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ بازار سنسان پڑا تھا۔ پنواڑیوں اور دودھ والوں کی اِکّا دُکّا دکانیں ابھی تک کھُلی تھیں، جن پر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ تانگے والے نے ایک دودھ والے کی دکان کے سامنے تانگہ ٹھیرایا۔ اُتر کر دکان پر گیا۔ دودھ والا بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"اماں نوروز خاں کہاں سے آرہے ہو؟ آج تو تم نے بڑی دیر

لگا دی۔

نوروز بولا "یار چھاؤنی کی ایک سواری لے کر گیا تھا، ملیتھن نکل گیا اپنا" اس نے لمحہ بھر توقف کر کے کہا "لا یار سیر بھر دودھ تو دے۔ بڑے آبخورے میں دیتا"

"یہاں نہیں پیو گے؟"

"نہیں یار ساتھ لے جاؤں گا"

نوروز کا جواب سن کر دودھ والا چونک پڑا۔ اُس نے جھک کر تانگہ کی جانب دیکھا، جس میں اتو خاموش بیٹھا تھا۔ وہ نوروز سے کہنے لگا "تو یوں کہو نا! ابے کہاں سے پھنسا لایا؟"

نوروز مسکرا کر بولا "بس پوچھ نہ، چڑھ گیا ہتّے۔ اللہ سب کو رزق دیتا ہے پہلوان"

دودھ والے نے ایک بار پھر اتو کو دیکھا۔ ران کھجاتے ہوئے بولا "لونڈا تو صورت شکل کا اچھا دِکھے ہے۔ پر یار یہ تو بہت چھوٹا ہے۔ ابے یہ تو مر جائے گا۔ سالے کھینچے کھینچے پھرو گے۔ میرا کہنا مان، یہ چکّر اب چھوڑ دے۔ گھر دَر بسا لے"

وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا "ابے کیا رکھا ہے گھر بسانے میں۔ خواہ مخواہ کا ٹنٹا ہے"

پہلوان بولا "تم کو تو سالے چاٹ ہی اور لگ گئی ہے"

"یار پہلوان! تُو زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔ لا دُودھ دے" یہ کہہ کر نوروز نے پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر دودھ والے کو دیا "ربڑی ہو تو پاؤ بھر وہ بھی دے دے۔ ربڑی نہ ہو تو کچھ اور میٹھا دیدے"

دودھ والا بولا "آج تو بڑے زوروں پر جا رہا ہے" نوروز صرف مُسکرا

کر رہ گیا۔ پہلوان نے دودھ سے بھرا ہوا آبخورہ اُس کو دیا۔ کہنے لگا۔ "ربڑی تو ہے نہیں، جلیبیاں دے دوں؟"

"لا یار وہی دے۔ دیر نہ کر۔"

پہلوان نے جلیبیاں اور پانچ روپے کے نوٹ سے بچی ہوئی رقم اُس کے حوالے کر دی۔ نوروز نے تانگہ کے قریب آکر دودھ کا آبخورہ اور جلیبیوں کا پُڑا انّو کو تھما دیا۔ خود اُچک کر تانگے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے نے حرکت کی اور تانگہ بازار سے گزرنے لگا۔

مختلف راستوں کے چکّر کاٹنے کے بعد تانگہ ایک احاطہ کے اندر داخل ہُوا۔ احاطہ کی چار دیواری بوسیدہ تھی۔ اندر کھپریل کی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے کئی گھر تھے۔ ان ہی میں نوروز کی کوٹھڑی بھی تھی۔ دروازے پر تالا پڑا تھا۔ نوروز نے تالا کھولا۔ ماچس جلا کر ایک چندھی سی لالٹین روشن کی، جس کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک طرف پلنگ پڑا تھا، جس پر میلے کچیلے بستر کے علاوہ نوروز کے کپڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ٹرنک تھا، جس پر کنگھا، تیل کی شیشی اور ایسی ہی چند چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

نوروز نے لالٹین روشن کی۔ بستر پر سے کپڑے ہٹائے۔ انّو سے بولا۔ "تم یہاں بیٹھو، میں ذرا گھوڑا کھول کر تھان پر باندھ دُوں۔ بس ابھی آیا۔ گھبرانا نہیں۔"

وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھڑی کی فضا مرطوب تھی اور ایک عجیب سی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ انّو خاموشی سے پلنگ پر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی کی ایک ایک چیز کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک گُم صُم تھا۔ ہر چیز اُس کے لئے اجنبی تھی۔ ہر بات انوکھی تھی۔ گذشتہ

چھ سات گھنٹوں میں اُس کی زندگی میں، کچھ اس طرح پے بہ پے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں کہ اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف خوابوں کا دھندلکا چھایا تھا، جس میں اُس کی اپنی ذات گُم ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر احساس دم بخود تھا۔

نوروز واپس آیا۔ اُس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی لگائی۔ المونیم کے بڑے سے کٹورے میں دودھ اور جلیبیاں لے کر انّو کے پاس گیا۔ انّو نے صرف سہ پہر کی چائے پی تھی۔ اب اُسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نوروز نے اصرار کیا تو اُس نے دودھ میں بھیگی ہوئی جلیبیاں پی لیں۔ نوروز نے ہاتھ بڑھا کر طاق سے لالٹین اُٹھائی اور پھونک مار کر بجھا دی۔

نوروز سویرے بہت تڑکے اُٹھ کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

انّو کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ نہ جانے کب سے جاگ رہا تھا اور بستر پر لاش کی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ اُس نے نوروز کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ روشندان سے اُبھرتی ہوئی ہلکی سفید سفید کافوری روشنی کو بھی دیکھا۔ سویرا ہو رہا تھا۔ کہیں قریب ہی مسجد میں اذان بلند ہو رہی تھی۔

"اللہ اکبر! اللہ اکبر!"

احاطے میں ملی جُلی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ بچّوں کے رونے کی آوازیں، بوڑھوں کے کھانسنے کی آوازیں، عورتوں کے چیخنے کی آوازیں۔ اور یہ سب آوازیں گُھل مل کر ملکے ہلکے شور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ انّو چپ پڑا اس شور کو سُنتا رہا۔ روشن دان سے اُبھرنے والی روشنی کو دیکھتا رہا۔

نوروز جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھوں میں گرم گرم پوریوں کا پُڑا دبا ہوا تھا۔ اُس نے انّو پر ایک نظر ڈالی۔ کہنے لگا۔ "ابے تو ابھی تک لیٹا ہے۔ منہ ہاتھ تو دھو لیا ہوتا۔"

انّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پلنگ سے نیچے اُترا تو اُس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اُس نے کونے میں رکھے ہوئے لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرا اور کوٹھڑی کے دروازے پر جاکر منہ دھونے لگا۔

اُس کا جی متلا رہا تھا۔ مگر نوروز نے اصرار کرکے اُس کو دو پُوریاں زبردستی کھلا ہی دیں۔ چار پوریاں اس نے انّو کے دوپہر کے کھانے کے لیئے رکھ دیں۔ کہنے لگا۔ "موقعہ لگا تو میں دوپہر کو آجاؤں گا۔ نہیں تو رات کو واپسی ہوگی۔ گھبرانا نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔"

انّو نے کھوئی ہوئی نظروں سے اُس کو دیکھا اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ نوروز نے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔ "اب تو اطمینان سے پڑکر سو۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ بھُوک لگے تو پُوریاں کھالینا۔ رات کا کھانا میں لے کر آؤں گا۔ ٹھیک ہے۔" اُس نے انّو کے رخسار میں ہولے سے چُٹکی بھری۔ مسکراکر بولا۔ "وکیل صاحب کو دیر ہورہی ہوگی۔ مجھے اُن کے لیئے تانگہ لے کر جانا ہے۔ گھبرانا مت۔"

وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ دروازہ بند کیا اور اس میں تالا لگا دیا۔

انّو دن بھر کوٹھڑی کے اندر نڈھال پڑا رہا۔ سہ پہر کو ذرا بھُوک لگی مگر ایک پُوری بھی نہ کھائی گئی۔ نہ جانے کیسی طبیعت ہورہی تھی۔ اُس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

رات کو دس بجے کے قریب نوروز آیا۔ وہ اپنے ساتھ خمیری روٹیاں اور سالن لایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ انّو کے لیئے ایک پھُولدار ریشمی بش شرٹ بھی لایا تھا۔ اُس نے بڑے شوق سے بش شرٹ اسی وقت انّو کو پہنائی اور ہنس کر بولا۔

"بچ گئے اُستاد۔ اب میرے ساتھ رہا تو عیش کرادوں گا۔"

انّو کو بش شرٹ پہن کر کوئی خاص مسرّت نہ ہوئی۔ مگر نوروز بڑا خوش

نظر آرہا تھا۔ بار بار بش شرٹ کی تعریف کرتا۔ اُس کی اپنی قمیص خاصی میلی تھی۔ اور شلوار اُس سے بھی زیادہ میلی تھی۔ وہ دُہرے بدن کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ تیس بتیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔ رنگ سانولا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہنستا تو آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چہرہ کچھ ایسا بے ڈھنگا ہو جاتا کہ اچھا خاصا اُلو کا پٹھا معلوم ہوتا۔

لیکن وہ اُلو کا پٹھا ہرگز نہ تھا، روزانہ دس بارہ روپے اور کبھی کبھی تو اٹھارہ بیس روپے کما لاتا تھا۔ طبیعت میں چڑچڑا پن تھا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا تھا۔ شہر کے تانگے والوں میں وہ بڑا سرکش مشہور تھا۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں اچھے تھے، اس لئے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا، جب اڈے پر کسی تانگے والے سے اس کی تو تکار نہ ہوتی۔ اکثر اس گالی گلوچ میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی۔

لیکن اتو کے ساتھ نوروز کا رویّہ بڑا اچھا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا۔ اتو نے بھی کبھی اُس کو ناراضگی کا موقعہ نہ دیا۔ ایک تو وہ فطرتاً خاموشی پسند تھا۔ اب اُس نے بولنا اور بھی بند کر دیا تھا۔ ہر وقت چُپ چُپ رہتا۔

نوروز روزانہ صبح کوٹھڑی میں تالا لگا کر چلا جاتا، اور رات گئے آکر کھولتا۔ واپسی پر وہ اتو کے لئے کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ، اکثر اور بھی کچھ نہ کچھ لے آتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوروز زور زور سے ڈکاریں لیتا اور دھم سے بستر پر گر جاتا۔ اتو کو آواز دے کر کہتا۔

”لے بے ذرا ٹانگیں تو دبا دے۔“

اتو پائنتی پر بیٹھ کر چُپ چاپ اُس کی موٹی موٹی پنڈلیاں دبانے لگتا۔ نوروز اُس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں ہوتا۔ وہ اتو سے پوچھتا ”کیوں بے

کوئی تکلیف تو نہیں تجھ کو ؟"

انّو اپنا چھوٹا سا سر انکار میں ہلا دیتا۔

وہ اصرار کر کے پوچھتا۔ "دیکھ بے کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً کہہ دیا کر۔"

"اچھا" انّو کا مختصر سا جواب ہوتا۔

نوروز کو اُس کی یہ خاموشی کبھی کبھی بڑی گراں گزرتی۔ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں کہتا۔ "ابے تُو نے کوئی چپ کا روزہ رکھا ہے، ذرا بات چیت کیا کر۔ یہ کیا منہ لٹکائے بیٹھا ہے۔ اور دیکھ جو تیرا جی چاہے، بے خوف مجھ سے کہہ دیا کر۔ دیکھ تو میں تیری بات پوری کرتا ہوں کہ نہیں۔"

اُس کے اسی اصرار پر آخر ایک روز انّو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے اسکول میں داخل کرا دو۔"

نوروز حیرت سے چونک پڑا۔ "اسکول میں داخل کرا دوں ؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ "ابے کیا کرے گا اسکول جا کر، وہاں تو لڑکے جا کر ایک نمبر آوارہ ہو جاتے ہیں۔ جا بے تُو بھی یوں ہی رہا۔"

اُس کے اِس جواب سے انّو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اسکول میں داخل ہو جائے گا۔ خوب پڑھے گا۔ پھر اچھی سی کوئی نوکری کر لے گا اور سلطانہ کو اپنے پاس بُلا لائے گا۔ اُسے سلطانہ بہت یاد آتی تھی۔ اُس کو یاد کر کے وہ اکثر رو پڑتا۔ اب وہ اُس کے پاس جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نیاز دیکھ لیتا تو اُس کو زندہ نہ چھوڑتا۔

نوروز کے پاس رہتے ہوئے انّو کو دو ہفتے سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ نوروز اُس کو روزانہ کوٹھڑی میں بند کر کے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ وہ دن بھر کوٹھڑی میں قید رہتا۔ کبھی کبھی دل گھبراتا تو اُٹھ کر بے چینی سے چکر کاٹنے

لگتا۔ پھر اپنی بے کسی پہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ وہ سسکیاں بھر کر دیر تک روتا رہتا۔ نوروز سے اُس کو کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس کے دانت غلیظ تھے۔ منہ سے بڑی خراب بُو آتی تھی۔ ابابیل کے پروں کی طرح گھنی مونچھیں تھیں۔ جب وہ اس کو پیار کرتا تو اتو کا جی متلانے لگتا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوروز کے منہ پر تھوک دیتا۔

ایک روز رات کو واپس آیا تو وہ نشے میں دُھت تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ قدم بہکے بہکے پڑ رہے تھے۔ اُس نے کوٹھڑی کے اندر داخل ہوتے ہی گھُور کر اتو کو دیکھا۔ جھوم کر بولا۔

"کنڈی لگا دے۔"

اُس کی آواز اس وقت پھٹے بانس کی طرح بے ڈھنگی تھی۔ اتو نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ نوروز کوٹھڑی کے بیچوں بیچ کھڑا جھومتا رہا۔ اُس نے گہری نظروں سے اتو کو دیکھا۔ "اِدھر آ بے۔" اتو چُپ چاپ اُس کے پاس چلا گیا۔

نوروز ہونٹ بھینچ کر چیخا۔ "اے جیو میری جان" یہ کہہ کر اُس نے اتو کو دونوں بازوؤں پہ اُٹھا لیا اور دُھوں سے بستر پہ اُٹھا کر پھینک دیا۔ پھر اُس نے لالٹین پہ ایک لات ماری، جو دُور تک لڑھکتی چلی گئی۔ لالٹین کی لو چند بار بھڑکی اور بجھ گئی۔ کوٹھڑی میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔

صبح اُٹھ کر نوروز نے دیکھا تو اتو غائب تھا۔ اُس کی نظر فوراً دروازے پہ گئی۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر جا کر دیکھا اتو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات کو نہ جانے کب اُٹھ کر فرار ہو گیا تھا۔ نوروز دن بھر پاگلوں کی طرح تانگہ پہ بیٹھا اتو کو تلاش کرتا۔ مگر کہیں اُس کا سُراغ نہ ملا۔ کئی روز تک وہ اس کو جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا، مگر اتو ایسا غائب ہُوا کہ پھر اُسے نظر نہ آیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ نوروز اُس کو قریب قریب بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ اچانک نظر آگیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ بازاروں کی رونق اُجڑ چکی تھی۔ نوروز تھکا ہارا لوٹ رہا تھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر اُس نے دیکھا۔ بجلی کے کھمبے کے پاس انّو کھڑا تھا۔ وہ اُس وقت بوسکی کی قمیص اور شلوار پہنے تھا۔ گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ کلّے میں پان تھا۔ آڑی مانگ نکلی تھی۔ بجلی کی روشنی میں اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اُس کے ہمراہ تین آدمی تھے۔ وہ اُجلے لباس پہنے ہوئے تھے اور وضع قطع سے اوباش نظر آتے تھے۔ انّو مسکرا مسکرا کر اُن سے باتیں کر رہا تھا۔

نوروز نے اُس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے تانگہ آگے بڑھایا اور عین اُن لوگوں کے سامنے جا کر روک لیا۔ نیچے اُترا۔ انّو نے اُس کو دیکھا تو چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ نوروز نے نتھنے پُھلا کر اُس کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"کیوں بے حرام کے تخم۔" نوروز کے منہ سے جھاگ اُڑنے لگا۔ اُس کی مونچھیں خطرناک طریقے پر پھڑپھڑانے لگیں۔ اُس نے لپک کر انّو کا بازو دبوچ لیا۔ ڈانٹ کر بولا: "منہ کیا تک رہا ہے۔ سیدھی طرح چلتا ہے کہ دُوں ایک ہاتھ۔"

تینوں شخص لمحہ بھر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے نوروز کو تکتے رہے۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر کہا: "بات کیا ہے جی؟"

نوروز بولا: "اسی سے پُوچھ لو۔"

"اِس سے تو بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تم بتاؤ۔"

نوروز بگڑ کر بولا: "دیکھو جی بہت دن تم نے میرا لونڈا رکھ لیا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ چُپ چاپ الگ کھڑے رہو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

وہ شخص مسخرے پن سے بولا " اچھا" اور اپنے ساتھ والے سے کہنے لگا " لو جی یہ لونڈا اس کا ہو گیا "

نوروز کہنے لگا " اس سے پوچھ کر تو دیکھو "

وہ شخص بولا " اس سے کیا پوچھنا ہے۔ آٹھ سو روپیہ نقد خرچ کیا ہے۔ تانگہ گھوڑا بک جائے گا۔ جا کر بنّو ہیجڑے سے پوچھ لو کیا رقم دی ہے، اس لونڈے کی "

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اننو نوروز کی کوٹھڑی سے نکل کر بھاگا تو راستے میں بنّو ہیجڑے سے اُس کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ بنّو اب بن سے اُتر چکا تھا۔ اُس نے نائیکہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ گھیر گھار کر نوخیز لڑکوں کو لاتا۔ کچھ دن اُن کی کمائی کھاتا اور جب کوئی مالدار اسامی مل جاتی تو اُس کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ اننو کی خوف زدہ نگاہیں دیکھ کر بنّو کی تجربہ کار نظریں تاڑ گئیں کہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ اُس نے اننو کو دلاسا دیا اور بہلا پھسلا کر اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ کچھ دن اُس کو اپنے پاس رکھا۔ پھر احمد جان کے ہاتھ بیچ دیا۔

اُس وقت نوروز سے احمد جان ہی بات کر رہا تھا۔ وہ کھالوں کا کاروبار کرتا تھا۔ آمدنی اچھی تھی۔ ہر طرح کی عیاشی کرتا تھا۔ خود بھی مزاج میں غنڈا پن تھا۔ اور دو چار بدمعاشوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا۔

نوروز اُس سے کہنے لگا " میں کسی سالے بنّو ونّو کو نہیں جانتا۔ میں تو اس کو ابھی لے کے جاؤں گا "

احمد جان نے کہا " لے جایا جائے تو لے جاؤ "

نوروز نے گردن اُونچی کر کے کہا " دیکھوں تو کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے " اُس نے اننو کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا " چل بے "

اُسی وقت احمد جان کا ایک اور ساتھی بڑھ کر آگے آیا۔ نوروز کو آہستہ

سے دھکا دے کر بولا " الگ ہٹ کے بات کر۔"

نوروز نے خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا اور چیخ کر بولا ۔

" یہ مت سمجھنا کہ اکیلا ہوں، تینوں پر بھاری ہوں۔"

مگر وہ شخص مشتعل نہ ہُوا۔ نرمی سے بولا " جا بھئی اپنا کام کر، کیوں خواہ مخواہ سر ہوئے جا رہا ہے۔"

نوروز نے پھر انّو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ احمد جان کے ساتھی نے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑا سا چاقو باہر نکال لیا۔ کڑ کڑ کر کے چاقو کے کُھلنے کی آواز اُبھری۔ نوروز نے دیکھا چاقو کی جھلکتی ہوئی نوک اُس کے پیٹ پر تھی۔

وہ آدمی کہنے لگا " اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ورنہ لاش بھی تمہاری ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔"

نوروز چُپ چاپ کھڑا جھلکتے چاقو کو دیکھتا رہا۔

احمد جان نے نوروز کو گالی دے کر کہا " ابے اب یہاں سے ٹلے گا بھی یا ہتیا کرانے کا ارادہ ہے۔"

نوروز پسپا ہونے کے سے انداز میں پیچھے ہٹا اور گردن جھکا کر تانگہ کی طرف چل دیا۔ جب وہ تانگہ پر سوار ہونے لگا تو احمد جان نے کہا ۔

" آئندہ اِدھر کا رُخ نہ کرنا، ورنہ ٹھنڈے پڑے ہوگے۔"

نوروز کو ان پر تاؤ تو بہت آیا مگر وہ ایک نہیں تین تھے اور مسلح تھے، وہ بالکل نہتّا تھا۔ لہٰذا اُس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اُس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور تانگے کو آگے بڑھا دیا۔ کولتار کی پختہ سڑک پر اُس کے تانگے کی آہٹ دُور تک اُبھرتی رہی، انّو احمد جان اور اُس کے ساتھیوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔

(۵)

انّو گھر سے نکلنے کے بعد واپس نہ آیا۔

سلطانہ روزانہ اُس کا انتظار کرتی۔ اُسے اُمید تھی کہ انّو ایک نہ ایک روز ضرور واپس آئے گا۔ اُس نے انّو کی ایک ایک چیز سنبھال کر الماری میں سجا کر رکھ دی تھی۔ اُس کے لئے کپڑوں کے کئی نئے جوڑے سلوائے تھے۔ وہ بھی الماری میں رکھے تھے۔ جب کبھی انّو بہت یاد آتا تو وہ الماری کھول کر کھڑی ہو جاتی اور ساری چیزوں کو حسرت سے دیکھتی۔ پھر اُس کا دل بھر آتا۔ بے اختیار رو پڑتی۔ انّو سے اُس کو بڑی ڈھارس تھی۔ اُس کے جانے کے بعد تنہائی کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھر کے چکر کاٹا کرتی۔ گھنٹوں دریچے پر کھڑی سڑک کی جانب خواب ناک نظروں سے تکا کرتی کہ شاید انّو آتا ہوا نظر آجائے۔

اُس کو اِس قدر پریشان دیکھ کر گھر کی بوڑھی خادمہ نے مشورہ دیا کہ گمٹی میں ایک بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ وہ فال نکال کر ایسی پتے کی باتیں بتاتے ہیں کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ اُن کا تعویذ ایک پر ایک ہے۔ اس سلسلہ میں اُس نے کئی حیرت انگیز واقعات بھی سُنائے، جن کو سُنکر سلطانہ کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ ایک روز جب نیاز باہر گیا ہوا تھا، اُس نے خادمہ کو اپنے ہمراہ لیا اور شاہ صاحب کے پاس جا پہنچی۔ اُس نے دیکھا کہ حاجت مندوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ دُور دُور سے لوگ اُن کے پاس آئے تھے۔ اُن کا قیام ایک ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا مختصر مکان تھا۔ جس میں کُل دو کمرے تھے۔ آگے سائبان تھا۔ جس میں مردوں کے لئے انتظام تھا۔ ایک کمرے میں پردہ دار خواتین بیٹھی تھیں۔ سُلطانہ

وہیں جاکر بیٹھ گئی۔ وہ نو بجے دن کو وہاں پہنچی تھی۔ دوپہر کو اُس کی طلبی ہوئی۔

کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ شاہ صاحب مسند سے لگے بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر لوبان سُلگ رہا تھا۔ ہر طرف تیز خوشبو پھیلی تھی۔ وہ ادھیڑ آدمی تھے۔ خوب گھیردار داڑھی تھی۔ سر پہ کالی کلیں تھیں۔ اُس وقت وہ زعفرانی رنگ کا کُرتا اور ویسا ہی تہبند باندھے ہوئے تھے۔ چہرے سے جلال ٹپکتا تھا۔ سلطانہ اندر پہنچی تو وہ آنکھیں بند کئے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ بوڑھی خادمہ بھی تھی۔

دونوں غالیچہ کے ایک سرے پر مؤدّب ہوکر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ کمرے کے اندر گہرا سکوت طاری تھا۔ اچانک شاہ صاحب کی آواز اُبھری۔

"لڑکی تیرا بھائی شمال مشرق کی جانب گیا ہے۔ وہ ایک شخص کے چنگل میں بُری طرح پھنسا ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کو سخت حیرت ہوئی کہ اُنھیں کس طرح پتہ چلا کہ وہ اپنے بھائی کے بارے میں معلوم کرنے آئی تھی۔ اُن سے تو اُس کی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ عقیدت سے اُس کی گردن جُھک گئی۔ کمرے کے اندر عُود و لوبان کے مرغولے لہرا رہے تھے۔ گہری خاموشی اور تیز خوشبوؤں کی مہک نے ماحول کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔

ذرا دیر بعد شاہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سلطانہ کو گھور کر دیکھا۔ حیرت زدہ ہوکر بولے۔ "تم دونوں کب آئیں؟" سلطانہ تو خاموش رہی، البتہ بوڑھی خادمہ نے کہا۔

"ہم کو تو آئے ہوئے دیر ہوگئی۔ بلکہ آپ نے بی بی جی سے کچھ کہا بھی

تھا۔"

"کاہے کے بارے میں؟"

"ان کا چھوٹا بھائی بہت دنوں سے لاپتہ ہے۔ اسی کے بارے میں آپ نے کہا تھا۔"

شاہ صاحب آہستہ سے مسکرائے۔ "اچھا، اچھا۔ میں تو نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔" لمحہ بھر رُک کر انہوں نے کہا "حاجیوں کا ایک جہاز طوفان میں گھر گیا تھا۔ مجھے حکم ملا کہ فوراً جاکر حاجیوں کو بچاؤ۔ اللہ غنی کیا عالم تھا جہاز کے اندر کہرام برپا تھا۔ ہر شخص موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ موجیں دہاڑتی ہوئی اُٹھ رہی تھیں۔ جہاز درخت کے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔" وہ اس طرح آہستہ آہستہ بول رہے تھے جیسے خواب میں بڑبڑا رہے ہوں۔ خادمہ کا منہ حیرت سے کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ سلطانہ کا سر عقیدت سے اور جھک گیا۔

شاہ صاحب نے زعفران کی روشنائی سے دو تعویذ لکھے اور سلطانہ کو دیتے ہوئے بولے۔ "یہ لو، ایک گھر کے شمالی کونے میں زمین کھود کر دفن کر دینا۔ دوسرا کسی اُونچے درخت پر دھاگے سے لٹکا دینا۔ جیسے جیسے ہوا سے تعویذ ہلے گا، ویسے ہی لڑکے کے دل میں ہَول اُٹھے گا۔ گھر کی یاد ستائے گی انشاء اللہ شام تک واپس آجائے گا۔"

سلطانہ نے تعویذ لے کر پرس سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر نذرانے کے طور پر پیش کرنا چاہا تو شاہ صاحب ہنس پڑے۔ "تمہارا بھائی آجائے تو ایک سیاہ بکرا منگا کے صدقہ کر دینا۔ اُس کا گوشت غریب محتاجوں میں تقسیم کر دینا۔"

سلطانہ نے نوٹ پرس میں واپس رکھ لیا۔ شاہ صاحب سے اجازت لی اور خوشی خوشی گھر آگئی۔ شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق اُس نے ایک

تعویذ زمین میں دفن کرا دیا۔ دوسرا باغیچہ میں لگے ہوئے پیپل کے ایک پیڑ کی اُونچی شاخ پر لٹکوا دیا۔ اُسے یقین تھا کہ انّو ضرور آجائے گا۔ شاہ صاحب کی شخصیت کا طلسم اس پر پوری طرح چھا گیا تھا۔

اُس روز اُس نے خانساماں کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے سامنے کھیر تیار کرائی۔ انّو کھیر بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ شام تک وہ بڑی خوش خوش رہی جب دن ڈھلنے لگا اور دھوپ کا رنگ گہرا بسنتی ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔ بار بار دریچے پر جا کر دیکھتی۔ سورج غروب ہو گیا۔ دن کا الاؤ سرد پڑ گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ شام ہو گئی مگر انّو نہ آیا۔

رات ہو گئی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ راستے سنسان پڑ گئے۔ مگر انّو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی اور انّو کا انتظار کرتی رہی۔

پھر بہت سی شامیں آئیں اور گزر گئیں اور شاہ صاحب کا تعویذ پیپل کی اُونچی شاخ پر لہراتا رہا۔ خادمہ نے دوبارہ شاہ صاحب کے پاس جانے کے لئے کہا۔ مگر سلطانہ پھر اُن کے پاس نہ گئی۔ اُس کی عقیدت کا طلسم درہم برہم ہو چکا تھا۔

نیاز کو سلطانہ کے دُکھ کا پُورا پُورا احساس تھا۔ وہ ہر طرح اُس کی ناز برداری کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ اُس کے لئے خرید کر لاتا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔ انّو کے چلے جانے پر اظہارِ افسوس کرتا لیکن سلطانہ اُس سے بیزار سی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ انّو نے صرف اُس کی وجہ سے گھر چھوڑا تھا۔ حالانکہ بوڑھے خانساماں نے صرف اس قدر بتایا تھا کہ اُس نے نیاز کو انّو پہ ناراض ہوتے سُنا تھا۔ اس کے بعد انّو کوٹھی کا پھاٹک کھول کر چپ چاپ باہر چلا گیا۔

جب وہ اس بات پہ غور کرتی تو اُس کے دل میں ہُوک سی اُٹھتی نیاز

کے خلاف شدید نفرت کا طوفان اُمڈ آتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ اس کوٹھی سے کہیں پہ چلی جائے۔ وہ ہر طرف نظریں دوڑاتی مگر اُسے کوئی بھی اپنا غم گسار نظر نہ آتا۔ ایسے عالم میں کبھی کبھار سلمان کا بھی خیال آتا۔ مگر اُس کی یاد کے ساتھ ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اُس کا جی چاہتا کہ اگر سلمان مل جائے تو وہ اس کا منہ نوچ لے۔ اُس کے چہرے پر تھوک دے اور ہزاروں کوسنے دے۔ پھر وہ سوچتی، کاش ایک بار سلمان اُس کو مل جائے اور وہ اُس کو یہاں لاکر دکھائے کہ اب سلطانہ وہ لڑکی نہیں رہی، جس کو غریب اور لاوارث جان کر اُس نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ شاندار کوٹھی میں رہتی ہے۔ اُس کے پاس موٹر ہے، قیمتی فرنیچر ہے۔ نوکر ہیں، خدمت گار ہیں، جن پر اُس کا حکم چلتا ہے۔ اُس کے پاس ڈھیر سارے ریشمی کپڑے ہیں۔ زیورات ہیں۔ جوتوں کی درجنوں جوڑیاں ہیں۔ وہ جس ٹھاٹھ باٹھ سے رہتی ہے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ان ہی دنوں ایک بار اصرار کر کے نیاز اُس کو اپنے ہمراہ خان بہادر فرزند علی کے گھر لے گیا۔ خان بہادر بڑی شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن شاہانہ تھا۔ ہر کمرے میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر تھا۔ کام کاج کے لئے نوکروں کی پلٹن تھی۔ مگر اس کی بیوی بڑی چھچھوری تھی۔ اِترا اِترا کر بات کرتی تھی۔ اُس کے ہر انداز سے نودولتا پن ٹپکتا تھا۔ البتہ دونوں لڑکیاں بہت شائستہ تھیں اور بڑا لڑکا بہت ہنس مکھ تھا۔

شام کی چائے اُس نے ان تینوں کے ساتھ پی۔ لڑکے کا نام شاہد علی تھا۔ نکلتا ہوا لمبا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، تیکھے نقوش، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ خاصا خوبصورت نوجوان تھا۔ ایم۔ اے کر چکا تھا اور اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے والا تھا۔ چائے پر بھی امریکہ کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔

اچانک اُس نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مسز نیاز! آپ کو دیکھ کر تو بڑی حیرت ہوئی۔"

سلطانہ کو اُس کے مسز نیاز کہنے پر سخت تعجب ہوا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اس غلط فہمی کو دُور کر دے۔ پھر یہ سوچ کر چُپ ہو گئی کہ نیاز نے نہ جانے اُس کے متعلق ان لوگوں سے کیا کہا ہے۔ سلطانہ کو بڑا غصّہ آیا۔ کم بخت نے کم سے کم اشارہ ہی کر دیا ہوتا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اُس نے شاہد سے کہا۔

"آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولا: "میں سمجھتا تھا نہ جانے آپ کیسی ہوں گی۔" اُس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ سلطانہ کو اس کی یہ ادا بڑی پیاری معلوم ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

وہ گھبرا گیا۔ "میں سمجھتا تھا کہ آپ کچھ عجیب سی ہوں گی۔"

اُسی وقت شاہد کی بہن نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تعجب تو مجھے بھی ہوا۔"

سلطانہ کی سمجھ میں اُن کی باتوں کا مطلب نہیں آیا۔ پوچھنے لگی۔

"کیوں؟"

وہ بولی۔ "ہم تو سمجھتے تھے کہ نیاز صاحب کی مسز تو بڑی بور سی ہوں گی۔ موٹی موٹی، کالی سی۔ مگر آپ اتنی زیادہ خوب صورت ہوں گی، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" پھر وہ اپنے بھائی کو متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں بھائی جان! یہی بات ہے نا؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "سچ مچ آپ بڑی گرینڈ معلوم ہوتی ہیں۔"

سلطانہ کا ایک بار پھر جی چاہا کہ وہ اُن کی غلط فہمی رفع کر دے۔ مگر اس میں نیاز کی ناراضگی کا ڈر تھا اور وہ اُس کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھی۔

کوٹھی پر واپس آکر وہ دیر تک خان بہادر کے گھر والوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُس کی ناک چڑھی بیوی، ملنسار بیٹیاں اور ہنس مکھ شاہد جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کی باتیں سلطانہ کو بار بار یاد آتی رہیں۔

چند روز بعد کا ذکر ہے۔ رات کے کوئی آٹھ بجے اچانک شاہد آگیا۔ نیاز اُس وقت کوٹھی پر موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہ اس وقت غیر حاضر رہتا تھا۔ سلطانہ چاہتی تو نیاز کے دوسرے ملنے جُلنے والوں کی طرح اُس کو بھی ٹال دیتی۔ مگر شاہد سے ملنے وہ خود ڈرائنگ روم میں گئی۔ وہ کسی کام سے نیاز کے پاس آیا تھا۔

باتوں باتوں میں اُس نے سلطانہ کو پھر مسز نیاز کہہ کر مخاطب کیا۔ سلطانہ نے سوچا کہ وہ اس غلط فہمی کو مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ کہنے لگی۔

"آپ مجھے مسز نیاز نہ کہا کریں۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "کیوں ؟"

"میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" سلطانہ نے شرما کر دبی زبان سے کہا۔ "شاید آپ کو پتہ نہیں۔ نیاز صاحب رشتے میں میرے سوتیلے والد لگتے ہیں۔"

شاہد تعجب سے منہ پھاڑ کر بولا۔ "ارے !" لمحہ بھر تک وہ ہکا بکا اس کو تکتا رہا۔ "تو پھر اُس روز آپ نے یہ بات کیوں نہ بتائی ؟"

"آپ لوگوں نے بتانے کا موقعہ ہی کہاں دیا۔"

شاہد معذرت کرنے لگا۔ "ہم تو یہی سمجھے ہوئے تھے۔ یہ تو بہت بُری بات ہوگئی۔ آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔" پھر اُس نے گھبرا کر خود ہی کہا۔

"آپ نے ضرور بُرا مانا ہوگا۔"

اس کو پریشان دیکھ کر سلطانہ کہنے لگی "وہ تو غلط فہمی تھی۔ اُس کا کیا بُرا ماننا۔"

شاہد نے اس کے بعد کچھ نہ کہا۔ چُپ چاپ بیٹھا سگرٹ پیتا رہا پنکھے کی ہوا سے اُس کے بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ چہرہ سوچتا ہُوا معلوم ہو رہا تھا۔ اِس عالم میں وہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ سلطانہ نے کئی بار اُس کو دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ہر بار وہ اُس کو بڑا کشش انگیز نظر آیا۔ معصوم چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں اور ہرے بھرے گلابی ہونٹ۔

کمرے کے اندر خاموشی چھائی تھی۔ باہر احاطہ میں درختوں کے خشک پتّے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے۔ دبی دبی آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ رات کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

سلطانہ نے اُسے خاموش دیکھ کر پُوچھا۔ "آپ کیا سوچنے لگے؟"

وہ چونک کر بولا۔ "کچھ نہیں، بس ایسے ہی ذرا سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" سلطانہ نے زیرِلب مسکرا کر کہا۔ شاہد علی نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور بے چین ہو کر اُنگلی سے سر کے بال کُریدنے لگا۔ پھر اُس نے دبی زبان سے کہا۔ "میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں؟"

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر اُٹھا۔ دروازے پر پہنچا۔ اور سلطانہ کی جانب دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔ سلطانہ کچھ نہ بولی۔ گم صم بیٹھی رہی۔

دوسرے روز شام کو وہ پھر آیا۔ نیاز اُس وقت بھی موجود نہ تھا۔ سلطانہ جیسے اُس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بلاجھجک پہنچ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مگر کوئی بات نہیں ہوئی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔

اور باہر شام در و دیوار سے نیچے اُتر رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ تاریک ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد شاہد کی آواز خاموشی میں اُبھری "میں آپ ہی سے ملنے کے لئے آیا تھا"

"مجھ سے؟" سُلطانہ کے لہجہ میں استعجاب تھا۔

"یہاں تو بہت ویرانی ہے" شاہد نے گفتگو کا رُخ بدل دیا "آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

"گھبراتا تو ہے" اس دفعہ سلطانہ کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر شاہد کو دیکھا "آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے؟"

شاہد چُپ رہا۔ اُس نے پہلو بدلا۔ اُس کے چہرے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ اچانک وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی طرف مڑا۔ آگے بڑھا۔ مگر دہلیز تک پہنچتے پہنچتے ٹھٹکا۔ پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے دونوں کی نظریں ملیں۔ شاہد مبہوت کھڑا رہا۔ پھر کسی سحر زدہ انسان کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہُوا سلطانہ کے قریب آیا۔ اس کی سانس اتنی تیز چل رہی تھی، گویا ہانپ رہا ہو۔ سلطانہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے کہ سلطانہ نے شاہد کی گرم گرم سانسوں کی حرارت اپنے رخساروں پر محسُوس کی۔

شاہد کی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ ہونٹوں پر لرزش تھی اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بے اختیار سلطانہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اُس کے لبوں کو، رخساروں کو، بالوں کو، گردن کو دیوانوں کی طرح چُومنے لگا۔ سلطانہ نے کسمسا کر کئی بار اُس کے بازوؤں کے حلقے سے نکلنے کی کوشش کی مگر صرف کلبلا کر رہ گئی۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اُس نے نڈھال ہو کر اپنا سر

شاہد کے کندھے سے ٹکا دیا۔ وہ موم کی طرح پگھل چکی تھی۔

کمرے کی خاموشی میں شاہد کی تیز سانسوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سلطانہ اُس کے پہلو میں بُت بنی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد شاہد کی آواز اُبھری "میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ میں ایم ایس نہیں کروں گا۔" وہ اپنی بے ترتیب سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں ؟" سلطانہ نے مجسم سوال بنکر پوچھا۔

"میں تم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں آج یہی کہنے آیا تھا۔" وہ ہولے ہولے سلطانہ کے سر کو تھپکنے لگا۔ "میں پہلے تم سے شادی کروں گا۔ خدا کی قسم! میں آج ہی امّی سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بے حد جذباتی ہوگیا۔ "تم میری ہو، تم میری ہو۔" اُس نے پاگلوں کی طرح سلطانہ کی گردن کو چومنا شروع کر دیا۔

جب شاہد چلا گیا۔ تو سلطانہ اپنے کمرے میں گئی۔ آئینہ کے رُو برُو کھڑے ہوکر اپنا عکس دیکھا۔ اور ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی کیا وہ واقعی خوب صورت ہے۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ شاہد اس سے بیاہ کرے؟ یہ سوالات۔ اُس کے ذہن میں کلبلاتے رہے اور اس کی دلکش آنکھیں بار بار آئینہ میں جھپکتی رہیں۔ ہونٹ لرز کر رہ جاتے۔ اُن پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

وہ شام اور ایسی کئی شامیں اُس نے انگڑائیاں لے لے کر اور مُسکرا مُسکرا کر گزاریں۔

مگر شاہد دوبارہ نہ آیا۔ ایک روز نیاز نے باتوں باتوں میں سلطانہ کو بتایا کہ شاہد علی امریکہ چلا گیا۔ سلطانہ کے دل پر زور کا گھونسا لگا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ زندگی ایک بار پھر اُس کو جُل دے گئی تھی۔

اِس صدمہ نے اُسے توڑ پھوڑ ڈالا۔ وہ بہت سے سُہانے خواب، جو اُس نے پچھلے کئی روز میں دیکھے تھے، تارِ عنکبوت کی مانند بکھر کر رہ گئے۔ اُس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیل گیا۔ پھر وہی زندگی کا لق و دق صحرا تھا۔ وہی تنہائی، وہی بے چارگی۔

ساون کا مہینہ لگ چکا تھا۔ آسمان پر اُودی اُودی بدلیاں گھر گھر کر آتیں۔ مینہ برستا، اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا۔ برسات کی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پچھم سے گھٹائیں اُمڈیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ بج رہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹیں سیٹیوں کی طرح رات کے سنّاٹے میں چیخ رہی تھیں۔ گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سلطانہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اچانک بجلی غائب ہو گئی۔ جھلکتی ہوئی تمام روشنیاں اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ سلطانہ خوفزدہ ہو گئی۔

وہ دیر تک سہمی ہوئی پڑی رہی۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ پھر اُس نے برساتی میں کار رُکنے کی آواز سُنی۔ نیاز واپس آگیا تھا۔ اُس کے قدموں کی آواز پختہ فرش پر سُنائی دی۔ گھنٹی زور سے بجی۔ دروازہ کھلنے کی آواز اُبھری۔ نیاز اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کئی بار اُس کے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ کوٹھی پر گہرا سنّاٹا چھایا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش برابر ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔ سلطانہ ابھی تک سو نہ سکی تھی۔ بجلی واپس نہیں آئی تھی۔ اندھیرے سے اس کو وحشت ہو رہی تھی۔ تیز ہوا کی سرسراہٹوں میں اُس نے سُنا، باہر ورانڈے میں کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ چاپ رُک رُک کر

اُبھر رہی تھی۔ سُلطانہ لرز کر رہ گئی۔

قدموں کی آہٹ رُک رُک کر اُبھرتی رہی۔ بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہوا کے شور سے دل دہلتا تھا۔

اِسی اثناء میں کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔

ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی۔ پھر ایک بھاری آواز اُبھری۔

"سلطانہ۔ سلطانہ!"

نیاز اُس کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔

سلطانہ نے پوچھا "کون ہے؟"

نیاز نے کہا "دروازہ کھولو۔"

کئی لمحے تک سلطانہ خاموش پڑی سوچتی رہی کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ دروازے پر آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ کی آواز اُبھرتی رہی۔ نیاز رُک رُک کر اُس کو آواز دیتا رہا۔

آخر سلطانہ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نیاز اندر آ گیا۔ ذرا دیر وہ چُپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اُس نے سلطانہ سے کہا۔

"دیکھو ذرا ہوشیار سونا۔"

اُس نے جلدی سے پوچھا "کیوں؟"

وہ کہنے لگا "مجھ کو ابھی ابھی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ورانڈے میں چل رہا ہے۔"

آواز سلطانہ نے بھی سُنی تھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ نیاز کہتا رہا۔

"پہلے تو میں پڑا پڑا اُس آہٹ کو سُنتا رہا۔ پھر نکل کے دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ اندھیرا اس قدر ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم نے موم بتیاں بھی منگا کر نہیں رکھیں۔"

اُس کی آواز اندھیرے میں آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔

خوف کے مارے سلطانہ کی آواز تک نہ نکلی۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔

نیاز نے پوچھا "تم کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر سلطانہ کا بازو تھام لیا۔

"چلو آج تم میرے کمرے میں سو جاؤ۔"

سلطانہ نے کسمسا کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔"

اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

نیاز نے اُس کو پیار سے ڈانٹا "پاگل مت بنو، آؤ!" اور اُس کو اپنے دونوں بازوؤں پر اُٹھا لیا۔ سلطانہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ سہمی ہوئی سی اس کے سینے سے لگ گئی۔

نیاز اس کو بازوؤں پر اُٹھائے ہوئے کمرے کے باہر آ گیا۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر، درختوں پر، چھتوں پر بج رہے تھے۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی درختوں سے گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔

اندھیرا بہت گہرا تھا اور اس گھنگھور اندھیرے میں نیاز کے بوجھل قدموں کی آواز برآمدے کے پختہ فرش پر آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔

کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ۔ آواز دُور ہوتی چلی گئی۔

باہر درختوں میں کوئی پرندہ اچانک زور سے چیخا۔ پھر اس کی آواز
بارش کے شور میں ڈوب گئی۔

فصلِ نہم

(۱)

سلمان لگ بھگ ڈیڑھ مہینہ تک اسپتال میں رہا۔ اُس کے جسم پر تیرہ زخم آئے تھے۔ تین روز تک وہ سرجیکل وارڈ میں بے ہوش پڑا رہا جب اُسے ہوش آیا تو آنکھوں کی بینائی بہت دُھندلی تھی۔ نقاہت اس قدر زیادہ تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ پہلو میں تیسری پسلی کے نیچے بلّم کا ایسا گہرا زخم تھا جس نے کئی روز تک ڈاکٹروں کو پریشان کئے رکھا۔

شروع شروع میں بعض اسکاٹی لارک اسپتال میں اُس کی عیادت کو آتے رہے۔ پھر اچانک اُنھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ یہ بات سلمان کو تعجب خیز معلوم ہوئی۔ اُسے اسکاٹی لارکوں کی اس بے اعتنائی پر غصہ آیا اور اپنی بیکسی پر دُکھ بھی ہوا۔

جب وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ راستہ بھر سوچتا رہا کہ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں وہ اسکاٹی لارکوں

کے اِس رویّہ پر شدید احتجاج کرے گا اور یہ دریافت کرے گا کہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا۔

لیکن جب گمٹی پہنچ کر اُس نے ہیڈکوارٹر کو دیکھا تو وہ سب کچھ بھول گیا۔ ہیڈکوارٹر کی دیواریں ابھی تک جُھلسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگا دیئے گئے تھے۔ مگر آتشزدگی کے نشانات، جگہ جگہ دھویں کے سیاہ دھبے بن کر بکھرے ہوئے تھے۔ لائبریری کی ایک دیوار چٹخ گئی تھی۔ اس میں کئی انچ چوڑا شگاف تھا۔

سلمان جس وقت وہاں پہنچا، دن ڈھل چکا تھا۔ شام کے اُبھرتے ہوئے دُھندلکوں میں ہیڈکوارٹر کی عمارت کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آ رہی تھی۔

سلمان نے اندر داخل ہو کر دیکھا، کمروں کے اندر سنّاٹا تھا۔ نہ وہ پہلی سی چہل پہل تھی۔ نہ اسکاؤٹ لارکوں کی مصروف زندگی کی گہما گہمی تھی۔ ہر طرف آسیب زدہ خاموشی چھائی تھی۔ وہ راہداری سے گزرتا ہوا دفتر کی طرف چل دیا۔ دفتر کا دروازہ کُھلا تھا۔ کمرے کے اندر دن کی ڈوبتی ہوئی روشنی مدھم پڑ چکی تھی۔ اِس نیم تاریکی میں ایک نحیف و لاغر شخص میز پر جھکا کسی دستاویز کو پڑھنے میں منہمک تھا۔ اُس نے قریب جا کر دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ یہ ڈاکٹر زیدی تھا۔ اس کے چہرے پر جھُریاں پڑ گئی تھیں۔ بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا نظر آ رہا تھا۔

سلمان کے دل کو دھکّا لگا۔ وہ دروازے پر رُک گیا۔ غور سے دیکھنے لگا کہ آیا وہ ڈاکٹر زیدی ہی ہے یا کوئی اور۔ واقعی وہ اب بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے گردن اُٹھا کر سلمان کی طرف دیکھا اور حیرت سے چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو سلمان !"

سلمان گرم جوشی سے اُس کے سینے سے لگ کر کہنے لگا۔ "ڈاکٹر تُم نے اپنا یہ کیا حُلیہ بنا لیا ہے؟"

ڈاکٹر صرف مُسکرا کر رہ گیا۔ اُس کی مسکراہٹ بڑی پژمردہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اُس کو سلمان کے اِس سوال سے ذہنی اذیت پہنچی تھی — سلمان نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اُٹھ کر لیمپ روشن کیا۔

سلمان نے پوچھا "اور اسکائی لارک کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے فرنٹ پر کام کرنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"

ڈاکٹر زیدی کے اس جواب سے سلمان کو بڑی ڈھارس پہنچی۔ اس کے بعد باتوں کا طویل سلسلہ چھڑ گیا۔ ڈاکٹر زیدی نے بتایا کہ صفدر بشیر حملہ کی رات ہی کو ہلاک ہو گیا۔ اُس کے جسم پر زخموں کے ۴۲ نشانات تھے۔ اِس کے علاوہ دوسرے اسکائی لارک بھی زخمی ہوئے تھے۔ صرف فہیم اللہ دو اسکائی لارکوں کے ساتھ پچھلی دیوار پھاند کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پولیس موقعہ واردات پر اس وقت پہنچی جب حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ حالانکہ فہیم اللہ نے ہیڈ کوارٹر سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولیس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔

پولیس کی تفتیش شروع ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لئے گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضہ میں لے لئے۔ عمارت کو سر بمہر کر دیا گیا۔

اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا — پولیس رپورٹ کے مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر، فلک پیما سے

استعفیٰ دے چکا تھا۔ وہ لندن جانے والا تھا۔ واردات کی شب وہ ہیڈ کوارٹر آیا تھا۔ اور فلک پیما کے فنڈ میں اُس کی جو رقم موجود تھی، اُس کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا مگر اس رقم کو دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔

اسکاؤٹ لارکوں میں صفدر بشیر کے حمایتی بھی تھے۔ پہلے تکرار ہوئی پھر اس تکرار نے باقاعدہ فساد کی شکل اختیار کر لی۔ بعض اسکاؤٹ لارکوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ صفدر بشیر اپنے حامیوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا، ہیڈ کوارٹر کی عمارت کو آگ لگا دی۔ پولیس کے بیان کی تائید علیم احمد نے کی۔ بعد میں فہیم اللہ بھی سرکاری گواہ بن گیا۔ ان دونوں کے علاوہ پولیس نے بستی سے بھی چند گواہ مہیا کر لئے۔

مقدمہ کی سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ پولنگ سے قبل کسی اسکاؤٹ لارک کی ضمانت نہ ہو سکی۔ ووٹنگ کے وقت پولنگ اسٹیشنوں پر اسکاؤٹ لارکوں کا نہ کوئی پولنگ ایجنٹ موجود تھا اور نہ ہی ووٹوں کی گنتی کے وقت کوئی نمائندہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی اُمیدوار تھا مگر دوسرے اسکاؤٹ لارکوں کے ساتھ وہ بھی جیل میں بند تھا۔ انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس کے ووٹ اتنی تعداد میں کم نکلے کہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔ خان بہادر فرزند علی بھاری اکثریت سے میونسپل بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اس شاندار کامیابی پر اُس کا دھوم دھام سے جلوس نکلا۔ بستی میں جگہ جگہ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اُس کے کارکنوں نے اپنے گھروں پر چراغاں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کی کامیابی کے چند ہی روز بعد اسکاؤٹ لارکوں کی ضمانتیں منظور ہونی شروع ہو گئیں۔ انتخابات کے کچھ ہی عرصہ بعد علی احمد بھی رہا کر دیا گیا۔ البتہ ریاض جیل میں ہنوز نظر بند تھا۔ بعض اسکاؤٹ لارک رہائی کے بعد اسقدر

خوفزدہ اور ہراساں ہوئے کہ اُنھوں نے فلک پیما سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب صرف سات اسکاؤٹ لارک رہ گئے تھے۔ اِس افراتفری میں تمام مرکزوں پر کام بند ہو گیا۔ انڈسٹریل ہوم پر کسی نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ تعلیم بالغاں کے تمام مرکز بند ہو گئے۔ دار المطالعہ میں ایک تانگے والے نے اپنا گھوڑا باندھنا شروع کر دیا اور اُسے باقاعدہ اصطبل بنا دیا۔ فلک پیما کا فنڈ ضبط کر لیا گیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کی ویران عمارت سر بہ مہر تھی۔

رہائی کے بعد اسکاؤٹ لارکوں کے سامنے طرح طرح کی مشکلات تھیں۔ جن پر قابو پانے کے لئے سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کی جا رہی تھی۔ تحریک کو زندہ رکھنے کے واسطے از سرِ نو سازگار فضا پیدا کرنی پڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر زیدی دیر تک سلمان کو بیتی باتیں سُناتا رہا۔ سلمان نے یہ حالات سُنے تو غم و غصہ سے تڑپ کر بولا۔ "یہ سب مصیبتیں خان بہادر کی لائی ہوئی ہیں۔ بڑا کمینہ اور بے رحم شخص ہے۔"

ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا اور خود غرض بنا دیتی ہے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "فہیم اللہ اور علیم احمد سے بھی کبھی ملاقات ہوئی؟"

"نہیں!" ڈاکٹر نے لمحہ بھر رُک کر کہا۔ "سُنا ہے، خان بہادر نے دونوں کو میونسپلٹی میں ملازمت دلوا دی ہے۔ آمدنی اچھی ہے۔ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد علی احمد بھی وہاں آ گیا۔ اُس کے ہمراہ دو نوجوان اسکاؤٹ لارک بھی تھے۔ علی احمد نے سلمان کو دیکھا تو گرم جوشی سے گلے سے لگا لیا۔ ہنس کر بولا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ جس طرح اور اسکاؤٹ لارک ہمارا ساتھ چھوڑ گئے

تم نے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔"

سلمان نے جواب دیا۔"میں آج ہی تو اسپتال سے نکلا ہوں۔ آپ لوگوں نے یہ بھی تو نہیں پوچھا کہ میں کس حال میں رہا۔ زندہ بچا کہ مر گیا۔"

علی احمد معذرت کرتے ہوئے بولا۔"بھئی معاف کرنا۔ کچھ عرصہ تو جیل میں گزرا۔ رہائی ملی تو ایسا افرا تفری کا زمانہ گزرا کہ کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ تمہاری شکایت بالکل درست ہے مجھے اِس کا بیحد افسوس ہے۔"

اِس کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آٹھ بجے تک سارے اسکائی لارک دفتر میں اکٹھا ہو گئے۔ ہر ایک نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ سلمان کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ان میں ایک نئی توانائی اور مستعدی نظر آ رہی تھی۔

اس روز سب نے مِل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب فلک پیما کا اجلاس ہوا، جس میں آئندہ کے کام کا پروگرام تیار کیا گیا۔ اُن کی راہ میں جو دشواریاں تھیں، اُن کے خلاف جدوجہد کرنے پر غور کیا گیا۔ اجلاس آدھی رات تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں ہر مسئلہ پر بحث ہوئی۔ ہر اسکائی لارک نے بحث میں حصہ لیا۔

نئی تجاویز پیش کی گئیں، جن میں سب سے زیادہ اس تجویز پر زور دیا گیا کہ فلک پیما کے کچھ نئے کارکن بنائے جائیں۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لئے کہ فلک پیما کے پاس اب بہت قلیل فنڈ تھا۔ وہ بھی علی احمد نے بارہ ہزار روپے میں اپنا مکان فروخت کر کے مہیّا کیا تھا اور جس کا بیشتر حصّہ مقدمہ بازی اور ضروری اشیاء کی خریداری پر خرچ ہو چکا تھا۔ علی احمد نے اس بات پر اسکائی لارکوں کی توجہ دلائی کہ فنڈ جمع کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔

بعض اسکاؤٹ لارکوں کا خیال تھا کہ فلک پیما کے ہمدردوں سے چندہ لیا جائے۔ سلمان نے تجویز پیش کی کہ تعلیمِ بالغاں کے مرکزوں میں پڑھنے والے طلبا سے فیس لی جائے جو بہت معمولی ہو۔ ڈاکٹر زیدی نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا اور اس سلسلہ میں یہ رائے دی کہ ڈسپنسری سے جو دوائیں دی جاتی ہیں، مریضوں سے اُن کی کچھ نہ کچھ قیمت لی جائے۔ کم سے کم اُن لوگوں سے جو قیمت دے سکتے ہیں۔ لیکن اُس روز کسی تجویز کو قبول نہیں کیا گیا اور فنڈ کے مسئلہ کو آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے سلمان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن آرام کرے۔ اُس کی صحت اِس قابل نہیں تھی کہ وہ کوئی کام کر سکے۔ مگر اُس نے ڈاکٹر کی ایک نہ سُنی۔ دوسرے ہی دن اپنے پُرانے شاگردوں سے ملا۔ جس جگہ مرکز تھا، اُس جگہ کو دیکھا وہاں ایک قصائی نے گوشت کی دکان کھول لی تھی۔ اُس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ سلمان اس سے ملا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ دکان کہیں اور لے جائے۔ مگر وہ سرکش آدمی تھا۔ یہ بات سُنتے ہی گالیاں بکنے لگا۔ سلمان کے ساتھ جو لوگ تھے اُن کو بھی غصہ آگیا۔ اچھی خاصی لڑائی جھگڑے کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔

سلمان نے بات کو آگے نہ بڑھنے دیا اور یہ طے کیا کہ مرکز کسی اور جگہ قائم کر لیا جائے۔ کہیں جگہ نہ ملے تو فوری طور پر کسی کھلی جگہ چٹائیاں بچھا کر اور گیس بتی جلا کر کلاسیں شروع کر دی جائیں۔

شام کو سلمان وہاں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک مکان کی دیوار کے سہارے پُرانے ٹین کے ٹکڑوں کا سائبان ڈال دیا گیا تھا۔ گیس بتی جل رہی تھی اور فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ اُس کو بڑی خوشی ہوئی اور وہ دن یاد آگیا جب فلک پیما نے تعلیمِ بالغاں کا پہلا مرکز قائم کیا تھا۔

چند ہی روز میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجبوراً داخلہ بند کرنا پڑا۔

جب مرکز اچھی طرح چلنے لگا تو اُس نے ایک اسکائی لارک کی وہاں ڈیوٹی لگائی اور خود دوسرے مرکز کو منظم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ لگ بھگ مہینہ بھر میں سلمان نے دوڑ دھوپ کر کے تعلیم بالغاں کے تین مرکز قائم کر دئیے۔ ان میں باقاعدہ تعلیم بھی شروع ہو گئی۔

علی احمد کو سلمان کے آنے سے بڑی مدد ملی۔ اب ہر کام معمول پر آتا جا رہا تھا۔ انڈسٹریل ہوم کو اسکائی لارکوں نے اپنی نگرانی میں لے کر از سرِ نو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ دار المطالعے پھر سے جاری کر دئیے گئے۔ ڈسپنسری کو بھی درست کیا گیا۔ مگر سب سے بڑی دِقت فنڈ کی تھی۔ جس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل تھا۔

اسکائی لارک ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ فنڈ کس طرح مہیا کیا جائے۔ فنڈ کی قلت کے باعث اسکائی لارکوں نے ایک وقت کا کھانا بند کر دیا تھا۔ اور اپنی تمام ضروریات کم سے کم کر دی تھیں۔ سگرٹوں کے بجائے انہوں نے بیڑیاں پینا شروع کر دی تھیں۔ جن کے کپڑے پھٹ گئے تھے، وہ دوسرے اسکائی لارکوں کے کپڑوں سے کسی نہ کسی طور اپنا کام چلا رہے تھے۔

سلمان کی صحت اسپتال سے نکلنے کے بعد پہلے ہی خراب تھی۔ سخت مشقت اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث اس کا جسم اور لاغر ہو گیا۔ چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ خشک بال تنکوں کی طرح کھڑے رہتے۔ اُس کے چہرے پر ویرانی برسنے لگی تھی۔ مگر وہ اپنی ذات سے بے نیاز کام کرنے کی دُھن میں مگن تھا

ایک شام وہ بڑے بازار سے گزر رہا تھا، اچانک نیاز سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ نیاز کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔ وہ اُس وقت خاصی ماڈرن لگ

رہی تھی۔ جدید طرز کا ریشمی لباس اور ہلکا ہلکا میک اَپ، وہ کسی شہزادی کی طرح پُر وقار نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایک دکان سے نکل کر باہر آ رہے تھے۔ سلمان نے چاہا کہ اُن کی نظریں بچا کر نکل جائے مگر نیاز نے اُس کو دیکھ لیا۔ اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

" ہیلو سلمان!"

مجبوراً اُس کو رکنا پڑا۔ نیاز اُس کے قریب آ کر بولا۔" ارے بھئی! کہاں ہو۔ کہیں نظر ہی نہیں آتے؟"

سلمان نے جواب دیا۔" میں تو یہیں تھا۔"

" مگر تم نے یہ اپنا کیا حُلیہ بنا لیا ہے؟"

سلمان اس کی بات سُن کر کسی قدر گھبرا گیا۔ واقعی اُس کا عجیب حُلیہ تھا۔ خشک بال، بڑھا ہُوا شیو، چہرے پر گرد۔ لباس گندا، جس کی ایک آستین اس طرح پھٹ گئی تھی کہ اندر کی جلد نظر آتی تھی۔ اور نیاز ایسا لگتا تھا، جیسے کسی لانڈری سے ابھی دُھل دُھلا کر نکلا ہے۔ اس وقت وہ ہوائی بُش شرٹ اور کارڈرائی کی پتلون میں خاصہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سُرخی تھی۔ آنکھیں شفاف تھیں۔ سلطانہ کے ہمراہ کسی طرح بھی وہ ناموزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے اُس کے رُو برُو خود کو کوڑے کے ڈھیر سے نکلے ہوئے چوہے کی طرح حقیر محسوس کیا۔

نیاز بولا۔" کہیں نوکری دوکری بھی ملی یا ابھی تک بے روزگاری کا چکر ہے؟"

" نوکری کا ارادہ تو مدت ہوئی میں نے ترک کر دیا تھا۔"

" تو پھر کیسے کام چل رہا ہے؟" نیاز نے سلمان سے پوچھا۔

" کچھ سوشل کام کر رہا ہوں آج کل۔"

نیاز ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی اس سوشل کام دام کے چکر میں کہاں پڑے ہو۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو کیا ہو رہی ہے۔ میں پہلے تو تمہیں پہچان ہی نہ سکا"۔

سلمان اُس کی باتوں سے پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "بیمار تھا"۔

نیاز بڑے مشفقانہ انداز میں بولا۔ "بھئی یہ لیڈری ویڈری تم کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے آدمیوں کے چونچلے ہیں۔ میرا کہا مانو تو اس جھنجھٹ پر لعنت بھیجو۔ اور کل کسی وقت آکر مجھ سے ملو، میں تمہارے لئے نوکری کا بندوبست کرا دوں گا۔ میرا دفتر پاور ہاؤس کے برابر والی سڑک پر ہے۔ وہاں پہنچ کر جس کسی سے پوچھو گے دفتر کا پتہ بتا دے گا۔ میں عام طور پر ۱۰ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور دو بجے تک ضرور رہتا ہوں۔ لو یہ میرا کارڈ رکھ لو"۔ یہ کہہ کر اُس نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر سلمان کو دیا۔

سلمان کو اس کی باتوں پر سخت جھنجھلاہٹ ہوئی — اُس نے سوچا۔ یہ سالا کباڑیہ جس نے نہ جانے کیا چار سو بیس کر کے کچھ رقم پیدا کر لی ہے، اب اس طرح بات کرنے لگا ہے کہ جیسے دولت کے ساتھ اُس کی سمجھ بھی بڑی ہو گئی ہے۔ کچھ یہی سوچ کر اُس نے کسی قدر بے رُخی سے کہا۔

"آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ، فی الحال مجھ کو ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی ایسا پروگرام ہوا تو آپ سے ضرور ملوں گا"۔ سلمان نے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی ہونٹوں سے لگا کر سلگانے ہی والا تھا کہ نیاز نے اپنا سنہری سگرٹ کیس کھولا اور سلمان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"لو یہ ۵۵۵ پیو"۔

سلمان کہنے لگا۔ "شکریہ، میں بیڑی ہی پیوں گا"۔

وہ بے تکلفی سے بولا۔ "اماں اس خواہ مخواہ کے تکلف میں کیا

رکھا ہے۔ اچھی چیزیں استعمال کیا کرو۔ تو باتیں بھی اچھی ہی اچھی سوجھتی ہیں۔"

اسی وقت سلطانہ نے بیزاری سے کہا " چلیے دیر ہو رہی ہے۔"

نیاز نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا" یہ مسٹر سلمان میرے پُرانے ملنے والے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیڈری کے چکر میں پڑ کر اپنی یہ حالت بنالی ہے۔" وہ سلمان کی جانب سے صفائی پیش کرنے لگا۔ مگر سلطانہ نے سلمان کا ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ چپ چاپ اپنے لمبے لمبے سُرخ ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

سلمان کو ایک ایک لمحہ دوبھر ہو رہا تھا۔ جلدی سے بولا" اچھا، اب میں چلوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

" اچھا، اچھا! جی چاہے تو کبھی دفتر کی طرف چلے آنا۔" یہ کہتا ہُوا نیاز آگے بڑھ گیا۔

سلطانہ اُس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اُس کی خوب صورت صراحی دار گردن اُٹھی ہوئی تھی۔ چال میں تمکنت تھی۔ دونوں قریب کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ کار نیاز ڈرائیو کر رہا تھا۔ سلطانہ اُس کے برابر ہی بیٹھی تھی۔ سلمان چپ چاپ کھڑا اُن کو دیکھتا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ سلطانہ ایک بار اُس کی جانب ضرور دیکھے گی۔ مگر سلطانہ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بڑے لاڈ سے نیاز کے شانے پر جھک کر اُس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ دونوں مسکرا دئے۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔ سلمان دور تک اس کو خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا اُس نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ سلمان! سلطانہ اب بہت دُور جا چکی ہے اور تم کیچڑ میں گر پڑے ہو اور اس کیچڑ میں گرنا تم نے خوشی سے منظور کیا ہے، اِس لئے کہ تم معاشرے سے غلاظت صاف کر دینا

چاہتے ہو۔ تمہیں حسین چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہیئے۔ خواہ وہ سلطانہ ہو یا چودھویں رات کی چاندنی۔ تم تو خوب صورتی کے حصول کے بجائے بدصورتی کو حسن میں ڈھالنے کے لیئے جدوجہد کر رہے ہو۔

سلمان نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا تو لیا مگر وہ یہ نہ بھول سکا کہ اُس کی زندگی میں ایک لڑکی سلطانہ بھی آئی تھی، جس نے ایک رات اُس سے محبّت کی بھیک مانگی تھی اور جس نے آج اُسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ایک نگاہِ غلط انداز ہی ڈال لیتی۔ کیا وہ اس سے انتقام لے رہی تھی یا واقعی سلطانہ نے اُس کو حقیر سمجھا تھا۔ یہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے سوال اُس کے ذہن میں اُبھرتے رہے، ڈوبتے رہے۔ ڈوبتے رہے، اُبھرتے رہے۔ اس اُلجھن میں وہ اس روز پُوری یکسُوئی کے ساتھ پڑھا بھی نہ سکا۔

رات اُس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ پھر اُس کی کتنی ہی راتیں بے چینی میں کٹیں۔ آخر ایک روز وہ اسی بے چینی کے عالم میں علی احمد کے پاس پہنچا۔ اس سے کہا کہ اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ چند روز کے لئے گھر جانا چاہتا ہے۔

علی احمد نے اُس سے صرف اِتنا کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے واپس آنے کی کوشش کرے۔ اس نے سلمان کو ۲۰ روپے سفر کے لئے دیئے، اور ایک بار پھر جلد آنے کی تاکید کی۔

دوسرے روز سلمان رات کی ٹرین سے سفر پر روانہ ہوگیا۔

(۲)

ایک دھندلی صبح سلمان چُپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ اٹیچی کیس لٹک رہا تھا۔ لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک

بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے کسی دیسی دواخانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔

اس کی آمد پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ کنبہ کا ہر فرد اُس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی ممتا بلک اُٹھی۔ وہ اُسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ کچھ دیر اُس کے چاروں طرف ہجوم رہا۔ پھر ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ نہ کسی نے زیادہ بات چیت کی اور نہ اُس پر سوالات کی بوچھاڑ کی۔ اُس کے جھلسے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے لباس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اُس کا باپ ملازمت سے ریٹائر ہو کر پنشن پر آ گیا تھا۔ اُس نے لمبی داڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ بیٹھتا اور دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتا۔ رات کو تہجد بھی پڑھتا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا، جہاں وہ خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا۔ اور کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

نماز مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا اور صحن سے چُپ چاپ گزرتا ہُوا بیٹھک میں جا کر بیٹھ جاتا۔ پاس پڑوس سے اُس کے کچھ ہم سن بوڑھے آ جاتے۔ وہ حقہ پیتے، پان چباتے اور باتیں کرتے۔ اُن کی گفتگو کا دائرہ بہت محدود ہوتا۔ چھوٹی چھوٹی نجی باتیں۔ کچھ ذاتی اُلجھنیں اور کبھی کبھار گرد و پیش کی زندگی پر سرسری سا تبصرہ

اُس کے باپ کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کو اطمینانِ قلب حاصل تھا۔ اُسے فخر تھا کہ اُس نے ۲۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ

سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دئے۔ ہمیشہ اپنے افسروں کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اُسے سوا تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اُس کو دُکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اُس کا بیٹا سلمان، نالائق رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ نائب تحصیلدار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنے سن سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا تھا۔ وہ بات بات پر رو پڑتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکومت تھی۔ مگر اب اُس کو ردّی سامان کی طرح گھر کے کاٹھ کباڑ میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پیکوں سے اُس نے دیواروں پر خوب گلکاریاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولادوں کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی۔ وہ اُسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھیں۔ گھر میں جب کوئی "معزز مہمان" آتا تو اُس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا۔ اس لئے کہ وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی۔ اُس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑپن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دُھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی، جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھُپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہوتا تھا، جب وہ اپنی اولادوں سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجا لباس پہنے، جوتیاں گھسیٹتی ہوئی اَدبدا کے مہمانوں کے سامنے آجاتی۔ دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے۔ وہ دانت کٹکٹا کر اُس کو گھورتیں، تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دُور ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کر کے عین مہمان کے سامنے آکر بیٹھ جاتی اور دُنیا جہان کے قضیے چھیڑ

دیتی۔ بعد میں گھر کے اندر کہرام مچتا۔ ہر طرف سے اُس پر لتاڑ پڑتی۔ وہ چیخ چیخ کر روتی۔ کوسنے دیتی اور اپنی بہن کے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کی دھمکی دیتی۔ پھر ٹرنکوں سے کپڑے نکلتے، بستر بندھتا اور اسٹیشن جانے کے لئے تانگہ بلایا جاتا۔ یہ گویا سارے ڈرامے کا نقطۂ عروج ہوتا تھا۔ جانے سے قبل ماں ہر اولاد کے گلے لگ کر سسکیاں بھرتی اور یہیں سے حالات معمول پر آنا شروع ہوجاتے۔ سارا معاملہ رفع دفع ہوجاتا۔

جب بھی گھر میں مہمان آتے، اُن کے جانے کے بعد اکثر یہی ڈراما ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مہمانوں کی آمد سے پہلے ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا۔ سو سو طرح سے اُس کی خوشامد ہوتی۔ بار بار ہدایتیں دی جاتیں اور منّت سماجت کر کے اُسے کمرے کے اندر بند کر دیا جاتا۔ مگر یہ اُس کی مرضی پر منحصر تھا۔ اس لئے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا یہ اقدام بہت ہی خطرناک ہوتا تھا۔ لہٰذا کبھی تو ہنگامہ ٹل جاتا اور کبھی پاس پڑوس والوں کو بھی مہمانوں کی آمد کا پتہ چل جاتا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی، جس کے پاس ان دنوں گھر کا چارج تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اُس نے ماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا، جس کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنا یہ حق کھونے کے بعد اُس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے بدتر ہوگئی تھی۔ اب چھوٹی بیٹی کی حکمرانی تھی۔ وہ انٹرمیجیٹ کے فائینل ایئر میں تھی۔ اُس کو جدید طرز کے بھڑکدار لباس، میک اپ اور اپنی اُستانیوں کو نت نئے تحفے دینے کا شوق تھا۔ اس فضول خرچی کا اثر گھر کے بجٹ پر پڑتا۔ اور ہمیشہ نزلہ ماں کے پاندان پر گرتا۔ جو اس کا مونس تنہائی رہ گیا تھا۔ ماں ہر بات سے بے نیاز ہوچکی تھی۔ اُس کو صرف پان سے دلچسپی تھی اور جب پان ملنے میں بھی دشواری پیش آتی تو وہ بھڑک

اٹھتی۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی تھی۔ اُس نے فلسفہ میں ایم۔اے کیا تھا۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفہ میں یقین رکھتی تھی۔ اور وہ فلسفہ یہ تھا کہ کسی گزیٹیڈ آفسر سے اُس کی شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اُس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ لاکھ میک اپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ گھر میں کسی سے بہت کم بات چیت کرتی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی، گویا وہ اس کے تابعدار تھے۔

گزیٹیڈ افسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر مُلکی اسکالرشپ کے لئے کوشاں تھی۔ ان دنوں اُس پر یہی دُھن سوار تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے وزارتِ تعلیم کے ایک بڑے افسر کے بنگلے کے اتنے طواف کئے تھے کہ اُس کے متعلق بہت سے اسکینڈل مشہور ہو گئے۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سراپا تصنّع تھا۔ اُس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی۔ اُس کی بیوی میٹرک تک پڑھی تھی۔ لہٰذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بنتا جا رہا تھا۔ وہ سویرے اُٹھ کر بیڈ ٹی پیتا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا اور اخبار میں ہمیشہ ایسی خبریں تلاش کرنے کی کوشش کرتا، جن میں ان افسروں کا ذکر ہوتا جن سے اُس کی شناسائی تھی۔ دفتر جاتے وقت بیوی اُس کو دروازے تک چھوڑنے جاتی تھی جہاں وہ اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اور بائی بائی کہتا ہوا چلا جاتا۔ بیوی کو ہمیشہ ڈارلنگ کہتا۔ ہالی وُڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر نئے نئے انداز کے لباس پہنتا اور بڑا عجیب و غریب نظر آتا۔

وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز پیتل کی ایک

گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اُس کو بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ کبھی بیوی کے لئے جمنازیم کا سامان لے آتا۔ سویرے بہت تڑکے اُٹھتا اور اپنی نگرانی میں بیوی سے ورزش کرواتا۔ اُسے طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ عام طور پر وہ اپنا ہر تجربہ بیوی پر آزماتا تھا جب وہ موٹی ہو جاتی تو ڈائٹنگ کرواتا۔ دُبلی ہو جاتی تو مکھن اور دودھ کی مقدار میں ناپ ناپ کر اضافہ کرتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا اگر کبھی ان کی زبان سے اُردو کا لفظ سُن لیتا تو آگ بگولہ ہو جاتا۔ اس کے دو بچے تھے، جو بہت کم سن تھے۔ مگر اُن کو کانونٹ میں داخل کرانے کے لئے اس نے ابھی سے کوشش شروع کر دی تھی۔

وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے، جن کو پورا کرنے کے لئے وہ رشوت لینے کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ اُس کو بڑا آدمی سمجھا جائے۔ لیکن ماں اُس کو بڑا آدمی سمجھنے کے بجائے اُلّو کا پٹھا سمجھتی تھی جس کا انتقام وہ اس طرح لیتا کہ اکثر رات کو بیئر کا ایک گلاس چڑھاتا اور نشہ کی ترنگ میں ماں کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔

چھوٹا بھائی بی۔ اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں جٹا رہتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ کسی طرح سی۔ ایس۔ پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ چمکتی کار، اردلی اور سر کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی بینائی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔ اُسے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے کے اندر کتابوں پر جھکا ہوا نظر آتا۔

سلمان کئی سال بعد آیا تھا اور ان کئی سالوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں

ہو چکی تھیں کہ وہ اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ بظاہر اُسکے بھائی بہنوں کے پروگرام مختلف تھے مگر سبکی منزل ایک ہی تھی۔ وہ اس سیڑھی تک پہنچ جانا چاہتے تھے جس پر چڑھ کر وہ اُوپر کے طبقے میں شامل ہو سکتے تھے مگر وہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے تھے اُنکے سر نیچے اور ٹانگیں اُوپر تھیں تاکہ وہ نیچے نہ دیکھ سکیں۔ صرف بلندی کو تکا کریں۔ وہ نیچے اُترنا نہیں چاہتے تھے اور اُوپر پہنچنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ اُنہیں ایک ایسے سہارے کی ضرورت تھی، جو اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُوپر کھینچ لے۔

سلمان اس لئے گھر آیا تھا کہ اُس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی۔ اور جس ذہنی انتشار میں وہ مبتلا تھا، اس میں کمی آجائے گی۔ مگر اُسے پہنچے ہوئے ہفتہ بھی نہ گزرا کہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر پر پڑا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کا بڑا اذیت ناک دور تھا۔ اُس کے بھائی بہنوں کا رویہ بڑا افسوس ناک تھا۔ کوئی اُس کے قریب آکر نہ پھٹکتا۔ وہ اُس سے اِس طرح پرہیز کرتے، جیسے وہ مجسّم ٹائیفائیڈ کی بلا بن گیا تھا، جو قریب آتے ہی اُن سے چمٹ جاتی۔

سب مل کر قہقہے لگاتے۔ فلموں پر تبصرے کرتے۔ لباسوں کے نئے نئے ڈیزائنوں پر بحث کرتے۔ مگر کوئی اُس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ وہ بخار میں بے سُدھ پڑا تپتا رہتا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلا کرتا۔ ایک ایک چیز کو ترسا کرتا۔

منجھلے بھائی کو تو اپنی نت نئی مصروفیات کے باعث اس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی سی۔ ایس۔ پی بننے کی تیاری میں غرق تھا۔ وہ سلمان کے لئے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آکر اس قدر احسان جتایا تھا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آجاتی۔ مگر وہ بھی اس طرح کہ

ناک پر رومال رکھ کر دروازے کی دہلیز ہی پر رُک جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اُس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور اُلٹے قدموں واپس لوٹ جاتی۔

ایک ماں کی ماتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ رات رات بھر اُس کے سرہانے بیٹھ کر آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا پلاتی۔ اس کا سر دباتی۔ بخار کی شدّت ہوتی تو اُس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اس کو تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے چین ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اس کو سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رو پڑتی۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لئے دوا بھی قرض پر آ رہی تھی۔ وہ موسمبی کا عرق پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اُس کو بچوں کی طرح ضدّی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمبیاں منگوانے کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو اُس کو ٹالتی رہی۔ پھر اپنی مجبوری پر رو پڑی، اور آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئی۔ سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہُوا۔ اُس کے کمرے کے سامنے صحن تھا، اور صحن کے مشرقی کونے پر اُس کے منجھلے بھائی کا کمرہ تھا، جو کھلی ہوئی کھڑکی سے نظر آتا تھا۔

لیٹے لیٹے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اُس نے دیکھا کمرے میں میز بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اُس کا بھائی اُونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک افسر کی عیادت کے لئے ہسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل، جن میں سُرخ سُرخ موسمبیاں بھی تھیں، اُس کے لئے بطور خاص منگوائے گئے تھے۔ اس لئے کہ خالی ہاتھ جانا بڑی معیوب بات تھی۔ سلمان نے سب کچھ خاموش نظروں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کر

رہ گیا۔

ایک رات بخار کی شدّت سے اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اُس کا بدن انگیٹھی کی طرح سُلگ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک پڑ گیا تھا۔ اُس نے کئی بار ماں کو اپنی نحیف آواز سے پُکارا۔ مگر شام سے ماں کو بھی بخار تھا۔ کوئی خطرناک مرض نہ تھا۔ مسلسل شب بیداری سے بیمار پڑ گئی تھی اور اُس وقت اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اُسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

سلمان کچھ دیر تک آوازیں دیتا رہا۔ پھر ہمّت کر کے پلنگ سے نیچے اُترا۔ گھر پر سنّاٹا چھایا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈوبتے چاند کی زرد زرد چاندنی چھت کی منڈیر پر جھلک رہی تھی۔ ہوا سرد تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلمان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے صحن عبور کیا۔ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ جہاں کھانے کی میز تھی۔ کمرے میں دُھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں اُس نے میز پر رکھا ہوا تھرماس دیکھ لیا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے کا سہارا لیے ہانپتا رہا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے، اور حلق میں پیاس کی شدّت سے کانٹے چُبھ رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ تھرماس کھولا۔ اس میں سے برف کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اچانک اس کے پَیر زور زور سے کپکپائے اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرانے لگے۔ وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔ اُسے نہیں معلوم وہ کب تک کمرے کے سرد فرش پر پڑا رہا۔ کب وہ اپنے بستر پر آیا، کون اُسے اُٹھا کر لایا۔ جب اُسے ہوش آیا تو سب سے پہلی آواز جو اُس نے سُنی، وہ اُس کی بھاوج

کی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

- "تھرماس کے ٹکڑے ہو گئے۔ پچھلے ہی مہینے تو چالیس روپے کا خریدا تھا۔"

اُس کے شوہر نے اُس سے صرف اِس قدر کہا۔ "ڈارلنگ تم اِس طرح پریشان ہو کر اپنا وزن کم کر لوگی۔ میں دوسرا تھرماس لے آؤں گا۔"

مگر وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ اور سلمان بستر پر پڑا اُس کی آواز سُنتا رہا۔ بہ اور ایسے ہی کتنے زخم اُس نے بیماری کے دنوں میں اپنے دل پر کھائے۔ اور ہر بار دُکھ سے بلبلا کر رہ گیا۔

اُس کا باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر سلمان کے کمرے میں بھی آتا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا نبض ٹٹول کر دیکھتا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سرہانے کھڑا کھڑا زیرِلب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔ اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا۔

جب بھی وہ آتا، سلمان کی آنکھ کُھل جاتی۔ اس وقت اس کو اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اُس کی سفید داڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں انسان کی ازلی مظلومیت جھلکتی۔ سلمان سوچنے لگتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بدقسمت ہے۔ اُس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دس، دس۔ بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹے۔ ہمیشہ جُوتا جھوٹا پہنا اور رُوکھا سُوکھا کھایا۔ نہ کبھی بالاخانے پر جانے کی اُسے توفیق ہوئی۔ نہ اُسے مے خانے سے نکلتے دیکھا گیا۔ نہ کسی کی بانکی چِتون نے اُس کو گھائل کیا اور نہ سُہانی راتوں میں اُس کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔

اُس نے زائد سے زائد مشقت کی۔ کم سے کم خرچ کیا اور زائد سے زائد پس انداز کیا۔ اور یہ سب کچھ اُس نے صرف اس لئے کیا کہ اُس کی اولادوں کا مستقبل

روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپیہ جو اُس نے اپنی خوشیاں نیلام کرکے کمایا تھا، اولاد کی تعلیم پر لگا دیا اور اُس کی تعلیم یافتہ اولاد میں اور اَن پڑھ نیاز میں، کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ یہ بدقسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا، جس نے اُس کو کوئی تعلیم نہیں دی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اُس پر صَرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اسی سَم سَم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اُس کے بہن بھائی سرگرداں تھے۔ لیکن نیاز نے اس سَم سَم کا سُراغ لگا لیا تھا اَن پڑھ کباڑیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی، کار اور بنک بیلنس، جیت کے تینوں کارڈ اُس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا۔ اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

سلمان کو نیاز سے بھی نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اُس کو اِس لئے حقارت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگرٹ نہیں پی رہا تھا۔ شان دار سوٗٹ نہیں پہنے تھا۔ اُس کے پاس کار نہیں تھی — وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی زندگی کو سنوارنا چاہتا تھا۔ اور اُس کے بہن بھائی، اِس لئے اُس کو ذلیل سمجھتے تھے کہ اُس نے بڑا عہدہ ہتھیانے کی کوشش نہیں کی۔ بنک بیلنس کیوں نہ بڑھایا۔ اُن کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخرا پن تھا۔ اِس لئے کہ وہ بلندی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں یہ پتہ نہ تھا کہ نیچے کروڑوں ننگے بھوکے کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے تھے، جو اُن ہی کی طرح انسان تھے۔ جن کی خوشیاں اور غم اُن سے مختلف نہیں تھے۔

بیماری کے دنوں میں وہ مسلسل ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ اُس کے

وجود میں چھپا ہوا خود سر درندہ بیدار ہونے لگا۔ وہ پریشان حال انسانوں کا دُکھ درد بھول کر اپنے بہن بھائیوں سے انتقام لینے کی سوچنے لگا۔ ان کو نیچا دکھانے کا پروگرام بنانے لگا۔ وہ اپنی ذلّت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اُس نے فلک۔ پیما کے ہیڈکوارٹر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور یہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ ان ہی دنوں اُس کی ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کر لے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اُس کی زندگی میں وہ اپنا گھر بسائے۔ یہ پروگرام دراصل اُس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعہ اُس نے سلمان تک پہنچایا۔ متوسط طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اُسے بھی سلمان کو راہِ راست پر لانے کا ایک ہی مجرّب نسخہ سمجھ میں آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا۔ مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا ایم ایل اے ہے۔ اور چونکہ اُس کا باپ مر چکا ہے، لہٰذا چچا نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دِلوا دے گا، یہ سُن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ اُس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں، صرف چور دروازے سے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اور ایم۔ ایل۔ اے کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہو گی۔ لہٰذا وہ چند روز تک غور و خوض کرنے کے بعد شادی پر رضامند ہو گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اُس کے باپ نے روپیہ قرض لے کر خرچ کیا، اس لئے کہ وہ ایک ایم۔ ایل۔ اے کا سمدھی بننے جا رہا تھا۔ شادی میں شہر کے اعلیٰ حکّام اور معززین کے علاوہ تین وزیر بھی

شریک ہوئے۔ لہذا تمام مقامی اخبارات میں شادی کی تقریب کے فوٹو شائع ہوئے۔ جن میں اُس کے بجائے وزیر دُولھا معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اخبار نے جس کو سرکاری اشتہارات کی اشد ضرورت تھی، دُولھا کو بھی نکال دیا اور فوٹو میں صرف وزیر ہی رہنے دئے۔

سلمان کو شبِ عروسی ہی پر اندازہ ہوگیا کہ اُس کی بیوی سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہے۔ اُس نے آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ اُس کا ذہن گیلی مٹی کی طرح تھا، جسے وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔ وہ اُس کی توقع سے زیادہ دلکش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اُس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار روپے نقد ملے تھے اور مُلازمت کے لئے اُس کے ایم۔ ایل۔ اے سُسر نے کوشش شروع کردی تھی۔

شادی کے تیسرے ہی ہفتہ سُسر کا خط آیا کہ فوراً کراچی پہنچو، ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا، اور اُسی دن پہلی ٹرین سے کراچی روانہ ہوگیا۔

(۳)

گلابی جاڑوں کی ایک نڈھال دوپہر تھی۔ نوشا ٹرام کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اُس وقت وہ اکیلا ہی تھا۔ چکرم کی ڈیوٹی اُستاد پیڈرو نے نمائش پر لگادی تھی اور نوشا کو پوکر کی ٹیم میں شامل کردیا تھا۔ ۴ بجے اُس کو پوکر سے ایک ایرانی چائے خانے میں ملنا تھا۔ ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ وقت گزارنے کے لئے اُس نے سوچا ٹرام پر کیماڑی تک کا ایک چکر ہی لگا لیا جائے۔ ممکن ہے کوئی شکار پھنس جائے۔

اب وہ کبھی کبھار اکیلے بھی کام کر جاتا تھا۔ حالانکہ اُستاد پیڈر کی سخت ہدایت تھی کہ بغیر ٹیم کے کوئی کاریگری نہ دکھائی جائے۔ اس میں خطرہ بہت تھا۔ مگر اب نوشا جیب تراشنے کے فن میں خاصا منجھ گیا تھا اور اس قدر نڈر ہوگیا تھا کہ سیکڑوں کے ہجوم میں جیب صاف کر دیتا۔

نوشا خاصی دیر سے ٹرام کا انتظار کر رہا تھا، مگر کوئی ٹرام آتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اُکتا کر وہ پیدل ہی چل دیا۔ راہ گیر تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ دکانوں پر سناٹا تھا۔ دو رکشا والے فٹ پاتھ کے قریب اپنی اپنی رکشاؤں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ فضا بڑی بوجھل تھی۔ نوشا نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے اور ہولے ہولے سیٹی بجاتا ہُوا بلا مقصد ایک طرف چل دیا۔ کچھ دُور تک اپنی دُھن میں مگن اسی طرح چلتا رہا۔ ایک موڑ پر کسی گداگر نے صدا لگائی۔

"بابا اللہ کے نام پر اس محتاج کو کچھ دیتے جاؤ۔"

نوشا اِس صدا پر توجہ دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ آواز جانی پہچانی تھی۔ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ پلٹ کر دیکھا، ایک دیوار کے سائے میں فٹ پاتھ پر ایک گداگر سُکڑا سمٹا پڑا تھا۔ اُس کے جسم پر بے حد غلیظ لباس تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ اُس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ داہنا ہاتھ خیرات کے لیے آگے بڑھا تھا۔

نوشا نے غور سے گداگر کے چہرے کو دیکھا۔ وہ تکلیف سے کانپ اُٹھا۔ یہ راجہ تھا۔ اُس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ سُکڑا سمٹا جسم کسی سڑتی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آرہا تھا۔ نوشا نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اُس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ قدموں کی آہٹ پا کر راجہ نے ایک دردناک صدا بلند کی۔ اُس کے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

جگہ جگہ پھنسیاں تھیں، جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔

نوشا نے آہستہ سے آواز دی "راجہ!"

راجہ نے آنکھیں کھول دیں اور نوشا کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

پھر وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ "نوشا!" وہ ہاتھ کا سہارا لے کر اُٹھ بیٹھا۔

نوشا نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "یار! یہ تیری کیا حالت ہوگئی ہے؟"

اُس کی بات سے راجہ کو دُکھ پہنچا۔ اُس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لئے مسرّت کی جو رمق اُبھری تھی، اُس نے فوراً دم توڑ دیا۔ وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا۔ "میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

اُس کا لہجہ بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدہ تھا۔ آواز میں اس قدر کرب تھا، جیسے کسی غیرمرئی قوّت نے اُس کا کلیجہ دبوچ لیا ہو۔

نوشا نے کہا۔ "پر یار! تجھ کو تو اسپتال بھیج دیا گیا تھا، وہاں علاج نہیں ہوا؟"

راجہ کے ہونٹوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ اُبھری۔ کہنے لگا۔ "اسپتال والوں نے میری ایک ٹانگ کاٹ ڈالی اور کوڑھیوں کے اسپتال بھیج دیا۔ کئی روز تک وہاں پڑا رہا۔ مگر اسپتال میں جگہ نہیں تھی۔ ایک روز چوکیداروں نے زبردستی اُٹھا کر مجھے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب سے یونہی دربدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔"

نوشا خاموش بیٹھا رہا۔ راجہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔ "ایک حکیم جی کو دکھایا تھا۔ وہ کہنے لگے تم کو پُرانی آتشک ہے۔"

نوشا نے پوچھا۔ "یہ آتشک کیا بیماری ہوتی ہے؟"

"سُنا ہے رنڈی بازوں کو یہ بیماری ہو جاتی ہے۔"

نوشا نے پریشان ہو کر کہا۔ "یار تُو نے تو کبھی ایسی حرکت کی

نہیں"۔

- "میں نے حکیم جی سے یہی بات کہی تو وہ بولے تمہارے باپ کو یہ مرض ہوگا۔ یہ خاندانی بیماری ہوتی ہے"۔

"تو پھر تم نے کچھ علاج ولاج کروایا؟"

سڑتی ہوئی لاش میں سے پُرانا راجہ جاگ اُٹھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا "یار تُو بھی کمال کرتا ہے۔ اب علاج کوئی پھوکٹ میں ہوجاتا ہے۔ اس میں رقم لگتی ہے"۔

نوشا اُس کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے فوراً بات کا رُخ بدل دیا۔

"یہ تو بتاؤ تم آج کل رہتے کہاں ہو؟"

راجہ بڑی گھناؤنی ہنسی ہنس کر بولا "اپنا بھی کوئی گھر بار ہے۔ جہاں جی چاہا پڑ رہا۔ کوئی ہفتہ بھر سے تو یہیں پڑا ہوں"۔ لمحہ بھر کے لئے وہ رُکا "مگر یہ تو بتا تُو آج کل کیا کر رہا ہے۔ ویسے تو تیرے بڑے ٹھاٹھ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں نوکری ووکری کر لی"۔

نوشا صاف بات نہ بتا سکا "ہاں یار ایک جگہ نوکری ہی کر لی ہے"۔

"مزے میں گزر بسر ہوتی ہے؟"

"بالکل"۔ نوشا نے مختصر جواب دیا۔

راجہ نے جھجکتے ہوئے کہا "نوشا تُو مجھے ایک بیساکھی دِلوا دے"۔ اُس نے پاس پڑے ہوئے ڈنڈے کی طرف اِشارہ کیا "اِس سالے سے دو قدم چلنا مصیبت ہوجاتا ہے۔ میں نے بیساکھی کے لئے دس روپے جمع کئے تھے، کوئی سالا چوٹٹا سوتے میں نکال لے گیا"۔ راجہ نے اُس کو ایک گندی گالی دی، اور بڑے دُکھ سے بولا "نوشا تُو مجھے بیساکھی ضرور بنوا دے۔ تیرا بہت بڑا احسان ہوگا۔ مجھے بہت تکلیف ہے"۔

نوشا نے فوراً کہا۔ "یار اِس میں احسان کی کونسی بات ہے۔ میں جلدی ہی بیساکھی دلوا دوں گا۔"

وہ گھنٹہ بھر تک راجہ کے پاس رہا اور اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چلتے وقت اُس نے راجہ کو ایک روپیہ دیا اور کھانے کے لیئے جو کچھ مانگا، وہ خرید کر اُس کو دے دیا۔ راجہ صبح سے بھوکا تھا۔

راجہ سے مِل کر نوشا کی طبیعت مکدّر ہو گئی تھی۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ بار بار اُس کو راجہ کی بے کسی کا خیال آتا۔ اُس نے سوچا کہ راجہ کے لیئے اُسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن وہ پھر اُس کے پاس گیا۔ اس دفعہ وہ اس کے لیئے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے گیا تھا۔

اب وہ اکثر راجہ کے پاس جاتا اور کچھ نہ کچھ اُس کو دے کے آتا۔ راجہ کے لیئے اُس نے ایک بیساکھی بھی خرید دی تھی جس کے سہارے وہ چلنے لگا تھا۔ چوہے کی کھال کا سا گھناؤنا لباس اُتروا کر نیا جوڑا پہنا دیا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ کہیں رہنے کو جگہ مِل جائے تو اُس کے ایک حصّہ میں راجہ کی رہائش کا بندوبست کر دے۔

سردی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ راجہ رات بھر شبنم میں پڑا بھیگا کرتا اور سردی سے کانپتا رہتا۔ رہنے کو مکان تو نہ مِل سکا، البتہ ایک مکان کی دیوار کے ساتھ ترپال لگا کر نوشا نے سائبان بنا دیا تھا۔ جس کے نیچے راجہ رہنے لگا۔

راجہ کے لیئے وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس سے اُس کو بڑی خوشی ہوتی۔ یہ عجیب سی خوشی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔ وہ محض جیب کترا نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ اُس کی اب سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ راجہ کی بیماری دُور ہو جائے۔

ایک روز وہ راجہ کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ مگر وہ اس کا علاج کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ اسے کوڑھ ہے، کوڑھیوں کے اسپتال لے جاؤ۔ مگر نوشا اُس کو کسی اسپتال نہ لے گیا۔ اُسے خوف تھا کہ جس طرح اسپتال والوں نے ٹانگ کاٹ کر لنگڑا بنا دیا اسی طرح اُسکے جسم کا کوئی اور حصّہ نہ کاٹ دیں۔

ڈاکٹروں کی جانب سے مایوس ہو کر وہ راجہ کو ایک حکیم کے پاس لے گیا۔ اُس نے دونوں کی بہت ڈھارس بندھائی۔ اُس کا خیال تھا کہ راجہ کا مرض لاعلاج نہیں تھا۔ اگر پابندی سے علاج کرایا جائے تو وہ صحتیاب ہو سکتا تھا۔ اس علاج کے لئے اُس نے ڈھائی سو روپے مانگے تھے۔

نوشا اس وقت تو راجہ کو خاموشی کے ساتھ واپس لے آیا مگر اب اُس پر یہ دُھن سوار تھی کہ کسی طرح ڈھائی سو روپے مہیا کئے جائیں تاکہ راجہ کا باقاعدگی کے ساتھ علاج ہو سکے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ پوکرے ساتھ جیب تراشی کرنے کے علاوہ اکیلا بھی کاریگری کے ہاتھ دکھانے لگا اور اس رقم کو اُستاد پیڈرو سے پوشیدہ رکھتا۔ اُسے ڈھائی سو روپے کی ضرورت تھی تاکہ وہ راجہ کا علاج کرا سکے۔

اُن ہی دنوں ایک روز اُس نے ایک شخص کو بھانپا۔ اُس کے پاس لمبی رقم تھی۔ نوشا نے سوچا کہ اگر اڑ ٹنگ جاتے تو آج ہی راجہ کے علاج کی پوری رقم نکل آئے گی۔ رات کے نو بجے تھے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ راستوں پر سناٹا بڑھ گیا تھا۔ دو بار نوشا نے اُس شخص کو گھیرا، مگر وہ ہتھے نہیں چڑھا۔ مگر نوشا برابر اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ شخص سڑک سے مڑ کر ایک گلی میں گھس گیا۔ گلی سنسان تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ نوشا سائے کی طرح اُس کے برابر چلتا رہا۔ اُس نے پتلون کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو نکال کر آہستہ سے کھول لیا اور جب وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اندھیرا زیادہ تھا، نوشا جھپاک سے اُس کے سامنے آکر کھڑا

ہو گیا۔ اور کھلا ہوا چاقو اُس کے سینے پر رکھ کر بولا۔

"جو کچھ پاس ہے نکال کر چُپ چاپ دے دو۔"

اُس نے گھبرا کر نوشا کو دیکھا، جو اندھیرے میں بھوتوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جو عین سینے پر رکھا تھا۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے خوف سے منہ پھاڑ دیا۔ مگر آواز نہ نکلی۔ نوشا نے اُسے خاموش دیکھ کر خود ہی اُس کی جیب سے پرس نکال لیا۔ ابھی نوشا نے پرس نکال کر اپنی جیب میں رکھا ہی تھا کہ گلی میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ دو سائے ایک فلیٹ کی کھڑکی سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں نظر آئے۔ دونوں راہ گیر اسی طرف آ رہے تھے۔ نوشا نے اُس کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں گھسیٹا۔ ڈپٹ کر بولا۔

"آواز نکلی تو پورا چاقو اُتار دوں گا سینے میں۔"

وہ خوف سے کانپ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوشا کو گھور رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں ایک دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ چاپ گلی کے پتھریلے فرش پر اُبھر رہی تھی۔ اُن کے جُوتے فوجیوں کی طرح وزنی تھے۔ نوشا کو شبہ ہوا کہ کہیں وہ پولیس والے تو نہیں ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ کسی قدر گھبرا گیا۔

بھاری بھاری قدموں کی آہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ کھٹ، کھٹ، قریب اور قریب اور قریب۔ اچانک نوشا کے کھلے ہوئے چاقو کی زد میں کھڑے ہوئے خوف زدہ آدمی نے حلق سے آواز نکالی۔ یہ آواز اتنی ہیبت ناک تھی کہ تنگ و تاریک گلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ ساتھ ہی وہ چلّانے لگا۔

"بچاؤ! بچاؤ۔"

نوشا نے اُس کے کھلے ہوئے منہ پر پوری قوت سے مکّہ مارا،

وہ آدمی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ مگر سنبھلنے کے ساتھ ہی اُس نے پھر دہاڑنا شروع کر دیا۔ اب نوشا کے لئے وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ اُس نے اندھیری گلی میں بھاگنا شروع کر دیا۔ اُس وقت تک فلیٹوں کی کھڑکیاں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ گھبرائے ہوئے لوگ بالکنیوں سے نیچے گلی میں جھانک رہے تھے۔ بعض نے اُونچی آوازوں سے بولنا شروع کر دیا۔

گلی میں داخل ہونے والے دونوں راہ گیر واقعی پولیس والے تھے۔ شور سُن کر پہلے تو وہ ٹھٹکے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ اُسی وقت اُن کے سامنے ایک سایہ تیزی سے لہرایا۔ کوئی گلی میں تیز رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ یہ نوشا تھا۔ دونوں نے فوراً اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔

نوشا کچھ دُور تک گلی میں بھاگتا رہا۔ پھر وہ داہنے ہاتھ کو مُڑنے والی ایک گلی میں گھُس گیا۔ یہ گلی بھی تاریک تھی۔ اُس کے قدموں کی آوازیں گلی کے پتھریلے فرش پر اُبھر رہی تھیں۔ وہ گلی میں پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ سے ٹھوکریں کھاتا، لڑکھڑاتا، بے تحاشہ بھاگتا رہا۔ اُس کی پُشت پر ملی جُلی آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں کے قدموں کی آہٹ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دونوں کانسٹیبل زور زور سے سیٹیاں بجا کر خطرے کا اعلان کر رہے تھے۔

دوڑتے دوڑتے نوشا کی سانس پھُول گئی۔ قدم ڈگمگانے لگے۔ اچانک ایک نئی مصیبت سامنے آگئی۔ اب گلی کے دوسرے نکڑ پر بھی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ دُھندلی روشنی میں انسانی شکلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی رفتار سُست کر دی اور ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دیوار میں کھڑکی تھی۔ نوشا نے کھڑکی پر ہاتھ رکھا۔

اور ایک اُمید موہوم کے ساتھ سوچا کہ شاید کھڑکی کھُل جائے۔ کھڑکی کا ایک پٹ ہاتھ رکھتے ہی کھُل گیا۔ وہ اُچک کر اُس پر چڑھ گیا اور اندر کود گیا۔ اُس نے فوراً کھڑکی بند کردی اور اُس سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا جس جگہ کھڑا تھا، وہ ایک تنگ سی راہداری تھی۔ راہداری جہاں ختم ہوتی تھی، وہاں سے جنوبی سمت کو ایک زینہ تھا، جس کی سیڑھیاں اُوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ اُوپر سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی، جو ایک زرد دھبے کی طرح دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ نوشا دھندلی روشنی میں دم بخود کھڑا تھا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ وہ منہ کھولے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

باہر گلی میں ابھی تک آوازوں کا شور اُبھر رہا تھا۔ گلی کے پتھریلے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ گونج رہی تھی اور تیز تیز بجتی ہوئی سیٹیاں چیختی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں کسی کے کھانسنے کی آواز اُبھری۔ ساتھ ہی زینے میں روشنی پھیلنے لگی۔ کوئی آہستہ آہستہ چوبی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔

قدموں کی آہٹ اُبھرتی رہی۔ روشنی زینے سے نکل کر راہداری کی دیواروں پر پھیلنے لگی۔ پھر زینہ پر ایک سایہ اُبھرا۔ ایک بوڑھا آدمی نمودار ہوا۔ اس کی مختصر سی سفید داڑھی تھی۔ سر گنجا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ تھا۔ وہ گاؤن پہنے تھا۔ لمبے قد کا آدمی تھا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں موم بتّی تھی۔ وہ کمر کو ذرا خم دے کر چل رہا تھا۔ نوشا بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا۔ اُس نے کھُلا ہوا چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور بوڑھے کو سہمی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا۔

زینہ سے اُتر کر وہ شخص راہداری میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ

آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ چند قدم کے فاصلہ پر رہ گیا تو اُسکی نگاہ نوشا پر پڑی۔ وہ رُک گیا۔ اس کا ہاتھ کانپ اُٹھا۔ موم بتی کی لَو زور سے تھرتھرائی۔ راہداری میں بہت سی دُھندلی دُھندلی پرچھائیاں جھُومنے لگیں۔ نوشا نے ایک لمحہ کا بھی انتظار نہ کیا۔ جھپٹ کر اُس کے سامنے کھُلا ہُوا چاقو بڑھا کر بولا۔

"آواز نکلی تو پُورا چاقو سینے کے اندر ہوگا۔"

بوڑھے نے حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ کھُلے ہوئے چاقو کو دیکھا۔ اُس کے جھُرّیوں بھرے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ نہ اُس نے جسم کو کوئی حرکت دی اور نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ نوشا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ اُس کے جس ہاتھ میں کھُلا ہُوا چاقو تھا، اُس میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ بوڑھے نے اُس کی گھبراہٹ اور ہاتھ کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا۔ سنبھل کر نرمی سے بولا۔

"گھبراؤ مت تم یہاں قطعی محفوظ ہو۔"

نوشا کھُلا ہُوا چاقو تانے اُسی طرح کھڑا رہا۔ بوڑھا اُس کو بڑا عجیب و غریب معلوم ہُوا۔

وہ لمحہ بھر رُک کر بولا "ڈرو مت۔" اِس دفعہ اس کا لہجہ صاف اور پُر اعتماد تھا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں، مجھ سے تم اس قدر کیوں ڈر رہے ہو؟ آؤ، میرے ساتھ آؤ۔" وہ مُڑا۔ لیکن نوشا اس کے ہمراہ جاتے ہوئے جھجکنے لگا۔ البتہ اُس نے چاقو نیچے کر دیا تھا۔ بوڑھا بڑے مشفقانہ انداز سے بولا۔

"بھئی تم مجھ سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ آؤ گھبراؤ مت۔"

اُس کے لہجہ میں اس قدر نرمی اور سادگی تھی کہ نوشا کے قدم خود بخود اُٹھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے

کی سیڑھیاں طے کیں اور اُوپر پہنچ گئے۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ زینے کے عین مقابل ایک دروازہ تھا۔ وہ شخص اُس میں داخل ہوگیا۔ نوشا بھی اُس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ یہ ایک مختصر کمرہ تھا۔ اس کے آگے ایک تنگ راستہ تھا۔ دونوں کمرے سے گزر کر باہر آ گئے۔ سامنے دروازہ تھا، جس سے روشنی پھوٹ کر باہر آرہی تھی۔ مگر وہ اس طرف نہیں گیا۔ دوسری طرف مُڑ گیا۔ کچھ دُور آگے چل کر اُس نے ایک دروازہ کھولا اور اس میں چلا گیا۔ نوشا نے دیکھا کمرہ خاصا کُشادہ تھا۔ اُس میں کتابوں سے بھری ہوئی تین الماریاں تھیں۔ ایک لمبی میز تھی، جس پر بہت سی کتابیں اور کاغذات بکھرے تھے۔ اُس شخص نے موم بتی میز پہ رکھ دی۔ اور ایک کُرسی پر جھکا ہُوا بیٹھ گیا۔ اُس نے نوشا کو برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارا کیا۔ نوشا کسی سحر زدہ انسان کی طرح چُپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ بوڑھے نے میز پر رکھا ہُوا پائپ اُٹھایا۔ تمباکو بھری اور اس کو سلگا کر آہستہ آہستہ پائپ پہ کش لگانے لگا۔ اچانک کراہنے کی آواز رات کے سناٹے میں اُبھری۔ کوئی رُک رُک کر کراہ رہا تھا۔ آواز سُن کر نوشا نے چونک کر کان کھڑے کئے۔ وہ کسی نامعلوم خوف سے لرز اُٹھا۔ بوڑھا خاموشی کے ساتھ پائپ پر کش لگاتا رہا۔ تمباکو کا تیز بودار دھواں کمرے میں بکھیرتا رہا۔

ذرا دیر بعد کمرے کے باہر چاپ اُبھری۔ سولہ سترہ برس کی ایک دُبلی پتلی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا جسم اُونی شال میں لپٹا ہُوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بوڑھے کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ اُس سے کہنے لگی۔

"ابّا جان! ابھی تک بجلی نہیں آئی۔ سارے گھر میں اندھیرا پڑا ہے۔"

وہ جیسے چونک پڑا۔ "اوہ بجلی، میرا خیال ہے، مجھے ڈاکٹر رفیق کے گھر سے پاور ہاؤس ٹیلیفون کر دینا چاہیئے۔" لمحہ بھر کے لیئے اُس نے توقف کیا۔ "مگر اب تو وہ سو گیا ہوگا ؟"

وہ کہنے لگی۔ "آپ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون ہی کرنے تو گئے تھے۔"

وہ گھبرا گیا۔ "ہاں گیا تو ہیں ضرور تھا۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اُس نے نوشا کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "تم یعنی تم ؟ میرا مطلب ہے۔"

وہ ہکلانے لگا۔ "اوہو ہو بھئی معاف کرنا۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ دیکھو نادرہ ! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ تم ان کو گرم گرم دودھ لاکر پلا دو۔ اور بھئی مجھے بھی ایک گرم پیالہ کافی کا مل جائے تو کیا بات ہے ؟" وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

نادرہ نے اِس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ کمرے سے باہر جانے کے لیئے مڑی۔ بوڑھے نے اُس کو جاتے جاتے ٹوک کر پوچھا۔ "کیا تمہاری ماں کو پھر دَورہ پڑا ہے ؟"

وہ بولی۔ "جی ہاں۔ مگر اب اُن کو نیند آگئی ہے۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگانے لگا۔ موم بتّی کی روشنی میں اُس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ موٹے موٹے چشموں کے پیچھے اُس کی آنکھیں اُونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

ذرا دیر بعد نادرہ دونوں ہاتھوں میں ایک تکونا طشت لیئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ طشت میں دودھ سے بھرا ہُوا گلاس اور کافی کی پیالی رکھی تھی۔ اُس نے میز پر جھک کر طشت رکھا۔ اس کا چہرہ موم بتّی کی زرد روشنی کے سامنے آگیا۔ نوشا نے غور سے دیکھا اور سوچنے لگا، لونڈیا زوردار ہے۔ اُس کے خدوخال

سُبک تھے۔ آنکھیں کلیوں کی طرح شفاف تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ اس پر ہلکی ہلکی سنجیدگی چھائی تھی۔ اُس نے گلاس اُٹھایا اور بڑی بے باکی سے نوشا کو دے دیا۔ نہ وہ جھجکی، نہ شرمائی۔

وہ کمرے میں زیادہ دیر تک نہ رُکی۔ نوشا نے دودھ کا گلاس ختم کیا تو اس کو اپنے جسم میں کسی قدر تازگی محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اُسے چلنا چاہیئے۔ اسی وقت بوڑھے نے اُس سے پوچھا۔

"تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں" نوشا نے انکار میں گردن ہلائی۔

"چوری؟" بوڑھے نے دوسرا سوال کیا۔

نوشا نے آہستہ سے کہا "ہاں" اور ندامت سے گردن جھکالی۔

بوڑھے نے گہری سانس بھری۔ ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس سے کہنے لگا "تمہاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی، مگر تم جرائم پیشہ کیسے بن گئے؟"

پھر خود ہی چونک کر اُس نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہیئے۔ یہ بات تمہیں خود بھی نہیں معلوم ہوگی۔ تمہیں ابھی بہت سی باتیں نہیں معلوم ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم ڈاکٹر، قانون داں، سائنس داں، ماہرِ تعلیم، مصنّف اور مصوّر بن سکتے ہو تو یہ تمہارے لئے بڑی حیرت کی بات ہوگی۔"

نوشا کو واقعی اُس کی بات پر تعجب ہوا۔ وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اُس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کہتا رہا "کیا تم اپنی زندگی کی نہج کو نہیں بدل سکتے؟" اُس نے رُک کر ایک بار پھر اپنے جملے کو دہرایا "نہج تمہارے لئے مشکل لفظ ہے۔ مجھے یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیئے۔ یوں سمجھو۔!" وہ پھر اُلجھا "بھئی معاف کرنا ہم

نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میرا نام کلیم اللہ ہے۔ میں ایک مقامی کالج میں ریاضی کا پروفیسر ہوں۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نوشا"

پروفیسر نے مسکرا کر نوشا کو دیکھا۔ "نوشا یعنی دولہا۔ بھئی تمہارا نام تو خوب ہے۔ گو میں اس بات کا قائل نہیں کہ نام کا اثر کردار پر پڑتا ہے۔ مگر تمہارے نام میں بڑی رجائیت ہے۔ غالب کی عرفیت بھی مرزا نوشا تھی۔ تمہیں تو شاعر ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جس نے یہ نام رکھا ہوگا اس کا مزاج ضرور شاعرانہ ہوگا۔" کہتے کہتے وہ رک گیا۔ حسبِ معمول چونک کر بولا۔

"بھئی معاف کرنا، میں ذرا بہک گیا تھا۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو ناموں کی نفسیات کا اتنا شعور ہی کہاں ہے۔ سچ پوچھو تو اتنا نفسیاتی شعور کہیں نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک اچھے بھلے انگریز ادیب کا نام مسٹر ڈرنک واٹر نہ ہوتا۔ ڈرنک واٹر تم جانتے ہو۔ اس کا مطلب ہے۔ پانی پیو۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا مسخرا پن ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی نام ہوا۔"

وہ بے تکان بولتا جا رہا تھا۔ نوشا خاموش بیٹھا اُس کا منہ تک رہا تھا۔ پروفیسر کی باتیں اس کی سمجھ میں مشکل سے دس فی صد آرہی تھیں۔ وہ بہت جلد اُکتا گیا۔ اُس نے تھکے ہوئے انداز میں جمائی لے کر انگڑائی لی۔ پروفیسر نے فوراً کہا۔ "او ہو ہو تم کو نیند آرہی ہے۔ تم کو اب سو جانا چاہیے۔"

نوشا نے فوراً کہا۔ "میں اب جاؤں گا۔"

پروفیسر بولا۔ "رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ کیا اس وقت تمہارا جانا مناسب ہوگا؟"

نوشا بولا۔ "میں چلا جاؤں گا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔"

پروفیسر کہنے لگا۔ "تم مجھ سے آئندہ ضرور ملنا۔ تم ابھی عادی مجرم نہیں

بنے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب تم مجھ پر چاقو تانے کھڑے تھے تو تمہارا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے اُسی وقت بھانپ لیا تھا کہ تم ابھی اناڑی ہو" لمحہ بھر کے لئے رُک کر وہ بولا "کیا تم کبھی جیل بھی گئے ہو؟"

نوشا نے بڑی سادگی سے جواب دیا "ہاں"۔

پروفیسر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا "تم جیل بھی جا چکے ہو، پھر بھی اناڑی ہو۔ سلسلے کی کوئی درمیانی کڑی ضرور غائب ہے۔ میرا سارا تجزیہ غلط ہو گیا" اُس نے چونک کر نوشا کو دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "بہرحال تم مجھ سے ضرور ملو۔ آؤ میں تم کو دروازے تک پہنچا دوں"۔

اُس نے موم بتی اُٹھائی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں زینے سے اُتر کر نیچے آئے اور راہداری عبور کر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ نوشا نے دروازے سے نکلتے ہوئے مُڑ کر پروفیسر کو دیکھا۔ موم بتی کی روشنی میں وہ ناٹک کے مسخرے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ نوشا باہر گلی میں پہنچ کر سوچنے لگا۔ یار کس اُول جلول سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ سالا نہ جانے کونسی ایران توران کی ہانک رہا تھا۔ کہنے لگا یہ کام چھوڑ دو۔ پھر کیا کرو، جھک مارو۔ کیا کیا اڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر، قانون دان اور نہ جانے کیا اناپ شناپ بنا رہا تھا۔ بھئی حد ہو گئی۔ بھلا میں ڈاکٹر کیسے بن سکتا ہوں۔ یہ تو تقدیر کی بات ہے۔ اپنی قسمت میں تو ہاتھ کی صفائی دکھانا لکھی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے اُس نے جیب سے پرس نکال کر دیکھا۔ اُس میں پونے دو سو سے اُوپر روپے تھے۔ خوشی کے مارے اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ دل ہی دل میں کہا۔ یارا اپنے کام کی بھی کیا بات ہے۔ منٹوں میں چاندی کٹتی ہے۔ اُستاد پیدرو سچ کہتا ہے کہ یہ کچی کیمیا ہے۔ بس ذرا ہاتھ کی صفائی اور تھوڑی سی کاری گری چاہیئے۔

وہ اِسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اڈّے کی طرف چل دیا۔

(۴)

نوشا جب اڈّے پر پہنچا تو رات کے ساڑھے گیارہ کا عمل تھا مگر اُستاد پیڈرو کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ دیوار سے پیٹھ ٹکائے کسی مہنت کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ چاروں طرف جیب کترے حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ کمرے کے اندر تمباکو کا دھواں بھرا تھا۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔ نوشا کو دیکھتے ہی اُستاد کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"کیوں بے تو اب تک کہاں تھا؟"

نوشا نے آہستہ سے کہا۔ "سنیما چلا گیا تھا۔"

اُستاد پوچھنے لگا۔ "اور تو اُستاد اللہ رکھا کے علاقے میں کیوں گیا تھا۔ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ بولٹن مارکیٹ کے اُس پار کا علاقہ اپنا نہیں ہے۔ پر تم تو سالو! اپنی ماں کے یار ہو۔ ابے تو وہاں اپنی باندگی دکھانے کیوں گیا تھا۔ اُستاد اللہ رکھا کے کاریگر تم سے پتلا موتتے ہیں سالو! تم خواہ مخواہ دلوں میں پھیر ڈلوا دو گے۔" اُستاد پیڈرو نے اُس کو گھور کر دیکھا۔ "لا نکال جھمکوں کی رانی" گرہ کٹی کی رقم کے لئے یہ اُستاد پیڈرو کی اپنی مخصوص اصطلاح تھی۔

نوشا پہلے تو سٹ پٹایا کہ ضرور کچھ گول مال ہے۔ اُستاد کو کہیں سے سراغ لگ گیا ہے۔ مگر یہ رقم وہ اُستاد کو دینا نہ چاہتا تھا۔ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں تو اُس طرف گیا بھی نہیں۔ آغا بلبلی ہوگا۔ وہی اُس طرف جاتا ہے۔"

آغا بلبلی ایک کونے میں سکڑا سکڑا یا بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ اُس نے کچھوے کی طرح اپنی شتر کھی بے ڈول گردن نکال کر نوشا کو دیکھا اور ناک میں منمنا کر بولا۔

"اماں دیکھ رہے ہو اُستاد! سالا خواہ مخواہ کے لئے مجھ سے فلاشیئن کر رہا ہے۔ وہ رانپٹا دُوں گا کہ بتیسی نکل پڑے گی۔ میں تو دوپہر سے بخار میں پڑا بھُن رہا ہوں اور یہ سالا اپنی اُڑا رہا ہے۔"

اُستاد پیڈرو نے اُس کو ڈانٹ دیا۔ "بند کر اپنا لیکچر، بہت کہہ چکا۔" پھر وہ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں جی! تم نے خود اُسے دیکھا تھا۔" اُس نے نوشا کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا۔ "ہاں جی، یہی لونڈا تھا۔ شام سے شکار کے پیچھے مت ٹرلا رہا تھا۔"

نوشا نے اس عرصہ میں پہلی بار اس کو دیکھا۔ وہ دوہرے بدن کا مضبوط نوجوان تھا اور گردن اُونچی کئے بڑی بے باکی سے بول رہا تھا۔ "اُستاد میں نے کئی بار اُس کو اشارہ بھی کیا کہ یہ اپنا گاہک ہے۔ ایک بار ٹوپ ٹاپ بھی مارا تو یہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔"

اُستاد پیڈرو مسکرانے لگا۔ "یار تو بھی کیا بات کر رہا ہے۔ اسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ یہ سالا سمجھے گا، اُستادی کے بیگر۔ ابھی تو ــــ" اُستاد نے ایک گندی گالی دی۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ابھی اناڑی ہے۔"

نوشا ہٹ دھرمی پر اُتر آیا۔ "اماں بے فضول میں میرے اُوپر الزام لگا رہے ہو۔ میں نے تو تم کو دیکھا بھی نہیں۔" وہ خونخوار نظروں سے اُسے گھُورنے لگا۔ اسی وقت اُستاد نے ایک زناٹے کی گالی دے کر کہا۔

"اب چُپکا بھی رہے گا یا چج نچ ہی کئے جائے گا۔ تیری ساری کھکّا شاہی کا ابھی پتہ چلنے جاتا ہے۔"

نوشانے چوری کا بٹوا پھینک دیا تھا اور نوٹ پتلون کی موری میں سوراخ کر کے چھپا لئے تھے۔ اُسے اطمینان تھا کہ وہاں تک کسی کی نظر نہ جائے گی۔ لہٰذا اس نے چمک کر کہا۔ "جھوٹ بول رہا ہوں تو میری تلاشی لے لو۔"

اُستاد نے گردن ہلا کر کہا۔ "کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں تجھ کو یوں ہی چھوڑ دوں گا۔"

اُس نے چکرم کو اشارہ کیا۔ "دیکھ بے ناداں اسی کے پاس ہے یا کہیں رکھ آیا۔ ذرا انٹی لگا کے، یہ بڑا حرامی دکھے ہے۔"

چکرم نے دونوں ہاتھ پکڑ کے نوشا کو کھڑا کر دیا۔ اُستاد نے ڈپٹ کر کہا۔ "ہاتھ اُوپر کر۔" نوشا نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا دئیے۔ چکرم تلاشی لینے لگا۔ اُستاد بلی کی طرح تیز نظروں سے نوشا کو گھورتا رہا۔ چکرم نے ہر جگہ ٹٹولا۔ جسم کا ایک ایک گوشہ کریدا مگر رقم برآمد نہ ہوئی۔ ایک بار وہ اپنے ہاتھوں کو تھپکی دیتا ہوا اُوپر سے نیچے تک آیا تو اُستاد کی تجربہ کار نظر نے تاڑ لیا کہ جب چکرم کا ہاتھ پیروں پر آیا تو نوشا ذرا سا بدکا تھا۔ اُس نے نوشا سے کہا۔

"ذرا میرے کنے تو آ بیٹو۔"

نوشا اُس کے پاس چلا گیا۔ اُستاد کا ہاتھ سیدھا پتلون کی موری پر پہنچا۔ اُس نے اُنگلی ڈال کر نوٹوں کا فلیتہ نکالا اور بے نیازی سے اُٹھا کر سامنے ڈال دیا۔ سب نے حیرت سے اُس کو دیکھا۔ نوشا کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اُستاد پیڈرو نے قہر آلود نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ ڈانٹ کر بولا۔

"ابے میرے سے ٹرکیں کرنے چلا تھا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے لونڈے ٹانگ کے نیچے سے نکل چکے ہیں۔ ۳۰ سال سے اُوپر ہو گئے یہ کام کرتے ہوئے۔ جھک نہیں ماری ہے۔" اُستاد پیڈرو نے دونوں کان

پکڑ کر گردن ہلائی۔ ایسے اُستاد کا شاگرد ہوں کہ ولایت تک اُس کی تصویریں کھنچ کر گئیں۔ اُستاد پیڈرو کچھ دیر یوں ہی لیکچر دیتا رہا۔ پھر اُس نے چکرم سے کہا۔

"ذرا گن تو کتنی رقم ہے؟"

چکرم نے مُڑے تُڑے نوٹوں کو اُٹھا کر گنا۔ اُستاد سے کہنے لگا۔

"ایک سو تراسی ہیں۔"

اُستاد پیڈرو نے اللہ رکھا کے آدمی سے پوچھا "کیوں جی! تمہارا حساب کیا کہتا ہے۔ ٹھیک ہے رقم؟"

وہ بولا "ہاں جی بس اِتنا ہی ہمارا اندازہ تھا۔"

"تو یہ سنبھالو اپنی امانت۔"

اُستاد نے نوٹ چکرم سے لے کر اُس کو دے دئے۔ اُس نے نوٹ لے کر گنے اور اُس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اُستاد کے آگے ڈال دئے۔ کہنے لگا۔ "یہ ۴۶ روپے ہیں۔ ۲۵ فی صدی کے حساب سے تمہارا اتنا ہی محنتانا بنتا ہے۔ اگر تمہارا ریٹ کچھ اور ہے تو وہ بتا دو۔"

اُستاد کہنے لگا۔ "نہیں جی، یہی ٹھیک ہے۔"

وہ آدمی اُٹھ کر جانے لگا تو پیڈرو نے کہا۔ "اُستاد اللہ رکھا سے میرا سلام کہنا۔ اُن سے کہہ دیجیو، لونڈا ابھی اناڑی ہے۔ قاعدہ قانون نہیں جانتا۔ ویسے میں اس کی اچھی کندی کر دوں گا۔"

اللہ رکھا کا آدمی چلا گیا۔ کمرے کے اندر سناٹا چھا گیا۔ نوشا کی سٹّی گم تھی۔ اب اُس کی شامت آنے والی تھی۔ وہی ہوُا۔ اُستاد پیڈرو نے اُس کو ذبح کرنے والی تیز نظروں سے گھُور کر دیکھا۔ گالیاں دے کر کہنے لگا۔

"سالے تُو مجھے چکر پھریاں دیتا ہے۔ حرام کے تخم نے ناک، کٹوا دی

اللہ رکھا کہے گا پیڈرو نے نہ جانے کیا اَلَم غَلَم شاگرد رکھ چھوڑے ہیں۔ اس کٹنی والے سے اپنی یوں ہی لگتی ہے۔ شہر کے ایک ایک اڈے پر یہ بات پہنچ جائے گی۔ تُف ہے سالی ایسی اُستادی پر۔ ساری عزت کرکری ہو گئی۔"

نوشا ملزموں کی طرح سر جھکائے سہما ہُوا بیٹھا رہا۔ اُستاد غصّہ سے چیختا رہا۔ پھر اُس نے قادر سے کہا "او قادرا، لگا اِس حرام کے جنے کے دو چار ٹھڈے۔"

قادر نے اُٹھ کر نوشا کے ایک ہی ٹھڈ لگایا تھا کہ وہ تکلیف سے بلبلا کر چیخنے لگا۔ اُستاد نے قادر کو ہدایت دی "ابے ذرا دبا کے، کیا زنخوں کے سے ہاتھ چلا رہا ہے۔ یہ سالا تو یوں ہی فیل مچا رہا ہے۔"

قادر نے کوٹنے کے سے انداز میں دونوں بازوؤں کو تولا۔ پہلے داہنے ہاتھ کو ذرا سا ترچھا کیا۔ اور کہنی کی ہڈی کی بھرپور ضرب لگائی۔ نوشا کراہتا ہُوا فرش پر لوٹنے لگا۔ قادر نے جھپٹ کر ٹھڈ لگایا۔ ایک، دو، تین۔ وہ تابڑ توڑ ٹھڈ لگاتا چلا گیا۔ قادر بڑا اکڑیل جوان تھا۔ بھاری بھرکم کسرتی جسم تھا۔ ایک ایک بازو کا وزن پنج سیریوں میں تھا۔ پنڈلیاں اور پیر لوہا لاٹ تھے۔

نوشا زور زور سے چلّایا۔ پھر اُس کی آواز حلق سے غیں غیں کر کے نکلنے لگی۔ اُس کا منہ پھٹا ہُوا تھا۔ چہرہ وحشت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح فرش پر لوٹنے لگا۔

نہ جانے، وہ دیو کا دیو قادر کب تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا کہ اسی اثنا میں اُستاد کی آواز اُبھری "بس بے۔ سالے کو ذرا سانس تو لینے دے۔"

قادر اپنی جگہ پہ جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ گینڈے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے جیب کترے

دم بخود تھے۔ نوشا ابھی تک فرش پر تڑپ رہا تھا۔ اُستاد پیڈرو نے ایک ٹانگ اُٹھا کر دوسری پر رکھ لی اور جسم کو ہولے ہولے حرکت دینے لگا۔ سامنے دیوار پر اُس کا مہیب سایہ جھوم رہا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ ہر شخص خاموش تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نوشا تڑپتے تڑپتے تھک کر شل ہو گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ کمرے کے سکوت میں اُس کی بوجھل سانسوں کی آواز صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اُستاد کی بھاری بھرکم آواز اُبھری۔ وہ نوشا سے کہہ رہا تھا۔ "اُٹھ کے بیٹھ، بہت ہو چکا نخرہ۔ نہیں تو سالے دو چار ہاتھ اور لگواؤں گا جو کسر رہ گئی ہے، وہ بھی پوری ہو جائے گی۔"

نوشا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ وہ منہ بسور بسور کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ مگر اُستاد پیڈرو اس کی حالتِ زار سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا، چکرم کو اشارہ کر کے بولا۔

"سالے کو تھوڑا سا 'زندہ طلسمات' پلا۔ پھر اس کو چلتا کیا جائے۔"

چکرم کمرے سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ قارورے کی شیشی لئے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اُس میں زرد زرد پیشاب بھرا تھا۔ شیشی کو دیکھتے ہی نوشا چیخنے لگا۔

"اُستاد! اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ مر جاؤں گا۔"

"اب غلطی کروں تو جان سے مار دینا۔"

وہ دہائی دیتا رہا مگر اُس کی ایک نہ سُنی گئی۔ اُستاد پیڈرو کی ہدایت پر ایک جیب کترا اُس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا۔ دوسرے نے اُس کا مُنہ چیر دیا۔ چکرم نے قارورے

کے کئی قطرے اُس کے حلق میں ڈال دئے۔ اِس کے بعد نوشا کو چھوڑ دیا گیا۔

نوشا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ وہ زور زور سے اُبکائیاں لے رہا تھا۔ اُستاد ڈانٹ کر بولا "باہر جا کر اُلٹی کیجیو۔ سالے یہاں گندگی پھیلائی، تو ابھی اور زندہ طلسمات پلواؤں گا۔ اب جا رہا ہے کہ نہیں"۔

نوشا لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد نوشا کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔

"اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔" اُستاد تیکھے لہجے میں بولا۔ "تم ابھی اپنا ٹین پاٹ یہاں سے گول کرو۔"

نوشا نے مری ہوئی آواز سے کہا۔ "اُستاد! میں خدا کی قسم تم سے سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے۔"

اُستاد چیخ کر بولا۔ "اب تو اپنی بات کو اپنے ہی ساتھ رکھ۔"

"میری بات تو سُن لو اُستاد!"

"میں تجھے اچھی طرح جان گیا ہوں، تُو ایک نمبر حرام کا تخم ہے۔" اُستاد پیڈرو نے دس روپے کا ایک نوٹ اُس کی طرف پھینکا۔ حقارت سے بولا۔ "لو سالے خاں یہ بھی لیتے جاؤ۔ یہ کام تیرے بس کا نہیں۔ تُو تو مجھے بھڑوا دِکھے ہے۔ اُن ہی کی طرح پٹیاں نکالتا ہے۔ اب جا کے اپنی ماں کے لئے کوئی یار ڈھونڈ۔"

اس بات پر نوشا نے اُس کو گھور کر دیکھا۔ اُستاد نے ڈانٹا۔ "سالے! آنکھیں کیا دکھا رہا ہے۔ جا کے تھانے میں رپٹ لکھا دیجیو کہ اُستاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو۔ پر یہ بھی سُن لے کہ دو ہزار روپے مہینہ نقد کھلاتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہنا، تو یہ سمجھ

رِیا ہو کر میں اُستاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ کھڑا رہا۔

اُستاد نے ڈپٹ کر کہا۔" ابے تُو جا رہا ہے یا کچھ اور تیری کندی کراؤں۔ تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون آ رہا ہے۔ بس اب تُو چلا ہی جا۔"

نوشا نے دس روپے کا نوٹ اُٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اڈے سے باہر آ گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ نوشا نے سوچا رات کہاں کاٹے۔ اچانک اُس کو راجہ کا خیال آ گیا۔ مگر اُس کی یاد آتے ہی وہ جھنجلا گیا۔" اس سالے کی تو تقدیر ہی کھوٹی ہے۔ سوچا تھا کہ اس رقم سے اُس کا علاج کرا دوں گا، اُلٹا اپنا ڈبا گول ہو گیا۔ نہ رہنے کو ٹھکانہ ہے نہ کوئی کام کاج۔"

وہ اسی طرح سوچتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ سیدھی سڑک پر وہ دُور تک چلا گیا۔ راستہ سُنسان تھا۔ سناٹے میں کہیں کہیں زور زور سے کتے بھونک رہے تھے۔ گشت کرنے والا ایک کانسٹیبل اُس کے قریب سے گزرا۔ اُس نے مشتبہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ نوشا گھبرا گیا۔ اِس طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرنا مناسب نہیں تھا۔ سردی تھی اور وہ بہت تھکا ہُوا بھی تھا۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

رات دیو کی طرح سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ شبنم کے قطرے درختوں کے پتّوں سے ٹپ ٹپ فٹ پاتھ پر گر رہے تھے۔ اُس کے قریب ہی ایک شخص گٹھڑی کی طرح سُکڑا سُکڑایا پڑا تھا۔ اُس کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ مزے سے پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ نوشا کو سردی کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک دفعہ اُس نے قریب پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا اچانک اُس کو خیال آیا کہ اس شخص پر ذرا ہاتھ کی صفائی کا تجربہ کرنا چاہیئے ۔ یہ سوچتے ہی اُس کی اُنگلیاں چُلبلانے لگیں ۔ وہ کھسک کر اُس کے قریب ہو گیا ۔ ہاتھ بڑھا کر اُس کی جیبیں ٹٹولنے لگا ۔ وہ ایک بوسیدہ اُونی کوٹ پہنے تھا ۔ اُس کی ایک جیب سے کاغذوں کے چند پُرزے اور ایک ٹوٹا ہوا کنگھا نکلا ۔ دوسری جیب بالکل خالی تھی ۔ البتہ اندر کی جیب سے ایک روپے کا نوٹ اور چند آنے کی ریزگاری نکلی ۔ پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر بھی نکلی ۔ تصویر کو اُس نے دھندلی دھندلی روشنی میں دیکھا ۔ اُس میں گول مٹول سا ایک بچہ بیٹھا ہمک رہا تھا ۔ اُس تصویر کا مقصد اُس کی سمجھ میں نہیں آیا ۔ پہلے تو نوشا نے سوچا کہ رقم کو صاف کر دے ۔ مگر پھر یہ خیال کر کے اُس کو واپس جیب میں رکھ دیا کہ سالا بھوکا مر جائے گا ۔ خواہ مخواہ کو سینے دبے گا ۔ اُسے اس بات پر خوشی ہوئی کہ اب وہ بہت صفائی سے کام کر سکتا تھا ۔ اُس نے اُس آدمی کی تمام جیبوں کی تلاشی لے ڈالی مگر اُس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔

شبنم سے اُس کے بال بھیگ گئے تھے اور سردی کا احساس شدید ہو گیا تھا ۔ بار بار اُس کا جسم کانپ اُٹھتا ۔ نیند کا کوئی امکان نہیں تھا ۔ اُس نے سوچا کوئی نہ کوئی چائے خانہ تو کھُلا ہی ہو گا ، وہاں جا کر چائے پی جائے ۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔

دفعتاً نوشا کو اس آدمی کا خیال آ گیا ، جو بے خبر پڑا سو رہا تھا ۔ اُس نے سوچا کہ وہ اُس کو خبردار کر دے ، ورنہ کوئی اُس کا بھائی بند جیب صاف کر جائے گا اور سویرے اُٹھ کر اُس کے پاس چائے پینے کو بھی کچھ نہ ہو گا ۔

اُس نے جھک کر اُس کو جھنجوڑا اور بے تکلفی سے بولا " اے بھائی !

نیند کے متوالے" مگر وہ نہ اُٹھا۔ اچانک نوشا کو محسوس ہوُا کہ اُس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوُا تھا۔ نہ جانے وہ کب کا مرا ہوُا پڑا تھا۔ اِس خیال کے آتے ہی وہ خوف سے کانپ اُٹھا۔ اس کو ایسا محسوس ہوُا کہ لاش اس سے چمٹ گئی ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے فوراً آگے بڑھ گیا اور پیچھے مُڑ مُڑ کر لاش کو دیکھتا رہا۔ اُسے بار بار ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی دبے قدموں اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔

اِسی گھبراہٹ کے عالم میں وہ ایک ایرانی چائے خانہ میں داخل ہوُا۔ وہاں اس وقت بھی خوب چہل پہل تھی۔ شب زندہ داروں کا ہجوم تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں رکشا والے تھے۔ وکٹوریہ والے تھے، پولیس کے کانسٹیبل تھے اور آوارہ گرد لوگ تھے۔ نوشا نے گرم گرم چائے کے دو گھونٹ پیے تو ذرا سکون ملا۔ ایک پیالی چائے ختم کرنے کے بعد اُس نے دو مسکہ بن کھائے۔ ایک اور گرم گرم ڈبل چائے چڑھائی۔ مگر ابھی تک وہ سنبھل نہیں سکا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اُس مرے ہوئے آدمی کا خیال آ رہا تھا، جس کی جیبوں سے اُس نے ایک روپیہ اور پانچ آنے نکلے تھے۔ یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا۔ وہ بار بار سوچتا، یہ گرہ کٹی کا پیشہ سالا بڑا واہیات ہے۔ یار اِس پیشے کو تو چھوڑ ہی دینا چاہیئے۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ پھر کرے گا کیا ؟ اِسی عالم میں کوئی اُس کے وجوُد کے اندر سے بولا۔ دنیا میں سب جیب کترے ہی تو نہیں ہیں۔ اس خیال سے اُسے کسی قدر تقویت پہنچی۔

وہ دیر تک چائے خانہ میں بیٹھا رہا۔ جب صبح کے آثار ہویدا ہوئے اور ہلکی ہلکی سفیدی آسمان کے کناروں پہ اُبھرنے لگی تو وہ چائے خانے سے نکل کر باہر آ گیا اور سڑکوں کی آوارہ گردی شروع کر دی۔

دن بھر وہ کام دھندے کے لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر اس کا وہ دن بیکار گیا۔ رات اُس نے ریلوے اسٹیشن کے مُسافر خانے میں گذاری۔ کئی روز تک یہی سلسلہ رہا۔ دن سڑکوں اور چائے خانوں میں گزرتا اور رات مُسافر خانے میں۔ اُس کے دس روپے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اس احساس سے وہ گھبرا جاتا۔

آخر ایک ورکشاپ میں اُسے موٹر کلینر کا کام مل گیا۔ ۵۰ روپے مہینہ تنخواہ اور صبح ۸ بجے سے ۸ بجے شام تک کی ڈیوٹی۔ سب شرائط اُس نے قبول کرلیں اور کام شروع کردیا۔

کام تو مل گیا مگر رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ معاً اُسے پروفیسر کلیم اللہ کا خیال آیا۔ اُس نے سوچا، چل کر اُس سے ملا جائے۔ باتیں تو بہت کرتا تھا، شاید کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ ایک شام ورکشاپ سے نکل کر وہ سیدھا پروفیسر کے پاس گیا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھا۔ اس کو دیکھتے ہی بولا۔

"آخر تم آ ہی گئے، مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

نوشا کہنے لگا۔" میں نے پُرانا دھندا چھوڑ دیا ہے اور ایک گیراج میں نوکری کرلی ہے۔"

پروفیسر ہو، ہو کر کے بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس خبر سے اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ کہنے لگا۔" بہت اچھا، بہت اچھا۔ تم تو انجینئر بن سکتے ہو۔" اُس نے نوشا کے موبل آئل سے داغ دار لباس کو غور سے دیکھا۔ "تم تو ابھی سے انجینئر لگنے لگے۔" وہ اُس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دینے لگا۔

نوشا نے دفعۃً غنیمت جان کر مطلب کی بات کہدی۔" کام تو مل گیا، مگر رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اسٹیشن جاکر مُسافر خانے میں پڑ رہتا ہوں۔"

پروفیسر ذرا دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

" نہیں، میں تم کو رہنے کے لئے جگہ دوں گا۔" اُس نے فوراً اپنی بیٹی کو بُلایا۔ جب نادرہ آگئی تو وہ اُس سے کہنے لگا۔" نادرہ ان سے ملو۔ یہ نوشا ہیں۔ ہمارے دوست۔ اگر تم کو دوست کے لفظ پر اعتراض ہے تو میں اس لفظ کو واپس لیتا ہوں۔ بہرحال یہ ہمارے مہمان ضرور ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں گے۔"

وہ بولی۔" مگر ابا جان گھر میں جگہ کہاں ہے ؟"

" وہ ایک احمقانہ سی مثال ہے۔ جگہ دل میں ہونی چاہیئے۔ تو اس وقت جگہ دل ہی میں نکالنا پڑے گی۔ دل نہیں۔ دماغ! دماغ سے سوچو کہ کہاں جگہ نکل سکتی ہے۔"

نادرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر ذرا دیر تک بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے چٹکی بجا کر کہا۔" یہ ٹھیک رہے گا۔ کھانے کے کمرے سے میز اُٹھا کر تم گیلری میں لگا دو۔ کیا مضائقہ ہے، کھانا ہی تو کھانا ہے گیلری بھی بُری جگہ نہیں۔ جس شہر میں ایک انسان کو سر چھپانے کے لیئے چھت تک میسّر نہ ہو، وہاں کسی کو ڈائننگ روم رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ خود غرضی ہے۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

نادرہ پروفیسر کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ ایک بار طے کر لیتا تھا، اُسے پُورا کیئے بغیر نہیں رہتا۔ لہذا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئی اور گھر کے بوڑھے مُلازم کی مدد سے کھانے کی میز نکال کر راہداری میں ڈال دی۔ کمرہ نوشا کے لیئے خالی کر دیا گیا۔

پروفیسر نے اُس کے لیئے چارپائی اور بستر کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس رات نوشا، کئی راتوں کے بعد، گہری نیند سویا۔ سویرے ہی سویرے پروفیسر کی

آواز سُن کر نوشا جاگ اُٹھا۔ پروفیسر اُس کو چائے کے لئے بُلا رہا تھا۔ اُس نے غسل خانے میں جاکر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور اُس کے پاس چلا گیا۔ پروفیسر اور نادرہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میز پر چائے اور ناشتے کا سامان رکھا تھا وہ اُن کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جھجکنے لگا۔ پروفیسر نے کہا۔

"تم شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو۔ آؤ، اِدھر آکر بیٹھو۔"

نوشا سُکڑا سُکڑا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ اور اخبار کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ نادرہ نے نوشا کو چائے بنا کے دی۔ ٹوسٹ اور ایک انڈا دیا۔ نوشا آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا۔ وہ گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کو ہر چیز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔

اُس روز وہ ورکشاپ پہنچا تو اُس کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش تھی۔ کام بھی محنت سے کیا۔ پہلی بار اُسے ورکشاپ سے چھٹی ہوتے وقت خوشی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا گھر آیا اور غسل خانے میں دیر تک نہاتا رہا۔ رات کا کھانا بھی اُس نے پروفیسر ہی کے ساتھ کھایا۔

چند ہی روز کی رہائش کے بعد اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی زندگی میں بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ اب سڑکوں کی آوارہ گردی اور گھٹیا چائے خانوں میں وقت گزارنے کے بجائے زیادہ تر گھر ہی پر رہتا۔ اُس کی زندگی میں کسی قدر باقاعدگی اور نظم و ضبط پیدا ہو رہا تھا۔

○

فصل دہم

(۱)

کراچی آئے ہوئے سلمان کو کئی مہینے ہو گئے تھے۔ سُسر کے اثر و رسوخ سے اُس کو ایک غیر ملکی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ کام بھی زیادہ نہ تھا۔ پانچ ہزار روپے، جو سُسرال سے، شادی پر سلامی میں ملے تھے، اس کے پاس موجود تھے، اس میں سے چار ہزار روپے پگڑی دیکر اس نے شہر کے ایک بارونق علاقے میں رہائش کے لئے فلیٹ لے لیا تھا۔

اِس میں تین کمرے تھے۔ فلیٹ روشن اور ہوادار تھا۔ پاس پڑوس بھی نہیں تھا۔ اس کئی منزلہ بلڈنگ میں زیادہ تر پارسی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے رہن سہن میں نفاست اور مغربیت تھی۔ مگر اکثر رات گئے تک خوب ہنگامہ رہتا تھا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ سلمان عام طور پر گھر ہی پر رہتا تھا۔ اور اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں گزارتا۔ ان دنوں اس کا

صرف یہی مشغلہ تھا۔ ہفتے کی شروع تاریخوں میں وہ بازار سے نئی نئی کتابیں خرید کر لاتا۔

فلیٹ کا ایک کمرہ اُس نے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس میں ایک مختصر لائبریری بن گئی تھی۔ کتابوں کی دو الماریاں، مطالعہ کی میز اور صوفہ سیٹ لگا کر اُس نے کمرے کو قرینے سے آراستہ کیا تھا۔ کچھ فرنیچر اُس نے خریدا تھا کچھ کرایہ پر لے آیا تھا۔

کراچی میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ اور نہ ہی کسی کے ساتھ اس نے مراسم بڑھانے کی کوشش کی۔ دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں سے اُسے کبھی دلچسپی اور اُنسیت پیدا نہ ہوئی۔ مگر وہ حتی الوسع کوشش کرتا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اُس نے اپنی بے ترتیب زندگی میں اب بڑی باقاعدگی پیدا کر لی تھی۔ چند موٹے موٹے اصول اُس نے وضع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ دفتر کے کسی شخص سے بدمزگی پیدا نہیں کرے گا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اُسے روزانہ وہاں سات گھنٹے گزارنا پڑتے تھے۔ البتہ دفتر سے باہر آنے کے بعد وہ اس ماحول کو اس فضا کو یکسر فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی ساتھی کے ساتھ اُس کے تعلقات دفتر کی چاردیواری سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اتوار کو عام طور پر وہ میٹنی شو دیکھتا یا سمندر کے کنارے کسی پُر فضا مقام پر چلا جاتا اور گھنٹوں ریت پر بیٹھا شور مچاتی لہروں کو دیکھتا۔ اُس کی زندگی میں ایک طرح کا ٹھیراؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اُس سے مطمئن بھی تھا۔ کبھی کبھی اُسے کھانے کی دقّت کا احساس ہوتا۔ ہوٹل کے کھانے سے وہ اُکتا گیا تھا۔ اُس نے ایک مُلازم رکھ لیا، اور گھر پر کھانا پکوانے کا بندوبست کیا۔ مگر وہ ہفتہ بھر بھی نہ

ٹکا۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ملازم غائب تھا۔ سوٹ کیس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ خیریت ہوئی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور اس میں صرف ۴۲ روپے پڑے تھے۔ ان ۴۲ روپوں کے علاوہ وہ کچھ کپڑے چرا کر بھی لے گیا۔ نقصان زیادہ نہ ہوا تھا۔ مگر اسی روز اُس نے طے کر لیا کہ وہ ملازم نہیں رکھے گا۔ دوسرے روز اُس نے بیوی کو بلانے کے لئے خط لکھا اور پھر ہر خط میں اصرار کرنے لگا۔

جاڑوں کی ایک کہر آلود صبح کو وہ کراچی پہنچ گئی۔ اُس کے ہمراہ ایک بوڑھی خادمہ بھی تھی۔ بیوی کو لینے صبح تڑکے وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ اس انتظار میں اُس نے ایک خاص کیف محسوس کیا۔ یہ ایسی مسرت تھی جو وہ بہت عرصہ بعد محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ انٹر کلاس کے ایک زنانہ ڈبے سے اُس کی بیوی بوڑھی خادمہ کے ساتھ اُتری۔ وہ برقع پہنے ہوئے تھی اور بہت شرمائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گھر آکر بھی اس کا یہی انداز رہا۔ بات کرتی تو اس کی نگاہ نیچے جھکی رہتی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی پریشانی نظر آتی۔

اُس روز اُس نے دفتر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لہذا وہ فلیٹ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا، دفتر روانہ ہو گیا۔ سہ پہر ہونے تک اس کا دل کام سے اُچاٹ ہو گیا۔ اس روز وہ جلد ہی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دفتر سے نکلا، تو بہت خوش تھا۔

وہ گھر جانے کی بجائے سیدھا بازار گیا۔ وہاں اُس نے حلوہ سوہن خریدا۔ تازہ پھل لئے اور گل فروش کی دکان سے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی خرید لیا۔ گھر پہنچا تو بیوی چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے شاید کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اس کا چمپئی چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ تھا۔ ہلکے آسمانی لباس میں وہ دل کش نظر آ رہی تھی۔ سلمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اُس کی بیوی حسین

تھی۔

چائے پیتے وقت وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے چھیڑتا رہا تاکہ اس کا حجاب کسی قدر کم ہو۔ اس وقت وہ ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح غیر سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ بات بات پر زوردار قہقہے لگاتا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ اس کی یہ شام بڑی خوشگوار گزری۔

سلمان کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کی بیوی بڑی محنتی اور سُگھڑ تھی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی بیدار ہوجاتی۔ اُس کے جوتوں پہ پالش کرتی۔ کپڑوں پر استری کرتی۔ شیو کرنے کا سامان آئینہ کے سامنے رکھ دیتی۔ جتنی دیر وہ غسل کرتا، اس عرصہ میں وہ ناشتہ تیار کر کے میز پہ لگا دیتی۔ گو گھر میں خادمہ موجود تھی۔ مگر اُس کا سارا کام وہ خود کرتی۔ اور اس میں اُس کو مسرت بھی محسوس ہوتی۔ سلمان نے اکثر غور کیا کہ اگر اُس نے کسی کام کے لئے خادمہ سے کہا، تو اس کی بیوی خود ہی وہ کام کر دیتی۔

شام کو واپس آتا تو چائے تیار ملتی۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پہ بیٹھ جاتا۔ بیوی اُس کے قدموں پہ جھک کر جوتے کا فیتہ کھولنے لگتی۔ اس بات پر سلمان نے منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آئی۔ اُس کے کپڑے وہ خود ہی ہینگر پہ ٹانگتی۔ اُس کی ایک ایک چیز قرینے سے لگی ہوتی۔ حالانکہ وہ بیوی کے آنے کے بعد خاصا لاپرواہ ہوگیا تھا۔ دفتر جاتا تو سارے کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر ڈال دیتا۔ مگر شام کو ہر چیز اپنی جگہ آراستہ ملتی۔

یہ بڑے پُرکیف دن تھے۔ اُس کی صحت بہت اچھی ہوگئی تھی۔ چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ وہ اچھا خاصا سجیلا جوان نظر آتا۔ لیکن ان دنوں وہ جس قدر باتونی ہوگیا تھا، بیوی اُسی قدر خاموش رہتی۔ وہ بہت کم بات چیت کرتی۔ کوئی بات اچھی لگتی تو صرف مُسکرا دیتی۔ اُس کے سفید سفید دانت جھلکتے اور سُرخ لب

کپکپا کے رہ جاتے۔ سلمان کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

کم گو ہونے کے باوجود وہ بڑی ملنسار تھی۔ اُس نے کچھ ہی دنوں میں پاس پڑوس میں خاصا میل جول پیدا کر لیا تھا۔ بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی نوجوان عورتیں زیادہ تر دفتروں میں ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پر خرچ کرتیں۔

پڑوس کے فلیٹوں میں رہنے والی یہ لڑکیاں اکثر اُس کے گھر بھی آتیں۔ اِٹھلا اِٹھلا کر باتیں کرتیں۔ اُن کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ اُن کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا۔ جسم کی ہر حرکت مصنوعی تھی۔ وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ اُن کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکینڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خاں کے نئے معاشقوں کے بارے میں بات کرلیتیں۔ ان کے تذکرہ میں ایک خاص لذّت محسوس کرتیں۔

سلمان نے غور کیا کہ اُن لڑکیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے میل جول نے اُس کی بیوی میں بھی بعض تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ باتوں کے دوران خواہ مخواہ انگریزی کے بھونڈے الفاظ استعمال کرتی۔ اُس نے اپنے بالوں کا انداز بدل دیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ میک اپ کرنے لگی تھی۔ اب اُس کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ وہ اُس کے حُسن کی تعریف کرے۔ پہلے وہ فلم دیکھنے سے پرہیز کرتی تھی، مگر اب وہ دبے دبے الفاظ میں فلم دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کرتی۔

ایک اتوار کو پکنک کا پروگرام بنا، جس کو پڑوسیوں نے بنایا تھا۔

اُنھوں نے ایک اسٹیشن ویگن کا بندوبست بھی کیا تھا۔ سب اس میں لد لدا کر ہاکس بے پہنچے۔ اس روز سلمان کی بیوی کا بُرقع بھی اُتر گیا۔ پارٹی میں خاصی تفریح رہی۔ سمندر میں غسل کیا گیا۔ ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں سے جسم کو سینکا گیا۔ بہت سی الّم غلّم چیزیں کھائیں۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اور جب سورج بحیرہ عرب میں ڈوبنے لگا اور لہروں کا رنگ ارغوانی ہوگیا تو وہ تھکے ہارے واپس ہوئے۔

اس کے بعد اکثر اتوار کو پک نک پارٹیاں ہوتی رہیں۔ سلمان ہفتہ کی شام بیوی کے ساتھ پکچر ضرور دیکھتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بیوی کے ساتھ شام کو ٹہلنے نکل جاتا۔ دونوں کچھ شاپنگ کرتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ مہینے کی شروع تاریخیں ہوتیں تو وہ شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں رات کا کھانا بھی کھا لیتے۔

زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ البتہ اب اس میں سکون کم تھا اور ہنگامے زیادہ ہو گئے۔ مگر یہ ہنگامے اس طرح دبے قدموں زندگی میں داخل ہوئے تھے کہ سلمان کو ان کا مطلق احساس نہ ہوا۔ وہ ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جس قدر یہ ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے، مطالعہ کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے وہ روزانہ چالیس پچاس اور کبھی کبھی تو سو، سوا سو صفحات پڑھ ڈالتا تھا۔ ان دنوں وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اُس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے شیڈ کا ہلکا عکس لہراتا۔ بیوی بار بار کروٹ بدلتی۔ خواہ مخواہ بات کر کے اُس کو چھیڑتی، مگر وہ مطالعہ میں محو رہتا۔ اب یہ محویت کم ہونے لگی تھی۔

بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ جُوتوں اور سینڈلوں کی اُس نے درجنوں جوڑیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا

لباس تیار کرانے کا پروگرام بناتی۔ میک اَپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نت نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لئے ہوتا، کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لئے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھارا جاتا۔ جب بھی دونوں بازار جاتے کوئی شاپنگ نہ بھی ہوتی تب بھی فیشن میگزین ضرور خریدے جاتے، جن کو پڑھ پڑھ کر وہ روزانہ نئے انداز سے بال سنوارتی، ایسے لباس سیتی جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عُریاں نظر آتی۔ اُن کی فٹنگ اِس طرح ہوتی کہ جسم کا ایک ایک خم نظر آتا۔

اب وہ کام کرنے سے بھی جی چُرانے لگی تھی۔ اور ہر وقت خادمہ کو احکامات دیتی رہتی۔ کام کرنے سے ہاتھوں کی جلد کھُردری پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اور زیادہ محنت کرنے سے رنگت سانولا جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ اب وہ یہ فن ضرور جان گئی تھی کہ اپنی دلکشی کی زائد زائد کس طرح نمائش کی جائے۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی۔ سج سجا کر شام کو چائے کی میز پر بیٹھتی تو کمرے میں تازہ پھولوں کی شگفتگی اور مہک رچی ہوتی۔ سلمان دفتر سے تھکا ہارا آتا۔ اُس کے دل آویز چہرے اور پھڑکتے ہوئے جسم کو دیکھتا تو ساری تھکن بھول جاتا۔ اُس کی قربت میں لذت اور کشش محسُوس کرتا۔

آمدنی بندھی ٹکی تھی، اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ کتابوں کی خریداری کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی۔ مطالعہ بھی بند ہو گیا۔ تنخواہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بلکہ اکثر بلوں کی اَدائیگی پھر بھی رہ جاتی، جن کو آئندہ ماہ پر ٹالنا پڑتا۔

سلمان اب سگریٹ گن گن کر پینے لگا تھا، اور اپنی ضروریات کا سامان خریدنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا۔ اب وہ اکثر بغیر استری کیا ہوا سُوٹ پہن کر آفس چلا جاتا۔ دفتر میں ہر شخص سے اُس کا لین دین شروع ہو گیا تھا۔ کبھی

کبھی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو بدمزگی بھی پیدا ہوتی۔ پہلے وہ دفتر کے ساتھیوں سے مراسم بڑھانے سے کتراتا تھا مگر اب کم از کم قرض خواہوں سے اُسے زیادہ گھُل مِل کر رہنا پڑتا۔

سلمان کے مزاج میں رفتہ رفتہ چڑچڑا پن آتا جا رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بیوی سے اُلجھ پڑتا۔ اور پھر کئی کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتا۔ پکچر چلا جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ اُس میں ایک عجیب سا لااُبالی پن آ گیا تھا۔

جاڑے جا چکے تھے، اور گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر "شبِ ماہ" منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھُلے لان میں رات بھر بیئر پیتا رہا، اور پُورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ ملازم لڑکیاں بھی تھیں، جن کو نشے میں دُھت ہو کر اُس نے بہت ستایا۔ ایک لڑکی کا اُس نے اسکرٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے اُس نے گال نوچ لئے اور وہ بلبلیوں کی طرح غرّا کر اس پر چلّانے لگیں۔ ایک موٹے تگڑے نوجوان کے چہرے پر اُس نے بیئر کا پُورا گلاس اُنڈیلا۔ اور اس سے فری اسٹائل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پورا چاند نکلا تھا۔ ہر طرف اُجلی اُجلی چاندنی بکھری تھی۔ اکسٹرا پر تیز گت بج رہی تھی۔ پینے کے لئے اچھی بیئر تھی۔ اور آس پاس خوب صورت لڑکیاں تھیں جو ہلکے ہلکے سرور سے لڑکھڑا رہی تھیں گھنٹیوں کی طرح بجتے ہوئے تیز تیز قہقہے لگا رہی تھیں اور ہر بے تکلفی کو کبھی پیار سے ڈانٹ کر اور کبھی صرف مسکرا کر ٹال دیتیں۔ اس خوب صورت رات کو اُس نے جی بھر کر ہنگامہ کیا اور خوب لُطف اندوز ہوا۔

واپس گھر پہنچا تو رات کے تین بجے تھے۔ دروازہ اُس کی بیوی نے کھولا۔ وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ سلمان پہلی بار اُس کے سامنے شراب پی کر گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کہتا کچھ تھا، بات نکلتی کچھ تھی۔ جسم بے قابو ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے دُھندلی دُھندلی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ اُس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے، اور جھومتا جھامتا بستر پر جاکر اوندھے منہ گر پڑا اور اُسی حالت میں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کو اپنے رخسار پر نمی محسوس ہوئی۔ وہ نشہ سے چونکا۔ ذرا دیر بعد چہرے پر ایک اور قطرہ گرا۔

سلمان نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ بیوی اُس پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ کمرے کی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کا دل کش چہرہ کملایا ہوا نظر آرہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ سلمان نے گردن جھکائی اور چُپ چاپ سوچنے لگا کہ اُسے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اُسے اس طرح اپنی بیوی کو دُکھ نہیں پہنچانا چاہیئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے اس بات پر مسرّت بھی ہوئی کہ اس کی بیوی اس سے بے تحاشا پیار کرتی تھی۔ اس مسرّت میں رات بھر کے سارے ہنگاموں سے زیادہ لذّت تھی۔

(۲)

ہفتہ کی شام تھی۔ سلمان دوپہر ہی کو دفتر سے گھر واپس آگیا تھا۔ مہینے کی شروع تاریخیں تھیں۔ سہ پہر کو چائے پیتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ شام گھر سے باہر گزاری جائے۔ پروگرام یہ بنا کہ کسی خوب صورت سے ریستوران میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی جائے۔ اس کے بعد فلم دیکھی جائے۔ فلم کے انتخاب پر دونوں کی پسند مختلف تھی۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ فلم کا انتخاب

آئس کریم کھاتے وقت کیا جائے۔ فلم دیکھنے کے بعد رات کا کھانا بھی ان کو باہر ہی کھانا تھا۔ اور یہ طے ہؤا تھا کہ کھانا چاہے کسی ہوٹل میں کھایا جائے مگر اس میں سیخ کے کباب ضرور ہوں، گرم ہوں اور چٹپٹے ہوں۔

یہ پروگرام بنا کر دونوں گھر سے باہر آئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ دن ڈھلتے ہی شہر کی ساری آبادی گھروں سے نکل کر سڑکوں اور بازاروں میں آگئی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ شوروغل تھا۔ دکانوں پر بھیڑ تھی۔ دونوں تفریح کے موڈ میں تھے اور بے فکری کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے۔ ایک موڑ پر سلمان نے دیکھا کہ ایک نوجوان اُس کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ معمولی لباس پہنے ہوئے تھا سر پر اُلجھے ہوئے گھونگھریالے بال، کھُلتا ہؤا رنگ اور چہرے پر ہلکی بھوری بھوری مونچھیں۔ سلمان کو پہلے تو اُس کے انداز پر غصّہ آیا۔ پھر ایسا محسوس ہؤا کہ اُس نے کہیں اُسے دیکھا ضرور ہے۔ اُس کو شُبہ ہؤا کہ وہ نوشا تھا۔

وہ واقعی نوشا تھا اور اُس نے سلمان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر رُک گیا۔ چند قدم آگے بڑھا۔ مگر یہ سوچ کر اُسے شرمندگی کا شدید احساس ہؤا کہ وہ گھر سے بھاگ کر کراچی آیا تھا اور یہ بات سلمان کو بھی معلوم ہو گی۔ وہ ملے گا تو اس کا ذکر ضرور کرے گا، اور اس کے متعلق وہ کچھ سُننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور راہ گیروں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

سلمان کو دیکھنے کے بعد نوشا کو اپنا گھر یاد آگیا۔ اس نے سوچا نہ جانے امّاں کس طرح ہوں گی۔ سلطانہ کیسی ہو گی۔ انّو تو اب بڑا ہو گیا ہو گا۔ ٹھاٹھ سے اسکول جاتا ہو گا۔ شاید امّاں نے اس کی طرح انّو کو بھی اسکول سے اُٹھا کر کہیں کام کاج پر لگا دیا ہو گا۔ اُس کے اس طرح چلے آنے پر امّاں ضرور روئی ہوں گی۔ اُسے یاد آیا کہ ایک بار وہ گھر کی کھپریل پر چڑھتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اُس کا سر پھٹ گیا اور سارا چہرہ خون میں ڈوب گیا تھا۔ امّاں پہلے تو اُسے دیکھ کر تھر تھر کانپتی رہیں

اور پھر چیخ مار کر زور سے رونے لگی تھیں۔ اماں اُس کے لئے ضرور روتی ہوں گی، سلطانہ بھی روتی ہوگی۔ سب اُسے یاد کرتے ہوں گے۔

وہ اُس روز گھر سے بڑا ہشاش بشاش نکلا تھا۔ ایک روز پہلے اُس کو تنخواہ ملی تھی۔ اور ابھی تک اُس کی جیب میں کچھ کم ۲۰ روپے پڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے اُس نے اپنے لئے دو سوتی بش شرٹوں کے علاوہ ایک بنیان خریدا تھا۔ ٹافیوں کا ایک چھوٹا ڈبہ اُس نے یُونہی موج میں آکر خرید لیا تھا۔ نادرہ کے لئے اُس نے پلاسٹک کے خوبصورت آویزے بھی خرید لئے تھے۔ اُن کو خریدتے وقت اُس نے سوچا تھا، یار اِس لڑکی کی بدولت کھانے کے علاوہ گرما گرم چائے بھی مل جاتی ہے۔ اس کو راضی خوش رکھنا بہت ضروری ہے۔ تمام خریداری پر اُس کے ۲۵ سے زیادہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ مگر وہ خوش تھا اور جھُوم جھُوم کر چل رہا تھا۔ لیکن سلمان کو دیکھ کر اُس کا دل افسردہ ہوگیا تھا۔ اُسے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ بار بار اُسے خیال آتا کہ وہ کراچی میں عیش کرتا پھر رہا تھا، نہ جانے سب کس حال میں ہوں گے۔ کیسے ہوں گے؟

اِسی افسُردگی کے عالم میں وہ پروفیسر کے گھر پہنچا۔ بوڑھا ملازم اپنے گھر جانے کے لئے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ نوشا نے اُسے رخصت کیا۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور زینہ طے کرتا ہؤا اُوپر چلا گیا۔ گھر میں سنّاٹا تھا۔ پروفیسر کے کمرے میں روشنی تھی۔ اور پنکھا چلنے کی تیز بھنبھناہٹ خاموشی میں اُبھر رہی تھی۔ وہ اُس طرف نہیں گیا۔ راہداری سے گزر کر اُس نے نادرہ کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ سامنے میز پر نادرہ سر جھکائے پڑھنے میں محو تھی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس کے چہرے کے خدوخال پتھر کے مجسّموں کی طرح ترشے ترشائے نظر آرہے تھے۔ ایک ایک زاویہ، ایک ایک خم اُبھر کر نمایاں ہوگیا تھا۔ کھڑکی کھُلی تھی اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اُس

کے بال بکھر کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوشا نے نظر بھر کر اُسے دیکھا۔ اور چپکے سے کمرے میں جاکر اُس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ کو اُس کے آنے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے کونے پر پلاسٹک کے آویزے رکھ دئے۔ تیز روشنی میں وہ خوب صورت نظر آنے لگے۔ نادرہ نے حیرت سے آویزے دیکھے۔ پھر گردن موڑ کر نوشا پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"تم اِتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟"

"ورکشاپ سے لوٹ کر گھر کیوں نہیں آئے؟"

اُس نے نوشا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اُس کے لہجے میں تیکھا پن تھا، چہرے پر قدرے جھنجلاہٹ تھی۔ نوشا گھبرا گیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ خاموش کھڑا ٹکر ٹکر اُس کا چہرہ تکتا رہا۔

وہ کہنے لگی "ابّا جان پندرہ بار پوچھ چکے ہیں۔ تمہیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیئے۔"

نوشا نے سوچا، یار یہ تو بُلا کی طرح چمٹ گئی۔ سالی بڑی تیز لونڈیا ہے۔ ایسے بات کرتی ہے جیسے ماں بچّے کو ڈانٹ رہی ہو۔ مگر اُس نے کچھ کہا نہیں۔ چُپ چاپ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ نادرہ نے آویزے اُلٹ پُلٹ کر دیکھے اور تیزی سے بولی۔

"یہ کیوں لے آئے؟"

نوشا پھر بھی نہ بولا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ تم نے یہ ٹاپس کیوں خریدے؟"

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ "تمہارے لئے لایا تھا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "میرے لئے"۔ اُس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"جناب عالی! میرے پاس ایک درجن سے زیادہ کانوں کے ٹاپس ہیں۔ اور ذرا آپ اپنی اِس قمیض کو دیکھئے۔ موبل آئل کے داغوں نے ہر جگہ افریقہ کے جنگلات اگا دئے ہیں۔ اور یہ آپ کی اکلوتی قمیض ہے۔"

نوشا نے فوراً کہا۔ "دو بُش شرٹیں بھی تو لایا ہوں۔" اُس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیکیٹ کھولا اور اُس کے سامنے ڈال دیا۔

نادرہ نے بُش شرٹوں کو ایک نظر دیکھا۔ آویزوں کی ڈبیا کو اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ کر بولی۔ "آئندہ کوئی ایسی چیز خرید کر نہ لانا۔ اِسے اپنے پاس رکھو۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نوشا کو اس کا یہ انداز بڑا بُرا لگا۔ اُس نے گھور کر اُسے دیکھا۔ اور آویزوں کی ڈبیا اُٹھالی۔ جب وہ جانے لگا تو نادرہ نے پوچھا۔

"تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

نوشا بے رخی سے بولا۔ "کہیں نہیں۔"

"تو پھر چلو کھانا کھا لو۔"

وہ منہ پھلا کر بولا۔ "میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ اُس وقت کسی ضدی بچے کی طرح رُوٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نادرہ نے خاموشی سے اُسے دیکھا اور کوئی بات نہیں کی۔ نوشا جھنجلایا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور تھکے تھکے قدموں سے زینہ طے کر کے نیچے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نادرہ کے رویّہ سے اُس کو تکلیف پہنچی تھی۔ وہ اُس کے لئے خوشی خوشی آویزے خرید کر لایا تھا اور اُس نے اِس حقارت سے اُن کو واپس کیا کہ وہ تلملا کر رہ گیا۔ نوشا کو اس کے رویہ سے

محسوس ہوا کہ وہ اس کو گھٹیا اور حقیر سمجھتی تھی۔ وہ فطرتاً بڑا حساس تھا۔ یہ بات کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ بہت دیر تک وہ اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نوشا پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری تھی۔ اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر اندھیرے میں ایک سایہ سا لہرایا اور اس کو اپنے سرہانے کسی کے آہستہ آہستہ سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ پھر ایک نرم نرم سا ہاتھ اس کی پیشانی پر آکر ٹک گیا۔ ساتھ ہی آواز آئی۔

"نوشا!"

یہ نادرہ تھی اور اس کو آہستہ آہستہ جھنجوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ نوشا دم بخود پڑا رہا۔ اس نے سوچا نادرہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئی تھی۔ جب نادرہ نے کئی بار جھنجوڑا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتا ہوا بولا "نادرہ"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ پوچھنے لگا "کیا بات ہے؟"

وہ بڑے نرم لہجے میں بولی "کھانا کھا لو، تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

نوشا نے اٹھ کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا کہ نادرہ کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے کھانے کی پلیٹیں پلنگ پر رکھ دیں اور خود بھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔

"جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھا لو۔"

نوشا کسی سدھے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ غسل خانے میں گیا۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اس کو خاموش دیکھ کر نادرہ بولی "لاؤ وہ

ماچس کی ڈبیا کہاں ہے ؟" نوشا نے تکیہ کے نیچے سے ڈبیہ نکال کر اُسے دے دی۔

وہ اُس کو لے کر بولی۔" دیکھو اب کوئی ایسی چیز نہ خریدنا۔ تمہیں خود ابھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔"

نوشا سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

وہ کہتی رہی۔" معلوم ہوتا ہے تم نے میری بات کا بہت بُرا مانا۔" وہ زیرِلب مسکرائی۔" میں تم کو سزا دینا چاہتی تھی۔ دیکھو نا یہ کتنی بے تکی سی بات ہے۔"

نوشا کو اس میں کوئی بے تکا پن نہ معلوم ہوا۔ اُس نے کسی قدر تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اِس طرح گردن اُٹھائے بیٹھی تھی، جیسے کوئی اُستاد اپنے شاگرد کے رُو برُو بیٹھتا ہو۔ جب نوشا کھانا کھا چکا تو وہ پلیٹیں اُٹھا کر اُوپر جانے لگی۔ نوشا نے چاہا کہ وہ اُن کو خود اُٹھا کرلے جائے تو وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی۔" خواہ مخواہ کا تکلّف مت کرو۔ تم کو صبح تڑکے ورکشاپ جانا ہے، جلدی سو جاؤ۔" وہ کھٹ پٹ کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نوشا خاموش بیٹھا لکڑی کے زینہ پر اُس کے قدموں کی آہٹ سُنتا رہا۔

یہ پہلا موقعہ نہیں تھا۔ نادرہ ہمیشہ اُس سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ عمر میں وہ لگ بھگ اس کے برابر ہی تھی مگر اُس کا رویّہ بڑوں کا سا تھا۔ بات بات پر اُس کو ڈانٹ دیتی۔ شروع شروع میں تو نوشا نے اُس کے اِس انداز کے خلاف خاموش احتجاج کرنے کی کوشش کی، مگر رفتہ رفتہ وہ اس کے اس رویّہ سے مانوس ہو تا گیا۔ وہ ہر وقت نوشا کو ہدایتیں دیتی رہی۔

" نوشا تم صبح دیر سے کیوں اُٹھتے ہو ؟"

" نوشا تمہارے دانت بہت گندے ہیں۔ دونوں وقت دانت صاف

کیا کرو۔"

"نوشا تم یہ ایکٹروں کے سے بال مت رکھا کرو۔ بالکل لوفر لگتے ہو۔"

"نوشا تم نے پھر غلط زبان بولی۔ فلاسٹیٹن قطعی مہمل لفظ ہے۔"

وہ ہر وقت اُس کو ٹوکتی رہتی، نوشا تم نے یہ نہیں کیا، نوشا تم نے وہ نہیں کیا۔

اِس ڈانٹ پھٹکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں خاصی شائستگی پیدا ہوگئی۔ اب وہ بھونڈے پن سے قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ بات کرتا تو سنبھل سنبھل کے۔ پہلے اس کی وضع قطع فلم ایکٹروں کی سی تھی۔ اب اُس نے بال چھوٹے کرا دیے تھے۔ اور پتلون کی موریاں اُلٹ کر چڑھانا چھوڑ دی تھیں۔ رات کو مزے میں آکر کبھی کبھی وہ کوئی فلمی دُھن گنگناتا تھا، اب ایسی کوئی آواز رات کو اُس کے کمرے سے نہیں اُبھرتی تھی۔

پروفیسر سے نوشا کی مُلاقات صرف ناشتہ کی میز پر ہوتی، مگر اس وقت بھی وہ اخبار پڑھنے میں ڈوبا ہوتا تھا۔ بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے اُس کا نوشا سے آمنا سامنا ہوجاتا تو اس طرح کھویا کھویا گزر جاتا کہ جیسے اُسے دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز پروفیسر کو نہ جانے کیا سُوجھی۔ اچانک نوشا کے کمرے میں آگیا اور آتے ہی بولا "میں نے ابھی ابھی سوچا کہ تم کو کسی اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیئے۔"

نوشا نے دبی زبان سے کہا "میں کارخانے جو جاتا ہوں۔"

"بہت ٹھیک بات کہی تم نے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ نائٹ اسکول کیسا رہے گا؟ مگر نائٹ اسکول تو یہاں سب واہیات ہیں۔ ایک صاحب کو میں جانتا ہوں جو رات کو نائٹ اسکول چلاتے ہیں اور دن کو فرق امینی کرتے ہیں۔ نائٹ اسکول اور فرق امینی میں قدر مشترک کیا ہے۔ یہ مسئلہ آج تک میں حل نہیں کر سکا۔ مجھے

یقین ہے کہ وہ طلبا کو تعلیم دینے کے بجائے اُن کے ذہن غرق کرتے ہوں گے۔"
اپنی بات پر وہ خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

نوشا خاموشی سے اُس کی باتیں سُنتا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا۔ "کوئی وجہ نہیں کہ تم انجینئر نہ بنو۔ مگر تعلیم کا مسئلہ مگر تعلیم کا مسئلہ۔" وہ بے خیالی میں آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ پھر چونک کر بولا۔

"تم گیراج کی ملازمت کیوں نہ چھوڑ دو؟"

نوشا نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے بولنے کا موقعہ نہ دیا۔ آہستہ سے بولا۔

"تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ کماتے رہنا چاہیئے، ورنہ زندگی بھر احساسِ کمتری میں مبتلا رہو گے۔ کچھ اور سوچنا پڑے گا۔" یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد عرصہ تک نوشا سے پروفیسر کی مُلاقات نہیں ہوئی۔ نادرہ بھی اپنے باپ کی طرح عجیب و غریب سی لڑکی تھی۔ ذرا سی بات پر اُس کی بھویں تن جاتیں۔ آنکھوں میں تیز چمک آجاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوشا جھنجھلا کر کوئی اُلٹی سیدھی سی بات کہہ دیتا تو مُسکرا کر چُپ ہو جاتی۔ ایک دن تو اُس نے کمال کر دیا۔ نوشا نے ایک شوخ رنگ کی بُش شرٹ خریدی تھی۔ اُس پر کچھ عورتوں کی چیختی چلّاتی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ اُس کو پہن کر نادرہ کے سامنے سے گزرا تو وہ کہنے لگی۔

"نوشا تمہارا مذاق بڑا گھٹیا ہے۔"

نوشا اُس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔ "کیوں، کیا ہُوا؟"

وہ بولی۔ "اِس بُش شرٹ کو پہن کر تم ٹام بوائے سے زیادہ لائف بوائے صابن کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا کو تاؤ تو بہت آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ اُس کا مذاق اُڑاتی رہی۔

"اس لباس میں تم بالکل بوفر معلوم ہوتے ہو اور وہ بھی تیسرے درجہ کے۔"

نوشا کو اس روز وہ کئی بار اسی طرح ڈانٹ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی جھنجلایا ہوا

تھا۔ جل کر بولا" تم جو یہ روزانہ اُلٹے سیدھے بال بناتی ہو اور نہ جانے کیسی اُلٹی سیدھی فراکیں پہنتی ہو تو میں نے کبھی یہ نہیں کہا تم بالکل چڑی کی بیگم لگتی ہو۔ ایک دم چڑی کی بیگم"

کہنے کو تو غصّے میں نوشا نے یہ بات کہہ دی مگر فوراً ہی سہم گیا۔ اُس نے سوچا اب شامت آ گئی مگر نادرہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی اور جب نوشا جانے لگا تو روک کر بولی۔

"معاف کرنا نوشا، مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے تھی۔ میں اپنی غلطی کی تم سے معافی چاہتی ہوں"

نوشا ہکا بکا ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا۔ اور وہ بار بار معذرت کرتی رہی۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جن سے وہ بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کی لڑکی تھی۔ البتہ اُس کی بوڑھی ماں بڑی سیدھی سادی گھریلو سی عورت تھی۔ اُس کو گٹھیا کا عارضہ تھا۔ کبھی کبھی درد گردہ کا بھی دَورہ پڑتا۔ وہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ جب نوشا پہلے پہل اِس گھر میں آیا تو اُس نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ ممکن ہے اس کے خلاف اُس نے شوہر سے شکایت بھی کی ہو۔ مگر وہ جلد ہی نوشا سے مانوس ہو گئی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ نوشا بڑی مستعدی سے اس کی خدمت کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا اُس کی پنڈلیوں پر مالش کیا کرتا۔ اُس کا سر دباتا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُس کے لئے دوائیں اور انجکشن لاتا۔

نوشا اکثر رات کا کھانا کھانے کے بعد اُس کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ سرہانے اسٹول پہ بیٹھا اُس کا سر دبایا کرتا اور گھنٹوں اُس سے باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتیں سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی ہوتی تھیں۔ اُن میں کچھ ماضی کی یادیں ہوتیں، عزیزوں اور رشتے داروں کا تذکرہ ہوتا۔ کسی کی غیبت اور کسی کی تعریف ہوتی اور شوہر کے

خلاف گلے شکوے ہوتے۔ پروفیسر سے اُس کو بہت سی شکایتیں تھیں۔ یہ بڑی معمولی سی باتیں تھیں۔ جن کو نہ کبھی پروفیسر سنتا تھا اور نہ نادرہ توجہ دیتی تھی۔ نوشا ہی گھر بھر میں ایک ایسا فرد تھا جو سب کچھ چُپ چاپ بیٹھا سُنا کرتا اور اسی لئے نادرہ کی ماں کو اب وہ بڑا اچھا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ کمرے سے اُٹھ کر جاتا تو وہ بڑی بوڑھیوں کی طرح اُس کو دیر تک دُعائیں دیتی رہتی۔

نوشا اب پروفیسر کے کنبے کا ایک فرد بن چکا تھا۔ شروع شروع میں نوشا جو جھجک محسوس کرتا تھا، اب ختم ہو چکی تھی۔ کبھی کھانے میں دیر ہو جاتی تو وہ بڑی بے تکلفی سے غلام گردش میں آواز لگاتا نظر آتا "بھئی آج تو شہر بھر کے سب چوہے میرے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور خوب اُودھم مچا رہے ہیں۔"

اسی طرح جب اُس کی قمیصوں کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر سوار ہو کر اُس کو ٹھیک کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا، کبھی ناراض ہوتا اور اپنا کام کروائے بغیر نہ ٹلتا۔ البتہ وہ پروفیسر کلیم اللہ کو اب تک نہیں سمجھ سکا تھا، وہ پہلے بھی اُس کے لئے معمّہ تھا اور اب بھی معمہ تھا۔ وہ ہر بات قسطوں میں کرتا تھا۔ نوشا کے لئے گفتگو کی یہ تکنیک قطعی اجنبی تھی۔ وہ صرف اُس یہ جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ کم از کم اُس کے لئے تو وہ فرشتۂ رحمت سے کم نہ تھا۔

وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محلّہ کے ایک شخص نے جو سرکاری دفتر میں کلرک تھا، کسی بات پر نوشا کے سامنے پروفیسر کو اُلّو کا پٹھا کہہ دیا۔ نوشا نے ایک لمحہ بھی انتظار نہ کیا۔ تابڑ توڑ اُس کے جبڑے پر کئی مکّے رسید کر دئے۔ اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ پاس پڑوس میں کھلبلی مچ گئی۔ خاصہ ہنگامہ ہوا۔

بات پروفیسر تک پہنچی۔ اُس نے فوراً اُس شخص کے پاس جا کر معافی مانگی

اور دس روپے اصرار کر کے تاوان دیا۔ نوشا ڈرا کہ اب وہ اس پر ناراض ہوگا۔ مگر اُس نے نوشا سے صرف اس قدر کہا: "تمہارے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ تمہیں انجینئر کی بجائے فوجی بننا چاہیئے۔ مجھے تمہاری اسپرٹ پسند آئی۔"
وہ دیر تک اُس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دیتا رہا۔

(۳)

موسم گرما کی ایک سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف بگولے منڈلا رہے تھے۔ غبار کی دُھند میں ڈھکی ہوئی عمارتیں اُونگھتی نظر آ رہی تھیں۔ سلطانہ کمرے کے اندر تھکی ہوئی سی لیٹی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ بہت ہلکا لباس پہنے تھی۔ اس کے برہنہ بازو تکیہ پر جھول رہے تھے۔ چہرے پر گہری زردی تھی اور آنکھیں دُھلی دُھلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

مہینہ بھر تک اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے ہفتے واپس آئی تھی۔ اُس کے برابر ہی پلنے میں ایک ننھا سا بچہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ یہ اُس کا بچہ تھا۔ اُس کا چہرہ نیاز کی طرح چوڑا تھا۔ ناک کے نتھنے اُبھرے ہوئے تھے، اور دہانہ بڑا تھا۔ اِس بچے کی پیدائش میں وہ تین روز تک موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی وہ رات کے ۴ بجے پیدا ہوا تھا۔ اُس روز شام ہی سے سلطانہ کی حالت غیر تھی۔ اُس پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ۱۲ بجے تک اُس کی نبضیں ڈوبنے لگی تھیں۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اور چہرے پر سیاہی منڈلانے لگی۔

اُس کی یہ حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے گھبرا کر نیاز کو ٹیلی فون کیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس رات اُس نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ بدہوش پڑا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے ٹیلیفون اُٹھایا اور یہ کہہ کر رسیور رکھ دیا کہ وہ صبح سے پہلے اسپتال نہیں آ سکتا۔

نرس نے کئی بار نمبر ملایا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی مگر نیاز ایسا کروٹ بدل کر سویا کہ پھر اُس کی آنکھ ہی نہ کھلی۔

چار بجے تک سلطانہ پر نزع کی حالت طاری رہی۔ بچّے کی پیدائش کے بعد بھی اُس کو ہوش نہیں آیا تھا۔ اُس کے جسم میں خون داخل کیا گیا۔ نیاز آٹھ بجے صبح اسپتال پہنچا۔ بچّے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا۔ اُس کا اصرار تھا کہ وہ مریضہ کے پاس جاکر بچّے کو ایک نظر دیکھ لے۔ مگر اُسے گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ تمام وقت وارڈ کے باہر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب نرس نے بچہ لاکر دکھایا تو اُس نے جھک کر بچّے کو بے ساختہ چوم لیا۔

جب تک سلطانہ اسپتال میں رہی، وہ پابندی سے اُس کو دیکھنے جاتا۔ دن میں کئی کئی بار ٹیلیفون کرتا اور ہر بار بچّے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور پوچھتا۔ اس کو اپنے بچّے سے بے حد پیار تھا۔ کوٹھی میں واپس آکر سلطانہ نے دیکھا کہ نیاز نے بچّے کے لئے ڈھیروں کھلونے لاکر اکٹھا کر دئے تھے۔ صبح اُٹھنے کے ساتھ ہی وہ سلطانہ کے کمرے میں آتا۔ بچّے کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور دیر تک اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ رات کو واپس آتا تو ایک بار بچّے کو ضرور پیار کرتا۔ اگر وہ جاگتا ہوتا تو پالنے کے قریب بیٹھ کر عجیب و غریب آوازیں نکال کر اُس کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔

سلطانہ خوش تھی کہ نیاز بچّے سے اِس قدر پیار کرتا تھا۔ وہ خود بھی اُسے بہت چاہتی تھی۔ اُس نے اپنی جان کی بازی لگاکر اُس کو جنم دیا تھا۔ حالاں کہ بچّے کی پیدائش سے پہلے اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ اُسے ماں کی مامتا نہ دے سکے گی۔ سلطانہ کو اُس کے احساس ہی سے نفرت ہوتی تھی۔ ایک روز جب اُس پر یہ راز افشا ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو تمام دن روتی رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس کی نفرت بڑھتی گئی۔ وہ جل کر کبھی کبھی اُس کو کوسنے لگتی۔ "یا اللہ!

یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مرجائے"۔ اسی کوفت میں وہ بیمار ہوگئی۔ جسم لاغر پڑ گیا۔ ان دنوں وہ ذرا ذرا سی بات پر نیاز کو جھڑک دیتی۔ بلیوں کی طرح غرا کر اُس پر آنکھیں نکالتی اور گھنٹوں بند کمرے میں بیٹھی رویا کرتی۔ یوں بھی اُس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا تھا۔ وہ بہت ہی کم باہر نکلتی۔ گھر کے نوکروں تک کے سامنے آتے ہوئے خوف معلوم ہوتا۔

اُس نے سوچا تھا کہ پیدائش کے فوراً ہی بعد بچّے کا گلا گھونٹ کر چپکے سے اُسے ختم کر دے گی۔ اور اب اُس کی یہ حالت تھی کہ اُس کو دیکھ کر جی رہی تھی۔ وہ ہر وقت بچّے ہی کے کسی نہ کسی کام میں منہمک رہتی۔ اُسی کی بدولت وہ اب نیاز میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ورنہ اُس نے ہمیشہ نیاز کی قربت سے بیزاری محسوس کی تھی۔ وہ اُس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ کبھی بولتی بھی تو اُس میں تلخی ہوتی، حقارت ہوتی اور دبی دبی سی نفرت۔ مگر اب یہ ہوتا کہ نیاز جب صبح ہی صبح بچّے کو دیکھنے اُس کے کمرے میں آتا تو وہ دیر تک نیاز کے پہلو میں بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ سلطانہ، نیاز سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور بچّہ اُن کے تعلقات کے درمیان ایک مضبوط کڑی بن گیا تھا۔

گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ در و دیوار انگاروں کی طرح تپتے باہر احاطے میں خشک پتّے دن بھر کھڑکھڑاتے۔ ایک روز بڑی زور کی آندھی آئی۔ آسمان کا رنگ سُرخ پڑ گیا۔ درختوں کی شاخیں چیخ چیخ کر جھُولنے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن ٹوٹنے لگے۔ آندھی کا زور ٹوٹا تو موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

اس طوفان سے بڑا نقصان ہُوا۔ بجلی کے تار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے شام کا وقت تھا۔ سارا شہر تاریکی میں لپٹا ہُوا کسی کھنڈر کی طرح ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ تیز بارش سے جہاں اور بہت سا نقصان ہُوا، اس میں میونسپلٹی کا نیا مارکیٹ بھی شامل تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ نیچے بازار تھا۔ اُوپر کی منزل میں رہائشی

فلیٹ تھے۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور عمارت کے ایک حصہ کی چھت ٹوٹ کر نیچے آ گئی۔ کئی دیواریں شق ہو کر منہدم ہو گئیں۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اُوپر فلیٹوں میں رہنے والوں میں سے کئی خاندان پورے کے پورے زندہ درگور ہو گئے۔ بڑا بُرا وقت تھا۔ گہرا اندھیرا پھیلا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ فائر بریگیڈ والے رات بھر ملبے سے زخمیوں کو نکالتے رہے۔ بارہ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے۔ جن میں ۵ بچوں اور ۷ عورتوں کی لاشیں تھیں۔ ۵۵ زخمیوں کو نکال کر اسپتال پہنچایا گیا۔ بعض کی حالت بہت نازک تھی۔

دوسرے دن اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا۔ اداریوں میں اس المناک سانحہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا اور میونسپلٹی کے ذمہ دار حکام کے خلاف سخت اعتراضات کئے گئے۔

میونسپلٹی میں ایک گروپ خان بہادر کے مخالفین کا بھی تھا۔ اُنہوں نے اس حادثہ کی آڑ لے کر ایسے بیانات جاری کئے، جن میں خان بہادر پر بحیثیت چیئرمین بہت سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ شام کو شہریوں کی جانب سے احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ بعض مقررین نے کھلم کھلا نیاز کا نام لیا۔ اس لئے کہ مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکیدار وہی تھا۔ کمشنر نے احتجاج سے مرعوب ہو کر اسپیشل پولیس کے سینئر افسر کی نگرانی میں فوراً تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔

خان بہادر پہلے ہی کیا کم پریشان تھا، اس اطلاع نے اُس کو اور سراسیمہ کر دیا۔ معاملہ اب اور سنگین ہو گیا تھا اور مخالفین تلے ہوئے تھے کہ اُس کو جیل بھجوائے بغیر نہ رہیں گے۔ لہٰذا خان بہادر نے میونسپلٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ساری ذمہ داری نیاز پر ڈال دی۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک اُس کے خلاف کارگر نہ ہو سکی۔ مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔

میونسپلٹی کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف متوجہ

ہُوا۔ جو پولیس افسر اس کا نگران مقرر ہُوا تھا، اُس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ معلوم ہُوا کہ وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا تھا۔ خان بہادر نے یہ بات سُنی تو ہاتھ اُونچا کر کے بولا۔

"بس اب کام بن گیا"

دوسرے ہی دن خان بہادر اُس افسر سے ملا۔ آدمی تجربہ کار تھا۔ اُس کی باتوں سے تھوڑی ہی دیر میں خان بہادر کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ بن سکتا تھا۔ اُس نے ۲۰ ہزار روپے مخمل کی ڈبیہ میں رکھ کر اُس کو "نذرانہ" دیا۔ اور بقول شخصے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا اپنے گھر چلا آیا۔

تحقیقات ہوتی رہی۔ خان بہادر حسب معمول روزانہ شام کو وہسکی کے تین چار پیگ چڑھاتا اور رات گئے تک رمی کھیلتا رہتا۔ البتہ نیاز کی آمد و رفت اُس نے اپنے یہاں بالکل بند کرا دی اور یہ مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے شہر سے باہر چلا جائے۔ نیاز پہلے تو اس کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر اس کی سمجھ میں خود ہی یہ بات آ گئی کہ غیر حاضری سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہو گا۔ لہٰذا اُس نے فرار ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

نیاز کے لئے یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا۔ دوڑ دوڑ کے اُن ٹھیکے داروں کے پاس جاتا، جن کے ذریعہ اُس نے مارکیٹ بنوائی تھی۔ گھر میں جتنی دیر رہتا کھویا کھویا سا بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہتا۔ اکثر رات گئے بستر سے اُٹھ کر سلطانہ کے پاس آتا، اور اُس سے اُوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا۔

ایک رات وہ سلطانہ کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بچّہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ ہمک ہمک کر نیاز کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن نیاز بڑا افسردہ تھا۔ سلطانہ کہنے لگی "اپنی

پریشانی میں آپ نے ننھے کو بھی بھلا دیا۔ دیکھئے تو آپ کو کس طرح دیکھ رہا ہے۔"

نیاز نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کا رُخسار چوم کر بولا "بیٹیا تمہارے باپ کو سزا ہو گئی تو پھر تم کس کے ساتھ کھیلو گے۔"

سلطانہ نے فوراً کہا "آپ پر تو آج کل یہی بھوت سوار ہے۔"

نیاز مسکرا کر چُپ ہو گیا۔ سلطانہ کچھ اور کہنے ہی جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ نیاز نے بچہ کو سلطانہ کی گود میں دیا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ برساتی میں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ایک انسپکٹر اور کئی مسلح کانسٹیبل دروازے پر موجود تھے۔ وہ نیاز کا وارنٹ لے کر آئے تھے۔ اُنہوں نے اُس کو اُسی وقت حراست میں لے لیا اور گاڑی میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔

اِس بات کی اطلاع خان بہادر کو ملی تو وہ گھبرا گیا۔ اُس نے جو اسکیم تیار کی تھی، اُس میں نیاز کی گرفتاری کے پہلو کو نظر کر دیا گیا تھا۔ خطرہ یہ درپیش تھا کہ مارکیٹ کے ٹھیکے سے جو منافع ہوا تھا، اُس میں سے اسّی ہزار خان بہادر کے حصّے میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اُس نے شیشہ کا جو کارخانہ تعمیر کرایا تھا، اُس کے لئے سیمنٹ اور لوہا بھی مارکیٹ ہی کے کوٹے سے گیا تھا۔ یہ سارا کام نیاز کے ذریعہ ہوا تھا۔ اُس نے سوچا نیاز کہیں گھبرا کر سب کچھ صاف صاف نہ کہہ دے۔ ایسی صورت میں اُس کے پھنس جانے کا قطعی امکان تھا۔

پہلی بار خان بہادر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل کترانے کے بجائے اُسے نیاز کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہیئے۔ بہر حال اب جو کچھ ہو چکا تھا، اُس کا تدارک ضروری تھا۔ چنانچہ چند ہی روز بعد اُس نے دوڑ دھوپ کر کے نیاز کو ضمانت پر رہا کرا لیا۔

دوسرے مہینے تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ گورنمنٹ کو دے دی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مارکیٹ کی تعمیر میں جو سامان استعمال کیا گیا تھا وہ بہت

گھٹیا قسم کا تھا۔ دیواروں کی چنائی میں سیمنٹ کا تناسب بہت کم تھا۔ اس کی کو ریت اور مٹی سے پورا کیا گیا تھا۔ چھتوں میں کنکریٹ برائے نام ڈالی گئی تھی، اور لوہا ضرورت سے بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ اسی طرح عمارت کی بنیادیں بھی بہت کمزور اور کم گہری تھیں۔ یہ سارے الزامات نیاز کے خلاف تھے۔

تحقیقاتی کمیٹی نے حکومت سے پُرزور سفارش کی تھی کہ ٹھیکیدار کو سخت سزا دی جائے۔ اُس کی بدعنوانیوں کے باعث ۱۲ شہریوں کی قیمتی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ ۷ افراد اپنے جسموں کے اکثر اعضا ضائع کر کے اپاہج ہو گئے اور لاکھوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔

رپورٹ میں جگہ جگہ نیاز کے خلاف، ٹھیکیدار کی حیثیت سے سخت الزامات لگائے گئے تھے۔ اُس کو ہر طرح ایک خطرناک مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گو کہ یہ رپورٹ ہنوز ریلیز نہیں کی گئی تھی مگر خان بہادر کو اُس کی ایک نقل مل گئی تھی۔ نقل کے ملتے ہی وہ بدحواس ہو گیا۔ اب نیاز اُس کو اپنی سلامتی کے لئے بے حد خطرناک نظر آنے لگا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ معاملہ عدالت کے رُو برُو بھی جائے گا۔ اور وہاں نیاز کا بیان بھی لیا جائے گا۔

بہت کچھ سوچنے کے بعد خان بہادر کے ذہن میں ایک ہی تجویز آئی اور وہ تھی نیاز کے قتل کی سازش۔ نیاز کو قتل کئے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ اس کی موجودگی میں خان بہادر کو ہر وقت خطرہ درپیش تھا۔ وہ اُس کے خلاف سارے ثبوت مہیا کر سکتا تھا۔

اس سازش کا وہ پورا خاکہ تیار کر چکا تھا۔ اُسے صرف ایک شخص کا انتظار تھا، جو ان دنوں راولپنڈی میں تھا۔ اور جلد ہی آنے والا تھا۔

(۴)

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر گھٹا چھائی تھی۔ کمرے کے اندر نرم نرم بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے، جن میں برسات کے پہلے چھینٹے کی مہک تھی۔ نادرہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ لکھ رہی تھی۔ اُس کے برابر ہی نوشا بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے ابتدائی کلاسوں کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی۔ گزشتہ چند ہفتوں سے وہ باقاعدگی کے ساتھ نادرہ کی نگرانی میں پڑھ رہا تھا۔

نادرہ نے لکھتے لکھتے فاؤنٹین پن اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی۔ ٹیبل لیمپ کی گہری نیلگوں روشنی میں اُس کے جسم پر لہروں کا مدو جزر پھیلتا چلا گیا۔ نادرہ ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر دریچے پر اُٹھ کر چلی گئی۔

نوشا مکتب کے کسی طالب علم کی طرح جھُوم جھُوم کر پڑھ رہا تھا۔ اُس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ ذرا بعد نادرہ کی آواز اُبھری۔

"نوشا یہاں آؤ"۔

وہ چُپ چاپ دریچہ پر جا کر اُس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش کھڑی رہی۔ سامنے حدِّ نظر تک روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ اُونچی اُونچی عمارتوں کے جھلکتے ہوئے دریچوں نے چراغاں کر دیا تھا۔ رم جھم، رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ دُور اُفق پر بار بار بجلی کڑک رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے پھلکے جھونکوں سے نادرہ کے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر رخسار پر لہرا رہی تھی۔ چند منٹ بعد نادرہ نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آج رات بھر بارش ہو گی"۔

نوشا نے مختصر جواب دیا "ہاں"

اچانک نادرہ نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔ "نوشا تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے۔"

"نہیں" اُس نے اِنکار میں گردن ہلائی۔

"تم سخت بور معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ننھی ننھی بوندوں کی جھالر روشنی کے پس منظر میں لہراتی رہی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ نادرہ کا جسم بار بار تھرتھرا کے رہ جاتا۔ وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔ اُس نے نوشا کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

"تم نے کسی لڑکی کے ہونٹوں کو چُوما ہے؟"

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ نوشا کو اُس کی بات عجیب معلوم ہوئی۔ شرما کر بولا۔ "نہیں"

اِس دفعہ نادرہ نے گھوم کر اُس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "سچ؟"

نادرہ کی نظریں نوشا کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اُس نے اُلجھی ہوئی آواز سے کہا۔

"نوشا!"

اور نوشا نے بے اختیار اُس کے لبوں کو چوم لیا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا بوسہ تھا۔ گرم اور طویل۔ اُس کی لذت بڑی ہولناک تھی۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ اُس کا دل خوف سے ریل کے اِنجن کی طرح دھڑک رہا تھا۔

عین اُس وقت کمرے میں کسی کے کھنکھارنے کی آواز سُنائی دی۔ نوشا نے گردن پیچھے ہٹالی۔ پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔ عینک کے

موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی گول گول آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ گردن اُونچی کئے باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ نوشا اُس کو دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا۔ اُس نے نظریں نیچی کرلیں۔ پروفیسر نے اُنگلی کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بُلایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

نوشا اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینہ کی سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آگئے۔ پروفیسر نوشا کے کمرے کا دروازہ تھام کر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ "قطعی ناقابل برداشت۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ انسانی ہمدردی کا بے جا استعمال ہے۔" اچانک وہ زور سے چیخا۔

"کیا سمجھے تُم؟"

نوشا سر جھکائے مُجرموں کی طرح کھڑا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا "مسٹر تم اس کمرے کو فوراً خالی کردو۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ تم کو وقت نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ دہلیز کے بیچوں بیچ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔ نوشا ہکا بکا کھڑا اُس کا منہ تک رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

پروفیسر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو، جیب کترے ہو، اُٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خطِ مستقیم ہے اور تم خطِ منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی التناسب سمجھتے ہو؟"

نوشا ہونقوں کی طرح خاموش کھڑا اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر زور سے چیخا، "میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ تین منٹ ختم ہو چکے ہیں۔ پانچویں منٹ پر تمہارا ایک قدم اس گھر کے باہر ہونا چاہیئے۔ اپنا سامان پیک کرو۔ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

نوشا نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنا سامان ایک چادر میں باندھا اور گٹھڑی اُٹھا کر بغل میں دبالی۔ پروفیسر نے معائنہ کرنے والے انسپکٹر کی طرح نوشا کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور اُونچی آواز سے بولا۔

"بالکل ٹھیک۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

نوشا کمرے سے باہر نکلا۔ پروفیسر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ گھر کا صدر دروازہ کھولا۔ نوشا سہما ہُوا باہر چلا گیا۔ پھر اُس نے دروازے کا بولٹ چڑھانے کی آواز سُنی۔ اندر راہداری میں قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھری۔ چوبی زینہ پر کھٹ کھٹ کا شور ہُوا۔ پروفیسر اُوپر جا رہا تھا۔

نوشا دروازے کے باہر کھڑا، ایک ایک آواز، ایک ایک آہٹ سُنتا رہا، ابھی تک بُوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اُسے رہ رہ کر پروفیسر پر غصہ آ رہا تھا۔ سالا بالکل اُلّو کا پٹھا ہے۔ ایک دم سنکی ہے نہ جانے کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

لیکن اس گھر سے نکلنے کا اُسے بہت افسوس تھا۔ کئی سال بعد اُسے گھریلو ماحول ملا تھا۔ جہاں وہ خوش تھا مطمئن تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اسکول میں پڑھنا شروع کر دے گا۔ بغل میں موٹی موٹی کتابیں دبا کر ٹھاٹھ سے پڑھنے جائے گا۔ پھر وہ میٹرک کا امتحان پاس کرے گا۔ نادرہ نے یہی کہا تھا۔ مگر اس سالی نے تو اپنا ڈبّا ہی گول کر دیا۔ وہ اس پر جھنجلا بھی اور وہ اُس کو یاد بھی آئی۔ وہ چھریرے جسم کی نازک اور دلکش لڑکی، جو اُس کو بات بات پر ڈانٹتی تھی اور جس کے ناراض ہونے میں

اُس کو مزا آتا تھا۔ اب تو وہ اُس کو دیکھ بھی نہ سکے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ پھر بڑی بے چارگی کے عالم میں اُس نے سوچا کہ وہ کراچی چھوڑ دے گا۔ سیدھا امّاں کے پاس جائے گا۔ سب سالا کھٹراگ ہے۔ بس اب گھر چلنا چاہیئے۔ اسی وقت اُس نے طے کیا کہ وہ سویرے کی ٹرین سے کراچی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔

بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، اور رات سر پر کھڑی تھی۔ نوشا نے اسٹیشن کے مسافر خانے میں رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ معاً اُس کو راجہ یاد آگیا۔ اُس نے سوچا چلتے چلتے اُس سے بھی مل لینا چاہیئے۔ جانے اب اُس سے کبھی مُلاقات ہو بھی کہ نہیں۔

پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہونے سے اُس کو وحشت ہو رہی تھی۔ لہٰذا کپڑوں کی گٹھڑی سر پہ رکھ کر وہ بارش میں سڑک پر چل دیا۔ جب وہ راجہ کے پاس پہنچا تو رات سنسان پڑ چکی تھی۔ راجہ ایک کونے میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ قریب ہی ایک کتّا لیٹا تھا۔ ترپال سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اندر کیچڑ تھی، بدبو تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ نوشا ٹھٹک کر باہر ہی رُک گیا۔ اندھیرے میں اُس کو کچھ بھی سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتّا غرّا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی راجہ کی آواز اُبھری۔

"کون ہے؟"

نوشا نے بے تکلفی سے کہا "ارے یار میں ہوں نوشا۔ یہ یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔"

راجہ بوجھل لہجے کے ساتھ بولا "ابے اپنی تو قسمت ہی میں اندھیرا ہے۔ آ اندر آ جا۔"

نوشا گردن جھکا کر اندر داخل ہُوا تو اُس کے نتھنوں پر تیز بُو نے

اچانک حملہ کر دیا۔ وہ چُپ چاپ جا کر راجہ کے قریب بیٹھ گیا۔ راجہ نے پوچھا۔
"اِس وقت بارش میں کیسے آ گیا؟"

نوشا نے جواب دیا "میں صبح کی ٹرین سے گھر جا رہا ہوں"۔

"سچ؟" راجہ کو یقین نہ آیا۔ اصرار کر کے پُوچھنے لگا "یار ٹھیک ٹھیک بتا"۔

"ابے میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں"۔

"مگر تُو تو کہتا تھا کہ میں نے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اسکول میں نام لکھوانے والا ہوں۔ میٹرک کا امتحان دوں گا۔ یہ کروں گا، وہ کروں گا، وہ سارا پروگرام کیا ہو گیا"۔

"بات تو کچھ ایسی ہی تھی، پر یار اپنی سالی تقدیر ہی کھوٹی ہے"۔

اُس کی بات سُن کر راجہ گنگنانے لگا۔

تقدیر بنی، بن کر بگڑی، دُنیا نے ہمیں برباد کیا

نوشا بیزاری سے بولا "ابے بند کر اپنی یہ بھیرویں۔ میں بات کر رہا ہوں اور تجھے گلے بازی کی سُوجھی ہے۔ سالے تجھے کبھی عقل نہ آئی"۔

راجہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا "یار یوں ہی دل خوش کر لیتے ہیں۔ تُو آ گیا تو ذرا بات چیت بھی کر لی۔ ورنہ شام سے اکیلا پڑا ہوں۔ بُخار بھی ہو رہا ہے"۔

راجہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا نے اُس کے ماتھے کو چھُو کر دیکھا۔ وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ راجہ کے سارے کپڑے بارش کی بوچھار سے بھیگ گئے تھے۔ وہ اُس وقت دھوبی کی ناند میں پڑے ہوئے گیلے کپڑوں کی پوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

"ابے تُو نے کچھ کھایا پیا بھی؟" نوشا نے پوچھا۔

راجہ نے جواب دیا "نہیں، بھُوک ہی نہیں لگی"۔

"اچھا لے ایک سگرٹ تو پی"۔

"یار نوشا کیا بات کہی تُو نے قسم اللہ کی دل خوش کر دیا۔"

دونوں نے سگریٹیں سُلگائیں اور لمبے لمبے کش لگانے لگے۔ بارش کے قطرے ترپال پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ہوا سرد تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نوشا نے دیوار سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ راجہ پر بھی نیند کی غنودگی طاری ہو گئی۔ دونوں تھک کر سو گئے۔

رات کے پچھلے پہر نوشا کی آنکھ کھُل گئی۔ کُتّا بارش سے بھیگ کر کوں، کوں کرتا ہوا اُس کی ٹانگوں کے اندر گھُس گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور کتّے کو گالیاں دینے لگا۔

"مار دیا سالے نے۔"

راجہ بھی اُس کی آواز سُن کر جاگ اُٹھا۔ پُوچھنے لگا۔ "ابے کیا ہو گیا؟"

نوشا جل کر بولا۔ "ہو کیا گیا۔ یہ سالا تیرا کتّا ہے۔ حرامی پن کر رہا ہے۔ تُو نے بھی کیا کھٹراک رکھ چھوڑا ہے۔"

راجہ بڑے افسُردہ لہجے میں بولا۔ "یار آدمیوں کا ساتھ چھُوٹ گیا تو اب جانوروں سے بھی دوستی نہ کروں۔" اُس کے لہجہ میں بلا کا کرب تھا۔ نوشا کانپ اُٹھا۔

مینہ برسنا بند ہو گیا تھا۔ آسمان شفاف نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ نوشا کہنے لگا۔

"سویرا ہونے والا ہے۔ میں اسٹیشن چلوں گا۔"

راجہ نے فوراً کہا۔ "ابے چلا جانا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔"

نوشا کے پاس ۳۰ روپے اور کچھ ریزگاری موجود تھی۔ اُس نے خاموشی سے جیب کے اندر سے ۵ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور راجہ کو دیتے ہوئے

بولا۔

"لے یہ پانچ روپے رکھ لے۔"

"نہیں یار میں تیرے روپے نہیں لوں گا۔ میرا تو کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ تُو اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ خالی ہاتھ جائے گا تو سب کیا کہیں گے؟"

نوشا اصرار کرنے لگا مگر راجہ نے نوٹ نہیں لیا۔ کہنے لگا "تُو مجھے بس ایک سگرٹ پلا دے۔ گلا سُوکھ رہا ہے۔"

دونوں نے ایک ایک سگرٹ سلگائی۔ تمباکو کا دھواں ہر طرف بکھر گیا۔ راجہ نے سرہانے سے ٹٹول کر بڑا سا ایک چاقو نکالا۔ نوشا کی طرف بڑھا کر بولا۔

"لے تُو اسے رکھ لے۔ کچھ کام ہی دے جائے گا۔ میرے لئے تو اب یہ بیکار ہو گیا ہے۔"

نوشا نے فوراً کہا۔ "میں نے چاقو واقو رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کو تُو اپنے ہی پاس رکھ۔"

"اچھا تُو اسے میری نشانی ہی سمجھ کر رکھ لے۔" اُس کی آواز دردناک ہو گئی۔ آہستہ سے بولا۔ "میرے پاس رہے گا تو ڈر ہے کہ کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یار سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ تُف ہے ایسے جینے پر۔"

نوشا نے چاقو لے کر چُپ چاپ اپنے پاس رکھ لیا۔ راجہ کے چہرے کو دیکھا جو صبح کاذب کی دُھندلی روشنی میں بڑا خوفناک نظر آ رہا تھا۔ راجہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ وہ بار بار زخموں کی تکلیف سے کراہنے لگتا۔ آخر جب نوشا اُٹھ کر جانے لگا تو راجہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اِس دُنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرّا گئی۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ اُس نے نوشا کے ہاتھ کو مضبوطی سے دبوچ لیا۔ اُس پر اپنا منہ رکھ کر کہنے لگا۔ "نوشا خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے اللہ میرا کوئی نہیں رہا۔" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ نوشا کا دل بھر آیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر راجہ کے چہرے پر گرنے لگے۔

دونوں کچھ دیر اِسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں اُبھرتی رہیں۔ پھر راجہ نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نوشا سے کہا۔

"جا یار تجھے دیر ہو رہی ہے۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

نوشا نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور راجہ کو دے دیا۔ اُس نے اپنی گٹھڑی اُٹھائی اور باہر جانے لگا۔ باہر آکر اُس نے مُڑ کر راجہ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ نوشا کو رُکتے دیکھ کر وہ بولا۔ "یار اب تو جا۔ کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے اُس کو کھانسی کا دَورہ پڑا، اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا بڑھ کر سڑک پر آگیا۔ دُور تک راجہ کے کھانسنے کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچتی رہی۔

جب وہ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اُس نے ٹکٹ خریدا اور تیسرے درجے کے ایک ڈبّے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں دیر تھی مگر مسافروں کی ریل پیل شروع ہو گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ

ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ اور نوشا ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا اُسے اپنا شہر یاد آرہا تھا۔ اپنا محلہ اور محلہ کی وہ گلی، جس کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین تھی۔ جہاں راتوں کو سب لڑکے مل کر کھیلتے تھے، اودھم مچاتے تھے۔ محلّہ کی نیچی نیچی دیواروں والے وہ مکان، جن میں اُس کا بھی گھر تھا اور پھر اماں، سلطانہ اور انو۔ نہ جانے سب لوگ اب کیسے ہوں گے۔ اُس کو دیکھ کر اب کیا کہیں گے۔ ایک کے بعد دوسرا خیال، ایک یاد کے بعد دوسری یاد۔ خیالات کا سلسلہ تھا جو پھیلتا جا رہا تھا۔ ٹرین آہنی پٹڑیوں پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اور نوشا یادوں کی بھول بھلیوں میں اُلجھا ہُوا تھا۔

جس وقت وہ ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اُترا، ایک پہر رات گزُر چکی تھی۔ اُس نے خاموشی سے پلیٹ فارم طے کیا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آگیا۔ ایک رکشا والے کی جانب بڑھتے ہوئے شبہ ہُوا کہ اُس نے کہیں اُس کو دیکھا ضرور ہے۔ وہ دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

رکشا والے نے بھی غور سے دیکھا اور چیخ کر بے اختیار اُس کے گلے سے چمٹ گیا۔

"ابے نوشے تُو آگیا؟"

وہ شامی تھا۔ اُس سے مل کر نوشا کو بڑی خوشی ہوئی۔ پُوچھنے لگا۔ "ابے یہ دھندا تُونے کب سے شروع کر دیا؟"

وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔ "یار ابا کے مرنے کے بعد تو سالی مصیبتوں نے اپنا گھر دیکھ لیا۔"

"ابے تیرے ابا کا انتقال ہو گیا۔ کب؟"

"یار اُن کو مرے ہوئے یہ تیسرا سال ہے۔"

نوشا نے پوچھا "دکان بھی تو تھی تیری؟"

"وہ تو ابّا کی بیماری کے زمانے ہی میں بیچ دی تھی" شامی اپنی پریشانیاں سُنانے لگا۔ وہ صبح کے وقت اب بھی اخبار بیچتا تھا اور رات کو سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ گھر میں سات کھانے والے تھے اور اُن سب کا بوجھ تنہا اُس کے کندھوں پر تھا۔ اُس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ بات کرتے ہوئے بار بار کھانستا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اُس نے نوشا سے پوچھا۔

"مگر اس وقت تم جاؤ گے کہاں؟"

نوشا کو اُس کے سوال پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ کہنے لگا "گھر جاؤں گا اور کہاں؟"

اُس نے جلدی سے پوچھا "کونسا گھر؟"

نوشا گھبرا گیا "ابے کیا اُڑا رہا ہے۔ اپنے گھر جاؤں گا۔ وہی گلی والا گھر اور میرا کونسا گھر ہے"

شامی نے گردن نیچی کر لی اور آہستہ سے بولا "تو یار تجھ کو کچھ بھی پتہ نہیں؟"

نوشا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے صرف ایک لفظ کہا "کیا؟"

شامی بولا "اس گھر میں تو حاجی رحیم بخش رہتے ہیں"

نوشا نے گھبرا کر کہا "اور میری امّاں؟"

شامی نے جھجکتے ہوئے کہا "اُن کا تو دو سال ہوئے انتقال ہو گیا"

نوشا کے سینہ پر زبردست گھونسا لگا۔ وہ شامی کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ دیر تک اُس کی سسکیاں اُبھرتی رہیں۔ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا "میری بڑی بہن اور ابّو کہاں ہیں؟"

شامی نے چاہا کہ وہ اِس موضوع کو ٹال دے۔ کہنے لگا "تمہارے جانے کے بعد تو گھر میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ اب تم میرے ساتھ گھر چل کر بیٹھو تو اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گا۔ بڑی لمبی داستان ہے۔"

نوشا نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا "یار کچھ تو بتا دے۔ تُو نے مجھے یہ خبر بتا کر بے موت مار دیا ہے۔ ہائے اماں تم کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔"

نوشا پھر منہ بسُور کر رونے لگا۔ شامی نے کہا "اچھا اب تم رکشا پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو راستے میں بتا دوں گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برسنے لگا تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

نوشا رکشا پر سوار ہو گیا۔ شامی نے پیڈل پر پیر مارا۔ رکشا آگے روانہ ہُوا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد نوشا نے اپنا سوال دُہرایا "یار یہ تو بتا دے کہ سلطانہ اور انّو کہاں ہیں؟"

"انّو کی نہ پُوچھ۔ اُس سالے نے تو ناک کٹوا دی۔"

"کیوں؟" نوشا نے چونک کر پُوچھا۔

"سالا ہیجڑوں کے ساتھ رہتا ہے۔ روزانہ شام کو خوب پوڈر وَوڈر لگا کر اُن کے ساتھ بازار میں گھُومتا ہے۔ پھٹا پھٹ تالیاں بجاتا ہے۔ عورتوں کی طرح اِٹھلا اِٹھلا کر کمر لچکاتا ہے۔ اُس کو ذرا بھی غیرت نہیں آتی۔ یار بُرا نہ ماننا، میرا بھائی ہوتا تو سالے کے چار ٹکڑے کر کے ڈال دیتا۔ اُس نے تو ذلالت کی حد کر دی۔"

نوشا کا خون کھَول اُٹھا۔ پُوچھنے لگا "وہ رہتا کہاں ہے؟"

"نہ جانے کہاں رہتا ہے۔ ہر شام کو بازار میں ضرور نظر آتا ہے۔"

نوشا نے ایک لمبی ہُوں کی۔ پُوچھا "سلطانہ کا بھی کچھ پتہ ہے کہ وہ آج کل کہاں ہے؟"

شامی اس وقت سڑک کی ایک چڑھائی پر رکشا لے جارہا تھا۔ اُس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا نے ذرا دیر بعد اپنی بات دہرائی تو وہ کہنے لگا۔

"وہ تو نیاز کے ساتھ رہتی ہے۔"

نوشا بھونچکا ہوکر بولا۔ "نیاز کے ساتھ؟"

"ہاں بے! وہی نیاز، جس کی بازار میں کباڑ خانے کی دکان تھی۔ اب تو وُہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایک دم صاحب بہادر لگتا ہے۔ کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ اور موٹر سے نیچے بات نہیں کرتا۔ یار اُس کے تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ دیکھے گا تو پہچان بھی نہیں سکے گا۔"

"مگر سلطانہ اُس کے یہاں کیوں چلی گئی؟"

"یار بات یہ ہے کہ تیری اماں نے نیاز سے نکاح پڑھوالیا تھا۔ تُو ناراض نہ ہو تو ایک بات بتاؤں۔ میں نے سُنا ہے کہ سلطانہ کی اور نیاز کی کچھ لگ سٹ ہوگئی تھی۔ اِسی لئے نیاز نے تیری اماں کو مروا دیا۔ سارے محلے والے یہی کہتے ہیں۔" وہ رکشا چلاتا جارہا تھا اور رُک رُک کر بول رہا تھا۔ "سالے نے بہت حرامی پن کیا۔ ایک نمبر بدمعاش ہے۔"

نوشا خاموش بیٹھا اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ چند لمحے بعد اُس نے شامی سے کہا۔ "تجھے نیاز کا گھر معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم تو ہے۔"

"تو پھر مجھے وُہیں لے چل۔"

"یار اب اس وقت وہاں جاکر کیا کرے گا۔ وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے۔"

وہ نیاز کی کوٹھی پر جانے کے لئے اصرار کرنے لگا۔ شامی نے مجبوراً رکشا

اُس طرف موڑ دی۔ اب نوشا بہت کم بول رہا تھا۔ کبھی کبھار ہوں، ہاں کر دیتا۔ شامی رُک رُک کر محلّے کے دوسرے لوگوں کی باتیں سُناتا رہا۔

جب دونوں نیاز کی کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچے تو رات کے گیارہ بجے تھے۔ نوشا نے رکشا سے اُتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اُس نے بگڑ کر ایک گالی دی۔ منہ بگاڑ کر بولا "یار! تو کراچی سے چند ٹکے کما لایا تو مجھ پر رُعب جھاڑ رہا ہے۔ صبح گھر آنا۔ دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اور دیکھ نیاز کے ہاں تیرا زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔" وہ اُچک کر رکشا پر سوار ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

نوشا کوٹھی کے پھاٹک پر خاموش کھڑا رہا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ البتہ ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مگر یہ روشنی اس قدر مدّھم تھی کہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ نوشا نے آہستہ سے پھاٹک کھولا اور باغیچہ کے اندر چلا گیا۔ مگر برساتی کی طرف جانے کے بجائے وہ درختوں کی جانب مُڑ گیا۔ وہاں گھرا اندھیرا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ خشک پتے اُس کے جُوتوں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتا۔

اُس نے آہستہ سے جُوتے اُتارے اور درختوں کے نیچے ایک طرف رکھ دیئے۔ قریب ہی اپنی گھڑی بھی رکھ دی۔ اُس نے دبے دبے قدموں چل کر کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ ہر طرف سے مُعائنہ کیا۔ پھر اپنی گٹھڑی کے پاس آیا۔ چاقو نکال کر کھولا اور اُسے دانتوں میں دبا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ کوٹھی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ اور ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا، اُس کمرے پر پہنچا، جہاں روشنی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

اُس نے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے کر کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ نیاز سامنے صوفے پر ایک طرف جھکا ہوا نیم دراز تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ رُک رُک کر گہری سانس بھر رہا تھا۔ نوشا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ نیاز کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اچانک اُس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ آہٹ ہوئی۔ نیاز نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے نوشا کو دیکھا۔ مگر قبل اِس کے کہ وہ کچھ کہتا، نوشا جھپٹ کر اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پہلا ہی وار بھرپور کیا۔ تین پسلیاں چیر ڈالیں۔ نیاز زور سے چیخا۔

"ہائے مار ڈالا"

وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔ نوشا ایک ٹانگ کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور پے بہ پے وار کرنا شروع کر دیے۔ اُس نے نیاز کے سینے کو، پیٹ کو، گردن کو، بازوؤں کو، ہر ہر حصّہ کو چیر ڈالا۔ نیاز کا جیتا جیتا خون کمرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ وہ ذرا دیر تک تڑپتا رہا۔ کراہتا رہا۔ پھر اُس نے دم توڑ دیا۔

نوشا اُس کے سرہانے بیٹھا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ خون سے بھرا ہوا چاقو ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی اثناء میں کمرے کے باہر آہٹ اُبھری۔ نوشا نے دیکھا سلطانہ کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نوشا کو دیکھا۔ پھر نیاز کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھی۔ اُس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ چیخ کر کہا۔

"ہائے نوشا تُو نے یہ کیا کر دیا"

نوشا خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ

دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ سلطانہ جنگلی کبوتر کی سی اُس کی سُرخ سُرخ آنکھوں کو دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا "اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

نوشا نے خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا۔ گردن ہلا کر بولا "تھانے!" اُس کی آواز ڈھول کی طرح گرجدار تھی۔

سلطانہ فوراً دروازے پر پہنچی اور اُس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ "میں تجھے نہیں جانے دُوں گی؟"

نوشا غرّا کر چیخا "ہٹ جا حرامزادی چھنال میرے سامنے سے ٹکڑے کر کے ڈال دُوں گا۔"

وہ پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی "تو مجھے بھی مار دے۔ تو مجھے بھی مار دے۔" نوشا نے قریب پہنچ کر اس زور سے اُسے دھکا دیا کہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی۔ نوشا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سلطانہ دوڑ کر اُس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"نوشا میرے بھائی۔ اللہ کے لئے رُک جا۔ میری بات تو سُن لے۔"

وہ گڑگڑا کر رونے لگی۔ نوشا کے سر پر خون سوار تھا۔ اُس نے پَیر کو زور سے جھٹکا دیا۔ سلطانہ لڑھک کر دُور جا گری۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ فرش پر پڑی ہوئی چیخ رہی تھی۔

"نوشا خدا کے لئے رُک جا۔"

"نوشا! نوشا!"

اُس کی آواز دیر تک اُبھرتی رہی۔

نوشا کوٹھی سے نکل کر باہر آگیا۔ درختوں کے خشک پتوں پر اُس

کے قدموں کی آہٹ صاف سُنائی دے رہی تھی۔ کوٹھی میں بوڑھی خادمہ بدحواس ہوکر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نوشا نے احاطہ طے کیا۔ پھاٹک کھولا اور باہر سڑک پر آکر بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں خون سے لتھڑا ہوا چاقو تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔

ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ۔

سنسان سڑک پر نوشا کے قدموں کی آواز آہستہ آہستہ اُبھرتی رہی۔

○

فصل یازدہم

(۱)

قدموں کی آہٹ سن کر سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ اُس کی پشت پر لمبے قد کا ایک گورا چٹا نوجوان کھڑا بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ سلمان لمحہ بھر تک خاموش بیٹھا اُس کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اجنبی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام انیس اے، جیفرے ہے۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اس گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا کہ سلمان کی انگلیوں کا کچومر نکل گیا۔ اُس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ کون تھا۔ وہ اُس کے سیکشن کا انچارج انیس احمد جعفری تھا۔ وہ کمپنی کا سینئر آفیسر تھا اور سال بھر تک امریکہ میں ٹریننگ لینے کے بعد اسی ہفتے لوٹا تھا۔ لیکن دفتر میں اُس روز پہلی بار آیا تھا اور اپنے سیکشن کے ہر رُکن سے ذاتی طور پر ملاقات کر رہا تھا۔

اس کی پیشانی تنگ تھی۔ ناک ستواں تھی۔ سر پر بھورے بھورے خشخشی

بال تھے۔ وہ ٹخنوں سے اُونچی ڈھیلی ڈھالی پتلون اور نائیلون کی جھلکتی ہوئی سفید قمیص پہنے تھا۔ کالر میں شوخ رنگ کی ٹائی بندھی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنے کندھے اُچکاتا جارہا تھا۔ اُس کا لہجہ اُکھڑا اُکھڑا تھا۔ وہ خالص امریکی لہجے کے ساتھ بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔ دورانِ گفتگو جتنی بار اس نے سلمان کو مخاطب کیا، ہر بار مسٹر سالومن کہتا رہا۔ سلمان کو اُس کا اندازِ تخاطب بڑا عجیب سا لگا۔ مگر پہلی ہی مُلاقات میں اُس کو یہ اندازہ ہوگیا کہ انیس احمد جعفری دلچسپ نوجوان تھا۔

بعد میں دفتری امُور کے سلسلہ میں سلمان کو بارہا اس سے ملنا پڑا۔ اور ہر بار اُس نے محسوس کیا کہ جعفری میں افسروں والا روایتی کھُردراپن نام کو نہیں تھا۔ وہ بڑی نرمی سے مُسکرا مُسکرا کر بات کرتا تھا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اُس کا انداز بڑا مشفقانہ ہوتا۔ اپنے اِسی رویّہ کی بدولت وہ اُن کو ناراض کئے بغیر زیادہ سے زیادہ کام کراتا تھا۔ یہ تکنیک اُس نے سال بھر کی ٹریننگ میں بڑی مہارت کے ساتھ سیکھی تھی۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے علاوہ اگر وہ سلمان کو روکنا چاہتا تو اُس سے پوچھتا۔

"مسٹر سالومن! کیا میں دریافت کرسکتا ہوں آج شام کے لئے آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

سلمان فوراً سمجھ جاتا کہ اس استفسار کا کیا مطلب ہے۔ اگر اس کا کوئی پروگرام بھی ہوتا تب بھی اس کا اظہار نہ کرتا۔ اس لئے کہ وہ اس کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بلاجھجک کہہ دیتا "جی نہیں، آج شام میرا کوئی خاص پروگرام نہیں۔"

جعفری بڑے رسمی انداز سے کہتا "کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کی اس شام کا کچھ وقت لے لوں؟" اس کے بعد وہ کوئی کام سلمان

کے سپرد کر دیتا۔

اکثر وہ سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح سلمان کو بھی اتوار اور دوسری چھٹیوں پر بُلا لیتا۔ جب کبھی ایسا موقعہ ہوتا، وہ گھنٹی بجا کر پہلے چپراسی کو بُلاتا کینٹین سے چائے منگواتا اور اپنا امریکی سگریٹ (وہ ہمیشہ امریکن سگریٹ پیتا تھا) پیش کر کے کہتا۔

"مسٹر سالومن! کیا آپ اپنی ڈائری دیکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ میں یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ اتوار کے لئے آپ کے کیا کیا انگیجمنٹ ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ آپ آؤٹنگ کے موڈ میں تو ہرگز نہیں ہیں اور پکنک کے لئے موسم بڑا ارف ہے۔"

سلمان بغیر اپنی ڈائری دیکھے کہہ دیتا۔ میری ڈائری میں اس اتوار کا صفحہ بالکل خالی ہے۔

جعفری بڑے سرپرستانہ انداز میں مسکرا کر کہتا۔ "اس عمر میں لڑکوں کو اتنا صوفی نہیں بننا چاہیئے۔" لمحہ بھر توقف کر کے وہ حرفِ مطلب پہ آجاتا حسبِ معمول بڑے تکلف کے ساتھ کہتا۔

"اگر آپ ہالی ڈے کے موڈ میں نہیں ہیں تو میں آپ سے یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ آپ اپنا قیمتی وقت بستر پر صرف کرنے کے بجائے دفتر کو دے دیں۔ اگر یہ ممکن ہو سکتا ہے تو آپ مجھے ذاتی طور پہ ممنون ہونے کا موقعہ دیں گے۔"

جب کوئی سینئر افسر اپنے ماتحت سے اس قدر نرمی کے ساتھ مطالبہ کرے تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سلمان بھی سیکشن کے دوسرے ملازمین کی طرح اُس کی بات مان لیتا۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ سلمان نے پہلے ہی ارادہ کر لیا کہ وہ جعفری کے ایسے بے جا مطالبوں کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ مگر جب وہ

اُس کے رُوبرُو گیا تو انکار نہ کرسکا۔

اِن ہی خدمات کے صلہ میں کمپنی نے جعفری کو ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ اور بھی بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ جعفری جس کوٹھی میں رہتا تھا، وہ اُس کو کمپنی کی جانب سے ملی تھی۔ اُس کے پاس جو نئی شیلور لیٹ تھی وہ کمپنی ہی نے خرید کر دی تھی۔ ہر ماہ ایک ہزار روپیہ اُس کو مختلف الاؤنسوں کی صورت میں مِل جاتا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ سے رہتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا رہن سہن تھا۔ اور اعلیٰ طبقوں میں اُس کا اُٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔

سلمان پر یا تو وہ زیادہ مہربان تھا یا سلمان کو یہ گمان تھا کہ وہ اس کو زیادہ مانتا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ اُس کے ساتھ بڑی محبّت سے پیش آتا تھا۔ اگر کبھی دفتری اُمور میں سلمان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو وہ ناراضگی کا اظہار نہ کرتا۔ بُلا کر نرمی سے سمجھا دیتا۔ کبھی کبھی تنبیہ بھی کرتا تو ہمیشہ براہِ راست نہ کہتا۔

" میں سوچتا ہوں کہ آج کل آپ ذہنی طور پر پریشان ہیں۔ کیا آپ مجھے یہ حق دیں گے کہ میں اس سلسلہ میں کچھ پوچھ سکوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ میں آپ کی کچھ مدد کروں"۔ سلمان انکار کرتا کہ وہ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا نہیں ہے تو وہ پوچھتا "کیا آپ نے فائل پر میرا نوٹ دیکھا۔ میں معلوم کرنا چاہوں گا کہ آپ اس سے کس حد تک اِتفاق رائے رکھتے ہیں ؟" اور پھر اپنے سوالوں کے جواب کا انتظار کیئے بغیر کہتا "کیا میں آئندہ آپ سے یہ اُمّید رکھوں کہ آپ مجھے فائلوں پر سُرخ پنسل چلانے کا موقعہ نہیں دیں گے"۔

جعفری عام طور پر انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کبھی کبھار اُردو میں بات کرتا تو پہلے وہ انگریزی میں سوچتا۔ پھر اُس کا ترجمہ کرتا۔ یہ اندازِ گفتگو اُس

نے اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ویسے وہ علی گڑھ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور اس کے بی۔اے کے مضامین میں اردو بھی شامل تھی۔ بلکہ طالب علمی کے زمانے میں وہ شاعری بھی کرتا تھا اور کچھ اس قسم کی رومانی نظمیں کہتا تھا:

تم مرے واسطے یوں اشک بہایا نہ کرو
محفلِ حسن میں یوں دیپ جلایا نہ کرو
میری تصویر کو سینے سے لگایا نہ کرو
میری محبوب مجھے بھول بھی جا، بھول بھی جا

حالانکہ لڑکیاں اس کو نرا اُلو کا پٹھا سمجھتی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ یتیم لگتا تھا اور وضع قطع سے کانجی ہاؤس کا محرّر۔ مگر اب لڑکیاں اس کو ڈان ژوان کہتی تھیں۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب وہ بن سنور کر شام کو اپنی نئی شیو۔ پر نکلتا ہوں تو بڑا سجیلا جوان نظر آتا۔

جعفری کی شخصیت میں سلمان کے لئے روز بروز کشش پیدا ہوتی جارہی تھی۔ اس کشش میں ایک عقیدت مندانہ جذبہ کارفرما تھا۔ وہ اس کے رُوبرُو جاتا تو اس انداز سے بات کرتا جیسے منوں بوجھ سے دبا ہوا ہو۔

اُن ہی دنوں کا ذکر ہے ایک روز وہ دفتر سے نکلا تو بس اسٹینڈ پر بہت بھیڑ تھی۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی کسی بس میں جگہ نہ ملی تو پیدل ہی چل دیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف جارہا تھا۔ اچانک ایک جھلکتی ہوئی کار اُس کے قریب آکر رُکی۔ سلمان نے دیکھا جعفری اسٹرینگ وہیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ اُس نے اشارے سے سلمان کو قریب بلایا۔ مسکرا کر کہا۔

" اگر آپ چہل قدمی کے موڈ میں نہ ہوں، تو میں آپ کو گھر تک لفٹ دینے

میں خوشی محسوس کروں گا۔"

اُس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سلمان چُپ چاپ اگلی نشست پر اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ راستے میں دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ جعفری نے اُس سے صرف مکان کا پتہ دریافت کیا اور آہستہ آہستہ کسی نئی انگریزی فلم کی دُھن گنگنانے لگا۔ کار جب سلمان کے فلیٹ کے سامنے رُکی تو اُترتے ہوئے سلمان نے سوچا کیوں نہ جعفری کو چائے پر مدعو کر لیا جائے۔ اُس نے جھجکتے ہوئے اپنی اِس خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ جعفری ذرا دیر کچھ سوچتا رہا، پھر کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

دونوں زینہ کی سیڑھیاں طے کر کے اُوپر پہنچے۔ دروازہ بوڑھی خادمہ نے کھولا تھا۔ وہ اس وقت گندا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سلمان کو اس پر سخت غصّہ آیا اور کچھ شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ کمرے میں اُس کی بیوی موجود نہیں تھی۔ اُس نے جعفری سے اجازت لی اور پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ بیوی بستر پر لیٹی تھی۔ سلمان نے جاتے ہی کہا۔

" رخشی! میرے آفس کے جعفری صاحب آئے ہیں۔ چائے ہم ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔" اچھا، میں بھجوائے دیتی ہوں۔"

سلمان نے فوراً کہا۔" خدا کے لئے بڑی بی کے ہاتھ چائے نہ بھجوانا۔ اُس سے کہو کبھی کبھار تو نہا لیا کرے۔ کپڑوں سے ایسی بُو آ رہی ہے کہ اب۔ تم سے کیا بتاؤں جعفری بڑا نفاست پسند ہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو پینے سے انکار کر دے گا۔"

رخشندہ نے کہا۔" اچھا تو پھر خود ہی لے آؤں گی۔"

سلمان نے بیوی کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اُس وقت علم گھریلو لباس

پہنے ہوئے تھی، اور یہ بات سلمان کو مناسب نہ معلوم ہوئی۔ کہنے لگا "تم ذرا اپنا حلیہ تو ٹھیک کرلو۔ سخت واہیات لباس پہن رکھا ہے۔ دیکھو جلدی چائے لے کر آنا" یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈرائنگ روم میں جاکر سلمان نے دیکھا کہ جعفری ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سلمان چپ چاپ اُس کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خاموش بیٹھے بیٹھے سلمان کی نظر اس کُشن پر پہنچ گئی۔ جو جعفری کے پہلو میں رکھا تھا۔ اس کا غلاف خاصا میلا تھا۔ اس گندے کُشن کو دیکھ کر جعفری نے جانے کیا سوچا ہوگا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح کُشن اُٹھا کر صوفے کے پیچھے ڈال دے تاکہ جعفری کی اس پہ نظر نہ پڑے۔ ابھی وہ کُشن ہی کے متعلق غور کر رہا تھا کہ ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کا پردہ لہرانے لگا۔ سلمان نے دیکھا پردے کے کنارے پر جگہ جگہ چکنائی کے دھبے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں بوڑھی خادمہ کو کوسا۔ جس کے پھوہڑپن کے باعث پردے اس قدر بدنما ہو گئے تھے۔ آخر اُس نے اُٹھ کر پردے کو اس طرح سمیٹ دیا کہ داغ دھبے کسی حد تک چھپ گئے

چائے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ جعفری نے میگزین کا مطالعہ کرتے کرتے کئی بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی مگر سلمان سے کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ اُس سے زیادہ بے چین سلمان تھا۔ اُسے رہ رہ کر بیوی پر غصہ آرہا تھا۔

کوئی ۲۰ منٹ بعد بوڑھی خادمہ چائے کا سامان لے کر آئی۔ اب اُس نے کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور کسی حد تک صاف سُتھری نظر آرہی تھی۔ سلمان کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ چائے کا سامان رکھا ہی جارہا تھا کہ رخشندہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اُس وقت وہ ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اُس

نے میک اپ میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ سلمان نے بیوی کو دیکھا۔ وہ اس وقت بڑی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ جعفری احتراماً کھڑا ہو گیا۔ سلمان نے جعفری سے رخشندہ کا تعارف کراتے وقت خوشی محسوس کی۔ یہ خوشی ایسی ہی تھی جیسے جدید ترین ماڈل کی کار، شاندار کوٹھی یا اعلیٰ نسل کا کتا رکھ کر محسوس کی جاتی ہے۔

جعفری نے رخشندہ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر حجاب محسوس کر رہی تھی کہ جعفری زیادہ بات نہ کر سکا۔ وہ تمام عرصہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ البتہ سلمان بہت چہک رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بیوی سے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اُس کی مسرّت میں بچوں کی سی سادگی تھی۔

چائے پینے کے بعد جعفری زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اُس کو کسی سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ وہ سلمان اور رخشندہ کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ سلمان اُسے کار تک رخصت کرنے گیا۔

چند ہی روز بعد دفتر میں چھٹی ہونے سے کچھ ہی دیر قبل جعفری سلمان کے پاس آیا۔ کہنے لگا: "سالومن وہ اُس روز چائے پر تمہارے یہاں کیا چیز تھی۔" لمحہ بھر کے لئے وہ رُکا۔ "میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو شاید وہ پکوڑے تھے۔ کیا تم میرے خیال کی تائید کرو گے؟"

سلمان نے ہنس کر کہا: "جی ہاں وہ پکوڑے ہی تھے۔ کیا آپ کو پسند آئے تھے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اُن کا ذائقہ پسند آیا تھا۔ کیا تم آج شام مجھے چائے کی دعوت دے رہے ہو۔ لیکن پکوڑے کا آئیٹم ضرور ہو۔ اُن کے لئے میں شام کا بہترین پروگرام بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

سلمان اُس کو چائے پلانے پر خوشی سے تیار ہو گیا۔

دفتر سے نکلنے کے بعد وہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ چائے کے ساتھ خاص طور پر پکوڑے تیار کئے گئے۔ جعفری نے اُن کو بڑے شوق سے کھایا۔ اس روز وہ قطعی بے تکلفی کے موڈ میں تھا۔ چائے کے دوران اُس نے بڑے دلچسپ لطیفے سُنائے۔ سلمان اور رخشندہ کو خوب ہنسایا۔

چائے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے پکچر کا پروگرام بنایا اور اصرار کرکے دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ سنیما ہال میں بھی وہ بڑا ہنس مُکھ نظر آرہا تھا۔ پکچر دیکھ کر باہر نکلے تو جعفری اُن کو چھوڑنے گھر تک گیا۔ سلمان نے کھانے کے لئے کہا تو وہ مزید اصرار کے بغیر آمادہ ہوگیا۔ کھانا کھاکر بھی وہ رات گئے تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

جس وقت وہ سلمان کے فلیٹ سے نکلا، اُس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

(۲)

نیاز کے قتل کے چند ہی گھنٹے بعد ایک پولیس سب انسپکٹر کئی کانسٹیبلوں کے ہمراہ کوٹھی پر پہنچا۔ اُس نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ نیاز کی لاش ابھی تک خون میں ڈوبی فرش پر پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں خوفناک طریقے پر پھٹی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ دیوار کے قریب چت پڑا تھا۔

لاش سے کچھ فاصلہ پر سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نہ وہ رو رہی تھی، نہ جسم کو حرکت دے رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی خانساماں اور بوڑھی خادمہ بھی سہمے بیٹھے تھے۔ فرش پر، دیواروں پر خون کے لال لال لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کا ماحول بڑا ہیبت ناک تھا۔

سب انسپکٹر کمرے میں تفتیش کے لئے داخل ہوا۔ سلطانہ نے دیکھا نوشا بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ وہ کانسٹیبلوں کی حراست میں سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ آنکھیں سُرخ اور وحشت ناک تھیں۔ سلطانہ لمحہ بھر تک ٹکٹکی باندھے نوشا کو دیکھتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

کمرے پر ہولناک سکوت طاری تھا اور اس سکوت میں سلطانہ کی سسکیاں آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھیں۔ اچانک کوٹھی کے پچھواڑے درختوں تلے گیدڑوں کے بولنے کی آواز اُبھری۔ آدھی رات کا سناٹا، ان خوف ناک چیخوں سے درہم برہم ہوگیا۔ لاش کی کھُلی ہوئی آنکھیں ہر شخص کو گھُور رہی تھیں۔

سب انسپکٹر جُھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ایک ایک زخم دیکھ رہا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل کو ہدایتیں دیتا جا رہا تھا، جو اُس کی ہر بات کا ڈائری میں اندراج کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر نے تقریباً آدھ گھنٹے میں لاش کے معائنے کی رپورٹ مکمل کی اور اُس کے بعد نیاز کے مُردہ جسم کو سفید چادر سے ڈھک دیا گیا۔

لاش اور جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد سب انسپکٹر نے سب سے پہلے سلطانہ کا بیان لیا۔ اُس نے رُک رُک کر سسکیاں بھرتے ہوئے سب انسپکٹر کو بتایا کہ نوشا اُس کا چھوٹا بھائی ہے اور کئی سال بعد آیا ہے۔ نیاز کا اور اس کا کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ جس وقت دونوں کا جھگڑا ہوا، وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ نیاز کی چیخیں سُن کر وہاں آئی تھی۔ نیاز اُس وقت دم توڑ چکا تھا۔ اُس کا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا۔

اور جگہ جگہ زخموں کے نشانات تھے۔

انسپکٹر نے دریافت کیا "جس وقت آپ موقعۂ واردات پر پہنچیں، کیا اُس وقت مُلزم کمرے میں موجود تھا؟"

وہ لمحہ بھر کے لئے جھجکی، پھر نہ معلوم کیا سوچ کر صاف جھُوٹ بول گئی "نہیں۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا"

نوشا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا، جو سر جھکائے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا "پھر آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ مُلزم یہاں آیا تھا اور مقتول سے اس کا جھگڑا ہُوا تھا؟"

"میں نے پہلی بار اِس کو آپ کے ساتھ دیکھا ہے"

"اگر مُلزم کو یہاں پولیس کی حراست میں نہ دیکھتیں تو آپ کو اس پر کوئی شبہ نہ ہوتا؟"

"جی نہیں" سلطانہ نے صاف اِنکار کر دیا۔

"تو پھر آپ نے قتل کی اطلاع اب تک پولیس کو کیوں نہ دی؟"

"میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ اب تک میرے ہوش و حواس درست نہیں"

وہ اپنی سُوجھ بُوجھ کے مُطابق سب انسپکٹر کے ہر سوال کا رُک رُک کر جواب دے رہی تھی۔ جو کچھ اُس وقت اُس کی سمجھ میں آیا، کہتی چلی گئی۔ مگر اُس کی آواز سے، اُس کے چہرے کے اطمینان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خوف اور گھبراہٹ پر قابو پاتی جا رہی تھی۔ اُس نے رونا بند کر دیا تھا اور سب انسپکٹر کے ہر استفسار کے لئے خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سب انسپکٹر نے پوچھا۔ مقتول نیاز سے آپ کی کب شادی ہوئی

تھی؟"

سلطانہ اِس سوال پر گھبرا گئی۔ اُس نے نیاز کے خلاف اپنے دل میں شدید نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔

سب انسپکٹر کے اِس سوال کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ اُس وقت وہ شدید اذیت محسوس کر رہی تھی۔

سب انسپکٹر نے اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا "کیا وہ آپ کے شوہر نہیں تھے؟"

سلطانہ نے گردن جھکا کر کہا "وہ رشتے میں میرے سوتیلے باپ تھے۔" اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ نیاز کی لاش پر تھوک دے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے، اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اچانک برہنہ ہو گئی ہے۔

سب انسپکٹر نے سلطانہ سے اور بہت سے سوالات کئے مگر وہ اب قوتِ مدافعت کھو چکی تھی۔ اُس نے گھبراہٹ میں نہ جانے کیا کیا اُلٹے سیدھے جوابات دئے۔

پولیس نے بوڑھے خانساماں اور خادمہ کے بھی بیانات لئے پھر انسپکٹر کانسٹیبلوں اور نوشا کے ساتھ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ دروازہ پر کھڑی نوشا کو جاتے ہوئے دُور تک دیکھتی رہی۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں۔ وہ سر جُھکائے کانسٹیبلوں کے نرغے میں چُپ چاپ چل رہا تھا۔

رات بھر ایک پولیس کانسٹیبل نیاز کی لاش پر پہرہ دیتا رہا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے مُردہ گاڑی آئی اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے

اسپتال لے گئی۔

سب انسپکٹر کئی بار تفتیش کے سلسلہ میں کوٹھی پر آیا اور سلطانہ کے علاوہ خادمہ اور بوڑھے خانساماں سے نیاز کے قتل کے متعلق طرح طرح کی باتیں پوچھتا رہا۔ سلطانہ کو اُس کے سوالات سے بڑی وحشت ہوتی۔ مگر اس سے بھی زیادہ وحشت اس کو اس کوٹھی سے ہونے لگی تھی، جو اب مرگھٹ کی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی۔ کوٹھی پر ہر وقت ہُو کا عالم طاری رہتا۔ در و دیوار پر مُردنی چھائی رہتی۔ خالی کمرے بھائیں بھائیں کرتے۔ تمام دن اُکتا دینے والا سناٹا چھایا رہتا۔ شام ہوتے ہی ہر طرف دُھندلی دُھندلی پرچھائیاں رینگتی ہوئی نظر آتیں۔ باہر احاطہ میں گھنے درختوں تلے خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ دبی دبی آہٹیں اُبھرتیں۔

رات کو اکثر سوتے سوتے سلطانہ کی آنکھ کھُل جاتی۔ ایسا محسُوس ہوتا کہ نیاز خون میں ڈوبا ہوُا سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہوتیں۔ وہ گھُور گھُور کر دیکھتا۔ سلطانہ گھبرا کر بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں جاگتی رہتی۔ نیاز کا کمرہ عین اُس کے کمرے کے سامنے تھا۔ ہر شام وہ اس کمرے میں جا کر خود چراغ روشن کرتی۔ عُود و لوبان سُلگاتی، تاکہ نیاز کی رُوح خراب ہو کر بھٹکتی نہ پھرے۔ مگر رات گئے جب وہ اس کمرے کی جانب دیکھتی تو چراغ کی دُھندلی روشنی میں اس کو کمرے کے اندر کوئی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوُا معلوم ہوتا۔ ہوا زور سے چلتی۔ درختوں کے نیچے سُوکھے پتے کھڑکھڑاتے اور سُنسان رات میں کسی کے تیز تیز بھاگنے کی آہٹیں اُبھرتیں۔ وہ خوف سے آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر تمام رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔

مسلسل شب بیداری اور پے بہ پے دُکھوں نے اُس کی صحت خراب کر دی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ ان دنوں شدّت سے اس کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ مگر کوئی بھی ایسا نظر نہ آیا جو اُس کو ڈھارس دے سکتا، غم گساری کر سکتا۔ کوٹھی میں خادمہ کے علاوہ صرف خانساماں تھا۔ دونوں ہر وقت سہمے سہمے رہتے

تھے۔ بلکہ خادمہ تو ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ مگر سلطانہ نے اُس کو روک لیا۔

پھر بھی وہ رات کو کوٹھی پر رہنے کی بجائے اپنی بیٹی کے گھر پر جا کر سوتی تھی۔ اُس کو سلطانہ سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا تھا۔

ان ہی دنوں ایک شام، خان بہادر کوٹھی پر آیا۔ اُس کے ہمراہ ایک ادھیڑ آدمی تھا۔ اُس کا جسم بھدّا تھا۔ سانولا رنگ بڑی بڑی بے رونق آنکھیں اور کنپٹی کے پاس زخم کا گہرا نشان۔ وہ خاصا اول جلول لگتا تھا۔ اُس کے چہرے کی کرختگی دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔ خان بہادر نے سلطانہ سے یہ کہہ کر ملایا کہ وہ نیاز کا بڑا بھائی ہے راولپنڈی میں رہتا ہے اور نیاز کے مرنے کی اطلاع پا کر آج ہی آیا ہے۔ حالانکہ نیاز نے سلطانہ سے اُس کا کبھی تذکرہ نہیں کیا اور نیاز سے اس کی شباہت بھی نہیں ملتی تھی۔ پھر بھی سلطانہ نے اُس کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ خان بہادر فرزند علی کو وہ معزز اور ذمہ دار آدمی سمجھتی تھی۔ اُس کو خان بہادر کی باتوں پر فوراً اعتبار آ گیا۔

خان بہادر کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ البتہ وہ شخص کوٹھی ہی پر ٹھہر گیا۔ اُس کا نام فیاض تھا۔ راولپنڈی میں اُس کی کپڑے کی دکان تھی۔ نیاز کے قتل کی اطلاع اُس کو نیاز کے ایک دوست کے خط سے ملی تھی اور وہ فوراً خط ملتے ہی چلا آیا تھا۔ اُس کے بال بچے ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھے۔ اُس نے اپنے متعلق سلطانہ کو یہی بتایا تھا۔

مگر نہ تو اُس نے نیاز کی موت پر آنسو بہائے اور نہ اُس کے چہرے پر کسی گہرے غم کا تاثر تھا۔ سلطانہ سے اُس نے بات چیت بھی کم کی اور اُس کے بچّے کو دیکھ کر بھی کسی خوشنودی کا اظہار نہ کیا۔ رات کا کھانا اُس نے وہیں کھایا۔ وہ جبڑے ہلا ہلا کر بدتمیزی سے کھانا کھاتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے زور زور سے ڈکاریں لیں، جس سے اُس کا اُجڈ پن ظاہر ہوتا تھا۔ یوں بھی اُس کا لہجہ بڑا عامیانہ تھا۔ مگر سلطانہ کو اُس کے آنے

سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ کوٹھی پر رات بھر جو ہولناک سناٹا طاری رہتا تھا، وہ کچھ کم ہو گیا تھا۔

سلطانہ نے اُس کی رہائش کے لئے کوٹھی کے ایک کمرے میں بندوبست کر دیا۔ وہ سرِ شام ہی سونے کے لئے بستر پر چلا گیا۔ اُس رات سلطانہ کئی راتوں کے بعد گہری نیند سوئی۔ سویرے اُٹھ کر اُس نے فیاض کے لئے ناشتہ اپنی نگرانی میں تیار کرایا اور اس میں خاصا اہتمام کیا۔ وہ اُس کے سامنے جب بھی جاتی، دوپٹے کے آنچل سے سر کو ڈھک لیتی۔ بات کرتی تو نظریں نیچی کر کے۔ وہ اس کا احترام بالکل اپنے جیٹھ کی طرح کر رہی تھی۔

فیاض سہ پہر تک اپنے کمرے میں رہا۔ پھر وہ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ رات کو واپس آیا۔ اب اُس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام کو باہر رہتا۔ سلطانہ کے ساتھ پہلے ہی دن سے اُس کا جو رویہ تھا، وہ برقرار رہا۔ وہ اُس سے بہت کم بات چیت کرتا۔ اس کا زیادہ تر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔

فیاض کو آئے ہوئے چوتھا یا پانچواں دن تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اچانک شور سُن کر اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے سُنا فیاض خادمہ کو ڈانٹ رہا تھا۔ اُس کی آواز اُونچی تھی۔ وہ گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ سلطانہ سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھی تھی۔ اِسی اثناء میں بوڑھی خادمہ روتی ہوئی دروازے پر نمودار ہوئی۔ اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"بیگم صاحبہ میرا حساب صاف کر دیجئے۔ میں اب آپ کی نوکری نہیں کروں گی۔"

سلطانہ نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی۔ بیچ کر بولی۔ "میں آپ کی ٹہل چاکری کرتی ہوں۔ پر اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے عزّت بھی بیچ دی ہے۔ میں اس طرح گالیاں نہیں سُن سکتی۔"

خادمہ برابر بڑبڑاتی جارہی تھی اور سلطانہ اُس کو سمجھا رہی تھی کہ وہ اس طرح کوٹھی چھوڑ کر نہ جائے۔ اِسی اثناء میں سامنے سے فیاض آتا ہوُا نظر آیا۔ اُس کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پیشانی پر بَل تھے۔ اُس کا کرخت چہرہ جُھلسا ہوُا نظر آرہا تھا۔

وہ آتے ہی گرج کر بولا "یہ حرامزادی یہاں بیٹھی کیا فیل مچا رہی ہے"

خادمہ نے فوراً کہا "دیکھئے بیگم صاحبہ! پھر انہوں نے گالی دی۔ میں اگر کچھ کہہ سُن دوں گی، تو پھر مجھے نہ کہیئے گا۔"

فیاض نے اُسے گھُور کر دیکھا اور ڈانٹ کر کہا "ابھی یہاں سے نکل جا۔ مَیں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ سؤر کی بچّی، حرام زادی، کنجری"

فیاض گالیاں دینے لگا۔ خادمہ بھی بڑی تیز عورت تھی۔ اُس نے بھی ترکی بہ تُرکی جواب دیا۔ فیاض اُس کو مارنے کے لئے جھپٹا۔ سلطانہ اگر اُس کو نہ روکتی تو شاید وہ خادمہ کو مارتا بھی۔ وہ پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ خادمہ روتی پیٹتی کوٹھی سے باہر چلی گئی۔

سلطانہ کو خادمہ کے چلے جانے کا بہت افسوس ہوُا۔ وہ کام بھی مستعدی سے کرتی تھی اور اُس کی غم گُسار بھی تھی۔ جب سے نیاز مرا تھا، اُس وقت سے سُلطانہ کے لئے اُس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ ہر معاملہ میں اُس سے مشورہ کر لیتی۔ دل گھبراتا تو گھنٹوں اُس کے ساتھ بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتی۔ اِس طرح اُس کا دل بہل جاتا تھا۔ اُس کو فیاض کا رویّہ بہت بُرا معلوم ہوُا۔

شام کو خانساماں پر بھی نزلہ گرا۔ فیاض خواہ مخواہ اُس پر برسنے لگا۔ اُس کو بھی اُس نے چیخ چیخ کر گالیاں دیں۔ مگر بوڑھا خانساماں ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اُس نے زبان سے اُف تک نہ کی۔ سر جھکائے چُپ چاپ فیاض کی گالیاں سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ اُس کے پاس گئی۔ اُس نے دیکھا خانساماں باورچی خانہ

میں چپ بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ بہت افسردہ نظر آرہا تھا۔ سلطانہ نے اُس کو تسلّی دینے کی کوشش کی تو وہ رو پڑا۔ کہنے لگا۔

"بیگم صاحبہ اپنی قسمت ہی میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا لکھی ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ ہی کے قدموں میں ساری زندگی گزار دُوں گا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے اب یہاں سے میرا آب و دانہ اُٹھ چکا ہے۔"

سلطانہ دیر تک خانساماں کو سمجھاتی رہی۔ جب وہ اُسے سمجھا بجھا کر باورچی خانہ سے باہر نکلی تو اُس نے فیاض کو اپنے کمرے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پایا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی بولا۔ "دیکھوجی! تمہاری یہ عادتیں مجھ کو بالکل پسند نہیں۔ تم نے نوکروں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ سالے ایک نمبر کام چور ہو گئے ہیں۔" سلطانہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ننھا ایاز رو رہا تھا۔ وہ اُس کو گود میں لے کر کمرے کے اندر ٹہلنے لگی۔

فیاض کا رویّہ خانساماں کے ساتھ روز بروز خراب ہوتا گیا۔ وہ بات بات پر اُس پر برس پڑتا اور گندی گندی گالیاں دیتا۔ سلطانہ اگر بات کو رفع دفع کرنے کی غرض سے کچھ کہتی تو وہ آنکھیں نکال کر اس پر بھی غرّانے لگتا۔ اب وہ گھر کے ہر معاملہ میں ٹانگ اڑانے لگا تھا۔ ایک ایک بات کی چھان بین کرتا۔ یہ کیوں ہوا؟ یہ کس لئے کیا گیا۔ یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ اُس کی اِن حرکتوں نے چند ہی روز میں سلطانہ کو پریشان کر دیا۔

پھر اور نئی نئی باتیں سامنے آئیں۔ فیاض نے ڈرائیور کو علیحدہ کر دیا، اور کار گیراج سے نکال کر نہ جانے کہاں لے گیا۔ سلطانہ نے پُوچھا تو فیاض نے بڑی بے رُخی سے کہا۔ "مرمّت کے لئے گئی ہے۔" حالانکہ کار بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ مگر فیاض نے اِس طرح تیوری پہ بَل ڈال کر اُس کی بات کا جواب دیا کہ وہ مزید استفسار نہ کر سکی۔

کچھ عرصہ بعد وہ اپنی ہی وضع قطع کے ایک اور شخص کو بھی لے آیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ صورت شکل سے اوباش معلوم ہوتا تھا۔ تمام دن ڈرائنگ روم میں پڑا رہتا۔ لہک لہک کر فلمی گیت گاتا۔ گھٹیا قسم کے سگریٹ پیتا اور جلی ہوئی ماچسوں کی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے کمرے کے اندر بکھیر دیتا۔ صوفوں پر اُس نے جگہ جگہ تیل کے داغ دھبے ڈال دئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں سے تولیہ کا کام لیتا۔ دونوں وقت ڈھیر بھر کھانا کھاتا اور چائے کے کئی کئی کپ ایک ہی وقت میں پی جاتا۔ وہ کام کاج کچھ نہیں کرتا تھا۔ بس ہر وقت ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا رہتا۔ رات ہوتی تو فیاض کے کمرے میں جاکر سو جاتا۔ کہیں آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتا۔

سلطانہ جب اُس کے سامنے جاتی تو گھُور گھُور کر دیکھتا۔ لفنگوں کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا اور گھٹیا فلمی گانے گنگنانا شروع کر دیتا۔ اُس کا نام کرم الٰہی تھا مگر وہ چند ہی روز میں سُلطانہ کے لئے قہرِ الٰہی بن گیا تھا۔

سلطانہ ان تبدیلیوں پر غور کر ہی رہی تھی کہ فیاض نے ایک روز بڑی عجیب سی حرکت کی۔ اُس نے نیاز کا سارا سامان اُٹھوا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اور ہر کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ ہر الماری اور ٹرنک کھول دیکھا۔ پھر اُس نے سلطانہ کے زیورات اور کپڑے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اُس سے الماریوں کی کنجیاں طلب کیں۔ سلطانہ نے پہلے تو ٹالنا چاہا۔ مگر جب وہ بار بار اصرار کرنے لگا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔

وہ بگڑ کر بولا۔" اگر تم نے کنجیاں نہ دیں تو میں تمہاری ساری الماریاں اور بکسے اُٹھوا کر دوسرے کمرے میں بند کر دوں گا۔"

اِس دھمکی پر سُلطانہ بھی جھنجلا اُٹھی۔" دیکھئے میں آپ کی ہر بات خاموشی

سے برداشت کرتی رہی، اب آپ، حد سے زیادہ گزرتے جا رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں نہ اپنے صندوقوں اور الماریوں کی آپ کو کنجیاں دوں گی اور نہ اُن میں کسی کو ہاتھ لگانے دُوں گی۔"

"تو پھر پچھتاؤ گی۔" فیاض نے دھمکی دی۔ سلطانہ جل کر بولی۔ "جائیے جو آپ سے کیا جائے کر لیجئے۔"

فیاض آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں تم کو کھڑے کھڑے کوٹھی سے نکال سکتا ہوں۔"

"تم کون ہوتے ہو مجھ کو یہاں سے نکالنے والے۔"

"اچھا تو تم کو اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ اس گھر کا مالک کون ہے؟"

سلطانہ نے چیخ کر کہا۔ "اس گھر کی مالک میں ہوں، میں ہوں۔ کان کھول کر سُن لو۔"

فیاض بڑے بے ڈھنگے پن سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ "کہیں اس گمان میں بھی نہ رہنا۔ جس وقت چاہوں گا ہاتھ پکڑ کر کوٹھی سے باہر کھڑا کر دوں گا۔ بھیک مانگتی پھرو گی۔"

سلطانہ غصّے سے ہونٹ چبانے لگی۔ اُس نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ذرا نکال کے تو دیکھو۔" وہ غصّے سے بڑبڑانے لگی۔ "نہ جانے کہاں سے آ گئے مرنے والے کے بڑے بھائی بن کر۔ زندگی میں تو اس کی کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اب مرنے کے بعد اُس کے مال پر کفن کھسوٹوں کی طرح قبضہ کرنے آ گئے۔ اگر خان بہادر صاحب نہ کہتے تو میں تم کو یہاں گھسنے بھی نہ دیتی۔"

ابھی وہ غصہ میں نہ جانے اور کیا کچھ کہتی کہ فیاض نے چیخ کر کہا۔ "بس اب تم اپنی زبان بند کر لو، ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

سلطانہ اُس کی لال لال آنکھیں دیکھ کر چُپ ہو گئی۔ شور سُن کر کرم الٰہی اور بوڑھا خانساماں بھی باہر آ گئے۔ فیاض خاموش کھڑا گھُور گھُور کر سلطانہ کو دیکھتا رہا۔ اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہُوا کوٹھی سے باہر چلا گیا۔

سلطانہ تھکی ہوئی سی اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات سے ننھے ایاز کی طبیعت خراب تھی۔ وہ برابر روئے جا رہا تھا۔ اُس وقت بھی وہ رونے لگا تو جھنجلا کر سلطانہ نے بچے کی کمر پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ سلطانہ نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔ بچہ بلک بلک کر روتا رہا۔ آخر خانساماں اُسے اُٹھا کر کمرے سے باہر لے گیا۔ چمکار چمکار بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

تمام دن وہ کمرے میں مضمحل پڑی رہی۔ شام کو خان بہادر فرزند علی آیا۔ فیاض اُس کے ہمراہ تھا۔ اُس نے سلطانہ کو ڈرائنگ روم میں بُلوایا۔ بات چیت کا آغاز کرنے سے قبل اُس نے فیاض اور کرم الٰہی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

جب دونوں چلے گئے تو خان بہادر نے بڑے سرپرستانہ انداز میں سلطانہ سے کہا۔ "میں تم کو بہت سمجھ دار لڑکی سمجھتا تھا۔ مگر آج تم نے بڑی ناسمجھی کا ثبوت دیا۔ تم کو فیاض سے اِس طرح لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "آپ کو کیا خبر کہ وہ کس کس طرح مجھے پریشان کر رہے ہیں۔"

"بھئی فیاض تو مجھے بڑا بھلا مانس لگتا ہے۔" خان بہادر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال میں اُسے سمجھا دوں گا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے تم کو تکلیف پہنچے۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں تم سے بھی یہ کہونگا

کہ تم زیادہ غصہ کرنا چھوڑ دو۔" اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔" بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری قانونی پوزیشن بہت نازک ہے۔"

سلطانہ نے چونک کر خان بہادر کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش رہی۔

خان بہادر اپنے مخصوص انداز میں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔" مصیبت یہ ہے کہ نیاز کے ساتھ تمہارا باقاعدہ نکاح بھی نہیں ہوا۔"

سلطانہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔" میں نے تو اُن سے کئی بار کہا، مگر وہ ہمیشہ ٹالتے رہے۔"

" وہ ٹالتا نہیں رہا، بلکہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔" خان بہادر نے بتایا۔ اُس نے مجھ سے بھی اس سلسلہ میں ذکر کیا تھا۔ مگر میں نے اُسے منع کر دیا۔"

" کیوں ؟" سلطانہ کے لہجہ میں استعجاب تھا۔

" وہ ایسا ہے کہ تمہاری ماں چونکہ نیاز کی بیوی رہ چکی تھیں، لہٰذا شرعی طور پر تمہارا نیاز کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ فقہی مسئلہ ہے۔ میں نے صحیح صورتِ حال بتا دی۔ تم چاہو تو کسی عالمِ دین سے اِس کی تصدیق کر سکتی ہو۔" خان بہادر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔" بُرا نہ ماننا، سچ پوچھو تو تمہاری حیثیت نیاز کی داشتہ سے زیادہ نہیں۔"

سلطانہ کے دل پر شدید ٹھیس لگی۔ وہ غم و غصہ سے تلملا کر رہ گئی۔ خان بہادر اُس کے جذبات و احساسات سے بے نیاز بولتا رہا۔" میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ فیاض سے نہ بگاڑو۔ وہ جو کہتا ہے، مان لو۔"

اُس نے تسلّی دینے کی کوشش کی۔" بھئی کیا کیا جائے۔ اللہ نے تم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔"

سلطانہ نے کہا۔" اُنھوں نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب وہ میرے زیورات اور کپڑے لتّے بھی ہتیانا چاہتے ہیں۔ آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔ پھر

میرا بچہ ہے۔ وہ کس کی اولاد ہے۔ کیا باپ کی جائیداد میں اُس کا کوئی حق نہیں ؟"

"میں نے تم کو مسئلہ کی شرعی نوعیت بتادی ۔" خان بہادر نرم لہجے میں بولا۔ " اپنی قانونی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہتی ہو، تو میں یہ کہوں گا تمہارا نیاز کی جائیداد پر کوئی حق نہیں بنتا ۔" اُس نے نظر بھر کر سلطانہ کو دیکھا، جو سر جھکائے بجھی بجھی بیٹھی تھی ۔" نیاز کو تمہارے باپ کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ تب بھی سوتیلی اولاد ہونے کے رشتے سے اس کے ترکے میں تمہارا کوئی حصّہ نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا بچّہ، وہ بھی نیاز کی ناجائز اولاد ہے، اُس کا بھی حق نہیں بنتا ۔"

سلطانہ نے خان بہادر کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی ۔" مگر اُس کے باپ کی حیثیت سے تو ہر جگہ اُن ہی کا نام لکھا گیا ہے ۔"

خان بہادر مسکرا کر بولا ۔" تم کسی کا بھی نام لکھوا دو۔ مگر قانون تو یہ نہیں تسلیم کرے گا کہ اس بچّہ کا باپ نیاز ہی تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے تو لکھا نہیں کہ یہ میرا بچّہ ہے ۔"

سلطانہ نے جھٹ کہا ۔" اسپتال کے رجسٹر میں اُنھوں نے خود دستخط کیے تھے۔ آپ جا کر دریافت کر لیں ۔"

" اگر ایسا بھی ہے تب بھی مجھے علم نہیں کہ اس سلسلہ میں قانون کیا کہتا ہے ۔" خان بہادر بولا ۔" مگر میں یہ جانتا ہوں کہ پھر بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ عدالت میں اور بھی بہت سے ثبوت مہیّا کرنے ہوں گے۔ تم چاہو تو کسی وکیل سے مشورہ کر لو ۔"

" میں کس وکیل کے پاس جاؤں گی ۔" سلطانہ نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔
" آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں، میرا تو کوئی نہیں ۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔

" تم پریشان نہ ہو ۔" خان بہادر نے اُسے تسلّی دی۔ " میں تو چاہتا ہوں کہ عدالت میں جانے اور مقدمہ بازی کے چکّروں میں پڑنے کی نوبت ہی

نہ آئے ہم تم اطمینان سے یہاں رہو۔ میں فیاض کو سمجھا دوں گا۔ اب وہ یہاں کم ہی رہے گا۔ نیاز کے کاروبار کی فی الحال میں دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ مگر میں اسی ماہ عمرہ کرنے مکہ معظمہ جا رہا ہوں، لہذا جلدی سب کچھ فیاض کے سپرد کردوں گا۔ وہ کاروبار کے چکروں میں پھنس جائے گا تو تم سے اُلجھنے کی اُسے فرصت ہی کب ملے گی۔ تم کو جو کچھ گھر کے خرچ کے لیئے ہر ماہ ملتا تھا، وہ ملتا رہے گا۔ اب تم کنجیاں فیاض کو دے دینا۔ تاکہ بنک میں اور دوسری جگہ جو روپیہ پڑا ہے، وہ نکال کر کاروبار چلایا جائے۔"

مگر سلطانہ کنجیاں دینے پر رضامند نہیں ہوئی۔ خان بہادر نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کہنے لگا۔" تم فیاض کی جانب سے بہت بدگمان معلوم ہوتی ہو۔ خیر اُس کی بات چھوڑو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس پر دو چار روز غور کرلو۔ پھر اطمینان سے جواب دینا۔"

خان بہادر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اُٹھ کر چلا گیا۔ سلطانہ کو خان بہادر کی باتوں سے کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا اگر خان بہادر نے زیادہ اصرار کیا تو وہ تمام کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں دے دیگی۔ وہ اُسے شریف اور معقول آدمی سمجھتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ سلطانہ رات گئے تک اِن ہی باتوں پر غور کرتی رہی۔

خلافِ معمول وہ دیر سے سوئی۔ نہ معلوم کتنی رات گزر چکی تھی۔ اچانک آہٹ سے اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ کمرے کی اُس کھڑکی پر، جو باہر کے رُخ پر تھی ایک سایہ نظر آیا۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد غائب ہو گیا۔ باہر دُھندلی دُھندلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سنکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹیں اُبھر رہی تھیں۔ کوئی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سلطانہ خوف سے تھرا کر رہ گئی۔ نیاز کے کمرے میں چراغ کی زرد زرد روشنی پھیلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اُسی طرف دیکھتی

رہی۔

نیند اب آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ سہمی ہوئی خاموش پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے قریب آہٹ ہوئی۔ سلطانہ نے گھبرا کر دیکھا، کوئی گردن نکالے جھانک رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ کھڑکی پر چڑھ کر دھم سے کمرے کے اندر کودا۔ سلطانہ کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے چیخنے کے لئے منہ پھاڑا، اُسی وقت کسی نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا۔ دُھندلی دُھندلی چاندنی کے عکس میں اُس نے دیکھا فیاض اُس کے سینے پر جھکا ہوُا کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

سلطانہ نے مزاحمت کی تو فیاض نے اُس کے منہ پر ایک بھرپوُر ہاتھ مارا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا "چُپکی پڑی رہ حرامزادی"۔

اُس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ فیاض بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا۔ سلطانہ کے منہ پر دو بھرپوُر ہاتھ پڑے تو اُس کی بتیسی ہل گئی۔ فیاض پاگلوں کی طرح اُس کے لباس کو نوچنے لگا۔ اُس نے جھٹ جھٹ کر کے سلطانہ کے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اُس کے نیم برہنہ جسم کو کھسوٹنے لگا۔

سلطانہ برابر مزاحمت کرتی رہی۔ فیاض اُس کو بے دردی سے مارتا رہا۔ آخر وہ تھک کر شل ہو گئی۔ اُس نے بے بسی سے فیاض کے آگے ہاتھ جوڑ دئے۔ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ مگر فیاض دیوانہ ہو رہا تھا، اُس نے وحشیوں کی طرح اُس کے ہونٹوں کو، رخساروں کو، سینے کو اپنے گندے دانتوں سے چبا ڈالا۔

باہر پھیکی پھیکی چاندنی پھیلی تھی۔ درختوں کے نیچے سوُکھے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیاز کے کمرے میں چراغ کی لَو بار بار بھڑک رہی تھی۔ فیاض کھڑکی سے کوُد کر باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی کرم الٰہی اسی راستے سے کمرے کے

اندر آگیا۔ سلطانہ نے جل کر اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ مگر وہ بے حیائی سے ہنستا رہا اور رنڈی بازوں کی طرح بازاری پن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ سلطانہ نے ایک بار کھکیا کے اُس کے بازو پر کاٹ لیا۔ وہ پھر بھی ناراض نہ ہوا۔ نہ اُس نے سلطانہ کو مارا، نہ گالی دی۔ اُس کے جسم پر تھوڑا بہت جو لباس رہ گیا تھا، کرم الٰہی نے اُس کو بھی نوچ کھسوٹ کے پھینک دیا۔

کرم الٰہی کے جانے کے بعد وہ صبح تک بستر پر مادر زاد برہنہ پڑی رہی۔ اُس کا جسم مُردے کی طرح بے جان ہو گیا تھا۔ روتے روتے آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ گلا خشک پڑ گیا تھا۔ قریب ہی پائنتے میں اُس کا بچّہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی۔ بچّے کو لمحہ بھر تک جُھک کر دیکھتی رہی۔ پھر اُس کو سینے سے لگا کر رونے لگی۔

باہر صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپڑے پہنے اور تھکی ہوئی سی بستر پر گر پڑی۔ اُس روز اُس نے ناشتہ بھی کمرے ہی میں کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ دالان میں فیاض اور کرم الٰہی کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُن کے سامنے جاتے ہوئے اُسے ایسا محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگی ہو جائے گی۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے دونوں کوٹھی سے باہر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے ذرا ہی دیر بعد بوڑھا خانساماں گھبرایا ہوا سلطانہ کے پاس آیا۔ وہ بڑا خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

" بیگم صاحبہ! آپ کوٹھی فوراً چھوڑ دیجیے۔ یہ دونوں ننھے کو مار ڈالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا ہے۔"

سلطانہ اُس وقت بچّے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اُس نے جھٹ سے

ننھے ایاز کو سینے سے چمٹا لیا۔ گھبرا کر بولی "یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ تم مجھے خان بہادر کے پاس لے چلو۔"

وہ بولا "وہی تو یہ سب کچھ کرا رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔"

اِس انکشاف پر وہ چونک پڑی۔ یقین نہ آنے کے سے انداز میں بولی۔ "نہیں خانساماں وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتے۔"

وہ کہنے لگا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کرم الٰہی نے مجھ سے خود کہا ہے۔ یہ فیاض، نیاز میاں کا بھائی وائی کہاں ہے۔ خان بہادر نے خواہ مخواہ کا ڈھونگ رچایا ہے۔ یہ تو جائیداد پر قبضہ کرنے کا چکر ہے۔"

وہ انتہائی بے بسی سے بولی۔ "تو اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں، کہاں جاؤں، کس کے پاس جاؤں؟" اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ بوڑھا خانساماں ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔

"میرا بھائی یہاں شہر ہی میں رہتا ہے۔ آپ میرے ساتھ وہاں چلی چلیں۔ مجھے ان لوگوں سے خود خوف آتا ہے۔ کرم الٰہی مجھ کو خود کئی بار دھمکی دے چکا ہے۔ اُس کے ڈر کے مارے تو میں آپ کے پاس اب تک نہ آیا۔ خدا قسم! میں تو کب کا یہاں سے کام چھوڑ کر چلا جاتا۔ مگر آپ کی وجہ سے اب تک پڑا ہوں۔"

دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر یہی طے ہوا کہ فوراً کوٹھی چھوڑ دی جائے۔ یہ اسکیم بنانے کے بعد سلطانہ نے سوچا کہ وہ اپنے زیورات اور قیمتی کپڑے لے کر ان دونوں کی واپسی سے قبل کوٹھی سے چلی جائے۔ مگر اُس نے جب اس کمرے میں، جس کے اندر سارا قیمتی سامان رکھا تھا، جا کر دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فیاض نے راتوں رات سارے ٹرنک اور سوٹ کیس کمرے سے نکال کر

غائب کر دیے تھے۔ اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔

وہ دیر تک دروازے کا پٹ پکڑے افسردہ سی کھڑی رہی۔ بوڑھے خانساماں نے تسلّی دی تو وہ کسی قدر سنبھلی۔ اس وقت اُس کے پاس کچھ اُوپر سو روپے تھے۔ اُس نے ایک سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھا اور خانساماں کو ٹیکسی لانے کے لئے بھیج دیا۔

ذرا دیر بعد ٹیکسی آگئی۔ سوٹ کیس اور سامان اس میں رکھ دیا گیا۔ سلطانہ جب کوٹھی سے باہر جانے لگی تو اچانک اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ سوچا وہ کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ اِس سے تو اچھا یہی ہے کہ وہ کوٹھی میں رہ کر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے۔ مگر اُس کو فوراً ہی ننّھا ایاز یاد آگیا۔ اب وہی اُس کا سہارا رہ گیا تھا۔ وہ اُس کی جان خطرے میں ڈالنے کے لئے کسی طرح بھی تیّار نہ تھی۔

اُس نے حسرت بھری نظروں سے کوٹھی کے در و دیوار کو دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر سڑک پر آگئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک بار پھر اُس نے کوٹھی کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ٹیکسی آگے روانہ ہو گئی۔

(۳)

ایک شام، سلمان دفتر سے دیر میں لَوٹا۔ اُس نے دیکھا، فلیٹ کے نیچے سڑک پر جعفری کی کار کھڑی تھی۔ سلمان کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ جعفری کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ۶ بجے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اُس نے خود ہی تو سلمان سے ۶ بجے شام تک دفتر میں کام کرنے کے لئے کہا تھا۔ اور جب یہ بات تھی تو اُس کی غیر موجودگی میں وہ یہاں کیوں آیا۔ جعفری کا معمول تھا کہ جب وہ

اُس کے فلیٹ پر آتا تو ہمیشہ دفتر سے اُسے اپنے ہمراہ لے لیتا۔ اس چار ساڑھے چار ماہ کے عرصہ میں، جب سے جعفری کی اُس کے مکان پر آمد و رفت شروع ہوئی تھی، صرف ایک بار ایسا ہوا کہ جعفری اکیلا ہی آیا تھا مگر آنے سے قبل اُس نے سلمان سے بتا دیا تھا کہ وہ کس وقت اُس کے فلیٹ پر پہنچے گا۔ سلمان نے نئی جھلکتی ہوئی کار کو غور سے دیکھا، جو سڑک کے کنارے راج ہنس کی طرح پَر پھیلائے کھڑی تھی۔

بلڈنگ کے دریچوں سے دو پارسی لڑکیاں جھانک کر کار کو دیکھ رہی تھیں۔ سلمان نے سوچا جھلکتی ہوئی شاندار کار دروازے پر کھڑی ہو تو لڑکیوں پر رعب تو خوب ہی پڑتا ہے۔ اُس نے غور کیا کہ دونوں لڑکیاں اُس کو دیکھ کر مسکرائی بھی تھیں۔ سلمان نے کئی بار اپنی ٹائی کی گرہ درست کی، اُنگلیوں سے سر کے بالوں میں کنگھی کی اور گردن اُونچی کر کے زینے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

کمرے میں جا کر اُس نے دیکھا، جعفری صوفے کی پشت سے گردن ٹکائے، ٹانگوں کو بے تکلفی سے پھیلا کر اطمینان سے سگرٹ پی رہا تھا۔ اس وقت وہ ہلکا سلیٹی سُوٹ پہنے تھا۔ ٹائی شوخ رنگ کی تھی۔ قریب ہی دوسرے صوفے پر رخشندہ بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر ابھی تک چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں فلموں کے بارے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ سلمان کو دیکھتے ہی جعفری نے زوردار نعرہ لگایا۔

"ہیلو سالومن! میرا خیال ہے تمہیں اتنی دیر نہیں ہونی چاہیئے تھی۔" اُس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "میں ۴۳ منٹ ۱۸ سیکنڈ سے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ سخت بوریت میں مبتلا رہتا اگر مسز سالومن میری مدد کو نہ آتیں۔ تمہیں میری طرف سے پہلے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔"

جعفری نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بڑی بے تکلفی سے باتیں

کر رہا تھا۔ اُس نے سلمان کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے بولا "تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہو رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں فوراً ایک گرم گرم پیالہ چائے کا پینا چاہیئے۔ چائے بہت خوش ذائقہ ہے۔ کیا تم آج کل اورنج پیکو استعمال کر رہے ہو؟ یقیناً وہی ہے۔ اس کی مہک مجھے دھوکا نہیں دے سکتی"۔ وہ بڑی روانی سے بولتا رہا۔

رخشندہ نے چائے بنا کر دی۔ سلمان آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ چائے ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ نہ اُس میں اورنج پیکو کی مہک تھی اور نہ خوش ذائقہ تھی۔ جعفری پر اُس روز باتیں کرنے کا دَورہ پڑا تھا۔ وہ بے تکان بول رہا تھا اور بے تکلفی سے زوردار قہقہے لگا رہا تھا۔

رات کا کھانا بھی اُس نے سلمان کے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کلفٹن جانے کا پروگرام بنا۔ رات کے نو بجے تھے۔ روپہلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا تیکھی تھی۔ رخشندہ بھی اُن کے ساتھ تھی۔ وہ بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ بچوں کی طرح ہنس ہنس کر سادگی سے اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔ کھلی ہوئی گاڑی میں اُس وقت بیٹھنا بڑا رومانٹک لگ رہا تھا۔ شہر سے نکل کر جب وہ کلفٹن جانے والی سڑک پر آ گئے تو راستہ اور بھی رومانٹک ہو گیا۔ سڑک پر حدِ نگاہ تک دو رویہ روشنیوں کی قطار چلی گئی تھی۔

وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو فضا اور بھی زیادہ حسین ہو گئی۔ چاندنی میلوں تک بکھری ہوئی رُیت پر افشاں کی طرح جھلملا رہی تھی۔ سمندر کی لہریں شور کرتی ہوئی اُٹھتیں اور ساحل پر دُور تک بکھر جاتیں۔ تینوں ریت کے ایک ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ اور لہروں کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگے۔ ٹھیک اُس مقام پر جہاں سمندر اور آسمان کی سرحدیں مل رہی تھیں، چند بادبانی کشتیاں آبی پرندوں کی طرح اپنے سفید سفید بادبان لہرا رہی تھیں۔ فضا بڑی سہانی تھی اور اس سہانی فضا میں جعفری کی موجودگی پُرلطف

معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے مزے دار لطیفے سُنا کر خود بھی ہنس رہا تھا۔ ان دونوں کو بھی ہنسا رہا تھا۔

تینوں کلفٹن سے واپس ہوئے تو رات ڈھل چکی تھی۔ سڑکیں شبنم سے بھیگی ہوئی تھیں۔ رخشندہ کا جسم سرد ہوا سے کپکپا رہا تھا۔

سلمان کے گھر جعفری کی آمدورفت جاری رہی۔ اب وہ اکثر سلمان کی غیرموجودگی میں بھی آجاتا اور گھنٹوں بیٹھا بے تکلفی کے ساتھ رخشندہ سے باتیں کرتا رہتا۔ ایک بار وہ اُس کے لئے ایک بڑی قیمتی گھڑی لایا۔ کہنے لگا "لندن سے میرا ایک دوست لایا تھا۔ اُس کو یہ بھی پتہ نہیں کہ میں نے ابھی شادی نہیں۔ جب گھر میں بیوی موجود نہ ہو تو لیڈیز واچ کا کیا جائے۔"

یہ کہہ کر اُس نے خود اپنے ہاتھ سے رخشندہ کی کلائی پر گھڑی باندھ دی۔ گھڑی واقعی بڑی خوب صورت تھی، اور رخشندہ کی گوری گوری کلائی پر سج رہی تھی۔ اس کے بعد بارہا ایسا اتفاق ہوُا کہ رخشندہ کے لئے جعفری کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ سلمان نے ایک دفعہ دبی زبان سے اُس کو منع بھی کیا مگر جعفری نے اُس کی بات قہقہوں میں اُڑا دی۔ کہنے لگا۔

"اگر میرے پاس ایک عدد بیوی نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کوئی خوب صورت چیز بھی نہیں خرید سکتا۔ سالومن! تم مجھ پر اس طرح ظلم نہیں کر سکتے۔ شاپنگ میرا محبوب مشغلہ ہے۔ اور کسی خوب صورت چیز کو خرید کر الماری میں سجانے کا میں قائل نہیں۔ میں اپنے گھر کو میوزیم بنانا نہیں چاہتا۔ اور اب تو یہ گھر بھی میرے گھر کا ہی ایک حصّہ بن گیا ہے۔"

بات بھی ایسی ہی تھی۔ اب وہ سلمان کے یہاں بڑی بے باکی سے مُسکراتا ہوُا آتا اور آتے ہی لاأبالی پن سے کوٹ اُتار کر صوفے پر ڈال دیتا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا اور سلمان کی بیوی سے کہتا۔

"کیا آج رات کے کھانے پر مچھلی کے کباب ممکن ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج مچھلی کے کباب ضرور کھائے جائیں۔"

وہ اپنی فرمائش بے دھڑک بتا دیتا۔ ذرا بھی تکلّف سے کام نہ لیتا۔

سلمان سے اُس کے مراسم روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ دفتر میں بھی وہ اس سے اسی طرح پیش آتا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ دفتر والوں پر سلمان کا بھی رُعب پڑنے لگا۔ اب اُس کی خوب خوب خوشامدیں ہوتیں۔ طرح طرح سے اُس کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کسی کا جعفری سے کوئی کام ہوتا تو وہ سفارش کے لئے سلمان کو پکڑتا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ سلمان اگر جعفری سے کسی سفارش کر دیتا تو اُس کا کام بن جاتا۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود سلمان ان دنوں پریشان رہتا تھا۔ اُس کو اپنے گھر پر جعفری کا روز روز آنا جانا پسند نہیں تھا۔ جب سے جعفری کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی، رخشندہ اُس کی طرف سے بے نیازی برتنے لگی تھی۔ اُس کی حیثیت جعفری کے مقابلے میں گھٹ کر دوسرے درجے پر آ گئی تھی۔ جعفری کی موجودگی میں وہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہتا۔

اُنہی دنوں ایک روز وہ دفتر سے واپس آیا تو بیوی گھر پر موجود نہیں تھی۔ خادمہ نے بتایا کہ وہ جعفری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس طرح جعفری کے ساتھ تنہا گئی تھی۔ سلمان کو اُس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ جھنجلاہٹ میں اُس نے چائے بھی نہ پی۔

شام ہو گئی مگر دونوں واپس نہ آئے۔ سلمان بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

رات ہو گئی۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ پھر نو بجے، دس بجے، رات سنسان ہو گئی۔ سنّاٹا پھیلنے لگا۔ سلمان تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔

۱۱ بجنے کے کچھ دیر بعد دونوں واپس آئے۔ دروازہ سلمان ہی نے اُٹھ کر کھولا۔

جعفری نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔" ارے تم ابھی تک سوئے نہیں۔ تم یقیناً جاگ رہے تھے۔ میں شرط بدنے کو تیار ہوں۔" وہ بے تکلفی سے ہنس رہا تھا۔ رخشندہ البتہ خاموش تھی۔ وہ سلمان کی نظر بچا کر جھٹ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

دونوں فلم دیکھ کر آئے تھے۔ جعفری کچھ دیر تک فلم کی تعریف کرتا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ مگر چلتے چلتے سلمان سے کہتا گیا۔

" سالومن! آر۔ ڈی برانچ سے تمہارے خلاف بڑا سخت نوٹ آیا ہے۔ تم کام سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ درست نہیں۔ کل صبح دفتر میں مجھ سے مل لینا۔"

سلمان کا نصف غصّہ تو اس اطلاع سے رخصت ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ آر۔ ڈی برانچ والوں نے اُس کے خلاف کیوں شکایت کی۔ ضرور اس سے کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ ان دنوں وہ کام کی طرف سے لاپرواہی بھی بہت برت رہا تھا۔ وہ اِسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ بیوی نے آ کر کہا۔

" آپ نے کھانا نہیں کھایا؟"

سلمان نے رُوکھے پن سے کہا۔" نہیں۔"

رخشندہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔" میں ابھی کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔" اور وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سلمان نے اُس کو منع بھی کیا۔ مگر وہ باز نہ آئی۔ باورچی خانے میں برابر برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں اُبھرتی رہیں۔

ذرا دیر بعد رخشندہ کھانا لے کر آ گئی۔ وہ ابھی ابھی آگ کے سامنے

سے اُٹھ کر آئی تھی۔ اُس کے رخسار شعلوں کی تپش سے دہک رہے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر آگئی تھی۔ اِس آب و تاب نے اُس کی دل کشی اور بڑھا دی تھی۔ وہ اُس وقت بڑی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے میز اُٹھا کر لائی۔ اس پر کھانا لگایا اور قریب بیٹھ کر انتظار کرنے لگی کہ وہ کھانا شروع کرے۔ مگر سلمان رُوٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلائے خاموش بیٹھا تھا۔

آخر بیوی نے نوالہ بنایا اور اُس کے مُنہ کے قریب لے جا کر بولی "آپ کو میری قسم تھوڑا سا کھا لیجئے"۔ لیکن سلمان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بگڑ کر بولا۔

"ایک بار کہہ دیا کہ مجھ کو بھوک نہیں۔ پھر تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رخشندہ دیر تک کھانے کے قریب سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر وہ برتن اُٹھا کر باورچی خانے میں گئی۔ رات کے سنّاٹے میں ذرا دیر تک برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اُبھرتی رہی۔ وہاں سے نکل کر وہ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگی۔ سلمان بستر پر چپ لیٹا بیوی کی ہر حرکت دیکھتا رہا۔ ہر آواز کو، ہر آہٹ کو سُنتا رہا۔

چند منٹ بعد وہ کمرے میں آئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اُس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ وہ اُس کے چہرے پر جُھکی۔ سلمان نے آنکھیں بند کر لیں اور رخشندہ کی تیز تیز سانسوں کے لمس کو محسوس کرنے لگا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ پھر اندر آئی۔ کئی بار وہ کمرے میں آئی اور چند لمحے رُک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اس وقت بڑی بے چین معلوم ہو رہی تھی۔ سلمان نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا کہ اُسے اس طرح اپنی بیوی کو پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ خواہ مخواہ جذباتی ہو

گیا تھا۔ اُسے اپنی بیوی پر شُبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ جعفری کے ساتھ تنہا پکچر دیکھنے ہی تو گئی تھی۔ کون سا ایسا بڑا جرم ہو گیا جس کی وہ یہ سزا دے رہا تھا۔ اُسے رخشندہ پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ آخر وہ اُس کی شریکِ حیات ہے۔ اور اُس سے پیار بھی کرتی ہے، ورنہ وہ اس قدر بے قرار نہ ہوتی۔ یہ یقیناً اُس کے قدامت پسند خاندانی پس منظر کا اثر ہے جو وہ اِس طرح اُس کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کے باپ میں اور اُس کی عمر میں چوتھائی صدی سے بھی زیادہ کا فرق ہے اور اس چوتھائی صدی میں زندگی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اُسے زندگی کو اپنے باپ کی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ وہ سخت قدامت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

سلمان چُپ چاپ بستر چھوڑ کر اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ اُس کی بیوی صوفے پر تھک کر سو گئی تھی۔ تیز روشنی میں اُس کا چہرہ بڑا معصوم نظر آ رہا تھا۔ اُس کے جسم کا ایک حصّہ صوفے کے نیچے جھول رہا تھا۔ کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے آ رہے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ سلمان نے آہستہ سے جھنجھوڑا اور بڑے پیار سے بولا۔

"یہاں کھلی ہوا میں کیوں لیٹی ہو۔ طبیعت خراب ہو جائے گی"۔

رخشندہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اُس کے بازو کا سہارا لے کر اُٹھ بیٹھی۔ چند ہی روز بعد وہ پھر جعفری کے ساتھ سلمان کی غیر موجودگی میں باہر چلی گئی۔ اب وہ اکثر اس طرح جعفری کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ مگر نہ تو سلمان نے کوئی باز پُرس کی اور نہ رخشندہ نے کبھی پشیمانی کا اظہار کیا۔ پھر اکثر ایسا ہوا کہ وہ موجود بھی ہوتا تو جعفری صرف تکلفاً پُوچھتا۔

"کیا تم پکچر جانے کے مُوڈ میں ہو؟" اور فوراً کہتا "تم یقیناً تھکے ہوئے ہو۔ تم کو آرام کرنا چاہیئے"۔ وہ گھڑی دیکھ کر اُس کی بیوی کو آواز دیتا "تم ابھی تک

تیار نہیں ہوئیں رخشی!" وہ اب رخشندہ کو رخشی ہی کہتا تھا۔ ذرا دیر بعد رخشندہ کی آواز آتی۔" ابھی آئی" پھر وہ بن سنور کر آجاتی۔ اس وقت وہ ہالی وڈ کی اصطلاح میں "اِٹ گرل" معلوم ہوتی تھی۔

بعد میں جعفری نے سلمان سے تکلّفاً پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ روزانہ شام کو سلمان کے گھر آتا، وہ اور رخشندہ مسکراتے ہوئے باہر چلے جاتے۔ سلمان کمرے میں تنہا بیٹھا سوچا کرتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ کیا اُسے دونوں کا حد سے بڑھتا ہُوا یہ میل جول روک دینا چاہیئے۔ وہ الٹرا ماڈرن بننے کی کوشش کے باوجود ماڈرن بھی نہیں بن سکا تھا۔ اُسے اِس بات سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھُٹ رہا تھا۔ اس کی صحت پر بُرا اثر پڑرہا تھا۔ اُس نے بارہا سوچا کہ اُسے ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ مستقل آزار بن جائے گا۔

ایک روز اُس نے سنجیدگی کے ساتھ طے کیا کہ اُس کو جعفری کی آمد و رفت بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس طرح جعفری کے ناراض ہوجانے کا خدشہ تھا اور جعفری کی ناراضگی کا مطلب تھا کہ مُلازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ لہذا ایسا قدم اُٹھانے سے پیشتر پہلے دوسری ملازمت تلاش کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اُس نے ملازمت کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ مگر کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے پانچسو کے بجائے کہیں دو سو روپے کی بھی نوکری نہ ملی۔

دوسری ملازمت نہ ملی، لہذا وہ جعفری کو ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

سلمان نے سوچا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ رخشندہ کو جعفری کے ساتھ تنہا نہ جانے دے۔ خود بھی اُس کے ہمراہ جایا کرے۔ اس طرح اس تکلیف سے تو بچ جائے گا جو ان دونوں کے جانے کے بعد وہ محسُوس کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز جب دونوں باہر جانے لگے تو سلمان بھی اُن کے ہمراہ چلا گیا۔

مگر اُس روز اُس کو اور بھی زیادہ اذیت پہنچی۔ شام کی چائے اُنھوں نے تیزان

میں تھے۔ وہاں جعفری کے کچھ دوست بھی آ گئے۔ اور جب اُس نے رخشندہ کا تعارف مسز سلمان کہہ کر کرایا تو ہر ایک نے چونک کر اس طرح سلمان کو دیکھا جیسے اُن کو جعفری کی بات پر یقین نہیں آیا۔ سلمان نے سوچا کیا وہ واقعی بدصورت ہو گیا تھا یا اپنی وضع قطع سے اس قابل نہیں لگتا کہ اُس کو رخشندہ کا شوہر سمجھا جائے۔ یہ تکلیف کیا کم تھی۔ اس پر مستزاد جعفری کے دوستوں کی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اُن کے جملوں کا طنز تھا۔ بلکہ ایک بار تو وہ بلبلا اُٹھا۔ جعفری نے اپنے ایک دوست سے اُس کا تعارف کرایا تو وہ فوراً بولا۔

" تو گویا آپ ہیں مسٹر سلمان"۔ اُس کے لہجے میں غضب کا طنز تھا۔" آپ کی بیگم سے تو جعفری کے ساتھ اکثر مُلاقات ہوئی۔ مگر آپ سے بھی ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ تو جی بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔

سلمان نے پوچھا " آپ کو یہ کیسے معلوم ہُوا کہ میں بہت دلچسپ آدمی ہوں"۔

وہ کہنے لگا " کسی دن بیگم کے ساتھ میرے یہاں آ کر چائے پیجئے تو میں بتاؤں کہ آپ کتنے دلچسپ آدمی ہیں۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی"۔ پھر اُس نے اپنا ٹیلیفون نمبر اور کوٹھی کا پتہ بتایا۔ وہ وزارتِ صنعت و تجارت میں ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ " تو آپ دونوں کب آ رہے ہیں؟ ٹیلیفون کر دیجئے گا۔ میں اپنی کار بھیج دوں گا"۔

سلمان اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے جھنجلا کر دل ہی دل میں کہا۔ یہ سالا رشوت کی کمائی پر پلا ہوا مسٹنڈا ایم۔ اے نواز، کیا مجھ کو بھڑوا سمجھ رہا ہے یا محض اُلّو کا پٹھا، جو اس طرح رخشندہ کو اپنی کوٹھی پر لانے کے لئے مجھ سے بیباکی سے بات کر رہا ہے۔ اُس کا جی چاہا کہ نواز کے منہ پر کس کے ایک تھپڑ رسید کرے۔

جعفری فوراً بھانپ گیا کہ سلمان کو نواز کی بات ناگوار گزری۔ مسکرا کر بولا۔ "نواز! میرا مشورہ ہے تم ڈیل کارنگی کو ضرور پڑھو۔ میری مُراد اُس کی کتاب ہاؤ ٹو وِن فرینڈز سے ہے۔"

نواز کو بھی سلمان کی ناراضگی کا اندازہ ہو گیا تھا، لہٰذا وہ ڈیل کارنگی کے بارے میں جعفری سے باتیں کرنے لگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

اُس دن کے بعد سلمان پھر ان دونوں کے ہمراہ نہ گیا۔ اور اندر ہی اندر گھُٹتا رہا۔ اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رخشندہ بڑی بے باکی سے جعفری کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی اب جعفری کا بیشتر وقت سلمان ہی کے فلیٹ میں گزرتا۔

ایک اتوار جعفری نے سلمان کی ڈیوٹی دفتر میں لگا دی۔ وہ خود بھی دفتر آیا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ دھابے جی آؤٹنگ کے لئے جا رہا ہے۔ جنرل مینیجر کا شاید فون آئے تو اُس سے کہہ دے کہ وہ کسی رشتہ دار کو رخصت کرنے ایئرپورٹ گیا ہے۔ سلمان ۳ بجے تک دفتر میں کام کرتا رہا۔ اُس کے سر میں شدید درد تھا۔ لہٰذا وہ جلد ہی دفتر سے اُٹھ گیا۔ واپس گھر آیا۔ دیکھا، جعفری کی کار اُس کے فلیٹ کے نیچے کھڑی تھی۔ کار کو دیکھتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

سلمان غصّہ سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اُس نے بازار میں جا کر ایک چاقو خریدا اور یہ طے کر کے گھر میں گھُسا کہ وہ آج جعفری اور رخشندہ دونوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔ اُس کے سر پہ خون کھیل رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے چاقو کو وہ داہنے ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اپنی ذلت کا انتقام لینے کا اُس کی سمجھ میں یہی طریقہ آیا۔ روز روز کے چرکوں نے زندگی اُس کے لئے عذاب بنا دی تھی۔

اُس نے تیز تیز قدموں سے زینے کی سیڑھیاں طے کیں۔ غصّے میں دروازہ زور سے دھکّا دے کر کھولا۔ ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا دوسرے کمرے میں گیا۔ سامنے مسہری پر جعفری لیٹا تھا۔ اُس کی بیوی سرہانے بیٹھی جعفری کا سر دبا رہی تھی۔

سلمان کا غصہ اور تیز ہوگیا۔ وہ دہلیز پر سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ چاقو مضبوطی سے اُنگلیوں میں بھینچ لیا اور چیخ کر بولا "رخشی!"

اُس کی بیوی نے گھبرا کر دیکھا اور فوراً اُس کے قریب آگئی۔ اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "آہستہ بولئے، جعفری کی طبیعت خراب ہے!"

سلمان نے خونخوار نظروں سے گھور کر رخشندہ کو دیکھا۔ اُسی وقت جعفری کی آواز اُبھری۔

"سالومن! کیا بات ہے، میرے پاس آؤ۔"

جعفری اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سلمان کو خاموش دیکھ کر اُس نے کہا "تم رُوٹھے بچوّں کی طرح وہاں کیوں کھڑے ہو۔ یہاں تو آؤ! آؤ بھئی۔" اُس کا لہجہ سرپرستانہ تھا اور تحکمانہ بھی۔ سلمان آہستہ آہستہ چل کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

جعفری کہنے لگا "کیا تم مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو گے؟ میری طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔"

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ سلمان نے خاموشی کے ساتھ اُس کی پیشانی کو چھُوا۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔ اُس نے گھبرا کر جعفری سے کہا۔

"ارے آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے۔"

جعفری نے کراہتے ہوئے کہا "بہت خراب ہو رہی ہے طبیعت۔"

"میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

"نہیں میں خود چلوں گا۔"

سلمان نے سہارا دے کر اُس کو نیچے اُتارا اور اُس کو سنبھالے ہوئے کار تک لے گیا۔ رخشندہ بھی ساتھ تھی۔ کار وہی چلا رہی تھی۔ سلمان کو پہلی بار علم ہوا کہ وہ کار بھی چلانا سیکھ گئی تھی۔

تینوں ڈاکٹر کے کلینک پہنچے۔ واپسی پر سلمان جعفری کو چھوڑنے اُس کی کوٹھی گیا اور رات گئے تک وہاں رہا۔ رخشندہ بڑی مستعدی سے جعفری کی تیمارداری کرتی رہی سلمان خاموش بیٹھا اُس کو دیکھتا رہا۔

جب وہ گھر لوٹا تو چابی اُس کی جیب میں پڑا تھا۔ اور جعفری کی تیمار داری اور دیکھ بھال کے لئے رخشندہ وہیں ٹھیر گئی تھی۔

(۱۷)

سلطانہ کو بوڑھے خانساماں کے بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے دو مہینے ہو گئے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ مزاج میں نرمی تھی۔ بڑے بھائی کی طرح کم سخن اور مرنجاں مرنج تھا۔ بازار میں اُس کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ وہ صبح کا نکلا رات گئے گھر میں داخل ہوتا۔ تمام دن دکان پر بیٹھا رہتا۔

وہ سلطانہ کی بڑی عزت کرتا تھا اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ اُس کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مگر اُس کی بیوی بڑی نک چڑھی اور منہ پھٹ تھی۔ ذرا سی بات پر آنکھیں نکال کر کھڑی ہو جاتی۔ ہر سال اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ اب تک گیارہ کی پلٹن تیار کر چکی تھی۔ درجن کا آخری بچہ اُس کے پیٹ میں تھا۔ وہ دن بھر بچوں کو چیخ چیخ کر گالیاں دیتی۔ ہر وقت اُس کی ناک پر غصہ رہتا۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی اور اُس نے دہاڑنا شروع کر دیا۔ اُس کا تذ

ٹھگنا تھا اور نچلا دھڑ خوب، پھیلا ہُوا تھا۔ دیکھنے میں اچھی خاصی بھوری بھینس معلوم ہوتی تھی۔

سلطانہ کو وہ پہلے ہی دن سے اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ اُس سے بہت کم بات چیت کرتی۔ سلطانہ نے کبھی اُس سے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی چھوٹا سا گھر تھا جس میں کُل دو کمرے تھے۔ مگر سلطانہ کو رہائش کے لئے ایک کمرہ مِل گیا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت کمرے کے اندر گزارتی۔ ننھے ایاز کی ان دنوں طبیعت خراب تھی۔ دانت نکل رہے تھے۔ وہ ہر وقت ماں کی گود میں چڑھا رہتا۔ ماں لمحہ بھر کو جُدا ہوتی تو وہ ریں ریں کرنا شروع کر دیتا۔

بُوڑھا خانساماں ابھی تک بے روزگار تھا اور ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ سلطانہ اپنے ساتھ جو روپے لائی تھی، وہ خرچ ہو چکے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا وہ گھر میں کھاتی تھی۔ البتہ بچے کے دودھ اور دوسری ضروریات پر وہ اپنے پاس سے خرچ کر رہی تھی۔ جب سارے روپے خرچ ہو گئے تو ایک روز اُس نے خانساماں کو بُلایا اور کانوں میں پڑے ہوئے سونے کے آویزے نکال کر خانساماں کو دئے کہ وہ ان کو فروخت کر دے۔

خانساماں نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔" بیگم صاحبہ! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

سلطانہ بولی۔" دیکھو بابا تم مجھے بیگم صاحبہ نہ کہا کرو۔ مجھے بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔" وہ اب اُس کو خانساماں کے بجائے بابا کہنے لگی تھی۔

وہ مسکرا کر بولا۔" تو پھر کیا کہا کروں؟"

" جو آپ کا جی چاہے۔ ویسے آپ میرا نام تو جانتے ہی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔" چلو بھئی اللہ میاں نے مجھ کو اتنی بڑی پالی پوسی بیٹی دے دی۔" اُس نے سلطانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔" اچھا اب تم یہ بُندے پہن

لو۔ میرے پاس ابھی کچھ رقم پڑی ہے۔ فی الحال تم اس سے کام چلاؤ۔ جب تک اللہ میرا کام لگا دے گا۔"

سلطانہ نے بہت اِصرار کیا مگر وہ آویزے فروخت کرنے پر رضامند نہ ہُوا۔ اُسی وقت جاکر اُس نے اپنا صندوق کھولا اور پچاس روپے لاکر سلطانہ کو دیدئے۔ سلطانہ نے روپے تو لے لئے مگر اُس کو بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا اِس طرح کب تک کام چلے گا۔ کب تک وہ بوڑھے خانساماں سے روپے لیتی رہے گی۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اُنہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اُس کو سخت پریشان کر دیا۔

شاید جمعہ تھا۔ اُس روز خانساماں کا چھوٹا بھائی دکان سے سرِ شام ہی واپس آگیا تھا۔ جمعہ کو وہ عام طور پر جلد ہی گھر آجاتا تھا۔ اُس روز وہ بازار سے مٹھائی لایا تھا۔ اُس نے سلطانہ کو بھی مٹھائی بھجوانا چاہی تو اُس کی بیوی بگڑ کر بولی۔

"بس رہنے دو، بہت ہو چکیں خاطر داریاں۔ اپنے گھر میں کھانے والے کچھ کم ہیں جو تجھ کو مجھ کو کھلاتے پھر رہے ہو۔ خواہ مخواہ کے لئے بڑے بھیا نے ایک مصیبت لاکر ہمارے سر پر ڈال دی۔ بیگم ہوں گی اُن کے لئے۔ اُنہوں نے نمک کھایا ہے۔ ہمارے ساتھ کیا کر دیا جو دونوں وقت پلنگ پر بٹھا کر دسترخوان لگائیں۔"

وہ بڑی سرکش عورت تھی۔ ایک زبان میں دس باتیں کہتی تھی۔ تڑاق پڑاق بولتی چلی گئی۔ سلطانہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ درمیان میں دیوار تھی۔ مگر آواز صاف سُنائی پڑ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اس عورت کے منہ سے ایسی جلی کٹی باتیں کئی بار سُن چکی تھی۔ ذرا دیر بعد اُس کے شوہر کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"نیک بخت کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔ خدا کسی پر بُرا وقت نہ ڈالے بے چاری مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا لیتی ہے۔ دو وقت کا کھانا کھا

لیتی ہے تو اس میں کیا جاتا ہے۔ اللہ نہ جانے کس کے نصیب سے دیتا ہے۔"

بیوی اُس کے سمجھانے پر اور بھڑک اُٹھی۔ چیخ کر بولی "بس، بس رہنے دو اپنی خدا ترسی۔ ہم کون سے بڑے دھنّا سیٹھ ہیں۔ نہ جانے کس طرح رُوکھا سُوکھا کھا کر گزارہ ہو رہا ہے۔ اُوپر سے یہ مصیبت اور سر پہ آ گئی۔ یہ بڑے بھیّا اچھے خاصے دفعان ہو گئے تھے۔ اب آئے ہیں تو اپنے ساتھ یہ دُم چھلّا لگا کے لے آئے۔ خود بھی ٹھونس رہے ہیں اور اپنے الغنتون کو بھی ٹھُنسوا رہے ہیں۔"

وہ اُونچی آواز سے بول رہی تھی۔ سارے گھر میں اُس کی آواز گونجنے لگی۔ شوہر نے فوراً کہا "آہستہ بولو۔ وہ بے چاری سُنے گی تو کیا کہے گی؟"

وہ اور زور سے چلّا کر بولی "سُن رہی ہے تو سُننے دو۔ میں کسی کے لئے اپنے منہ میں قفل نہیں ڈالوں گی۔ میرا گھر ہے چاہے جس طرح بات کروں۔ دیکھو میں نے تم سے کہہ دیا کہ مجھ سے اب نہیں کھلایا جائے گا۔ تم بڑے بھیّا سے کہہ دو کہ وہ اپنی مصیبت اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہ سرائے یا ہوٹل نہیں ہے جس کا جی چاہا آ کر ٹھہر گیا۔ واہ واہ یہ بھی خوب رہی۔ خود مزے سے اینڈتے پھرتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ نچا کر نفرت سے منہ بگاڑا۔ "بھئی نوکری نہیں لگتی۔ اسے نوکری ملے تو کیسے، کوئی تلاش بھی کرے۔ اللہ دے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو۔"

شوہر مری ہوئی آواز سے بولا "اچھا اچھا میں اُن سے بات کروں گا۔ اب تو تم چُپ ہو جاؤ۔"

مگر وہ باز نہ آئی۔ کہتی رہی "اگر تم نے اُن سے نہ کہا تو خدا قسم میں سامان باہر رکھوا دوں گی اور دونوں سے کہوں گی کہ بڑھاؤ اپنا ٹٹو یہاں سے۔ بہت ہو چکی مہمان داری۔"

وہ زچ ہو کر بولا "خدا کے لئے تم اب چُپ ہو جاؤ۔ بس بہت کہہ

چٹکیں۔"

وہ بجائے چپ ہونے کے اور زیادہ زور زور سے چیخنے لگی۔ جو اُس کے جی میں آیا، کہتی چلی گئی۔ اور اُس کے ساتھ اُس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ شوہر سیدھا سادا دبّو آدمی تھا۔ ہنگاموں سے جلد گھبرا جانے والا۔ بجائے اس کے کہ وہ بیوی کو ڈانٹتا اُلٹا اُس کی خوشامد کرنے لگا۔

سلطانہ دم بخود بیٹھی ایک ایک بات، ایک ایک آواز سُنتی رہی۔ اُس نے سوچا اب۔ اس گھر میں وہ زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھیر سکتی۔ اس بات کو وہ رات گئے تک بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ کس کے پاس جائے۔ کہاں جائے۔ کئی بار اُس نے انتہائی نا اُمیدی کے عالم میں سوچا کہ اس زندگی سے تو موت بھلی۔ پھر اُس رات ایک ایسا لمحہ بھی آیا کہ اُس نے سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

بہت دنوں کی بات ہے، ایک بار ماں نے اُسے بتایا تھا کہ محلّہ کی ایک عورت نے ٹنکچر آیوڈین پی کر خودکشی کر لی تھی۔ سلطانہ کو تھوڑے سے ٹنکچر کی ضرورت تھی۔ اُس نے سوچا جب رات سُنسان ہو جائے گی اور گھر میں سب لوگ سو جائیں گے تو پہلے وہ ننھے ایاز کو ٹنکچر پلائے گی۔ پھر خود پی لے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ صبح کو بستر پر صرف لاشیں ہی ملیں گی۔ رات بھر وہ یہی سوچتی رہی اور چُپکے چُپکے آنسو بہاتی رہی۔

صبح اُس کی آنکھ دیر سے کُھلی۔ بستر سے اُٹھنے کے ساتھ ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ترکاری کاٹنے والی چھُری سے اپنی پنڈلی کو چیر ڈالا۔ چھُری کُند تھی۔ سلطانہ کو زخم لگانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار اُس کا ہاتھ کانپ جاتا۔ مگر پنڈلی کو زخمی کرنا ضروری تھا۔ ورنہ وہ ٹنکچر آیوڈین کیا کہہ کر منگواتی۔

پنڈلی زخمی کرنے کے بعد ٹنکچر کے لئے خانساماں کا انتظار کرنے لگی۔
وہ سویرے بہت تڑکے اُٹھ کر کہیں چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔
دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ ہر طرف دُھوپ پھیل گئی تھی۔ سلطانہ نڈھال بیٹھی تھی۔
بچہ اُس کی گود میں سو رہا تھا۔ اسی اثناء میں صغرا آ گئی۔ وہ چھریرے جسم کی زرد رُو
عورت تھی۔ دو چار مکان چھوڑ کر اُس کا گھر تھا۔ اکثر آیا کرتی تھی۔ سلطانہ سے
بھی اُس کی تھوڑی بہت یاد اللہ ہو گئی تھی۔ صغرا ان دنوں سخت پریشان تھی۔
اُس کے شوہر نے ایک طوائف کو گھر میں بٹھا لیا تھا اور اب اُسی کے ساتھ
رہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ صغرا اور اُس کے بچّوں کے اخراجات کے لئے
کچھ نہ کچھ دیتا رہتا تھا، مگر پچھلے کئی ماہ سے خرچ دینا تو ایک طرف، وہ اس
طرف آ کر جھانکا تک نہیں تھا۔ صغرا پر کئی کئی وقت کے فاقے پڑ رہے تھے۔
سلطانہ خود مصیبت کی ماری تھی، اسی لئے اُس کو صغرا سے
ہمدردی تھی۔

صغرا گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اُس کے پاس آئی۔ اُس روز
خلافِ توقع اُس کا چہرہ کھِلا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ سلطانہ کا
اُس وقت بات چیت کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ اور
اس تنہائی میں بیٹھ کر وہ ان باتوں کو سوچنا چاہتی تھی جو پچھلی رات سے اُس کے
دماغ میں منڈلا رہی تھیں۔ جن کو دُہرانے میں اُس کو مزا آ رہا تھا۔ یہ موت کا
ذائقہ تھا۔ مر جانے کی حسرت تھی۔

اُس کے چاروں طرف گہری تاریکی کا جال پھیلا تھا اور اس جال میں
اُلجھی ہوئی وہ اپنی اُکھڑتی ہوئی سانسوں کو محسوس کر رہی تھی۔ ان لمحوں کو دیکھ
رہی تھی، جب وہ اپنے بچّہ کو تیز بدبودار تیزابی ٹنکچر پلائے گی۔ بچّہ پہلے گھبرا
کر روئے گا۔ پھر تڑپے گا۔ اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں گی، منکا ڈھلک جائے گا

وہ مر جائے گا۔ وہ اُس کی لاش اُٹھاکر سینے سے چمٹالے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پیشانی کو چُومے گی۔ دوسرے لمحہ آیوڈین کی شیشی اُس کے ہاتھ میں ہوگی اور تیزابی مادہ اُس کے حلق سے نیچے اُتر رہا ہوگا۔ پھر اُس کا دل کٹنے لگے گا۔ وہ تڑپنے لگے گی۔ آنکھوں کے سامنے ہر چیز دُھندلی پڑتی جائے گی۔ ایک ہچکی، دوسری ہچکی اور پھر قصّہ ختم!

صبح بستر پر اُس کی لاش پڑی ہوگی۔ اُس کے برابر ننھّے ایاز کا مُردہ ہوگا۔ سب سے پہلے کمرے میں بابا آئے گا۔ اور اُس کی لاش دیکھ کر رو پڑے گا۔ وہ ضرور روئے گا۔ اُس کو ضرور دُکھ ہوگا۔ اور اُس کی بھاوج ضرور اُسے کوسنے دے گی۔ حرامزادی کو یہیں آکر مرنا رہ گیا تھا۔ وہ زور زور سے چیخے گی۔ اُس کا زن مُرید شوہر، اُس کو چُپ کرانے کے لئے منّت سماجت کرے گا۔ اور بستر پر لاش سڑ پڑ چکی ہوگی۔ اُسے کچھ بھی خبر نہ ہوگی۔

ان تمام باتوں کو وہ سوچ چکی تھی، سوچ رہی تھی اور دیر تک سوچنا چاہتی تھی۔ بار بار اُس کا دل بھر آتا۔ وہ رو پڑتی۔ رونے میں اُسے تسکین مِل رہی تھی۔ اِس لذت کا نام ہے قنوطیت۔ بند رگھاؤ۔ کریدتے جاؤ اور لُطف اُٹھاتے جاؤ۔ شکست خوردہ انسان کا آخری حربہ۔ ایک پناہ گاہ۔ اور اس پناہ گاہ میں سلطانہ سب کی نظریں بچاکر رُوپوش ہوجانا چاہتی تھی۔

مگر صغرا اُس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اُس وقت وہ کسی قدر ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ اُس نے خود ہی بات چھیڑی۔ کہنے لگی: "اللہ میاں نے میری تو سُن لی۔" لیکن سلطانہ نے اُس کی بات بالکل نہ سُنی۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش تھی صغرا کہتی رہی: "نہ اب اس حرامزادے (شوہر) کے آگے ہاتھ پھیلانے کی مجھے ضرورت ہے نہ تیرے میرے احسان اُٹھانے کی۔ اپنے ہاتھ پاؤں سلامت۔ اب تو دو چار کو بٹھاکر کھلانے کا دم ہے۔"

سلطانہ نے اُس کی باتوں پر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

صُغرا لمحہ بھر رُک کر بولی "اے کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

سلطانہ نے بے نیازی سے کہا "اچھی ہے۔"

"بڑی چُپ چُپ نظر آ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" سلطانہ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

صغرا مسکرا کر بولی "میں تو آج کل ٹھاٹھ سے کام پر جا رہی ہوں۔ اِسی لئے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔" اِس دفعہ سلطانہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل گیا۔

"کہاں مِل گیا کام؟"

"اے وہ کیا نام ہے اُس کا۔ انڈسٹریل ہوم۔ انگریزی میں نام رکھا ہے۔ یاد بھی تو نہیں رہتا۔"

سلطانہ کی دلچسپی بڑھنے لگی "کیا کام ہوتا ہے وہاں؟"

وہ بتانے لگی "فی الحال تو مَیں سلائی کا کام کرتی ہوں۔ ویسے کام سیکھ بھی رہی ہوں۔ وہاں تو نہ جانے کتنی طرح کے کام ہوتے ہیں۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں۔ خدا قسم بڑے اچھے اچھے گھروں کی عورتیں آتی ہیں۔"

"تمہیں تنخواہ مِلتی ہے؟"

"جتنا کام کرو، اُتنی ہی آمدنی۔ ہفتے کے ہفتے حساب مِل جاتا ہے۔"

سلطانہ نے جلدی سے پُوچھا "مجھے بھی وہاں کام مِل جائے گا؟"

مرنے کی تمنّا پر زندہ رہنے کی خواہش حاوی ہو گئی۔ سلطانہ بالکل بھول گئی کہ پچھلی رات سے اب تک وہ کیا کیا سوچتی رہی تھی۔ اُس نے کس کس طرح اپنا گلا کاٹا تھا، اور کس کس طرح خود کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر زندگی پھر زندگی ہے۔

حرکت اور حرارت ۔ جدوجہد مسلسل جدوجہد ۔

صغرا نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا "تم کام کرو گی ؟"

"کیوں کیا ہوا ؟"

"تو پھر کسی دن میرے ساتھ چلو ۔"

سلطانہ بولی "آج ہی لے چلو ۔"

صغرا نے کہا "میں دس بجے جاؤں گی ۔ تم تیار ہو جاؤ ۔ میں آکر تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گی ۔"

سلطانہ آمادہ ہو گئی ۔

صغرا چلی گئی ۔ سلطانہ نے اُٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا ۔ صاف سُتھرے کپڑے پہنے ۔ پنڈلی کا زخم نہ یاد آیا ، نہ اُس نے توجہ دی ۔

دس بجے سے کچھ دیر پہلے ہی صغرا آ گئی ۔ سلطانہ اُس وقت تک تیار ہو چکی تھی ۔ اُس نے ننھے ایاز کو خانساماں کی بڑی بھتیجی کے سپرد کیا ۔ اور صغرا کے ہمراہ گھر سے باہر نکلی ۔ صغرا اُس کو انڈسٹریل ہوم کے بجائے پہلے فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر لے گئی ۔ انڈسٹریل ہوم میں داخلے کی اجازت وہیں سے ملتی تھی ۔

دونوں وہاں پہنچیں تو دس بج چکے تھے ۔ ہیڈ کوارٹر کو دیکھ کر سلطانہ کو شبہ سا ہوا کہ وہ اس عمارت کو پہلے بھی کبھی دیکھ چکی ہے ۔ مگر وہ اس بات پر زیادہ توجہ نہ دے سکی ۔ شبہ صرف شبہ کی حد تک رہا ۔ اس عمارت کو جب پہلی بار اُس نے دیکھا تھا ، اُس وقت اندھیری رات تھی ۔ اور پھر اُس کی زندگی میں اُس وقت سے اب تک اتنی تیزی سے تبدیلیاں رُونما ہوئی تھیں کہ بہت سی باتوں کی یاد تک دُھندلا گئی تھی ۔

ہیڈ کوارٹر میں اس وقت علی احمد ڈیوٹی پر تھا ۔ صغرا نے سلطانہ کو اُس سے ملایا ۔ وہ سلطانہ کو انڈسٹریل ہوم میں داخل کرنے پر رضامند ہو گیا ۔ اُس نے

اسی وقت سلطانہ کا نام رجسٹر میں درج کیا اور داخلہ کا ٹکٹ بنا کر دے دیا۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ انڈسٹریل ہوم ہی میں اُس کی رہائش کا بھی بندوبست، ہو جائے مگر علی احمد نے اُس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ صاف کہہ دیا

" دیکھئے ہم آپ کو رہنے کی جگہ نہ دے سکیں گے۔ اِس کا بندوبست تو آپ کو خود ہی کرنا پڑے گا۔"

سلطانہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔" میں جہاں رہتی ہوں، وہ لوگ مجھے زیادہ عرصہ اپنے ساتھ ٹھہرانا نہیں چاہتے۔ میرا یہاں کوئی نہیں ہے جس کے پاس جا کر ٹھہر جاؤں۔"

" کوئی نہ کوئی تو ضرور ہو گا۔ میرا مطلب ہے کوئی عزیز، کوئی رشتہ دار۔"

وہ بولی۔" اگر اتنا ہی سہارا ہوتا تو میں آپ سے اس طرح کیوں کہتی۔"

علی احمد ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔" آپ کل اِسی وقت آئیے گا تو میں کچھ بتا سکوں گا۔ فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

سلطانہ کے لئے اب زیادہ اصرار کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ صغرا کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔

دوسرے روز وہ پھر ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ علی احمد دفتر میں موجود تھا۔ سلطانہ کو دیکھ کر بولا۔" انڈسٹریل ہوم میں تو ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔ آپ وہاں جائیں گی تو آپ کو خود اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ سردست یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہیڈ کوارٹر میں ٹھہر جائیں۔ یہاں آپ کو رہنے کے لئے ایک کمرہ مل جائے گا۔ مگر یہ آپ کی عارضی رہائش ہو گی۔ اسکائی لارک کوشش کر رہے ہیں کہ بستی میں آپ کے لئے مکان کا بندوبست کر دیا جائے۔"

سلطانہ نے خاموشی سے اُس کی بات مان لی۔ وہ اُسی روز اپنا سامان لیکر

وہاں پہنچ گئی۔ اسکاؤٹ لڑکوں نے سلطانہ کے لئے کمرہ خالی کر دیا۔ کمرہ بہت مختصر تھا مگر صاف ستھرا تھا۔

چند روز تو سلطانہ کو ہیڈکوارٹر میں بڑی وحشت معلوم ہوئی۔ وہاں سب مرد ہی مرد تھے۔ وہ انڈسٹریل ہوم سے شام کو لوٹتی اور زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ کبھی کبھار کسی کام سے باہر نکلنا پڑتا تو اُس کو بڑی شرم معلوم ہوتی۔ لیکن ننھا ایاز بہت جلد اسکاؤٹ لڑکوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ گھنٹوں اُن کے پاس کھیلا کرتا۔

سلطانہ دس بجے انڈسٹریل ہوم چلی جاتی۔ سینے پرونے کے علاوہ اُس کو تھوڑی بہت کشیدہ کاری بھی آتی تھی۔ اُس کو اسی کام پر لگا دیا گیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ زردوزی اور لکڑی کے کھلونے بنانے کا کورس بھی مکمل کر رہی تھی۔ کام میں سب سے بڑی مشکل ننھا ایاز تھا، جس نے شروع شروع میں رو رو کر اُس کو بہت پریشان کیا۔

انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے والی عورتوں میں بہت کم ایسی تھیں جو ننھے ننھے بچّوں کو اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ بچّوں سے چونکہ کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی تھی، اس لئے عام طور پر انڈسٹریل ہوم میں بچّوں والی عورتوں کو بہت کم داخلہ ملتا تھا۔ ویسے بچّوں کے لئے انڈسٹریل ہوم میں ایک لمبا سا دالان تھا۔ جس میں کئی پالنے پڑے تھے، جو بچّے گھٹنوں چلنے والے تھے، اُن کے واسطے لکڑی کی باڑھ لگا کر چھوٹا سا احاطہ بنا دیا گیا تھا، جہاں وہ کھیلتے رہتے۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا بھی مقرر تھی۔

سلطانہ رفتہ رفتہ ہیڈکوارٹر کے ماحول سے مانوس ہوتی گئی۔ علی احمد سے وہ ایک بار بات چیت کر چکی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی کبھار اس سے بات کر لیا کرتی۔ ننھا ایاز علی احمد سے بہت ہل گیا تھا۔ اِس لئے گفتگو کرنے کا روزانہ

کوئی نہ کوئی بہانہ نکل ہی آتا تھا۔ ذرا اطمینان نصیب ہُوا تو اُسے نوشا کا خیال ستانے لگا۔ اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اُس نے آخری بار اُسے پولیس کی حراست میں دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں پڑی تھیں۔

وہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرنا چاہتی تھی، مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ اگر اُس نے نوشا کے متعلق کچھ کہا تو اُسے اور بھی ایسی باتیں بتانا پڑیں گی جن کو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن ہے اُن کو سُن کر علی احمد اُس کے بارے میں کوئی اُلٹی سیدھی رائے قائم کر لے اور اُسے ہیڈ کوارٹر سے بھی نکلنا پڑے۔

ویسے اسکائی لارکوں کو بھی سلطانہ سے خاصی مدد ملتی تھی۔ وہ اُن کے پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کر دیا کرتی۔ قمیصوں میں بٹن ٹانک دیتی۔ ہفتہ کی رات کو فلک پیما کا اجلاس ہوتا تو وہ اسکائی لارکوں کے لئے چائے تیار کر دیتی۔ سارے اسکائی لارک اُس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ اُس سے بات کرتے تو نظریں نیچی کر کے۔ کبھی بلا وجہ اُس سے بات چیت کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ اگر وہ اُن کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی تو وہ بار بار اُس کا شکریہ ادا کرتے۔

سلطانہ کو اسکائی لارک بڑے عجیب و غریب لوگ معلوم ہوئے۔ وہ بلا کسی غرض کے سب کی خدمت کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ وہ اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا کھاتے، موٹا جھوٹا پہنتے اور بڑے مطمئن نظر آتے۔ بات کرتے وقت اُن کا لہجہ نرم ہوتا۔ وہ ننھے ایاز کے ساتھ کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح قہقہے لگا کر کھیلتے تھے۔ اور وہ اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ ہُمک ہُمک کے اُن کے پاس جاتا اور گھنٹوں ماں کے پاس آنے کا نام

نہ لیتا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ علی احمد اُس کے پاس اپنی قمیض میں رفو کرانے کے لئے آیا۔ اُس نے بلا کسی تمہید کے سلطانہ سے کہا "آپ پڑھائی کیوں نہیں شروع کر دیتیں۔"

سلطانہ نے فوراً کہا "آپ مجھے پڑھا دیا کریں گے؟"

علی احمد ذرا دیر خاموش رہا، پھر اُس نے کہا "میں شام کو صرف آدھ گھنٹہ آپ کو دے سکوں گا۔"

اُسی وقت پروگرام طے ہو گیا۔ دوسرے روز سورج غروب ہوتے ہی علی احمد پڑھانے آ گیا۔ وہ علی احمد کی توقع سے زیادہ ذہین نکلی۔ پڑھنے سے اُس کو دلچسپی بھی تھی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی اُس نے تعلیم بالغاں کا پہلا کورس ختم کر دیا۔ اُس کی گہری دلچسپی اور لگن کو دیکھ کر علی احمد نے پڑھائی کے وقت میں پندرہ منٹ کا اضافہ کر دیا۔ وہ وقت کا سختی سے پابند تھا۔ سبق شروع کرنے سے پہلے گھڑی دیکھ لیتا اور جیسے ہی ۴۵ منٹ پورے ہوتے، فوراً اُٹھ جاتا۔ پڑھائی کے دوران وہ کبھی غیر متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ کئی بار سلطانہ نے سوچا کہ وہ نوشا کے بارے میں علی احمد سے بات کرے، مگر علی احمد کا سنجیدہ چہرہ اور سوچتی ہوئی تیز آنکھوں کو دیکھ کر اُس کی ہمت جواب دے جاتی۔

وہ نوشا کے لئے بڑی بے چین تھی۔ آخر ایک روز اُس نے ہمت کر کے علی احمد سے کہہ ہی دیا "میرا ایک چھوٹا بھائی جیل میں ہے۔ اُس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

علی احمد نے چونک کر سلطانہ کو دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"کس کو قتل کیا تھا اُس نے؟"

سلطانہ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کے باپ کو"
علی احمد اور زیادہ حیرت زدہ ہوگیا۔ کہنے لگا "اپنے بہنوئی کو قتل کر دیا۔ بڑا بے رحم نوجوان ہے"

سلطانہ نے فوراً کہا "وہ اتنا برا نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں"
"کیوں ؟" علی احمد بدستور حیرت زدہ تھا۔

اس "کیوں" کا وہ کیا جواب دیتی۔ اسی بات کے طشت از بام ہو جانے سے تو وہ ڈر رہی تھی۔ پھر علی احمد نے خود ہی کہا "میری سمجھ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں آیا۔ ٹھیک ہے کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور تمہیں اس سے محبت بھی ہے۔ مگر تمہاری ساری تباہی تو اُسی کے ہاتھوں ہوئی۔ کم از کم میرا تو یہی اندازہ ہے"

سلطانہ نے سوچا کہ اگر علی احمد نے نوشا کے متعلق ایسی ہی رائے قائم کی تو وہ نوشا کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ نوشا کو پھانسی ہو جائے گی۔ اس کا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جُدا ہو جائے گا۔ اس نے یہی سوچ کر دبی زبان سے رُک رُک کر علی احمد کو ساری باتیں صاف صاف بتا دیں۔ اور جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں واقعی بہت بُری ہوں۔ آپ مجھ کو جتنا چاہیں ذلیل سمجھ لیں مگر اس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

کمرے کی فضا اچانک غمناک ہوگئی تھی۔ باہر رات کی تاریکی تھی۔ اور کمرے کے اندر سلطانہ کی سسکیاں اُبھر رہی تھی۔ علی احمد سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واقعی یہ لڑکی بڑی مصیبت زدہ ہے۔ وہ

ربڑ کی گیند کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر گر رہی تھی اور ہر جگہ اُس پر ٹھوکر لگائی جا رہی تھی۔ یہ عجیب معاشرہ ہے، جہاں عورت، ربڑ کی گیند اور خوبصورتی چوری کا مال بن جاتی ہے۔

لیمپ کی زرد زرد روشنی میں سلطانہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کا چہرہ بجھتی ہوئی موم بتی کی طرح آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بڑی مظلوم نظر آرہی تھی۔ علی احمد نے اُس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"تم پریشان نہ ہو، میں تمہارے بھائی کی رہائی کے لیئے ہر طرح کوشش کروں گا۔"

سلطانہ نے بھیگی ہوئی پلکوں سے علی احمد کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔" آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ مجھے ایک سہارا مل جائے گا۔ میرا کوئی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

علی احمد اُس کے رونے سے پریشان ہو گیا۔ وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک سلطانہ کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس نے سلطانہ کے سر کو تھپ تھپایا۔" رو ؤ مت، رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

اُس نے قدرے تامل کیا۔" چلو اُٹھ کر منہ دھو لو۔ تم بہت دیر تک رو چکی ہو۔"

سلطانہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر علی احمد کو دیکھا۔ وہ اُس کے عین مقابل کھڑی تھی۔

پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب علی احمد نے بڑے جذباتی انداز سے سوچا کہ سلطانہ واقعی بڑی خوب صورت ہے اور بڑی مظلوم بھی ہے۔ اُس نے گہری سانس بھری اور اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ سلطانہ کے شانے پر رکھ دیا۔

(۵)

سُنسان رات میں دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ سلمان اعظم تک جاگ رہا تھا۔ اُس نے خاموشی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رخشندہ اور جعفری دروازے پر کھڑے تھے۔ جعفری فوراً لوٹ گیا۔ سلمان سے اُس کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ ذرا دیر بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔ جعفری جا چکا تھا۔

سلمان دروازہ بند کر کے لوٹا۔ سامنے صوفے پر اُس کی بیوی تھکی ہوئی نیم دراز تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ دوسرے کمرے میں گیا۔ مگر فوراً ہی واپس آگیا۔ وہ اسی طرح لیٹی تھی۔ اُس کے بال بکھر کر ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک دُھندلا گئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل پھیکا پڑ گیا تھا۔ سلمان نے اُس کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور چپ چاپ اس کے رُو برو جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ رخشندہ نے اُسے دیکھ کر بڑے ناز سے کہا۔

”اُف! آج تو میں بہت تھک گئی۔“

سلمان نے نہ تو اُس کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ روشنی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ کمرے میں اُکتا دینے والی خاموشی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد رخشندہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ سلمان نے کہا ”بیٹھ جاؤ!“ اُس کی آواز خلافِ معمول بہت بھاری لگ رہی تھی۔

وہ بے نیازی سے بولی ”کیوں؟“

"مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"صبح بات کر لیجئے گا۔ مجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔" وہ بدستور لاپروا ہی سے بول رہی تھی۔ اُس نے جماہی لینے کے لئے منہ کھولا اور ملحقہ کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ سلمان نے روک کر کہا "میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

وہ دھم سے صوفے پر گر پڑی اور تیزی سے بولی۔ "لیجئے بیٹھ گئی۔ کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

سلمان لمحہ بھر تک اُس کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر بڑے اطمینان سے بولا۔ "مجھے تمہاری یہ حرکتیں قطعی پسند نہیں ہیں۔ میں ان باتوں کو اب زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر منوچہر کے پاس چلئے گا۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے اِس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ چلئے چل کر بستر پر لیٹئے۔ دو خواب آور گولیاں کھا لیجئے گا۔ اچھی نیند آجائے گی۔ دراصل بات۔۔۔"

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی تھی کہ سلمان نے ڈانٹ کر کہا "رخشی! زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ "لیجئے اس میں اسمارٹ بننے کی کون سی بات ہے۔ آپ تو خواہ مخواہ اُلٹی سیدھی باتیں سوچا کرتے ہیں۔"

وہ تیزی سے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہ اُلٹی سیدھی باتیں سوچنے کا موقعہ نہ دو۔ ورنہ۔۔۔" اُس نے جھٹ اپنا دایاں ہاتھ نکال کر سامنے کر دیا۔

اور کمانی دار چاقو کڑکڑ کڑ کرتا ہوا کھل گیا۔ روشنی میں اُس کا پھل اِس طرح جھلملایا کہ رخشندہ کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اُس نے وحشت زدہ نظروں سے سلمان کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سُرخ تھیں۔ چہرے پر اس قدر وحشت اور دیوانگی تھی کہ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر رخشندہ کی سہمی ہوئی آواز اُبھری۔

" یہ آج آپ سب کیا کر رہے ہیں ؟"

" یہ اب تمہارے سوچنے کی بات ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں۔"

" آخر آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

" میں چاہتا ہوں کہ تم جعفری سے ملنا جلنا بند کر دو۔"

وہ فوراً بولی۔" مگر یہ تو بہت بُری بات ہوگی۔"

سلمان اُونچی آواز سے بولا۔" اگر تم کو اپنے اُوپر اعتماد نہیں رہا تو کچھ عرصہ کے لئے اپنے میکے چلی جاؤ۔"

اِس دفعہ رخشندہ نے غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ سلمان کی بات سے اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چیخ کر بولی۔

" میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔"

" مگر بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی وہ اس روز دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ کئی بار وہ یہی بات پہلے اشاروں میں اور پھر نرمی سے کہہ چکا تھا۔

رخشندہ تلملا کر کھڑی ہو گئی۔" جو آپ چاہتے ہیں وہی ہوگا" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سلمان ذرا دیر صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ بھی سونے کے لئے اپنے بستر پر چلا گیا۔

دوسرے دن معمول کے مطابق شام کو جعفری آیا۔ سلمان اُس وقت گھر

ہی پر تھا۔ البتہ اُس کی بیوی جعفری کے آنے سے پہلے ہی برابر والے فلیٹ میں چلی گئی۔

جعفری سیٹی بجاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے پکارنے لگا: "رخشی!"

کوئی جواب نہ ملا۔

اِس دفعہ اُس نے اُونچی آواز سے کہا: "رخشی! جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ایسی خوب صورت شام کو صرف بوڑھے لوگ گھر پر رہتے ہیں یا بچوں کی آیائیں۔ مجھے اس وقت کمرے میں زیادہ دیر قید نہ رکھنا۔" وہ تیزی سے بولتا چلا گیا۔

خلافِ توقع جب اُس کو رخشندہ کی آواز نہ سُنائی دی تو وہ سامنے والے کمرے میں گھس گیا اور زور زور سے بولنے لگا: "یہاں تو اندھیرا ہے۔ کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

وہ رخشندہ کو تلاش کرتا ہوا اُس کو پکارتا رہا۔ سلمان خاموش بیٹھا اُس کی آواز سُنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جعفری واپس آیا۔

"سالومن! کیا تم بتا سکتے ہو، رخشی اِس وقت کہاں ہے؟"

سلمان نے آہستہ سے جواب دیا: "مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

جعفری نے لمحہ بھر رُک کر کہا: "تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو سکتی ہے؟"

"میں جب واپس آیا تو وہ موجود نہیں تھی۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

جعفری پوچھنے لگا: "تو گویا تمہیں اُس کے پروگرام کا کوئی پتہ نہیں۔ تم عجیب شوہر ہو، یعنی تم کو یہ نہیں معلوم کہ تمہاری بیوی اس وقت کہاں ہوگی؟"

سلمان نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دل ہی دل میں کہنے

لگا۔ واقعی میں عجیب شوہر ہوں۔ عجیب نہ ہوتا تو جعفری، تم مجھ سے میری بیوی کے متعلق اس طرح بات نہ کرتے۔ مجھ کو اتنا اُلّو کا پٹھا نہ سمجھتے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر ایک زنّاٹے کا تھپّڑ رسید کرے اور اُس کو دھکّے دے کر باہر نکال دے۔ مگر یہ تھپّڑ اُس کو بہت مہنگا پڑتا۔ اس میں پانچ سو روپے ماہانہ کا نقصان تھا، اور اتنا بڑا نقصان جھیلنے کے لئے وہ فی الحال آمادہ نہیں تھا۔

جعفری اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ آخر تھکا ہوا سا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑا بے چین نظر آ رہا تھا۔ اُس کی بے چینی میں سلمان کو لُطف آ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر تک وہ اسی بے چینی کے عالم میں رخشندہ کا انتظار کرتا رہا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اُس کے چہرے پر جو تازگی تھی، دُھندلا گئی۔ وہ مضمحل اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی عالم میں اُٹھ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

سلمان نے غور کیا کہ جاتے وقت وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ سلمان نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، جعفری نے تیزی سے سڑک کو عبور کیا۔ اپنی کار کے پاس پہنچا، اسٹیرنگ پر اُچھل کر بیٹھا، زور سے کار کا دروازہ بند کیا اور بہت تیز رفتار سے کار دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس کی یہ تمام حرکتیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ چوٹ کھا کے گیا تھا۔ کم از کم ہفتہ بھر تک نہیں آئے گا۔

مگر سلمان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نو بجے کے قریب وہ پھر موجود تھا۔ اُس کا چہرہ ابھی تک پریشان تھا۔ وہ کمرے میں اُس وقت، جس انداز سے داخل ہوا تھا، اُس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوشی سے نہیں آیا تھا۔ وہ چُپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے

سلمان سے پوچھا۔

"رخشی واپس آگئی ؟"

"ہاں" سلمان نے مختصر جواب دیا۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کہاں گئی تھی ؟"

"نہیں" سلمان نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

"کیوں ؟" جعفری کے لہجے میں بے قراری نمایاں تھی۔

"وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی ہے۔ میری ہمت نہ پڑی"

سلمان جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے رخشندہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ذرا دیر اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ سونے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔ اور اب شاید انگریزی کا کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔

جعفری نے سلمان کی بات سُن کر بڑی حقارت سے گھُور کر دیکھا۔ دریافت کیا "تم نے اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھا؟"

سلمان نے آہستہ سے کہا "نہیں"

جعفری نے کوئی بات نہیں کی۔ بے چینی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ پھر اُٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا، جس میں رخشندہ موجود تھی۔ وہ بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ کمرے میں دُھندلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں رخشندہ کا چہرہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جعفری جا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شکوہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں شام کو تم کہاں تھیں۔ میں نے تمہارا مکمل ایک گھنٹہ تک انتظار کیا۔ تم نے میری آج کی پوری شام خراب کر دی"

وہ خاموش رہی۔ اس نے جعفری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جعفری نے اِس دفعہ نرمی سے کہا" کیا بات ہے۔ تم کچھ اُداس معلوم ہو رہی ہو۔"

وہ بیزاری سے بولی۔"میرے سر میں درد ہے۔"

"اوہو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں؟"

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔" جی نہیں شکریہ!" اُس نے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔" جعفری صاحب! آپ آئندہ میرے کمرے میں اس طرح بغیر پوچھے نہ آیا کریں۔ یہ میرا بیڈ روم ہے۔ ڈرائنگ روم نہیں ہے۔"

جعفری سناٹے میں آگیا۔ گھبرا کر بولا۔" تم تو بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔"

وہ اسی طرح تیز لہجے میں بولی۔" بہتر ہوگا کہ آپ ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھیں۔"

اس دفعہ جعفری تلملا کر رہ گیا۔ رخشندہ کی یہ ساری باتیں اُس کے لئے بالکل انوکھی تھیں۔ اُن سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے گھور کر رخشندہ کو دیکھا اور جھنجلایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سلمان دروازے سے لگا چوروں کی طرح اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ جعفری کو آتے دیکھ کر وہ صوفے پر جاکر بیٹھ گیا۔ جعفری کمرے میں آیا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جعفری نے اُس سے کوئی بات نہیں کی۔ سیدھا دروازے کی جانب چل دیا۔ سلمان بھی اُس کے ساتھ ساتھ دروازے پر گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگے تو سلمان نے بڑی نرمی سے کہا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا وہ بہت ناراض ہے۔"

جعفری نے اُس کو مشتبہ نظروں سے گھور کر دیکھا اور چُپ چاپ باہر چلا گیا۔

صبح جب دفتر پہنچا تو تھوڑی ہی دیر بعد جعفری کا چپراسی اُسے بلانے آیا۔ سلمان نے اُس کے کمرے میں جاکر دیکھا۔ جعفری خاموش بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا۔ سلمان پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے پر کرختگی برسنے لگی۔ کہنے لگا۔

" آپ کے خلاف آر۔ ڈی سیکشن سے بڑی سخت شکایت آئی ہے۔ آپ بالکل لاپرواہ ہوتے جارہے ہیں۔ میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر اس دفتر کو چھوڑنا پڑے تو آپ کو حیرت نہ ہونا چاہیئے۔"

یہ سیدھی سادی دھمکی تھی۔ سلمان نے اس دھمکی کو خاموشی کے ساتھ سُن لیا۔ آئندہ پوری احتیاط برتنے کا وعدہ کیا اور جعفری کے کمرے سے باہر آگیا۔ لیکن اس دھمکی نے اُس کو پریشان ضرور کردیا۔ تنخواہ سے اُس نے اتنا بھی پس انداز نہیں کیا تھا کہ ایک مہینہ بھی بے روزگاری کا گزار سکے اور فوری ملازمت ملنے کی کوئی اُمید بھی نہ تھی۔

وہ اسی پریشانی میں بیٹھا تھا کہ جعفری نے اُس کو پھر بُلوایا۔ اس دفعہ اُس نے براہِ راست بات کی۔

" کیا تمہارا رخشی سے جھگڑا ہوا تھا؟"

" نہیں" سلمان نے صاف انکار کردیا۔

" تم مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ضرور ایسی بات ہے۔"

سلمان نے اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی۔" آپ یقین مانیے ایسی کوئی بات نہیں۔"

" کیا تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟" جعفری کے دل کا چور بول اُٹھا۔ وہ سلمان سے صاف صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر سلمان نے اُسے موقعہ نہ دیا۔ بڑی سادگی سے بولا۔" آپ سے مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟"

" تو پھر رخشی کل اس قدر ناراض کیوں تھی؟"

"ناراض تو وہ مجھ سے بھی ہے۔ آج صبح اُس نے میرے ساتھ ناشتہ بھی نہیں کیا۔ آپ ہی اُس سے پوچھئے۔ میری تو بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔" سلمان اُس وقت بڑا سادہ لوح معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کی اِس سادہ لوحی پر جعفری مسکرا دیا۔ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ضرور تمہاری کسی بات سے ناراض ہے۔ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے۔ تم اُسے ابھی سمجھ نہیں سکے۔"

وہ دیر تک بڑے سرپرستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا۔

شام کو جعفری سلمان کے گھر آیا۔ رخشندہ اُس وقت گھر پر موجود تھی۔ سلمان بھی دفتر سے ذرا دیر پہلے واپس آیا تھا۔ وہ اور جعفری باہر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ رخشندہ اُس کمرے میں آئی۔ نہ تو اُس نے جعفری سے بات کی، نہ اُس کی جانب دیکھا اور چُپ چاپ، دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ وہ اُس وقت عام گھریلو لباس میں تھی جس سے یہ بات واضح تھی کہ وہ پڑوس کے کسی فلیٹ میں ہی گئی تھی۔ کم از کم اس لباس میں وہ بازار نہیں جاسکتی تھی۔

جعفری دیر تک رخشندہ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ آخر جب شام گہری ہوگئی اور رات شہر میں اُتر آئی تو جعفری چُپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔

کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ جعفری آتا۔ رخشندہ یا تو گھر میں موجود ہی نہ ہوتی یا جعفری کے آتے ہی اُٹھ کر پڑوس میں چلی جاتی۔ اور جب تک وہ گھر میں موجود رہتا واپس نہ آتی۔ کبھی آمنا سامنا ہوجاتا اور جعفری زبردستی اُس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بے رُخی سے جواب دیتی۔ جعفری تلملا کے رہ جاتا۔ وہ ان دنوں سخت پریشان تھا۔ دفتر میں بھی کھویا کھویا نظر آتا۔ سلمان کے گھر آتا تو بے چینی سے کمرے میں ٹہلتا رہتا۔ گھنٹوں صوفے سے گردن ٹکائے خلا میں گھورا کرتا۔ تھک جاتا تو کار لے کر کہیں چلا جاتا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد پھر واپس

آجاتا۔

اُس کا تروتازہ چہرہ چند ہی روز میں جُھلس کر رہ گیا۔ آنکھوں کی چمک دمک بجھ گئی تھی۔ تیز لہجے میں جلدی جلدی بات کرنے کے بجائے وہ اب رُک رُک کر اور آہستہ آہستہ بات کرنے لگا تھا۔

رخشندہ بھی ان دنوں اُجڑی اُجڑی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے لباس میں اہتمام برتنا چھوڑ دیا تھا۔ میک اَپ کی طرف سے بھی لاپرواہ ہوگئی تھی۔ ہر وقت عام گھریلو لباس میں رہتی۔ کئی کئی روز کپڑے نہ بدلتی۔ بال بکھرے ہیں تو شام تک بکھرے رہتے۔ بہت ہوا تو لمبے لمبے بالوں کا بے تکا سا جوڑا باندھ لیا۔ اُس کے حُسن کی ساری سحر انگیزی اور دل کشی کی ساری سج دھج ماند پڑ گئی تھی۔ وہ بالکل معمولی لڑکی معلوم ہوتی۔ وہ رخشندہ جو ہر شام قدم قدم پر جادُو جگاتی ہوئی گھر سے نکلتی تھی، نہ جانے کہاں رُوپوش ہوگئی تھی۔ اُس کی آواز میں جو لوچ اور لچک تھی، وہ بھی نہ رہی۔ وہ اب چڑچڑی ہوگئی تھی۔ بات بات پر اُس کی پیشانی پر بَل پڑ جاتے۔ وہ ہر وقت رُوٹھی رُوٹھی سی رہتی۔

سلمان چُپ چاپ دونوں کی یہ حالت دیکھتا رہا۔ اُن کی بے چینی سے، اُن کی پریشانی سے اُس کو تسکین ملتی۔ اِس تسکین میں اُس ذہنی اذیّت کے انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا، جو جعفری اور رخشندہ سے اُسے پہنچا تھا اور جس کی تکلیف سے وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا تھا۔

لیکن اس کا جذبۂ انتقام جلد ہی آسُودہ ہوگیا۔ اُسے کچھ ایسا محسُوس ہونے لگا، جیسے وہ ان دونوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا ہے۔ دونوں بے چین تھے، بے قرار تھے۔ اور خوُد اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے، مگر مل نہ سکتے تھے۔ اِس سارے ڈرامے میں اُس کا کردار بالکل وِلن کا سا تھا اور جب وہ اِس بات پر غور کرتا تو خود اپنی نظروں میں گر جاتا۔ اُس کو ایک

عجیب سی ذلّت کا احساس ہوتا، جو خود بڑا اذیّت ناک تھا۔

کچھ یہی سوچ کر اُس نے ایک روز رخشندہ سے کہا "رخشی! تم کو جعفری کی اِس طرح بے عزّتی نہیں کرنا چاہیئے۔ تم اُس سے بات چیت تو کر لیا کرو۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ خود ہی تو اُن سے ملنے جُلنے پر منع کیا۔ اب خود ہی سفارش بھی کر رہے ہیں۔"

وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔ "مگر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اتنا سخت رویّہ اختیار کر لو۔ یہ تو اس بے چارے کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔"

اُس نے رخشندہ کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔

اُس شام رخشندہ نے جعفری کے ساتھ چائے بھی پی۔ بات چیت بھی کی۔ پھر تینوں پکچر دیکھنے چلے گئے۔ رخشندہ اور جعفری بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ رخشندہ نے اُس روز عرصہ کے بعد بڑی نفاست سے میک اَپ کیا تھا۔ بالوں کو ایک خاص انداز سے آراستہ کیا تھا۔ لباس میں بھی اُس کی خوش ذوقی صاف جھلک رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔ اُس کی یہ دل کشی دیکھ کر سلمان کو بھی مسرّت ہوئی۔ بہر حال وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اُس کو چھُو سکتا تھا، اُس کو چوم سکتا تھا۔ اُس کی گداز باہوں پر سر رکھ کر سو سکتا تھا۔

ایک بار پھر رخشندہ اور جعفری شام کو سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے۔ سلمان گھر میں بیٹھا کڑھتا رہتا۔ رخشندہ رات گئے جعفری کے ساتھ مُسکراتی ہوئی آتی۔ اُس کی یہ مسکراہٹ سلمان کے ذہن میں زہر بن کر سرایت کر جاتی۔ وہ اِس درد سے، اِس کرب سے بلبلا اُٹھتا۔ آخر اس اذیّت سے بچنے کا اُس نے یہ طریقہ نکالا کہ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ صبح دفتر کے لئے گھر نکلتا اور آدھی رات کے بعد واپس آتا۔

ایک شام وہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی کے ساتھ فلم دیکھنے گیا۔ گیارہ بجے دونوں سینما ہاؤس سے نکلے تو پینے پلانے کا پروگرام بن گیا۔ کچھ عرصے سے اُس نے شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی۔ اُس روز اُس کے ہمراہ عنایت تھا۔ اُس کو تنخواہ معقول ملتی تھی۔ اور وہ ابھی تک کنوارا تھا۔ بڑی بے فکری سے خرچ کرتا تھا۔ اُس کی تحریک پر دونوں شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں شراب پینے چلے گئے۔

ہال میں اس وقت بڑی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ نوجوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ فضا میں رنگ و بُو کی فراوانی تھی۔ یہ جاڑوں کی ایک سرد رات تھی۔ کوئٹہ کی برف پوش وادیوں سے آنے والی خنک ہوائیں چل رہی تھیں۔ لوگ موٹے موٹے اُونی لباسوں میں ملبوس تھے۔ اُن کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے۔

دونوں ایک ٹیبل پر جاکر بیٹھ گئے۔ سلمان اس وقت صرف برانڈی پینا چاہتا تھا۔ اُس کے لئے ویٹر برانڈی لے آیا۔ دونوں آہستہ آہستہ شراب پینے لگے۔ عنایت خاصا باتونی نوجوان تھا۔ وہ اپنا ایک تازہ معاشقہ سنانے لگا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بڑا اونچا فلرٹ تھا۔ سلمان اُس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مضحکہ خیز حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ہال کے ایک گوشہ میں اُس کی نظر گئی۔ وہ دم بخود رہ گیا۔

سامنے جعفری اور رخشندہ بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک ادھیڑ اور تنومند آدمی بیٹھا تھا۔ وضع قطع سے غیر ملکی نظر آتا تھا۔ وہ چھچھوری حرکتیں کر رہا تھا اور منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہا تھا۔ غالباً بہت زیادہ پی گیا تھا۔ سلمان نے دیکھا رخشندہ نے جام اُٹھایا اور اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ ہاں! وہ شیمپین پی رہی تھی۔ سلمان کا سارا

جسم لرز کر رہ گیا۔

وہ اپنی آنکھوں سے رخشندہ کو شراب پیتے دیکھ رہا تھا۔ وہ رُک رُک کر آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ اُس کی ایک ایک حرکت اور ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ عنایت نے ایک بار اُسے ٹوکا بھی۔

"کہاں کھو گئے تم؟ یہ پیگ تو ختم کرو۔"

سلمان نے چونک کر اپنا گلاس اُٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں غٹا غٹ خالی کر دیا۔ یہ اس کا تیسرا پیگ تھا۔ ایک بڑا اس نے اور منگوایا، اور بظاہر عنایت کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ مگر اُس کی پوری توجہ جنوبی دیوار کے قریب کی اُس ٹیبل کی جانب تھی، جہاں وہ تینوں بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد تینوں اُٹھ کر چلے گئے۔ رخشندہ کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ تنومند غیر مُلکی نے اپنا بازو آگے کر دیا اور رخشندہ اُس کے بازو میں جھولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دونوں آگے آگے تھے۔ جعفری اُن سے دو قدم پیچھے ہٹ کر چل رہا تھا اور دونوں ہاتھوں میں کئی پیکٹ اُٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اور چال ڈھال سے کسی بڑے آدمی کا مصاحب معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان پوری توجہ سے تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ عین اُس وقت عنایت کی آواز اُبھری۔

"او ہو ہو ہو! تم جعفری کو دیکھ رہے ہو۔ یار وہ آج کل اپنے پرموشن کے چکر میں لگا ہے۔"

سلمان نے حیرت سے عنایت کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

عنایت جھوم کر بولا۔ "یار بڑی زور دار لونڈیا ہے جو ڈائرکٹر کو پیش کی ہے۔ دیکھو تو کیسا چمٹائے ہوئے چل رہا ہے۔ رات تو آج اس سالے کی گزرے گی۔ ہائے ہائے کیا غضب کا دانہ ہے۔"

اُس نے رخشندہ کے گداز جسم کے بارے میں ایسی گندی بات کہی کہ سلمان

تڑپ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے عنایت نے اُس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ گھبرا کر پوچھنے لگا۔

"کیا یہی کمپنی کا وہ ڈائرکٹر ہے، جو پچھلے ہفتہ نیویارک سے آیا ہے؟"

وہ بولا۔ "مسٹر برائٹ کو کیا تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ دو سال قبل ان ہی دنوں دورے پر آیا تھا مگر اُس وقت تک تم کمپنی میں ملازم نہیں ہوئے تھے۔ ظالم اس عمر میں بھی بڑا رنگین مزاج ہے۔ جعفری کا پروموشن تو سمجھو پکا ہو گیا۔"

سلمان کو یقین نہ آیا۔ کہنے لگا: "نہیں یار ٹسنر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ بولا۔ "شرط بدلو۔ اسی ہفتہ تم سُن لینا کہ جعفری کو پروموشن مل گیا۔ اتنی بڑی رشوت پر تو سلطنت مل سکتی ہے، تم پروموشن کی بات کر رہے ہو۔ اُستاد ترقی کرنا چاہتے ہو تو یہ تکنیک سیکھ لو۔ سب سے آسان نسخہ ہے۔" عنایت نے قہقہہ لگایا۔ "ہندوستانی رجواڑوں اور دیسی ریاستوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں دوشیزائیں ایک زمانہ میں سچے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اگر کوئی نوجوان لڑکی صبح ہی صبح اپنے بھائی سے یہ کہہ دیتی تھی کہ رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ فوج میں کیپٹن بن گیا ہے، تو وہ اسی روز کیپٹن بن جاتا تھا۔ سرکاری ہرکارہ خود آرڈر لے کر گھر آتا تھا۔ کیا سمجھے؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "یار والیانِ ریاست کی بھی کیا بات تھی سب ہی سالے شاہ فاروق بنے پھرتے تھے۔"

وہ نشہ کی دھن میں بولتا جا رہا تھا اور سلمان کو اُس کی باتوں سے اُلجھن ہو رہی تھی۔

وہ تھوڑی ہی دیر بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ عنایت ابھی کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مگر سلمان نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بھی چلنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ واپس جاتے ہوئے سلمان نے دیکھا، جعفری اکیلا بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ سلمان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تو

کہ عنایت سچ کہہ رہا تھا۔ جعفری، رخشندہ کو برائٹ کے سپرد کر کے چلا آیا۔ اُس کو یقین نہ آیا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ رخشندہ گھر پر ہو گی۔

مگر جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو رخشندہ وہاں نہیں تھی۔ وہ رات گئے تک جاگتا رہا۔ پھر تھک کر سو گیا۔ صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو رخشندہ بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ نہ جانے وہ رات کو کس وقت لوٹی تھی۔ خادمہ نے دروازہ کھولا تھا اور اسی کی زبانی سلمان کو معلوم ہوا کہ رخشندہ جس وقت آئی تھی، اس وقت پڑوس کی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

سلمان نے ایک بار پھر اپنا شکاری چاقو نکالا۔ اُسے کھولا۔ چاقو کی کمانی زور سے کڑکڑاتی ہوئی چیخی۔ اب تنہائی میں وہ اکثر چاقو کھولتا۔ اس کی کمانی چیختی۔ سلمان اُس کی دھار پر انگوٹھا پھیر کر تیزی اور جلا کا اندازہ لگاتا۔

اوّل شب رخشندہ جب جعفری کے ساتھ گھر سے باہر چلی جاتی تو سلمان کمرہ بند کرتا۔ چاقو کھولتا اور ڈمی نکال کر بلندی پر رکھ دیتا۔ یہ ڈمی اُس نے موٹے اُونی کپڑے کے ایک بڑے تھیلے میں روئی بھر کر تیار کی تھی۔ وہ ہونٹوں کو زور سے بھینچ کر ڈمی پر چاقو سے وار پر وار کرتا۔ پھر تھک کر بیٹھ جاتا اور دیر تک ہانپتا رہتا۔ کبھی یہ ڈمی جعفری کا روپ اختیار کر لیتی، کبھی رخشندہ بن جاتی۔

سرما کی ٹھٹھرتی سنسان راتوں میں اُس نے اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بار جعفری اور رخشندہ کو قتل کیا تھا۔ اُن کے خون میں ڈوبے ہوئے جسموں کو پھڑکتے ہوئے دیکھا تھا، اور خوف سے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس کی تھی۔

دونوں کو قتل کرنے کا ہر رات وہ ایک نیا منصوبہ تیار کرتا مگر دوسرے دن اس منصوبے میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی۔ ابھی اس کا منصوبہ تیار نہیں ہوا تھا کہ ایک شام جعفری حسب معمول مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت رخشندہ اور سلمان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جعفری بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ دونوں

کے قریب پہنچ کر وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑے کھلنڈرے انداز میں بولا۔

"آپ لوگ چاہیں تو مجھ سے بڑی شاندار پارٹی لے سکتے ہیں"

رخشندہ نے بے تکلفی سے پوچھا "آج تو بڑے جوویل موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔ بات کیا ہے؟"

"پہلے تم مجھے ایک گرماگرم مبارک باد دو۔"

رخشندہ بولی "کوئی بہت اونچی بات معلوم ہوتی ہے، جو اس طرح پیشگی مبارکباد کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔"

وہ گردن کو خم دے کر ایکٹروں کی طرح لمحہ بھر تک اُس کو تکتا رہا۔ پھر اُس نے سینہ پر ایک ہاتھ رکھ کر اور کسی قدر گردن جھکا کر کہا "آپ کا یہ خاکسار کمپنی کا برانچ مینجر مقرر ہو گیا ہے۔ دو ہزار تنخواہ ملے گی۔ اُس کے ساتھ اور بھی بہت سے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کیوں ہے نا بڑی بات؟"

سلمان کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھوک دے۔ سالا بھڑوا! کس ڈھٹائی سے اپنا کارنامہ بیان کر رہا ہے۔ کم از کم رخشندہ کے سامنے تو اُسے اپنی اس ترقی کا اِس طرح اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ اس عہدے کی بلندی پر پہنچنے کا زینہ تو وہی بنی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے سلمان کو اچانک اپنا خیال آ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ جعفری سے بڑا بھڑوا ہے۔ جس کی بیوی رات رات بھر دوسروں کے پہلو گرم کرتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کتنی ذلت کی بات ہے۔ اُسے ڈوب مرنا چاہیے۔ نفرت، حقارت، غم اور غصے کے ملے جلے احساسات نے اچانک اُس پر حملہ کر دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

رخشندہ اور جعفری کے جانے کے بعد بھی وہ خاموش بیٹھا اسی طرح سوچتا رہا۔ پھر انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں اُس نے طے کیا کہ دونوں کو جس قدر جلد ہو

سکے، ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اپنی تذلیل کا وہ اسی طرح بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک دوسرے خیال نے اُس کے ذہن میں سر اُبھارا جو بالکل مختلف تھا۔ اُس نے سوچا وہ ان دونوں کے لئے کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی سُور کا شکار کرتے ہوئے مارا جائے۔

اُسی وقت اُس نے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اُس کا آغاز دوسرے دن دفتر میں اس وقت ہُوا، جب اُس نے جعفری کے سامنے اپنا استعفیٰ ڈال دیا۔ جعفری ہکّا بکّا ہو کر اُس کا مُنہ تکنے لگا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"تم ملازمت چھوڑ رہے ہو۔ تم کو ہو گیا گیا ؟"

سلمان بڑی سنجیدگی سے بولا "ابھی میں ایک استعفیٰ اور دینا چاہتا ہوں اور اس کے لئے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں" لمحہ بھر کے لئے وہ خاموش رہا۔ اُس نے جعفری کے چہرے کو غور سے دیکھا "میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں"

"میں اس سلسلہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں"

"میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہر وغیرہ طلب نہ کرے"

"تم نے اس کے بارے میں رخشندہ سے گفتگو کی ؟ میرے خیال میں تمہیں پہلے اس سے بات کرنا چاہیئے"

"میں چاہتا ہوں کہ میری جانب سے یہ تمام باتیں آپ کریں ؟"

جعفری ذرا دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اُس نے سلمان کو سمجھانے کی کوشش کی "میرا مشورہ ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ رخشندہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اُس کو چھوڑتے ہوئے تمہیں دُکھ نہیں ہو گا ؟"

سلمان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "ہرگز نہیں" اُس نے قدرے تامّل کیا "تو پھر آج آپ رخشندہ سے اس سلسلہ میں بات کریں گے ؟"

جعفری کو اس معاملہ میں سلمان سے قطعی ہمدردی نہیں تھی۔ مگر وہ خواہ مخواہ ہمدرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔" میں رخشندہ سے بات تو کرلوں گا۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

سلمان نے جل کر کہا۔" جعفری صاحب آپ کیوں مجھے خواہ مخواہ مشورہ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ دو ہزار روپیہ تنخواہ پانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی سمجھ بھی مجھ سے چار گنا قیمتی ہے۔"

جعفری ناراض ہونے کی بجائے نرم پڑ گیا۔ اُس نے سوچا اس وقت سلمان کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ اُس نے کچھ کہا تو وہ برس پڑے گا۔ آہستہ سے بولا۔ "اچھی بات ہے۔ میں رخشندہ سے آج ہی بات کروں گا۔"

سلمان نے مزید گفتگو نہ کی اور خاموشی سے چلا گیا۔ اُس نے دفتر میں بھی بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ شام تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا تو جعفری موجود تھا۔ رخشندہ بھی اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سلمان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ چُپ چاپ ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رخشندہ کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان نظر آرہی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ تینوں چُپ بیٹھے تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ پر کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ دسمبر کی یہ سرد شام بڑی اُداس تھی۔ کمرے کے کربناک سکوت سے ایسا محسوس ہوتا، جیسے یہاں کوئی مر گیا ہے اور وہ تینوں لاش کے سرہانے بیٹھے سوگ منا رہے ہیں۔

بہت دیر بعد جعفری کی آواز اُبھری۔" میں نے تمہارے آنے سے ذرا دیر پہلے رخشندہ سے بات کی تھی۔ اس بات سے اُس کو بڑا دُکھ پہنچا ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم بہت غلط قدم اُٹھا رہے ہو۔"

جعفری کی بات سُن کر رخشندہ کی گردن جھک گئی۔ اُس کے چہرے پر دُکھ

کا سایہ منڈلانے لگا۔ لیکن سلمان نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ چاقو نکالا اور فوراً واپس آگیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ٹانگیں پھیلا کر اس طرح سینہ تان کر کھڑا ہوگیا کہ وہ اُس کے سامنے بہت حقیر معلوم ہونے لگے۔

سلمان نے گھور کر جعفری کو دیکھا "ہاں تو مسٹر جعفری! تم کیا کہہ رہے تھے؟"

اُس نے ایک جھٹکے سے چاقو کھولا۔ اُس کی کمانی کڑکڑاتی ہوئی زور سے چیخی۔ جعفری اور رخشندہ کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ دونوں سہمی ہوئی نظروں سے سلمان کو دیکھنے لگے۔ سلمان نے بڑے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرے فیصلے سے اِس عورت کو دُکھ ہوا ہے۔ یہ عورت جو اتفاق سے میری بیوی ہے اور جس کو بیوی کہتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے" لمحہ بھر کے لئے وہ رُکا اور بڑی تیزی کے ساتھ بولنے لگا "میرا پہلا فیصلہ یہ تھا کہ میں تم دونوں کے سینے میں یہ چاقو پیوست کر دوں۔ مجھے صرف اسی طرح تسکین مل سکتی تھی۔ تم دونوں نے مل کر میرے سکون کو، میری خوشیوں کو لوٹا ہے۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی۔ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں اب بالکل قلاّش ہوں۔ ایک ہارا ہوا جواری۔ تم دونوں نے مجھ پاگل بنا دیا۔ مجھ کو کتّوں سے زیادہ ذلیل کر دیا۔"

سلمان کی آواز بھرّا گئی۔ وہ خاموش ہوگیا۔ جعفری اور رخشندہ خوف سے سہمے ہوئے دم بخود بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہروں پر دحشت برس رہی تھی۔ سلمان نے ذرا دیر رُک کر کہا "ڈرو مت، میں تم کو قتل نہیں کروں گا۔ میری زندگی اِتنی ناکارہ نہیں ہے کہ تم دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر پھانسی کے تختے پر لٹک جاؤں۔ میرے لئے یہ کوڑھی ہو کر مرنے سے

زیادہ گھناؤنی موت ہوگی ۔" ذرا دیر کے لیے وہ رُکا۔" جعفری! تم رنڈی کے بھڑوے ہو۔ میں بھی بھڑوا ہوں اور یہ سامنے وہ رنڈی بیٹھی ہے ۔"

اُس نے رخشندہ کی جانب اُنگلی اُٹھا کر اشارہ کیا۔" مگر اب میں اس رنڈی کا بھڑوا بننا نہیں چاہتا ۔ تم اپنی یہ امانت اپنے ساتھ لے جاؤ ۔ ورنہ سچ کہتا ہوں کہ مجھ کو وہ ذلیل موت اختیار کرنا پڑے گی ۔ جو میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا ۔ بولو کیا کہتے ہو ۔ میرے سر پر اس وقت خون کھیل رہا ہے ۔ میں ساری باتیں ابھی اور اسی وقت طے کرنا چاہتا ہوں ۔"

جعفری نے مری ہوئی آواز سے کہا۔" مجھے تمہاری بات منظور ہے ۔ میں رخشندہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

مزید بات چیت نہیں ہوئی ۔ سلمان نے خود اپنے ہاتھوں سے رخشندہ کا سارا سامان اُٹھا اُٹھا کر جعفری کی کار میں بھرا ۔ بوڑھی خادمہ کو بھی رخشندہ کے ساتھ رخصت کیا ۔ اور جب وہ چلے گئے تو نڈھال ہو کر دھم سے صوفے پر گر پڑا ۔ اور دیر تک لمبی لمبی سانسیں بھرتا رہا ۔

دوسرے روز عدالت میں حاضر ہو کر مجسٹریٹ کے رُو برُو دونوں نے طلاق نامہ پر دستخط کر دیے ۔ رخشندہ نے مہر معاف کر دیا تھا ۔ جعفری گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا ۔ دوسرا گواہ اُن کا وکیل تھا جس نے طلاق نامہ کی دستاویز تیار کی تھی ۔

عدالت سے باہر نکلتے وقت رخشندہ رو رہی تھی ۔ جعفری اُس کو تسلّی دینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ سلمان نے دونوں کو دیکھا اور تیزی سے اُن کے قریب سے گزر گیا ۔

سلمان شام تک کمرے میں مُردے کی طرح خاموش پڑا رہا ۔ اُس روز نہ اُس نے کھانا کھایا تھا اور نہ سہ پہر کی چائے پی تھی ۔ جو کچھ اُس نے کیا تھا،

اُس کا اُسے دُکھ تھا۔ رخشندہ کے ساتھ اُس نے اس گھر میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ ہر چیز سے اُس کی یاد وابستہ تھی۔ در و دیوار سے اُس کی آواز اُبھر رہی تھی۔ ہر طرف اس کا سایہ منڈلا رہا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب ایک رات رخشندہ دُلہن بن کر آئی تھی۔ وہ حجلۂ عروسی میں شرابیوں کی طرح جھومتا ہوا داخل ہوا تھا۔ سامنے پھولوں سے ڈھکی ہوئی مسہری پر وہ سُرخ لباس میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اُس کا جسم تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ وہ چُپ چاپ اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ پھر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے رخشندہ کا مہندی سے رچا ہوا گورا گورا نازک ہاتھ تھام کر کہا تھا "ہاتھ تو بہت خوب صورت ہے۔"

وہ سمٹ کر دوہری ہو گئی تھی۔ سلمان نے مسکرا کر کہا تھا "میری شہزادی!" وہ شرم سے سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ "بولو میری شہزادی!" اُس نے بڑے پیار سے اِصرار کیا تھا۔ "جی" بڑا مختصر سا جواب ملا تھا اور اُس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر دلہن کا گھونگھٹ اُلٹ دیا تھا۔ دُلہن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھُپا لیا۔ سلمان نے اُس کا کنول کی طرح دل آویز چہرہ دیکھ کر دل میں کہا تھا۔ یہ تو بڑی خوب صورت لڑکی ہے۔ اور پھر اس خوب صورت لڑکی کے ساتھ مِل جُل کر اُس نے ایک خوب صورت زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ اپنی پُر سکون دُنیا بسانے کا تہیہ کیا تھا۔ اور آج وہ خوب صورت خواب بکھر گئے تھے۔ پُر سکون دنیا جہنم بن کر اُجڑ گئی تھی۔

سلمان کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اُن کو یاد کرتے کرتے وہ تکیہ میں منہ چھُپا کر رونے لگا۔

جب رونے سے دل ذرا ہلکا ہو گیا تو اُس نے سوچا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اچانک اُس کو علی احمد یاد آ گیا۔ پھر فلک پیما اور اُس کے اسکائی لارک۔

اب علی احمد ہی اُس کو سہارا دے سکتا تھا اور فلک پیما کے ساتھ ہی اُس کی سرد اور ویران زندگی میں حرارت اور نمو پیدا ہو سکتی تھی۔

اُس نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر چلا گیا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ رات کے شو میں فلم دیکھی اور واپس آکر اطمینان سے سو گیا۔

چند ہی روز میں اُس نے گھر کا سارا سامان فروخت کر دیا۔ دفتر سے تنخواہ لی۔ فلیٹ اُس نے ساڑھے چار ہزار روپیہ لے کر پگڑی پر دے دیا۔

دسمبر کی ایک سرد رات کو وہ ایک سوٹ کیس اور بستر لے کر سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچ گیا۔

(۶)

سلمان جس وقت فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا، پہر دن گزر چکا تھا۔

گمٹی کی بے ترتیب آبادی کے تنگ اور بوسیدہ مکانوں کے بیچوں بیچ ہیڈ کوارٹر کی سفید دیواروں والی عمارت منارۂ روشنی کی طرح سر اونچا کئے کھڑی تھی۔ جاڑوں کی ہلکی ہلکی بسنتی دھوپ ہر طرف پھیلی تھی۔ گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ عورتیں دروازوں کی دہلیز پر بیٹھی اونچی آوازوں سے بول رہی تھیں۔

ہیڈ کوارٹر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ کوئی اسکائی لارک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سلمان اِدھر اُدھر جھانکتا ہوا لائبریری کی طرف مُڑ گیا۔ قریب پہنچا۔ مگر جھجک کر دروازے ہی پر رُک گیا۔ لائبریری کی لمبی میز پر ایک عورت جھکی ہوئی بڑے انہماک کے ساتھ اخبار پڑھ رہی تھی۔ اُس کا لباس صاف ستھرا تھا۔ پیٹھ سلمان کی جانب تھی۔

عورت نے دروازے پر چاپ سُنکر گردن موڑی۔ سلمان ششدر رہ گیا۔ وہ سلطانہ تھی۔ لمحہ بھر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کو تکتا رہا۔ پھر اُس نے بڑے تعجب سے کہا۔

"سلطانہ؟"

وہ آہستہ سے بولی۔"جی!"

سلطانہ بھی حیرت زدہ نظر آرہی تھی۔ اُس نے سوچا سلمان یہاں کیسے آ آگیا اور یہی بات وہ سلطانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔"تم یہاں کس طرح آگئیں؟" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔

سلطانہ نے جواب دیا۔"میں یہیں رہتی ہوں۔"

"یعنی تم ہیڈ کوارٹر ہی میں رہتی ہو؟"

"جی ہاں"

سلمان نے اور بھی زیادہ حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔"تو کیا تم بھی اسکائی لارک میں شامل ہوگئی ہو؟"

"جی ہاں پچھلے ہی مہینے مجھے رکنیت ملی ہے؟"

سلمان نے غور کیا سلطانہ کے چہرے پر ابھی تک وہی مانوس معصومیت تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے شرما شرما کے بول رہی تھی۔ وہی سادگی، وہی آنکھوں پر جھکی ہوئی گھنی پلکوں کے سائے۔ وہی گردن کا ہلکا سا خم۔ سلطانہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی۔ وہ ابھی تک ویسی ہی خوبصورت اور دل آویز تھی۔

وہ زندگی کا ایک طویل سفر طے کرکے واپس آیا تھا۔ راستہ ناہموار تھا۔ اُس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ دُکھ جھیلے تھے۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ سلطانہ اس طرح اچانک مل گئی۔ وہ بھی اس قدر

قریب کہ دونوں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکتے تھے۔ اب تو سلطانہ اُس کی راہ میں حائل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دونوں کی ایک ہی راہ تھی، ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی منزل تھی۔

یہ سوچتے سوچتے اُس کو اچانک نیاز یاد آگیا۔ اور اُس کا خیال آتے ہی سلمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابھی کوئی اُس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سلطانہ سے پوچھا۔

"نیاز کہاں ہے؟"

سلطانہ نے اُس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا "کئی ماہ ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔"

سلمان نے اطمینان کی سانس لی۔ عین اُس وقت علی احمد لائبریری میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ سُرخ سُرخ گالوں والا ایک تندرست بچہ تھا۔ یہ ایاز تھا۔ علی احمد نے حیرت سے سلمان کو دیکھا اور خوشی سے چیخ پڑا۔

"سلمان تم آگئے؟"

دونوں بانہیں پھیلا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ علی احمد اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا "مجھے یقین تھا کہ سلمان ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آگئے۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

سلمان معذرت کرنے لگا "میں پریشانیوں میں ایسا گھرا رہا کہ آپ کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ فرصت سے بتاؤں گا کہ مجھ پر اس عرصہ میں کیا کیا بیت گئی ہے؟"

علی احمد نے زور سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ مسکرا کر بولا "تم اُس چمک دمک پر ریجھ گئے ہو گے، جو دُور سے بہت خوب صورت اور بڑی دلکش

نظر آتی ہے۔ مگر یہ سونے کا پہاڑ صرف دیکھنے کے لئے ہے، جتنا اس کے قریب جانے کی کوشش کرو، اُتنا ہی دُور ہٹتا جاتا ہے۔ یہ عجیب گورکھ دھندا ہے۔ ایک نا سلجھاؤ دس اُلجھتے ہیں۔ ساری زندگی تانا بانا ہی سلجھاتے گزار دو، سرا کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔"

علی احمد پر فلسفیانہ مُوڈ طاری تھا۔ وہ ابھی نہ جانے کتنی دیر زندگی کے اسرار و رموز پر گفتگو کرتا، اچانک ننّھا ایاز اُس کے کرُتے کا دامن پکڑ کر زور زور سے رونے لگا۔

علی احمد نے بچّے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کے رخساروں کا بوسہ لیا۔ ہنس کر بولا۔

"سلمان! یہ سب سے چھوٹا اسکائی لارک، ایاز ہے۔"

سلمان نے بچّے کے گول مٹول سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "کس کا بچّہ ہے؟"

علی احمد نے مسکرا کر کہا "فی الحال تو یہ میرا ہی بچّہ ہے۔" مگر بچّہ کو شاید اُس کی بات ناگوار گزری۔ وہ منہ پھاڑ کر رونے لگا۔ پیچھے سے سلطانہ کی آواز آئی۔

"لائیے اس کو مجھے دے دیجئے۔"

علی احمد نے گھوم کر سلطانہ کو دیکھا اور سلمان کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا "سُلطانہ تم ان سے نہیں ملیں۔ یہ فلک پیما کے بہت سینیئر اسکائی لارک ہیں، سلمان۔"

سلطانہ نے نظریں اٹھائیں۔ سلمان نے دیکھا۔ وہی چھلکتی ہوئی شفاف آنکھیں۔ وہی سینے میں اُتر جانے والی نظریں، وہی گھبرایا گھبرایا سا معصوم چہرہ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "سلطانہ! میں مر کر بھی تم کو نہیں بھول سکتا۔ یہ آنکھیں، یہ عارض، یہ لب۔ سلمان لمحہ بھر کے لئے بالکل بھول گیا کہ سلطانہ اور اس کے علاوہ وہاں اور بھی کوئی موجود ہے۔

یہ علی احمد تھا۔ اُس نے سلمان سے کہا "سلمان! یہ سلطانہ ہے۔ میری

بیوی۔"

اڑاڑادھم! در و دیوار تک لرز کر رہ گئے۔ سلمان لڑکھڑا کر رہ گیا۔ پل بھر کے لئے اُس کے دل کی حرکت رُک گئی۔ اُس نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے علی احمد کو دیکھا۔ اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ علی احمد کسی قدر شرما کر بولا۔

"ہاں بھئی میں نے شادی کر لی۔"

یہ کہتے کہتے علی احمد کی نظریں جھک گئیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی دمک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی سُرخی لہرانے لگی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ رہنے والا علی احمد کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح معصوم لگ رہا تھا۔

سلمان پر لمحہ بھر تک سکتہ کا سا عالم طاری رہا۔ پھر اُس نے چونک کر کہا۔ "مُبارک ہو" اِس سے زیادہ وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اُس کی آواز میں دبی دبی تھرتھراہٹ تھی۔

علی احمد کہنے لگا۔ "تم سفر سے تھکے ہارے آرہے ہو۔ کسی کمرے میں جا کر آرام کرو۔ رات کو تم سے اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کورٹ جانا ہے۔"

سلمان نے پوچھا۔ "کیا اُس رات کے ہنگامے والا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے؟"

"نہیں، وہ تو کب کا ختم ہوگیا۔ اُس مقدمہ میں جان ہی کب تھی۔ وہ تو الیکشن جیتنے کے لئے اسکائی لارک کے خلاف پولیس نے بنایا تھا۔ یہ دوسرا ہی مقدمہ ہے۔"

علی احمد نے سلطانہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم بھی کورٹ چلو گی؟"

"جی ہاں۔ میں تو بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

علی احمد معذرت کرنے لگا۔ "بھئی معاف کرنا سلطانہ مجھے دیر ہوگئی۔"

سلطانہ بولی "آپ تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا دیر آرام تو کر لیجئے۔ کہئے تو چائے بنا دوں" اُس نے تھوڑے توقف کیا "مگر آپ زیادہ چائے پینا بند کر دیں۔ بہت چائے پینے لگے ہیں"

علی احمد مسکرا کر بولا "اچھا بھئی اب چائے کم پیا کروں گا"

دونوں بڑے گھریلو انداز سے گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے لب و لہجہ میں ایک دوسرے کے لئے خلوص تھا، پیار تھا۔ سلمان سے یہ سب کچھ دیکھا نہ گیا۔ اُن کی ایک ایک بات اُس کو ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کے لئے وہاں ٹھہرنا عذاب ہو گیا۔

"میں آپ سے شام کو ملوں گا" اُس نے علی احمد سے کہا۔

علی احمد بولا "تم اسکائی لارک افضل کے کمرے میں ٹھہر جاؤ۔ اُس کا کمرہ سب سے آخر میں ہے"

سلمان نے خاموشی سے اپنا بستر بند اور سوٹ کیس اُٹھایا اور لائبریری سے جانے لگا۔

"سلمان میں تمہاری کچھ مدد کروں؟"

"جی نہیں شکریہ! ان دونوں چیزوں کا وزن زیادہ نہیں ہے" یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

افضل کے کمرے میں جا کر اُس نے اپنا بستر بند کھولا اور سگریٹ سُلگا کر تھکا ہوا سا لیٹ گیا۔ اُس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ذہن پر برف کی تہیں جمتی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار سوچتا یہ کیا ہو گیا؟ اسی سلطانہ کے باعث ایک بار اُس نے فلک پیما چھوڑا تھا اور گھر جا کر جھمیلوں میں پھنس گیا تھا۔ کیا وہ پھر اس کے لئے فلک پیما کو چھوڑ دے؟ یہاں رہ کر وہ اُس کو علی احمد سے اس طرح باتیں کرتے ہوئے، پیار کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اُس کے لئے مستقل آزار بن جائے گا۔

انتہائی بے بسی کے عالم میں سلمان نے سوچا۔ خدایا! وہ اب کیا کرے، زندگی ہے کہ اُس سے رُوٹھتی ہی چلی جارہی ہے۔ حالات ہیں کہ بگڑتے ہی جارہے ہیں۔ جینے کا ہر سہارا، ہر اُمید اُسے ٹھکرا کر آگے نکل جاتی ہے۔ وہ یہاں آیا تھا کہ زندگی کے اِس دُکھ بھرے سفر میں علی احمد اُس کی رہنمائی کرے گا، اُس کو سہارا دے گا۔ مگر علی احمد نے ملتے ہی اُس کے سینے میں خنجر اُتار دیا۔ کیا وہ یہاں سے چلا جائے؟ ابھی اُس کے پاس پانچ ہزار روپے موجود تھے، جن سے سال بھر تک وہ گزارا کر سکتا تھا۔ اور اِتنی طویل مدّت میں کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر لینا ایسا مشکل نہیں تھا۔ پھر وہی ملازمت، وہی گھر اور اُس گھر کو آباد کرنے کے لیے ایک عدد بیوی کی ضرورت۔ پھر وہی پُرانا چکر، وہی دن رات، اور ان دن راتوں کو خوشگوار بنانے کے لئے وہی باسی ہنگامے، جن سے اُسے نفرت تھی۔ شدید نفرت!

اچانک اُس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ کوئی اُس کے وجود میں چیخا۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ وہ زندہ رہے گا، اور ایک اسکائی لارک کی طرح زندہ رہے گا۔ اِس زندگی میں، اِس جدوجہد میں حرکت تھی، مسرّت تھی اور یہ مسرّت بڑی مقدس اور پاکیزہ تھی۔ پہلے پورے معاشرے کو خوب صورت بناؤ۔ اُس کے چہرے سے غلاظت اور گندگی صاف کرو۔ پھر خوب صورت چیزوں کی خواہشیں کرو، زندگی حسین عورت کا ایک تبسم، شراب کا ایک جام نہیں ہے۔ زندگی عمل اور حرکت کا نام ہے انقلاب اور تغیر کا نام ہے۔ اِس تغیر سے تم منہ نہیں موڑ سکتے۔ تمہارے ذہن میں وہ کانٹا چُبھ گیا ہے جو تمہارے شعور کو کبھی خودکشی کرنے نہ دے گا۔

سلمان نے فلک پیما چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سہ پہر تک وہ کمرے میں پڑا گہری نیند سوتا رہا۔

شام کو سلمان لائبریری میں گیا۔ تمام اسکائی لارک وہاں موجود تھے۔ نئے اسکائی لارکوں سے اُس کا تعارف کرایا گیا۔ سب نے اُس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔

وہ ایک ایک سے گلے ملا۔ خوب زور زور سے قہقہے لگائے۔ اُس کی آمد کی خوشی میں اسکائی لارکوں نے ایک چھوٹی سی پارٹی دی۔ اس میں چائے تھی، پھل تھے اور گرم گرم سموسے تھے جو سلطانہ نے تیار کئے تھے۔ چائے کی میز پر اُس نے خوب باتیں کیں۔ طرح طرح کے لطیفے سُنا سُنا کر سب کو خوب ہنسایا۔

بہت عرصہ بعد اُس کی ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز شام گزری تھی۔

مگر وہ اب فلک پیما کا رُکن نہیں رہا تھا۔ طویل غیر حاضری کے باعث اُس کی رُکنیت منسوخ کر دی گئی تھی۔ وہ دوبارہ رکنیت حاصل کرنے کا متمنی ضرور تھا۔ اور اپنی اس خواہش کا علی احمد اور تنظیم کے دوسرے ارکان سے اظہار کر چکا تھا۔

چند روز بعد فلک پیما کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر زیدی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اب وہی فلک پیما کا صدر بھی تھا۔ علی احمد بدستور سیکرٹری جنرل تھا۔ اس نے سلمان کی رُکنیت بحال کرنے کی تجویز اجلاس میں پیش کی۔ تجویز پر مختصر بحث ہوئی اور اُسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ ساتھ ہی سلمان کو سخت تنبیہ بھی کی گئی کہ وہ آئندہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرے۔

سلمان اس وقت کمرے میں تھا۔ اُسے بُلایا گیا اور اجلاس کے فیصلہ سے آگاہ کیا گیا۔ رُکنیت بحال ہونے پر ارکان نے اُسے مُبارک باد دی۔ اُسے اجلاس کی کارروائی میں شرکت کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔ سلمان کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اُس نے اجلاس سے خطاب بھی کیا۔ صدر اور دوسرے ارکان کا شکریہ ادا کیا، اُنہیں یقین دلایا کہ وہ نہ صرف محتاط رہے گا، بلکہ پوری پوری کوشش کرے گا کہ اُس سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔ ساتھ ہی اُس نے پشیمانی کا اظہار کیا اور اپنے غیر ذمّہ دارانہ رویے کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔

ایجنڈے کی اہم شق، امجد خان کی رپورٹ تھی۔ جو پچھلے سالانہ انتخابات میں فلک پیما کا خازن منتخب ہوا تھا۔ رپورٹ میں مالی مشکلات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ فلک پیما کا کام اپنے ہمدردوں کے چندے اور انڈسٹریل ہوم کی آمدنی سے چل رہا تھا، مگر فنڈ کی کمی کے باعث تنظیم کی سرگرمیوں کا آگے بڑھنا روز بروز مشکل ہوتا جارہا تھا۔ اس ضمن میں ڈسپنسری کا ذکر خاص طور پر کیا گیا تھا، جو مالی مشکلات کے باعث غیر اطمینان بخش حالت میں تھی۔

سلمان نے صدر سے اجازت لی۔ اپنے کمرے میں گیا۔ سوٹ کیس کھولا۔ پانچ ہزار روپے نکالے۔ اجلاس میں واپس گیا۔ صدر کے سامنے نوٹوں کی گڈی رکھتے ہوئے نہایت انکساری سے کہا۔

"فلک پیما کے فنڈ کے لئے یہ میری حقیر پیشکش ہے۔"

اسکاؤٹ لارکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر سلمان کے خلوص کو سراہا۔ اُنھوں نے اس قدر جوش وخروش کا اظہار کیا کہ ذرا دیر کے لئے اجلاس کی سنجیدہ فضا درہم برہم ہوگئی۔ سلمان کا سینہ فخر سے تن گیا۔ زندگی میں اتنی زبردست خوشی اُس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

اجلاس میں ریاض بھی شریک تھا۔ وہ پچھلے مہینے جیل سے رہا ہو کر آیا تھا۔ فلک پیما کا باقاعدہ رُکن بن چکا تھا۔ وہ دیر سے خاموش بیٹھا تھا، اور سگریٹ پر سگریٹ لگا رہا تھا۔ وہ صدر کی اجازت سے تقریر کرنے کھڑا ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ اُس نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اسکاؤٹ لارک سلمان کے جذبۂ ایثار کی قدر کرتا ہوں۔ یہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ اُن کو فلک پیما سے کس قدر گہرا لگاؤ ہے۔ فلک پیما ایک جماعت ہے، ایک تنظیم ہے۔ اور کوئی تنظیم محض تنظیم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اغراض ومقاصد سے، یعنی اپنے سماجی اور اقتصادی پروگرام سے پہچانی

جاتی ہے۔ فلک پیما کا بھی ایک سماجی اور اقتصادی پروگرام ہے۔ اُسے عملی جامہ پہنانے اور کامیاب بنانے کے لئے ہم کو ان طبقات، سماجی گروہوں، تنظیموں اور جماعتوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون اور امداد حاصل کرنا چاہیئے، جو اس سے پوری طرح اتفاق کرتی ہیں۔"

افضل نے مداخلت کی۔" میں سمجھتا ہوں کہ اسکائی لارک ریاض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں عملی سیاست میں سرگرمی کے ساتھ اور بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہیئے۔"

"میں نے اپنی بات ابھی پوری نہیں کی ہے۔" ریاض نے مسکرا کر کہا۔" لیکن اسکائی لارک افضل اگر دلوں کا حال پڑھ لیتے ہیں اور ذہنوں کے بھید معلوم کر لینے کا گُر جانتے ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ اُن کا قیاس درست ہے۔ مَیں یہی کہنا چاہتا تھا۔"

اِس دفعہ افضل کے بجائے ساجد نے اُٹھ کر کہا۔" میں اسکائی لارک ریاض پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فلک پیما نے پہلے بھی عملی سیاست میں حصّہ لیا تھا۔ میری مُراد میونسپلٹی کے الیکشن سے ہے۔ یہ ہمارے لئے بڑا تلخ تجربہ ثابت ہُوا۔ ہمیں اس کے نتیجے میں بہت بڑی قربانی دینی پڑی۔"

اُس نے دیوار پر آویزاں صفدر بشیر کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔" یہ تصویر آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ فلک پیما کے بانی اور ہمارے نہایت محترم بلکہ رہنما کی تصویر ہے، اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن کی موت کیوں، کیسے اور کن حالات میں واقع ہوئی۔"

"ایسی قربانیاں تو ہمیں آئندہ بھی دینی پڑیں گی اور ذہنی طور پر اس کے لئے خود کو تیار کرنا پڑے گا۔" ریاض نے نہایت اعتماد سے کہا۔" آپ نے یہ بھی سوچا کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں، وہ کیا ہے؟ سیاست صرف کاروبار حکومت میں حصّہ

لینے کا نام نہیں۔ یہ بنیادی طور پر معاشرے میں اقتصادی رشتوں کا اظہار ہے۔ اُسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کارخانے دار بھی معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے، اور مزدُور بھی۔ دونوں ہی انسان ہوتے ہیں۔ اُن میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ مگر جب کارخانے دار کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتا ہے تو اُسے مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ایک طرح کا اقتصادی معاہدہ ہوتا ہے۔ مزدُور، جسم وجاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اپنی محنت بیچتا ہے اور کارخانہ دار اُسے خریدتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ مگر جب مزدُور اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لئے ٹریڈ یونین بناتے ہیں، تو اُسی وقت سے اقتصادی رشتوں کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے مفادات کے لئے جدّوجہد کرتے ہیں۔ یہی جدّوجہد یہی اقتصادی رشتوں کی تبدیلی سیاست ہے۔

"اسی طرح جب آپ غربت، پس ماندگی اور سماجی اور اقتصادی عدم توازن کو ختم کرنے اور معاشرے کو صحت مند اور خوب صورت بنانے کے لئے جدّوجہد کرنے کا عزم کرتے ہیں، تو یہ جدوجہد ان طبقات اور سماجی گروہوں کے خلاف ہوتی ہے، جو محنت کش عوام کی غربت اور پس ماندگی کا باعث ہیں، جو اُن کی محنت کا استحصال کرتے ہیں۔ یہی جدوجہد سیاست ہے۔ فرق صرف سیاست کی نوعیت کا ہے۔ ایک استحصال کرنے والے طبقات کی سیاست ہوتی ہے، ایک استحصال زدہ اور غریب طبقات کی سیاست ہے کہنے کا مطلب یہ ہے۔"

مگر علی احمد نے ریاض کو مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا "مجھے اسکائی لارک ریاض کے موقف سے قطعی اتفاق ہے۔ مگر اس بحث کے لئے جو بلاشبہ ایک صحت مند رجحان ہے، مناسب جگہ یہ اجلاس نہیں، اسٹیڈی سرکل ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اسکائی لارک ریاض کے ذہن میں اس اجلاس

کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی تجویز ہے، تو اُسے سامنے لائیں تاکہ اس پر غور کیا جائے۔"

ریاض نے علی احمد کی بات مان لی۔ اُس نے ایک تجویز کی صورت میں فلک پیما کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے اور تقسیم کار کی اہمیت پر زور دیا۔ تفصیل میں جانے سے گریز کیا۔ مختصر طور پر یہ بتایا کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے۔

اس کی تجویز پر زیادہ بحث نہیں ہوئی۔ اُسے منظور کر لیا گیا۔ اسی اجلاس میں سلطانہ کو انڈسٹریل ہوم کا انچارج، علی احمد کو تعلیم بالغاں کا انچارج، ڈاکٹر زیدی کو طبی امداد کے کاموں کا اِنچارج، ریاض کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا انچارج منتخب کیا گیا۔ سعید احمد کو، جو ہنوز طالب علم تھا، طلباء میں کام کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

ریاض کی دُوسری تجویز یہ تھی کہ فلک پیما اور اسکائی لارک، چونکہ عوام کے لئے نامانوس نام ہیں، لہذا تنظیم کا نام ایسا رکھا جائے جو ہمارے معاشرے کی روایات اور اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس تجویز پر طویل بحث شروع ہو گئی۔ رات لگ بھگ آدھی ہو چکی تھی اور اسکائی لارکوں کو صبح تڑکے اُٹھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صدر نے بحث کو ملتوی کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ تجویز پر آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے۔ اجلاس ختم ہو گیا۔

سلمان کو اُس کی خواہش پر ریاض کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ وہ پہلے بھی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا تھا۔ مزدوروں میں کام کرنے کا اُسے بخوبی تجربہ بھی تھا۔ صبح ہوئی تو وہ ریاض کے ہمراہ ٹریڈ یونین کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہ ایک بار پھر پورے جوش و خروش اور لگن کے ساتھ فلک پیما کے لئے کام کرنے لگا۔ اب وہ عمداً خود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتا، تاکہ سلطانہ کے

بارے میں اسے سوچنے کا موقع نہ ملے۔ اس جانفشانی اور مستعدی سے کام کرنے میں اُسے مسرّت حاصل ہورہی تھی۔ ذہنی آسُودگی مل رہی تھی۔

وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلہ میں اکثر رات گئے واپس آتا۔ اس کا بیشتر وقت مزدوروں کے ساتھ گزرتا۔ وہ اُن کے مسائل میں گہری دلچسپی لیتا۔ ریاض کی نگرانی میں اس کی ذہنی تربیت ہورہی تھی۔ اس کا سیاسی شعور زیادہ سے زیادہ بیدار ہوتا جارہا تھا۔ وہ مفروضی حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ان کا تجزیہ کرتا۔ اور اِس تجزیہ کی روشنی میں مزدوروں کی جدوجہد کے لئے حکمت عملی وضع کرتا۔

ہیڈکوارٹر میں واپس آتے ہی کھانا کھاتا اور لائبریری میں چلا جاتا۔ گھنٹوں مطالعہ میں غرق رہتا۔ اسٹیڈی سرکل کے مباحثوں کے لئے نوٹ تیار کرتا اور آدھی رات کو تھکا ہارا اس طرح بستر پر جاکر سوتا کہ صبح ہونے سے پہلے اُس کی آنکھ نہ کھُلتی۔

یہ اُس کی زندگی کے بڑے طوفانی لمحات تھے۔ کام، کام اور کام۔ ان دنوں اس پر یہی دُھن سوار تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو روز بروز بڑھاتا جارہا تھا۔ کبھی اس کے خلاف غیر ذمہ داری یا کام سے غفلت کا الزام نہ لگا۔ جب تک ہیڈکوارٹر میں رہتا، مطالعہ کرتا یا اپنی ڈائری بار بار دیکھتا کہ کس وقت اُسے کہاں پہنچنا ہے۔ اور کیا کام کرنا ہے۔

کبھی کبھار سلطانہ سے اُس کا آمنا سامنا ہوجاتا تو وہ صرف یہ سوچ کے رہ جاتا۔ یہ سلطانہ تھی۔ ہاں سلطانہ ہی تھی۔ وہی ہوگی، علی احمد کی بیوی، ننھّے ایاز کی ماں۔ اب وہ اُسے سلطانہ سے زیادہ علی احمد کی شریکِ حیات اور ننھّے ایاز کی ماں کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اس کوشش میں وہ اُس سلطانہ کو بھُولتا جارہا تھا، جو دلکش خدوخال والی ایک خوبصورت لڑکی تھی اور جس سے اس کو محبت رہی تھی۔

سلمان کے دن اور رات اِسی طرح گزرتے رہے۔ مصروف دن، معروف راتیں۔ مویشیوں کی سی زندگی بسر کرنے والے پس ماندہ اور مظلوم عوام کو انسان بنانے کی جدّوجہد۔ اُن کے لئے علم کی روشنی، شعور کی بالیدگی، ترقی اور خوشحالی کی تمنّا۔ اِس جدوجہد کی کوئی سرحد نہیں۔ یہ رواں دواں اور ہر آن آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ یہ معاشرے کی تبدیلی کا ایسا مسلسل سفر ہے۔ جس میں زندگی نت نئی منزلوں کی جانب جادہ پیما ہے۔ اس سفر میں انسانی جدّوجہد، اپنی جسمانی اور ذہنی محنت کے کس بل پر، دریاؤں کا رُخ موڑتی، سمندروں کا سینہ روندتی، ریگ زاروں اور صحراؤں کے چہروں کو بدلتی، کوہساروں کو پھلانگتی، چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہے۔ فطرت کے سربستہ اسرار و رموز افشا کر رہی ہے۔ کائنات کو تسخیر کر رہی ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ارتقائی عمل ہے۔

(۷)

نوشا جیل میں تھا۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ اقبالِ جرم کر چکا تھا۔ نیاز کے قتل کے الزام میں اُس پر مقدمہ چلا۔ نہ اُس کا کوئی گواہ تھا، نہ شاہد۔ نہ کسی نے اُس کے مقدمہ کی پیروی کی۔ لہٰذا مجسٹریٹ کی عدالت سے اُسے سیشن سپرد کر دیا گیا۔

اُن دنوں، شامی اکثر جیل میں اُس سے ملنے آتا۔ وہی اس بھری دُنیا میں اس کا تنہا ہمدرد و غم گسار تھا۔ پھر اُس کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ملاقات کے دن نوشا اُس کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ مگر شامی کو تپ دق ہو گئی تھی۔ وہ خون تھوکنے لگا۔ ہر وقت بخار میں بھُنتا رہتا۔ تپ دق کے مُوذی مرض نے اُس کے محنتی جسم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ کچھ عرصہ خیراتی

اسپتال میں رہا۔ اب اپنے گھر کے ایک گوشے میں پڑا، زندگی کے دن گِن رہا تھا۔

علی احمد نے جب نوشا کے مقدمہ کی پیروی شروع کی تو عالم یہ تھا کہ نوشا کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ دوسری طرف استغاثہ کے گواہ بھی پیدا ہو گئے تھے۔ پولیس کو یہ شہادتیں خان بہادر فرزند نے مہیا کی تھیں۔ وہ نوشا کے مقدمے میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ نوشا کے خلاف ہر طرح کے ثبوت مہیا کر رہا تھا۔ پولیس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔

علی احمد نے نوشا کے مقدمہ کے لئے جس وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں، وہ نیاز کے قتل میں خان بہادر فرزند علی اور اُس کے ایک مینیجر کو بھی مُلزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کا موقف یہ تھا کہ نیاز کو قتل سے پہلے زہر دیا جا چکا تھا۔ اپنے اِس موقف کی تائید میں اُس نے یہ دلیل ثبوت کے ساتھ پیش کی تھی کہ قتل کی رات خان بہادر اپنے مینیجر نذر محمد کے ہمراہ نیاز کے پاس آیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد نیاز نے اپنے پیٹ میں شدید درد محسوس کیا تھا۔ اُسے خون کی قے بھی ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی عینی گواہ سلطانہ اور اس کی خادمہ تھی۔

مگر دوسری ہی پیشی پر خادمہ اپنے بیان سے منحرف ہو گئی۔ خان بہادر نے ایک ہزار روپے دے کر اُسے توڑ لیا تھا۔ اب صرف سلطانہ واحد گواہ رہ گئی تھی۔ اس مرحلہ پر نوشا کے وکیل نے عدالت کے رُو بُرو ایک درخواست پیش کی، جس میں یہ التجا کی گئی تھی کہ نیاز کی لاش ایک مجسٹریٹ کی نگرانی میں قبر سے نکالی جائے۔ اس کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ لیکن عدالت نے سلطانہ کی گواہی کو اِس لئے قابلِ اعتنا نہ قرار نہ دیا کہ وہ نوشا کی حقیقی بہن تھی۔ لہٰذا درخواست مسترد کر دی گئی۔ عدالت کے اس فیصلے میں بھی خان بہادر

فرزند علی کے اثر و رسوخ اور دولت کو بہت بڑا دخل تھا۔

سلمان بھی نوشا کے مقدمے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ دو بار ملاقات کے دن نوشا سے ملنے جیل گیا۔ اُس کے لئے پھل اور مٹھائی بھی لے گیا۔ اُس نے نوشا کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھا تو تڑپ اُٹھا۔ اُس کا چہرہ بجھ گیا۔ اور دل بیٹھنے لگا۔

علی احمد بڑی تندہی سے نوشا کے مقدمے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ وہ وکیل سے ملتا۔ مقدمے کے سلسلہ میں تبادلۂ خیالات کرتا۔ ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہتا۔ مقدمہ کی سماعت جاری رہی۔

پھر ایک روز علی احمد نے دُکھ بھرے لہجے میں سلمان کو بتایا کہ نوشا کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور اس فیصلے کے خلاف وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر کر دی ہے۔ اب نوشا کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہائیکورٹ کے ہاتھ میں تھا۔

اِس عرصہ میں سلمان کو اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ یہی کہ ننھا ایاز، دراصل نیاز کا بچّہ تھا، جسے علی احمد اپنی اولاد کی طرح پال رہا تھا۔ نیاز کے قتل کے بعد خان بہادر فرزند علی نے اپنے غنڈے فیاض کے ذریعہ سلطانہ کو کوٹھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور ایک جعلی دستاویز کے ذریعہ نیاز کی تمام جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔ خان بہادر میونسپلٹی کا چیئرمین تھا۔ کئی کارخانوں کا مالک تھا کے پاس سندھ اور پنجاب میں زرعی املاک اور جاگیر تھی۔ یہ جاگیر اُس نے بوگس کلیم داخل کر کے غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی متروکہ املاک میں سے، اپنے نام الاٹ کرائی تھی۔ اب وہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی تیاری کر رہا تھا اور ممبر منتخب ہونے سے پہلے ہی وزیر بننے کے لئے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔

وزراء اور اعلیٰ حکام سے اُس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے تعلقات اور

اثر و رسوخ کا دائرہ ملک سے نکل کر بیرونِ ملک تک پھیل چکا تھا۔ اُس کا ایک لڑکا کولمبو پلان کے تحت، لندن میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ دوسرا فورڈ فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر کولمبیا یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔

خان بہادر فرزند علی جو اَب الحاج خان بہادر فرزند علی بن چکا تھا، اسلام کی سربلندی کا علم بردار تھا، نورانی مسجد کے پُرشکوہ منارے اُس کے جذبۂ ایمانی کا جیتا جاگتا ثبوت تھے۔ وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ اور محبِّ وطن تھا، اسکائی لارک کو وطن دشمن اور تخریب کار قرار دیتا تھا۔ انہیں سیکورٹی ایکٹ کے تحت جیل میں بند کرانے کی کھلم کھلا دھمکیاں دیتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے پاکستان میں متروکہ جائیداد کی طرح اسلام اور حب الوطنی کے جملہ حقوق بھی اپنے نام الاٹ کرا لئے ہیں۔

نوشا جیل میں تھا اور پھانسی کے پھندے کے سامنے میں کھڑا تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزندِ ارجمند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں، اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انّو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں، رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی تپ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور رکشا کھینچتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پیٹتا، ٹھمکتا، مٹکاتا ہے۔

نوشا کا مقدمہ اب ہائی کورٹ کے سامنے تھا۔ اُسے کراچی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب اُس کی اپیل پر عدالت نے اپنا فیصلہ سُنایا۔ علی احمد چند روز پہلے ہی کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہمراہ وکیل تھا۔ سلطانہ تھی۔ سلمان تھا۔ دو اور اسکائی لارک بھی

تھے۔

اُس روز صبح ہی سے سلطانہ بے حد پریشان تھی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے سُوجے ہوئے تھے۔ وہ رات بھر بے چین رہی۔ پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکی۔ وہ کھوئی کھوئی سی اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔ نہ بول رہی تھی، نہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ فیصلہ سُننے کی غرض سے جب سب عدالت میں پہنچے تو سلطانہ کی بے قراری اور بڑھ گئی۔

نوشا ملزموں کے کٹہرے میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اُس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ داڑھی کے بھُورے بھُورے سنہری بالوں میں اُس کا چہرہ، بحیرہ کے نوعمر ملّاحوں کی طرح خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں سے رُوٹھا ہُوا کھڑا ہو۔

عدالت میں موت کی سی گہری خاموشی چھائی تھی۔ پھر اس خاموشی میں ایک بھاری بھرکم آواز اُبھری۔ یہ جج کی آواز تھی۔ وہ فیصلہ سُنا رہا تھا۔ نوشا قاتل تھا۔ قانون کا یہی فیصلہ تھا۔

استغاثہ نے نوشا کے خلاف شہادتوں کے ساتھ پُورا پُورا ثبوت بھی مہیا کر دیا تھا۔ اُس کو موت کی سزا دی جا چکی تھی۔ ہائی کورٹ نے سیشن کے فیصلہ سے اتفاق رائے کیا تھا۔ اُسے برقرار رکھا تھا۔ البتہ نابالغ ہونے کے باعث عدالت نے سزائے موت کے بجائے نوشا کے لئے چودہ سال قید بامشقت کی سزا کا فیصلہ دیا۔ انصاف نے اپنا تقاضہ پُورا کر دیا تھا۔

نوشا کو ملزموں کے کٹہرے سے نکالا گیا۔ اور جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی، اُن میں ہتکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتکڑیاں پہن کر نوشا، پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"مجھے پھانسی دے دو!"

" مجھے گولی مار دو !"

" میں زندہ رہنا نہیں چاہتا "۔

" میں اب جینا نہیں چاہتا "!

" خدا کے لئے مجھے پھانسی دے دو !"

" جج صاحب ! اللہ کے لئے مجھے پھانسی دے دو !"

نوشا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترا بن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لئے جیل گیا تھا۔ اب اُسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی اس طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔ وہ موت چاہتا تھا۔ وہ بلک بلک کر پھانسی کی درخواست کر رہا تھا۔ مگر عدالت اُسے پھانسی دینے سے مجبور تھی۔ اِس لئے کہ وہ نابالغ تھا۔

پولیس کے کانسٹیبل اُسے گھسیٹ کر عدالت سے باہر لے گئے۔ نوشا نے ایک بار بے قرار ہو کر دونوں ہاتھ بلند کئے۔ اور آہنی ہتکڑیوں سے دیوانہ وار اپنا سر ٹکرانے لگا۔ آن کی آن میں اُس کی پیشانی پر سُرخ سُرخ لوتھڑے اُبھرنے لگے۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ کانسٹیبلوں نے جھپٹ کر اُس کی مشکیں کس لیں۔ سلطانہ چیخ مار کر اُس کی جانب لپکی۔

" نوشا ! میرا بھیا ! خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر نہ جا !"

" نہ جا، نوشا نہ جا، میں مر جاؤں گی "۔

" نوشا ، نوشا !"

علی احمد نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو تھام لیا۔ سلطانہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ علی احمد پیار سے اُس کی پیٹھ تھپتھپا کر تسلّی دینے لگا۔ اُس کا چہرہ شدتِ جذبات سے سُرخ پڑ گیا تھا۔ عینک کے موٹے

موٹے شیشوں کے پیچھے، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

سلمان لمحہ بھر تک، دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ آنسوؤں کے گرم گرم قطرے پلکوں سے ڈھلک کر ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگے۔ سلمان نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے اور چُپ چاپ عدالت سے باہر چلا گیا۔

◎

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اقبالیات

کلیات اقبال اردو	صدی ایڈیشن	۸۵/۰۰
دانشور اقبال	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۷۵/۰۰
اقبال شاعر و مفکر	نور الحسن نقوی	۸۰/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	نور الحسن نقوی	۳۰/۰۰
شکوہ جواب شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	۶/۰۰
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۳۰/۰۰
بال جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/-
ضرب کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/-
ارمغان حجاز اردو (عکسی)	علامہ اقبال	۱۰/۰۰

غالبیات

دیوان غالب	مقدمہ نور الحسن نقوی	۴۰/۰۰
غالب شاعر اور مکتوب نگار	نور الحسن نقوی	۴۸/۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۴۰/۰۰

سرسید

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	۲۰۰/۰۰
سرسید اور ان کے کارنامے	نور الحسن نقوی	۱۵/۰۰
مطالعہ سرسید احمد خاں	عبد الحق	۶۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبد اللہ	۶۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۲۰/۰۰
سرسید ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۵/۰۰

فیض

کلام فیض	عکسی	فیض احمد فیض	۵۰/۰۰
نقش فریادی	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰
دست صبا	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰
زنداں نامہ	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰
دست تہ سنگ	عکسی	فیض احمد فیض	۱۵/۰۰

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۶۰/۰۰
اردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۰۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۷۵/۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۳۰/۰۰

ادب و تنقید

خواب باقی ہیں (خود نوشت)	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
فکر روشن	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اردو تحریک	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
افکار کے دیئے	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
شیر دریا	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
کتب خانہ	رضا علی عابدی	۸۰/۰۰
شاعری کی تنقید	پروفیسر ابو الکلام قاسمی	۱۵۰/۰۰
محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک	نور الحسن نقوی	۳۰/-
عرفان سید حامد	مرتبہ اصغر عباس و شہاب الدین ثاقب	۲۰۰/-
مجنوں گورکھپوری: حیات و ادبی خدمات	شاہین فردوس	۲۵۰/-
نذیر احمد کے ناول	ڈاکٹر اشفاق محمد خاں	۸۰/۰۰
تصویریں اجالوں کی (خاکے)	نور الحسن نقوی	۱۲۰/۰۰
اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	۱۰۰/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری	نور الحسن نقوی	۴۵/۰۰
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۵۰/۰۰
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۷۵/۰۰
انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	۵۰/۰۰
غزل کی سرگذشت	اختر انصاری	۲۰/۰۰
غزل درس غزل	اختر انصاری	۳۰/۰۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۴۰/۰۰
اردو داستان: تحقیق و تنقید	قمر الہدیٰ فریدی	۵۰/-
اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید	پروین اظہر	۱۰۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۳۰/۰۰
تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی	۵۰/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	۶۰/۰۰
اردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۶۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	۱۸/۰۰
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۳۵/۰۰

اردو مرثیہ نگاری — مرتبہ ام ہانی اشرف — ۳۵/۰۰
ناول کا فن — مترجم ابوالکلام قاسمی — ۳۰/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء — عبدالقادر سروری — ۲۰/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی — ۵۰/۰۰
فن افسانہ نگاری — وقار عظیم — ۴۰/۰۰
نیا افسانہ — وقار عظیم — ۴۰/۰۰
داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — ۵۰/۰۰
اردو کی تین مثنویاں — خان رشید — ۳۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۲۰/۰۰
آئیے اردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۵/۰۰
قاری اساس تنقید — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۱۵/۰۰
فکر و آگہی — انجمن آراء — ۶۰/۰۰
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ — ام ہانی اشرف — ۱۵۰/۰۰
داستان، ناول اور افسانہ — دردانہ قاسمی — ۴۰/۰۰
آل احمد سرور شخصیت اور فن — امتیاز احمد — ۱۵۰/۰۰
فروغ تنقید — عبدالمغنی — ۷۵/۰۰
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش — عبدالمغنی — ۵۰/۰۰
پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی) — خالد حیدر — ۱۵۰/۰۰
ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری — یعقوب یاور — ۱۷۵/۰۰
مقدمہ کلام آتش — خلیل الرحمن اعظمی — ۳۰/۰۰
شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی — حسن احمد نظامی — ۱۷۵/۰۰
افکار و انشاء — وارث کرمانی — ۸۰/۰۰
احساس و ادراک — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۲۲/۰۰
اردو ادب میں طنز و مزاح — وزیر آغا — ۶۰/۰۰
چہرہ پس چہرہ — ڈاکٹر ابن فرید — ۲۵/۰۰
مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱۲/۰۰
مضامین مسعود — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۱۲۵/۰۰
باغ و بہار — مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی — ۳۵/۰۰
موازنہ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۳۰/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۳۰/۰۰
امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۳۵/۰۰
مجموعہ نظم حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۲۰/۰۰
مثنوی گلزار نسیم — مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی — ۲۰/۰۰
مثنوی سحر البیان — مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی — ۲۰/۰۰
انار کلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/۰۰

سیاسیات

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی — ۸۰/۰۰
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالٹیکل سائنس) — 〃 — ۸۰/۰۰
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — 〃 — ۵۰/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالٹکس) — 〃 — ۵۰/۰۰

متفرق

اصول تعلیم — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۳۵/۰۰
جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۴۵/۰۰
تعلیم اور اس کے اصول — محمد شریف خاں — ۲۰/۰۰
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول — محمد شریف خاں، آفاق احمد — ۲۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — مسرت زمانی — ۴۵/۰۰
عام معلومات — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۱۵/۰۰
ایجادات کی کہانی — 〃 — ۱۵/۰۰
علم سماجیات تصورات و نظریات — 〃 — ۲۰/۰۰
جدید علم سائنس — وزارت حسین — ۳۰/۰۰
رہبر تندرستی — مسرت زمانی — ۳۵/۰۰
رہبر صحت — مسرت زمانی — ۲۰/۰۰
علم خانہ داری — مسرت زمانی — ۳۵/۰۰
بچوں کی تربیت — مسرت زمانی — ۲۵/۰۰
گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی — ڈاکٹر محمد عارف خاں — ۳۰/۰۰
تفہیم البلاغت — وہاب اشرفی — ۲۰/۰۰
اردو کہکشاں (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) — ۱۰/۰۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم اے شہید — ۳۰/۰۰

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول) — قاضی عبدالستار — ۶۰/۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ) — قرۃ العین حیدر — ۷۵/۰۰
آخر شب کے ہمسفر (ناول) — قرۃ العین حیدر — ۱۰۰/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے) — قرۃ العین حیدر — ۷۵/۰۰
ضدی (ناولٹ) — عصمت چغتائی — ۲۵/۰۰
آنگن (ناول) — خدیجہ مستور — ۵۰/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۵۰/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے — 〃 — ۵۰/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے — 〃 — ۵۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے — 〃 — ۶۰/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے — 〃 — ۵۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

مطبوعات ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ

اقبالیات

- کلیات اقبال صدی ایڈیشن ۸۵/۰۰
- دانشور اقبال آل احمد سرور ۱۵۰/۰۰
- اقبال بحیثیت شاعر رفیع الدین ہاشمی ۷۵/۰۰
- اقبال شاعر و مفکر نورالحسن نقوی ۸۰/۰۰
- اقبال فن اور فلسفہ نورالحسن نقوی ۳۰/۰۰
- شکوہ جواب شکوہ مع شرح علامہ اقبال ۵/۰۰
- بانگ درا عکسی علامہ اقبال ۳۰/۰۰
- بال جبریل عکسی علامہ اقبال ۲۰/۰۰
- ضرب کلیم عکسی علامہ اقبال ۲۰/۰۰
- ارمغان حجاز اردو عکسی علامہ اقبال ۱۰/۰۰

غالبیات

- دیوان غالب مقدمہ نورالحسن نقوی ۴۰/۰۰
- غالب شخص اور شاعر مجنوں گورکھپوری ۴۰/-
- غالب شاعر اور مکتوب نگار نورالحسن نقوی ۴۸/-

سرسید

- سرسید احمد خاں اور ان کا عہد ثریا حسین ۲۰۰/-
- مطالعہ سرسید احمد خاں عبدالحق ۶۰/۰۰
- سرسید اور ان کے نامور رفقاء سید عبداللہ ۶۰/۰۰
- انتخاب مضامین سرسید آل احمد سرور ۲۰/۰۰
- سرسید ایک تعارف خلیق احمد نظامی ۵/۰۰
- سرسید اور ان کے کارنامے نورالحسن نقوی ۱۵/۰۰

فیض

- کلام فیض عکسی فیض احمد فیض ۵۰/۰۰
- نقش فریادی عکسی فیض احمد فیض ۱۵/۰۰
- دست صبا عکسی فیض احمد فیض ۱۵/۰۰

لسانیات

- مقدمہ تاریخ زبان اردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۶۰/۰۰
- اردو زبان کی تاریخ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۱۰۰/-
- اردو کی لسانی تشکیل ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۷۵/۰۰
- اردو لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری ۳۰/۰۰

ادب و تنقید

- شاعری کی تنقید پروفیسر ابوالکلام قاسمی ۱۵۰/۰۰
- نقوش علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر نورالحسن نقوی ۳۰۰/۰۰
- تصویریں اپنوں کی (خاکے) نورالحسن نقوی ۱۲۰/۰۰
- نذیر احمد کے ناول ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ۸۰/۰۰
- مجنوں گورکھپوری : حیات و ادبی خدمات ڈاکٹر شاہین فردوس ۲۵۰/۰۰
- اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمن اعظمی ۱۰۰/۰۰
- کچھ خطبے کچھ مقالے آل احمد سرور ۱۵۰/۰۰
- خواب باقی ہیں (خودنوشت) آل احمد سرور ۲۰۰/۰۰
- رشید احمد صدیقی کے خطوط آل احمد سرور ۱۸۰/۰۰
- فکر روشن آل احمد سرور ۱۵۰/۰۰
- اردو تحریک آل احمد سرور ۲۰۰/۰۰
- افکار کے دیئے آل احمد سرور ۲۰۰/۰۰
- جرنیلی سڑک رضا علی عابدی ۱۵۰/-
- شیر دریا رضا علی عابدی ۱۵۰/-
- فن تنقید اور تنقید نگاری نورالحسن نقوی ۳۵/۰۰
- اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار ۷۵/۰۰
- اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار ۵۰/۰۰
- داستان ناول اور افسانہ دردانہ قاسمی ۴۰/۰۰
- اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید پروین اظہر ۱۰۰/۰۰
- اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی ۳۰/۰۰
- تاریخ ادب اردو نورالحسن نقوی ۵۰/۰۰
- اردو ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی ۶۰/۰۰
- اردو ڈراما کی تاریخ و تنقید عشرت رحمانی ۶۰/۰۰
- دکنی ادب کی تاریخ محی الدین قادری زور ۱۸/۰۰
- اردو قصیدہ نگاری مرتبہ ام ہانی اشرف ۳/۰۰
- اردو مرثیہ نگاری مرتبہ ام ہانی اشرف ۳۵/۰۰
- ناول کا فن مترجم ابوالکلام قاسمی ۳۰/۰۰
- اردو مثنوی کا ارتقاء عبدالقادر سروری ۲۰/۰۰
- اردو تنقید کا ارتقاء عبادت بریلوی ۵۰/۰۰
- فن افسانہ نگاری وقار عظیم ۴۰/۰۰
- نیا افسانہ وقار عظیم ۴۰/۰۰
- داستان سے افسانے تک وقار عظیم ۵۰/۰۰
- اردو کیسے پڑھائیں سلیم عبداللہ ۲۰/۰۰
- آیئے اردو سیکھیں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۱۵/۰۰
- موازنۂ انیس و دبیر مقدمہ ڈاکٹر فضل امام ۳۰/۰۰
- مقدمہ شعر و شاعری مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی ۳۰/۰۰
- امراؤ جان ادا مقدمہ تمکین کاظمی ۳۵/۰۰
- مجموعہ نظم حالی مقدمہ ظہیر احمد صدیقی ۲۰/۰۰
- مثنوی گلزار نسیم مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی ۲۰/۰۰
- مثنوی سحر البیان مقدمہ قمر الہدیٰ فریدی ۲۰/۰۰
- انار کلی مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۵/۰۰

سیاسیات

- دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) محمد ہاشم قدوائی ۷۵/۰۰
- اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالٹکس) 〃 ۷۵/۰۰
- جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) 〃 ۴۰/۰۰
- مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالٹکس) 〃 ۴۰/۰۰

متفرق

- اصول تعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۳۵/۰۰
- جدید تعلیمی مسائل ڈاکٹر ضیاء الدین علوی ۳۵/۰۰
- تعلیم اور اس کے اصول محمد شریف خاں ۲۰/۰۰
- تنظیم مدارس کے بنیادی اصول محمد شریف خاں، آفاق عرفانی ۲۵/-
- تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے مسرت زمانی ۳۵/۰۰
- جدید علم سائنس وزارت حسین ۳۰/۰۰
- رہبر صحت مسرت زمانی ۲۰/۰۰
- رہبر تندرستی مسرت زمانی ۳۵/۰۰
- علم خانہ داری مسرت زمانی ۳۵/۰۰
- بچوں کی تربیت مسرت زمانی ۲۵/۰۰
- گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی ڈاکٹر محمد عارف خاں ۳۰/۰۰
- تفہیم البلاغت وہاب اشرفی ۲۰/۰۰
- اردو صرف ڈاکٹر انصار اللہ ۱۵/۰۰
- اردو نحو ڈاکٹر انصار اللہ ۹/۰۰
- اردو ٹیچنگ (ہندی کے ذریعے اردو سیکھئے) ۱۰/۰۰
- انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم اے شہید ۳۰/-

ناول اور افسانے

- حضرت جان (ناول) قاضی عبدالستار ۶۰/۰۰
- چار ناولٹ (ناولٹ) قرۃ العین حیدر ۷۵/۰۰
- آخر شب کے ہمسفر 〃 ۱۰۰/۰۰
- روشنی کی رفتار (افسانے) 〃 ۷۵/۰۰
- راجندر سنگھ بیدی اور انکے افسانے مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ۵۰/۰۰
- کرشن چندر اور انکے افسانے 〃 ۵۰/۰۰
- ہمارے پسندیدہ افسانے 〃 ۵۰/۰۰
- اردو کے تیرہ افسانے 〃 ۶۰/۰۰
- منٹو کے نمائندہ افسانے 〃 ۵۰/۰۰
- ضدی (ناولٹ) عصمت چغتائی ۲۵/۰۰
- پریم چند کے نمائندہ افسانے مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس ۵۰/۰۰
- نمائندہ مختصر افسانے مرتبہ محمد طاہر فاروقی ۲۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ